مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ الفرقان

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ الفرقان —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیرِ اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	نومبر 2007ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھراُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے‘ یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے‘ یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے‘ یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں‘ یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے‘ یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے‘ یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے‘ یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے‘ یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے‘ یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی‘ یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق‘ دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷ از۔ علامہ پرویزؒ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات واعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الفرقان

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ 16

پہلا باب: سورة الفرقان (آیت 1: تمہید)

لفظ برکت کا قرآنی مفہوم اور انسانی سوچ کی کیفیت 19

الفرقان کے لفظ کی بلاغت 22

بدلتے ہوئے حالات میں حق اور باطل کی تعریف 23

حق ہمیشہ حق ہوتا ہے 25

جھوٹ بولنے کی اجازت کا فتویٰ 25

جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں ارتکاب کا عمل 26

ہر جرم کا ارتکاب ضرورت کا رہینِ منت ہوتا ہے 27

الحق کے لیے وحی کی راہنمائی کی ضرورت لازم ہے 27

آج الحق کی تلاش میں سائکولوجسٹ فلاسفروں سے بہت آگے ہیں 29

دانشِ نورانی اور دانشِ برہانی میں بنیادی فرق ہے 29

وحی کی شکل میں قرآنِ حکیم کی تعلیم کا ماحصل 31

خدا تعالیٰ کی صفت تبٰرک کے مفہوم کی وضاحت 32

شبِ برات کی شرعی حیثیت 33

روزِ محشر امتیازی نشان رکھنے والی قوم کی نشانی: بھوک اور محکومی؟ 35

اس دنیا میں مومن کی زندگی کے آثار 35

جماعت مومنین ہر آن صفتِ فرقان کی ایک نئی شان سے مزین ہوتی ہے 36

جنگ بدر میں عملی طور پر صفتِ فرقان کی ایک زندہ مثال 37

دوقومی نظریہ کی مکمل محسوس تفسیر 37

یہ مجاہدین اور محاجزین سب کے سب مومن حقہ تھے 39

خدا تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کا بلندترین مقام ''علیٰ عبدہٖ'' کہہ کر متعین کر دیا ہے 40

ذاتِ خداوندی انسانوں کو ڈراتی نہیں بلکہ آگاہ کرتی ہے 41

خوف وحزن تو انسانی صفات کو جلا کر خاک کر دیتا ہے 41

دوسرا باب: سورة الفرقان (آیت: 2)

دین صرف خدا کی طرف سے ملتا ہے' کوئی رسول دین کا بانی نہیں ہوتا 45

ابن اللہ کا غلط تصور 45

یہودیوں کے ہاں نبوت اور عزیر کے تصورات کی حقیقت 45

خدا کے صحیح تصور کی اہمیت 47

ہمارے ہاں پایا جانے والا تصورِ خدا اور اُس کے اثرات 48

قرآنِ حکیم کی روشنی میں ہی خدا تعالیٰ کا حقیقی تصور ہے 50

خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا تعلق اس کے مقرر کردہ قوانین سے ہوتا ہے 51

دوحصوں میں اقتدار کی تقسیم: عالمِ امر اور عالمِ خلق 51
کائنات کی ابتدا کے متعلق موجودہ تحقیق اور قرآن حکیم کا ارشاد 52
عدم سے وجود میں لانے والی ہستی کسی Cause (سبب)
کی محتاج نہیں 53
بیج کی تقدیر 54
قرآن فہمی کے سلسلہ میں میرے لیے علامہ اقبالؒ کی راہنمائی 55
لغات القرآن، مطالب الفرقان اور تبویب القرآن کی افادیت 55
تقدیر کا قرآنی مفہوم 56
الذی خلق فسویٰ کا مفہوم 56
ذاتِ خداوندی اپنے آپ کو از خود پابند کرتی ہے 57
اقدار کے سلسلہ میں حضرتِ انسان کی عملی کیفیت 59
انسانی اعمال کے نتائج کو بدلنا انسان کے اختیارات سے باہر ہے 59
خدا تعالیٰ انسانی عمل کے ذریعے اپنی مدد کا متمنی ہے 61
لفظ تقدیر کی کیفیت اقبالؒ کی زبانی سنیے 62
تقدیر کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی مثال 63
بے عملی کی دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں 64
خدا اپنے اٹل قوانین کو کبھی نہیں بدلتا 65
وجودِ کائنات کا یہ سارا سلسلہ تقدیر کے مستحکم ہونے پر ہی موقوف ہے 65
خدا تعالیٰ کا اس قسم کا تصور قرآنِ حکیم کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا 67

تیسرا باب: سورۃ الفرقان (آیات 3 تا 10)

قوانین خداوندی کی نتیجہ خیزی کا دوسرا نام ہی اقتدارِ خداوندی ہے 69
مذہب میں پرستش ہوتی ہے جبکہ دین میں اطاعت 69
لا الٰہ کے بعد الا اللہ کا اقرار لازم ہے 70
انسانی صلاحیتوں کی کم مائیگی اور بے بسی کی کیفیت 71
سود و زیاں کا لالچ یا نقصان 71
دینِ خداوندی یا قانونِ خداوندی کا ماحصل طبقات کی نفی ہے 72
مادیت کی دنیا میں انسان کی بے بسی کی محسوس مثال 73
مردہ بدست زندہ کی کیفیت 73
انسانیت کے بلند مقام سے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں کی جانب سفر 74
وحیِ خداوندی کے سلسلہ میں دنیا بھر کے انسانوں کو ایک کھلا چیلنج 74
آج کے دور میں قرآن کے متعلق گِب (Gibb) کا اعتراف 76
چودہ سو سال پہلے کائناتی حقائق کے متعلق محیر العقول انکشافات 77
قرآنِ حکیم میں نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعارف 79
عقل و فکر سے ماورا توہم پرستی اور کرامات کے قصے 79
جاں نثاروں کی قربانیوں کا ماحصل اور ہماری احسان فراموشی کا نتیجہ 80
سخاوت اور درماندگی کے متضاد قصے 81
عقلِ انسانی کو قرآنِ حکیم کی روشنی ہی جلا بخش سکتی ہے 82
نبی اکرم ﷺ کی شخصیت بذاتِ خود ایک معجزہ تھی 83
نوعِ انسانی کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت کا یہ
اصول قیامت تک کے لیے راہنمائی ہے 84
نبی اکرم ﷺ کو جادو زدہ کہنے والوں کو قرآن نے ظالم کہا ہے 85
جادو کے سلسلہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا تفسیری بیان 85
قرآنِ حکیم کے ارشاد کے برعکس یہ روایات شہادت قرار پا گئیں 86
یہ بات عقیدت مندی کی نہیں بلکہ مفاد پرستی کی ہے 86
جمع شدہ روایات کی کیفیت 87

مودودی صاحبؒ کے طرزِ عمل پر بعض
جیدّ حضرات کا اعتراض اور علیحدگی 88
اتباعِ سنت کے نام پر خود ساختہ عمل کی دو ایک مثالیں 89
مجھے تو تجھ سے گلہ ہے اے مسلمان' ان سے نہیں 90
حدیث کو پرکھنے کا معیار 91
حدیث کے متعلق مودودی صاحبؒ کے تصورات اور
قرآنِ حکیم کی تعلیم کے نتائج 91

چوتھا باب: سورۃ الفرقان (آیات 11 تا 16)

سابقہ درس کی بازگشت نبی اکرمؐ کی معاشرتی زندگی 94
قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کو روزِ قیامت پر اٹھا رکھنے کا نتیجہ 96
انسان کی موجودہ زندگی نتائج کے لحاظ سے ایک کسوٹی ہے 96
انقلاب' ملک عظیم اور زبانِ عربی 97
لفظ قیامت کا مفہوم 97
لفظ الساعۃ کا قرآنی مفہوم 98
بنی اسرائیل کی داستان کے تفصیلی بیان میں لفظ الساعۃ کا استعمال 99
اس کائنات کے اندر کوئی امر یکبارگی نہیں ہوتا 100
اس انقلاب کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟ 100
لفظ الملوک کے سلسلہ میں اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا اظہار 101
مومن کے انقلاب کی پہچان: امن کا پیغام 102
طلسمِ سامری کو توڑنے کا طریق حضور ﷺ کی عملی زندگی کا نمونہ ہے 103
نبی اکرم ﷺ پر فرشتے بھیجتے ہیں 105
اس انقلاب کی تکذیب کرنے کا نتیجہ 106
قریش کے تکبر کی کیفیت 106
کسی کا مغلوب ہو جانا جہنم ہی کا دوسرا نام ہے 107
جہنم کا عذاب موت سے ختم نہیں ہوگا 107
محکوم قوموں کے لیے تو پورا پورا ملک ہی جیل خانہ ہوتا ہے 108
قرآن کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہمارے تراجم نے کیا ہے 109
انا للّٰہ وانا الیہ راجعون کا قرآنی مفہوم لفظ المصیر میں مضمر ہے 109
انسان کا بلندترین مقام کا حاصل کر لینا المصیر جسے جنت کہا جائے گا 110
انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت اختیار و ارادہ کی وسعتیں ہیں 111
انسانی چاہتوں سے بھی آگے کی منزل 112
جنت میں انسان کی پیشانی کا نور مزید اگلے راستوں کو منور کرتا جائے گا 112
انسان خدا کے کیے گئے وعدہ کے متعلق بھی پوچھ سکتا ہے 113

پانچواں باب: سورۃ الفرقان (آیات 17 تا 18)

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو نظروں سے اوجھل کر دینے کا نتیجہ 115
قرآنی آیات کے موجودہ تراجم اور تفاسیر کے عمل نے
قرآن کو کیا سے کیا بنا دیا 116
جہنم میں متبعین اور لیڈروں کے مابین باہمی مکالموں کا ذکر 117
اصل بات اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کرنا ہے 119
قرآنِ حکیم نے سائیکولوجی کو بڑی اہمیت دی ہے 120
اپنے لیے خود کوئی فیصلہ کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے 121
لیڈر عوام کو اور عوام لیڈروں کو قصوروار ٹھہراتے ہیں 122
قرآنِ حکیم احبار و رہبان دونوں کو مجرم قرار دیتا ہے 123
اعمال کی نتیجہ خیزی کے وقت لیڈروں اور متبعین کے
مابین باہمی چپقلش کا منظر 124

لیڈروں کی قوت تو ہمیشہ عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے 124

آج کا جمہوری نظام اور اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' 125

سب سے بڑا جرم قوم میں خوئے غلامی کا پیدا کرنا ہے 126

افلاطون کے فلسفہ کے مقابلے میں ارسطو کا Logic (منطق) کامیاب ہے 127

Logic (منطق) کے الفاظ کی الجھنوں کے جال کی گرفت اور اس کا اثر 128

یونان کی سوغات: تصوف کی خواب آور دنیا 128

تصوف کی تعلیم کا ماحصل 129

نبوتِ قادیاں اور جہاد 131

اس روشِ زندگی کا نتیجہ بھوک اور خوف کا عذاب ہے 132

ایک تمثیلی بیان میں عذاب کی ایک دوسری شکل 132

قرآنِ حکیم کی روشنی میں افراطِ زر کی تعریف اور اُس کی تباہ کاریاں 133

افراطِ زر کا نتیجہ تباہ کن طبقاتی تفریق کی شکل میں نکلتا ہے 134

چھٹا باب: سورۃ الفرقان (آیات 19 تا 26)

معاشرتی نظام کی ذمہ داری ہر شخص پر عائد ہوتی ہے 137

قرآنِ حکیم کے نزدیک ظلم کا مفہوم 137

رسول کو مافوق الفطرت یا مافوق البشر سمجھنے یا بنانے کا نتیجہ 139

سب سے بڑا معجزہ تو رسولِ خدا کی اپنی زندگی ہے 139

معجزہ انسانی عقل کے چراغ کو گل کر دیتا ہے 140

استقامت کے میدان میں استہزا کے سخت پتھر کا مقابلہ کرنا ہوگا 140

انسان کی ایک نفسیاتی کیفیت کا نفسیاتی طریق پر جواب 141

رسول بھی ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتا 142

فرشتوں کے متعلق ارشادِ خداوندی 143

انسان کا نامۂ اعمال ساتھ ساتھ مکافاتِ عمل کے ترازو میں تولا جاتا ہے 143

اعمال کے سلسلہ میں انسانی سوچ کا معیار 143

غلط اعمال کے سلسلہ میں ایک خوبصورت مثال 144

دنیا میں خیر و شر کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے 145

خیر و شر کا معیار صرف وحی مقرر کرتی ہے 145

مستقر اور مستودع کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں 146

مستقر کا قرآنی مفہوم 148

مادی نظریہ حیات قرآن کی تعلیم کے برعکس ہے 149

مستقر کی ایک دوسری شکل مقیل بھی ہے 150

قرآنِ حکیم کے یہ یوم تشقق السماء بالغمام کے الفاظ غور و فکر کے متقاضی ہیں 150

یہ الفاظ آج ہمیں کیا سبق دیتے ہیں؟ 151

اس دور کی خصوصیت کبریٰ 152

الرحمٰن یعنی صفتِ خداوندی کی عظمت پوری طرح کارفرما ہوگی 152

اس سے بھی ایک قدم آگے یعنی وہ رحیم بھی ہے 153

رحمِ مادر میں بچے کی پرورش کی نوعیت اور ماں کی قربانی 153

ماں کی طرف سے دودھ کی نہروں کے ساتھ شہد کی نہروں کا بھی مہیا کرنا 155

رحمت کے مفہوم کی بہترین مثال ماں کی آغوش اور باپ کا قاعدہ قانون سکھانا ہے 155

بچے کی صحیح پرورش رحمت اور الملک کے امتزاج کی رہینِ منت ہوتی ہے 156

انسانی دنیا میں صفاتِ خداوندی کے ظہور کی اہمیت اور اس کی لِم 157

قرآنِ حکیم انسان کو ڈیوٹی کا نہیں لبیک کا تصور دیتا ہے 157

ساتواں باب: سورة الفرقان (آیات 27 تا 31)

قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظام کی بنیادی
خصوصیت صرف دولفظوں میں 159
ہمارے ہاں نظامِ ربوبیت کے خدوخال کی نوعیت 160
انسانوں کا اختیار کردہ نظام ایک نہ ایک دن ختم ہوکر رہے گا 161
قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں کافر کا مفہوم کسی چیز کو چھپا کر رکھنا ہے 161
کسی گتھی کے نہ سلجھنے پر چڑچڑا پن کا پیدا ہونا عسرت کہلاتا ہے 162
آخر کار انسان کو وہ قرآنی نظام جو اس نے
ڈھانپ رکھا ہے ظاہر کرنا ہوگا 162
قرآنِ حکیم کے ہوتے ہوئے اس قندیلِ آسمانی کی
روشنی سے کون انکار کرے گا؟ 163
شیطان کے متعلق غلط تصور کا نتیجہ 163
ہمارے ہاں شیطان کا موجودہ تصور مجوسی یا پارسی مذہب کا پیدا کردہ ہے 164
شیطان کے متعلق ہمارے ہاں پائے جانے والے تصور کی حقیقت 165
ابلیس یا شیطان کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی ایک خوب صورت حدیث 165
لفظ خذولا کا مفہوم 166
امت کے خلاف خدا کی عدالت میں حضور ﷺ کی پکار 166
زوالِ امت کی وجہ جواز 168
لفظ مھجورا کا قرآنی مفہوم 168
ہم نے قرآنِ حکیم کو کئی ایک رسیوں سے باندھ رکھا ہے 169
قرآنِ حکیم کے ساتھ سب سے بڑی اور پہلی گہری سازش:
اس کے متن میں شکوک وشبہات 170
قرآنِ حکیم کو مختلف ادوار میں ترتیب دیئے جانے کی کہانی 171
زنا کی سزا رجم کے متعلق آیت بکری کھا گئی 171
قرآنِ حکیم کے حروف پر نقطے بھی نہ تھے 172
قرآنِ حکیم سات زبانوں میں نازل ہوا تھا، چھ کو جلا دیا گیا 173
قرآن کی پانچ سو آیات منسوخ ہوگئیں 174
قرآنِ حکیم کی آیات کو حدیث منسوخ کرسکتی ہے
اور دوسو سال بعد جمع کی جانے والی احادیث کی ماہیت 175
فقہ کی تاریخ اور اس کی حیثیت 176
اپنی اپنی احادیث اور اپنی اپنی فقہ کی روشنی میں
لکھی گئی قرآنی تفاسیر کی حالت 177
قرآنِ حکیم کی بعثت کا مقصد اور ضرورت 177
مہجورِ قرآن کا یہ عمل آج بھی جاری وساری ہے 178
قرآنِ حکیم کے علاوہ مثلہ معہ کا عقیدہ 179

آٹھواں باب: سورة الفرقان (آیات 32 تا 34)

نبی اکرم ﷺ پر مختلف اعتراضات کا ذکر اور آپ کی عملی زندگی 181
خلافت راشدہ کے دور کے متعلق ہمارا عملی تصور اور خدا کا فرمان 182
قرآنِ حکیم کے نزول کے متعلق کفار کے اعتراضات اور
خدا کی طرف سے ان کا جواب 182
قرآنِ حکیم کے الفاظ اور اس کا پروگرام موتیوں کی
ایک مالا کی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں 183
ہمارے ہاں ترتیل کے معنی قرآنِ حکیم کو مختلف
آوازوں کے ساتھ پڑھنے کا نام ہے 184
وحی کے مقابل کشف والہام کا عقیدہ 186

غارِ حرا میں وحی کے نزول کی روایت 187
آپ ﷺ کی ورقہ بن نوفل کی طرف سے
نبوت ملنے کے سلسلے میں روایات 188
مستشرقین کی طرف سے من گھڑت قصے ہمارے
ہاں کے لٹریچر کی زینت بن گئے 188
تزکیہ نفس کا قرآنی مفہوم 189
قرآن حکیم کی روشنی میں مزمل کی حقیقت 190
وحی کے پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے
عمل تزمیل کی ضرورت ہوتی ہے 191
انسانیت کو زندگی کے حقیقی مفہوم سے آشنا کرنے والی
عظیم ہستی مدثرؐ اور خداوندی پروگرام 192
قندیل آسمانی کا باہمی ربط مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی نظر میں 193
قرآن حکیم کے تعلیمی ربط کے سلسلہ میں قندیل آسمانی کی اپنی شہادت 194
عمل پیہم کے استحکام کی خاطر قلبی سکون کی اہمیت اور تیز رفتاری کا دُور 195
قرآن کی مخالفت کا جواب خود قرآن حکیم دیتا ہے 196
نبی اکرم ﷺ نے قرآن حکیم کتابی شکل میں نوع انسانی کو دیا تھا 197
کتاب مبین کا جمع کروانا اس کی وضاحت کرنا اور اسے
محفوظ رکھنا خود خدا کے ذمہ ہے 197
قرآن حکیم پر غور وفکر کرنے والوں کے لیے
بتویب القرآن نہایت مفید ثابت ہوگی 198
جہنم کی اصل حقیقت اور اہل جہنم کی پہچان 198
ایمان کا انگریزی ترجمہ Faith غلط ہے 199
اہل جہنم کی آنکھیں سامنے کی بجائے پیچھے کی طرف ہوں گی 200
قدامت پرست یا ماضی پرست اقوام کی حالتِ زار 200
پہلے دور کے انسان اور آج کے انسان میں فرق 201
انسانی عقل اور فکری علم کو صرف قرآنی سوچ ہی جلا بخشتی ہے 202
امروز و فردا کے حالات انسانی سوچ کے لیے تازیانہ ہوتے ہیں 202

نواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 35 تا 40)

قرآنِ حکیم کے تدریجی نزول کی حکمت 204
وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کا مقامِ بلند کس طرح حاصل ہوا؟ 206
قرآنِ حکیم میں تاریخی حقائق بیان کرنے کا مقصد 207
قرآنِ حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان
کو کیوں نمایاں حیثیت حاصل ہے؟ 207
نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی داستانِ موسیٰ علیہ السلام کے
جہادِ زندگی کی ہی مثل تھی 208
قوموں کی موت وحیات کا راز' فساد اور انقلاب کے
قرآنی مفہوم سمجھنے میں مضمر ہے 210
الساعۃ قرآنِ حکیم کی ایک بنیادی اصطلاح ہے 210
قرآنی انقلاب کا مقصد و منتہیٰ 211
ہماری تاریخی کتب نبی اکرم ﷺ کی شان میں
مغربی مفکرین کی گستاخیوں کے لیے اسلحہ خانہ ہے 212
مودودیؒ کے نزدیک حضور ﷺ کی زندگی کا عکس 213
نبوت کی زندگی کا پہلا دور اندرونی تبدیلیوں کا دَور ہوتا ہے 214
مخالف قوتوں کی طرف سے مخالفت کی وجہ جواز 215
مکافاتِ عمل انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے 215

اس جیسے پروگرام کی تکمیل کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام بھی تھے 216
تکذیب دین کا مفہوم 217
سابقہ قوموں کے تذکرہ کا مقصد ان کے انجام کو ظاہر کرنا ہوتا ہے 218
قرآن تاریخی واقعات سے اقدارِ خداوندی کی اہمیت کو واضح کرتا ہے 220
قرآن کے نزدیک تاریخ انسانوں کے تابع ہوتی ہے 220
ہیگل کا فلسفہء تاریخ انسانی اختیار وارادے کو سلب کر لیتا ہے 221
قرآنِ حکیم انسان کو مجبورِ محض قرار نہیں دیتا 222
تاریخ انسانی، تاریخ کے نتائج کی امین ہوتی ہے 223
نتائج کو قرآنی تاریخ کے معیار پر پرکھنا ہوگا 223
مومن کے دیکھنے اور ایک آرکیالوجسٹ کے دیکھنے میں
زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے 224

دسواں باب: **سورة الفرقان** (آیات 41 تا 49)

مذہب کی دنیا میں سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت 226
احبار ورہبان کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی اصل وجہ 227
انبیائے کرام علیہم السلام کا انقلابی پروگرام ہی ان کی سیرت تھی 228
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو قرآنِ حکیم میں محفوظ کرنے کی اہمیت 229
نبوت کی کشادہ ظرفی کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد 230
آسانیوں کا حصول ہمیشہ خونِ جگر کا متقاضی ہوتا ہے 231
ایک نہ ختم ہونے والا پروگرام 231
پہلے سے بھی زیادہ مشکل پروگرام کی تعلیم وتربیت کا مرحلہ تھا 323
مزاح اور استہزاء کے فرق کی روشنی میں سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ بلند 233
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سراجِ منیر کا لقب بڑا ہی غور طلب لقب ہے 234
عالمگیر انسانیت کے لیے آزادی کا پیامبر عظیم 235
اللہ کا قرآنی مفہوم 236
صرف قرآنِ حکیم ہی انسانی جذبات کی راہنمائی کرتا ہے 237
مذہب کی دنیا انسان کو نفس کشی کا سبق دیتی ہے 237
جذبات کو فنا کرنا تو قوتِ عمل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے 238
وحی خداوندی سرکش جذبات کو ساحلوں میں محصور کر دیتی ہے 238
وحی انسانی جذبات کی کمزوریوں سے ماوراء حقیقت ہے 239
انسانی فیصلوں میں انسانی تخیلات کا ہمیشہ دخل رہا ہے 240
ستاروں کی شکل میں راہنمائی کا ایک مستقل اور نہ بدلنے والا سہارا 240
وحی کے اندر انسانی جذبات کا دخل نہیں ہوتا 241
بات کو سمجھانے کے لیے قرآنِ حکیم کا محاکاتی انداز 243
اختیار وارادہ کے ہوتے ہوئے عقل سے کام نہ لینے
والا جہنم کا ایندھن ہوتا ہے 244
عالم گیر سطح پر انسان کے لیے ذلت وخواری کے سبب کی اصل وجہ 244
حقائق کو سمجھانے کے لیے قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان بڑا ہی غور طلب ہے 245
قرآنِ حکیم کی روشنی میں انا للہ وانا الیہ راجعون کا مفہوم 246
کائنات کی مثالوں کو بیان کرنے کا مقصد حقائق کو باور کرانا ہے 247
انسان کے مقابلے میں خارجی کائنات کی ہر شے
تعمیری نتائج پیدا کرتی ہے 248
سورج کی شعاعوں سے کشید کیے ہوئے پانی کی مثال 248
مومن کی صفت قانت کا قرآنی مفہوم 249

گیارھواں باب: **سورة الفرقان** (آیات 47 تا 52)

گزشتہ سے پیوستہ نفسِ مضمون 251

لفظ سبات کا استعمال اور یوم سبت 252
عیسائیوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات نفرت پر مبنی تھے 253
بتوں کے نام پہ دنوں کے نام رکھے گئے 253
قرآن حکیم نے زندگی بھر کسی دن کو بھی چھٹی کا دن قرار نہیں دیا 254
نیند کی حالت میں انسانی شعور کی کیفیت 254
نیند کی حالت میں انسانی شعور اعصاب سے لاتعلق ہو جاتا ہے 256
قوم ہمیشہ وہ تباہ ہوتی ہے جس کا غور وفکر کا سوچ کام کرنا چھوڑ دے 256
نینداور موت دونوں حالتوں میں شعور کو روک لیا جاتا ہے 257
شعور کے تسلسل کا ہی دوسرا نام میموری (Memory) ہے 257
''سبات'' کا یہ ایک لفظ حیات بعد الممات کی پوری
کیفیت کا ترجمان ہے 257
نیند کے بعد صرف معلومات ہی نہیں بلکہ احساسات
اور جذبات بھی واپس آ جاتے ہیں 259
خواب میں شعور کی نوعیت 259
شعور کا مربوط ہونا ضروری ہے 260
موت کے بعد کی زندگی کے درمیان کا وقفہ 260
کاش ایک کالج کی تعمیر کا میرا خواب پورا ہو جاتا 261
موت کے بعد شعور اس دنیا میں واپس نہیں آتا 261
قرآن حکیم کے نزدیک چھٹی کا کوئی تصور ہی نہیں 262
جمعہ کے روز جمع ہونے کا ایک مقصد تھا جسے نظر انداز کر دیا گیا 263
نعمائے خداوندی کا تذکرہ پانی کے سلسلہ میں نظامِ قدرت 264
بارشی پانی کے لیے طہوراً کی تشبیہ 266
حیات بعد الموت کے سلسلہ میں زمین مردہ کی مثال 266
خارجی کائنات میں خدا کی حکومت اور اپنی دنیا میں
اپنے جذبات کا اتباع: ایک کھلا تضاد ہے 267
مختلف مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد انسان کو حقیقت سے آشنا کرانا ہے 268
قرآنِ حکیم کا مکمل ہونا اور پھر محفوظ ہونا بذاتِ خود ختمِ نبوت کی دلیل ہے 268
رسول کی بعثت کا مقصد 270
لفظ کبیر کا قرآنی مفہوم 270
مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاں جہادِ کبیر اور جہادِ صغیر کا فلسفۂ تعلیم وعمل 271
ضابطہ حیات کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف کا نزول بھی 273
جہادِ کبیر کے لیے تلوار اور تلوار کے ساتھ قرآن:
یہ دونوں لازم وملزوم ہیں 274

بارھواں باب: **سورة الفرقان** (آیات 53 تا 58)

کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں 276
کارخانہ قدرت میں اقسام تفریق کی ایک حیران کن مثال 277
قرآنِ حکیم نے انسانوں کو صرف دو گروہوں میں ہی تقسیم کیا ہے 277
انسانوں کے مابین ٹکراؤ کی وجہ جواز صداقتوں کی نفی ہے 278
عربوں کی تمدنی زندگی پر ایک نظر 279
زمین کے نیچے قدم قدم پر بہتے ہوئے پانی کی کیفیت 280
زندگی کے تسلسل کو ماننے والوں اور اس سے
انکار کرنے والوں کے مابین ایک پردہ حائل ہے 281
چودہ سو سال پیشتر قرآنِ حکیم کے پیش کردہ حقائق 282
انسانوں کا اصل سوال طبعی طور پر یا قبائلی طور پر تقسیم ہونے کا نہیں 282
ہر دو طرف سے سسرال کا باہمی احترام جنتی زندگی کی نوید ہے 284
ہمارے ہاں بیوی کا بھائی شادی سے پہلے بھائی جان اور بعد میں سالا 285

انسان کوانسان پرستی سے نجات قرآنِ حکیم کی بنیادی تعلیم ہے 286
ختم نبوت کی حقیقت نے انسان کومکمل طور پر
آزادی کے تصور سے روشناس کر دیا ہے 286
آج ہمارا انگ انگ شخصیت پرستی میں جکڑا ہوا ہے 287
تیرا دل تو ہے صنم آشنا' تجھے کیا ملے گا نماز میں؟ 287
مُردہ لڑکی کا درخت کے ساتھ نکاح 288
قرآنِ حکیم کی بجائے پکی روٹی اور کچی روٹی کی امامت کا نتیجہ 289
مولانا احمد شاہ نورانی مرحوم کا ایک بیان 291
شب و روز' عمر بھر' پرویزؒ کی مخالفت کی وجہ جواز 291
عقل وفکر کی دعوت عمر بھر نبی کی زندگی کا خاصہ ہوتی ہے 292
بے لوث عمل قرآنِ حکیم کا بہترین اصول ہے 293
کسی لیڈر یا راہنما کے انتخاب کا بہترین اصول لیڈر کا بے لوث ہونا ہے 294
زندگی آرزو کے آبِ حیات سے ہی قائم و دائم ہے 294
انسانوں کے مرتب کردہ اصولوں کے مقابلے میں
خدا کی طرف سے ملنے والے اصول ہمیشہ ابدی ہوتے ہیں 295
ہماری تباہی و بربادی کا باعث ''توکل'' کا غلط مفہوم ہے 296
خداوند تعالیٰ کے قوانین پر مکمل بھروسے کا نام توکل ہے 296
لفظ سبح کا قرآنی مفہوم 297
لفظ حمد کا مفہوم 298
ذنوب کے غلط ترجمے نے قرآنِ حکیم کی ساری تعلیم کو ہی بدل دیا 299
اس سلسلہ میں مودودیؒ کا تفسیری بیان جو
قابلِ صد افسوس بھی ہے اور عجیب بھی 300
آپ حضور ﷺ کی چالیس سالہ زندگی آخر کس چیز کی شہادت تھی؟ 302
ذنب کا مفہوم قرآنِ حکیم کی روشنی میں 303

تیرھواں باب: سورۃ الفرقان (آیات 59 تا 62)

قرآنِ حکیم کے نزدیک ارض وسما کی کیفیت 306
کائنات کی ابتدا کے سلسلے میں انسانی عقل وشعور
جواب دینے سے عاجز ہے 306
کائنات کی ابتدا ایک ہیولیٰ سے ہوئی 307
موجودہ کائنات لحہ بہ لحہ پھیل بھی رہی ہے اور سنورتی بھی جا رہی ہے 307
ہمارے ہاں کے مفسرین کے نزدیک ''عرش'' کی کیفیت 308
عرش کے معنی کائنات کا مرکزی کنٹرول ہے 308
اس قدر محیر العقول سلسلہ کائنات پر کنٹرول کا مالک
ہونے کے باوجود وہ الرحمٰن ہے 309
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کا ذکر خیر اور ان کی خدمات 310
عربی زبان کی وسعت وکیفیت کا تذکرہ 310
لغت کے انداز میں رب العٰلمین' الرحمٰن اور الرحیم کا مفہوم 312
دنیا کی کوئی زبان قرآنِ حکیم کے الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکتی 313
سلسلۂ کائنات کی تحقیق اور خدا کی رحمیت 313
لائیڈ مارگن کی تحقیق: فجائی ارتقا 314
سورۃ رحمٰن میں لفظ الرحمٰن کی وضاحت 315
قرآنِ حکیم کی فصاحت وبلاغت تو قدم قدم پر غور وفکر کی متقاضی ہے 315
ہمارے ہاں كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کا کیا جانے والا ترجمہ 316
''عالمِ تغیرات میں تغیر نا آشنا انسانی ذات'' کی کیفیت 317
قرآنِ حکیم کے لفظ یسئلہ کا قرآنی مفہوم: احتیاج اور ضرورت 317

ہر آن قدم قدم پر بدلتی ہوئی ضروریات کے
مطابق ہر چیز کی نشوونما کرنے والی ذاتِ خداوندی 319
انسانوں کی دنیا میں حرمتِ الفاظ کا مقامِ بلند اور ان کی اہمیت 319
مذہب کی دنیا میں خدا کا تصور اپنا اپنا ہوتا ہے 320
ان بتوں کی بے کسی کی حالتِ زار 321
چودہ سو سال قبل سورج کی روشنی کے لیے ضیاء اور
چاند کے لیے نور کا لفظ استعمال کیا گیا 321
سورج کے لیے ضیاء اور چاند کے لیے نور کے الفاظ کا استعمال کیوں؟ 322
ثواب کے فریب میں مذہبی پیشوائیت کا کردار 324
مذہب کے تند و تیز نشہ سے انسان خود بھی نکلنا نہیں چاہتا 325
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبانی مومن کی کہانی 325
افسردہ ستاروں کا ہجوم خورشید کے نکلنے تک ہی ہوتا ہے 326
مذہب کی تاریک دنیا میں نورِ سحر کی نوید ہوتی ہی نہیں 326
گلشنِ زندگی کی اس خزاں میں بہارِ نو کا سماں اور حیاتِ تازہ کی نوید 327
یہ سب کچھ ہوگا لیکن ایک شرط کے ساتھ 328
شکر کا قرآنی مفہوم 328

چودھواں باب: **سورة الفرقان** (آیات 63 تا 70)

عبادت کا مفہوم 330
علی الارض ھونا کا قرآنی مفہوم 331
جھکو لیکن وقار کے ساتھ 332
ملاّ کی اذان اور مجاہد کی اذان میں بڑا فرق ہوتا ہے 333
لفظ ھوناً صفت محمود کا قرآنی مفہوم 333
یہاں تو جاہل سے بھی حسنِ سلوک سے پیش آنے کا سبق دیا گیا ہے 335
اس جھکاؤ کا وہ مفہوم جو ہمارے ہاں پیش کیا جاتا ہے 335
تصوف کی دنیا کا پیش کردہ اسلام 336
سورۃ مدثر میں پیش کردہ سیرتِ رسول ﷺ 336
اہلِ تصوف کی مصروفیات 337
متصوفانہ نظریاتی زندگی کا نتیجہ 340
قرآنِ حکیم کے نزدیک غور و فکر کی اہمیت 340
قرآنِ حکیم کے برعکس آج ہمارے ہاں ذکر کا پایا جانے والا مفہوم 341
قرآنِ حکیم انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹتا ہے 342
نتائج کی دنیا انسانی اعمال کی ہی پیداوار ہوتی ہے 343
عذاب سے بچنے کا طریق 344
اسراف کا قرآنی مفہوم 344
قرآنِ حکیم کا معاشی نظام تو آبِ حیات کے
بہتے ہوئے چشمے کی مانند ہے 345
خلافت و ملوکیت میں فرق 346
موچی گیٹ لاہور کے باہر اقبالؒ کا لا الٰہ کہنا 346
اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام یہ تھا، مقامِ ابراہیمی یہ تھا 347
ہر نماز سے پہلے کی جانے والی نیت کا اصل مقصد 347
قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کی قدر و منزلت 348
جنسیاتی بے راہ روی قوموں کو مضمحل کر دیتی ہے 348
جنسیات پر ڈاکٹر انون کی تحقیق 349
انسانی جذبات کو کنٹرول کرنے کا طریق ارادے
کی مضبوطی میں مضمر ہے 350
جنسی تقاضے اور طبعی تقاضے میں بنیادی فرق ہے 350

مغربی معاشرے میں نوجوانوں کی حالتِ زار 351
اس زوال کے اسباب معلوم کرنے کے لیے
کمیٹیوں کی تشکیل کی ضرورت نہیں 352
ہمارے ہاں چار چار بیویوں کے علاوہ ان گنت لونڈیوں کی اجازت 352
یہ سودا نہیں بکرا ہے 353
اصل پردہ تو نگاہوں کو بیباک ہونے سے روکنے کا ہے 353
نبی اکرم ﷺ کی تعلیم وتربیت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
کی نفسیات کو بدل کر رکھ دیا 353
دورِ نبوت ﷺ کی پہلی نسل کا کردار 354
جس کسی نے بھی جنسی جذبے کو بیباک کیا وہ تباہ ہو گیا'
دیکھیے برطانیہ کی مثال 355
جنسی بے راہ روی کے اس جذبے کے باوجود
راہِ راست پر آنے کی گنجائش ہے 355
قرآنِ حکیم کے نزدیک اصلاح کا طریق بڑا غور طلب ہے 356
پندرھواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 71 تا اختتام)
تلافی کے لیے تخریبی کام کے مقابلے میں صرف تعمیری کام کرنا ہوگا 358
قرآنِ حکیم کی تعلیم زندگی کے ایک ایک لمحہ کو محفوظ کرنا چاہتی ہے 360
قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک نہ بھولنے والا واقعہ 360
ایمان کا معیار وہ ہے جسے قرآن تسلیم کرے 361
قرآنِ حکیم کی صداقتوں اور حقیقتوں کو غور وفکر کے بغیر
تسلیم کرنے سے انسان مسلمان تو ہو سکتا ہے مومن نہیں بن سکتا 362
ایمان لانے کا مطالبہ ایمان والوں سے کیا جا رہا ہے 363
قرآنِ حکیم انسان کو علیٰ وجہ البصیرت ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے 364
انگریزی میں ایمان کا ترجمہ Faith (فیتھ) کرنا غلط ہے 365
قرآنِ حکیم کے نزدیک نبوت کے لیے انتخاب کا معیار 366
ایک رسول کو بھی عقل وشعور کے تحت وحی خداوندی پر ایمان لانا پڑتا ہے 366
وحی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ قلبِ نبوی پر باہر سے نازل ہوتی ہے 367
نبی اکرم ﷺ کو خدا تعالیٰ پر اور قرآن پر ایمان لانے
کا اعلان کرنا پڑا تھا 367
قرآنِ حکیم پیدائشی مسلمان کا نہ ایمان قبول کرتا ہے اور
نہ اُسے مومن تسلیم کرتا ہے 368
کیا عقل وشعور سے ایمان لے آنا کافی ہے؟ 369
ایمان کا 'دماغ سے قلب تک' کی رسائی حاصل کرنا بھی لازم ہے 369
نفسیاتی تبدیلی کے بغیر سیرت وکردار کی پختگی ممکن ہی نہیں 370
قلب کی تبدیلی کی ایک عملی مثال 370
کسی عمل کے لیے طبیعت کا مائل ہونا: یہ سیرت کی تبدیلی پر موقوف ہے 371
قلب کے بدل جانے سے دو جہانوں اور دو جانوں کی متضاد کیفیت 372
صرف وحی ہر دو راستوں کا تعین کرتی ہے 373
وحی کی عطا کردہ سرفرازیاں 374
اقدارِ خداوندی کے تحت انسانی اختیار وارادے کی آزادی 374
کسی قدر (Value) کی نافرمانی کے سلسلہ میں
ایمان کی تجدید' اس کی بازآفرینی 375
ایمان ہر آن اپنی قوت کا اظہار چاہتا ہے 376
اہلِ ایمان کی ایک حسین دعا 376
انسان کی کامیابی کا راز گھر کی ٹھنڈک میں مضمر ہے 377
اس ٹھنڈک کے حصول کا طریق 377
ہر قسم کی نعمتوں سے بھرپور زندگی 378

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ تمنا

قرآن حکیم کے متعلق نوع انسانی کے نزدیک سب سے اہم اور مقدم سوال یہ سمجھا جاتا ہے کہ آخر وہ کون سی خصوصیتِ کبریٰ ہے کہ جس کے تحت اس قندیل آسمانی کو ذکر للعالمین کہا گیا ہے چنانچہ ہمارا خیال ہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں ہمارا یہ ایمان ہے کہ قرآن حکیم کی صداقتوں اور حقیقتوں کو علیٰ وجہ بصیرت تسلیم کیے بغیر کوئی شخص بھی مومن نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا تعلق اس کے مقرر کردہ قوانین واقدار سے ہی ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس انسانی دنیا میں سب سے بڑا جرم قوم کو نظریاتی طور پر خوئے غلامی میں مبتلا کر دینا ہے۔ لیکن آج تو پوری انسانیت کی معاشی، سیاسی، تمدنی زندگی کا انگ انگ شخصیت پرستی میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت بالغہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس عہد کے عظیم مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ نے مئی 1980ء کی 16 تاریخ کو درسِ قرآن حکیم کے شروع میں فرمایا:

> ”آپ احباب کو جیسے علم ہے میں نہایت انکساری سے متعدد بار عرض کر چکا ہوں کہ میری عمر قریباً ساری کی ساری قرآنِ کریم کے ہی غور وفکر میں گذری اور اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ اس کے بعد قرآن کی تعلیم کا ملخص تم نے کیا پایا۔ نقطہٴ ماسکہ، مرکز، اس کا موضوع اس کا، عمود اس کا، یعنی یہ کیا چاہتا ہے، اس نے کیا کیا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے؟ تو وہ ایک فقرے میں یہ ہے کہ اس نے انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرایا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں تو یہ ہے کہ خدا نے کچھ اپنے متعلق اس میں کہا ہوا ہے وہ یہ کچھ کر رہا ہے اور یہ اس کی کتاب ہے اس نے اپنے متعلق یہ کچھ کہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کتاب تو اسی کی ہے مگر وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ
>
> محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
> مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا
>
> یہ ترجمان جو ہے یہ تو انسان کا ہے اور اس میں اس کے صحیح مقام سے اسے آشنا کرایا گیا ہے اور یہ چیز مذاہب کی دنیا میں تو ایک طرف رہی، یہ تو دنیائے فکر ودانش میں کہیں نہیں ملے گی، جو اس نے قرآن حکیم میں بیان کی ہے“۔

عزیزانِ من! قرآن حکیم کی طرف سے نوعِ انسانی کے لیے عطا کردہ نظامِ حیات کی بنیادی خصوصیت صرف دو لفظوں میں بیان کرنی مقصود ہو تو وہ یہ ہے کہ اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَکَانَ یَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا . [25:26]

> ”مفہوم: اس دور میں اقتدار اور کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو افرادِ معاشرہ کی پرورش ایسے کریں گے جیسے ماں اپنے بچوں کی کرتی ہے۔“

عزیزانِ من! خوف وحزن خواہ وہ کسی قسم کا بھی کیوں نہ ہو وہ تو انسانی صلاحیتوں کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے اور بقول پرویزؒ صاحب کہ ”آج کے دور میں تو یہ بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ الحق کی تلاش میں سائیکالوجسٹ فلاسفروں سے بہت آگے ہیں اور قومیں ہمیشہ وہ تباہ ہوتی ہیں جن کے غور وفکر کے سوتے کام کرنا چھوڑ دیں۔“ قرآن حکیم کے الفاظ اور اس کا پروگرام تو موتیوں کی طرح ایک مالا کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے اور وہ اس لیے کہ قرآنِ حکیم کی تعلیم زندگی کے ایک ایک لمحہ کو محفوظ کرنا چاہتی ہے۔ جبکہ اس تعلیم کا بنیادی اور اوّلین مقصد انسان کو انسان پرستی سے

نجات دلانا ہے۔ یہ امر واقع ہے کہ انسانی عقل کے فکری عمل کو صرف قرآنی سوچ ہی جلا بخشتی ہے کیونکہ اس کے بغیر تو ظن وتخمین کی محدودیت میں گرفتار انسانی عقل کی صلاحیتیں زبوں کارِحیات سے محفوظ رہ نہیں سکتی۔

خارجی کائنات میں خدا تعالیٰ کی حکومت اور اپنی دنیا میں اپنے جذبات کی اتباع! یہ ایک ایسا کھلا تضاد ہے کہ جس کا نتیجہ ہمیشہ انسانوں کے مابین ٹکراؤ کا موجب بنتا ہے کیونکہ یہ دراصل قرآن حکیم کی بیان کردہ صداقتوں کی نفی ہے۔ آج دنیا بھر میں عالمی سطح پر یہی وہ سیکولرازم ہے جس کی ہر سو بڑی شدت کے ساتھ پوجا ہو رہی ہے اور جس کے تحت مذہبی پیشوائیت کا خودساختہ متضاد مذہب افسانوں کا لبادہ زیب تن کیے مختلف سیاسی پارٹیوں، مذہبی فرقوں، بے لگام مغربی جمہوریت، نظام ربوبیت کے برعکس نظام سرمایہ داری، نیشنل ازم کی دیرینہ بیماری ذات پات کا کینسر اور زمین و آسمان کے فرق کے ساتھ طبقاتی تقسیم کی مزید صحت مندی کی خاطر شب و روز کوشاں ہے۔

عزیزانِ من! وحی کے بالمقابل عقل انسانی کا طریقہ ہمیشہ تجرباتی رہا ہے چنانچہ عقل انسانی کا یہ ماحصل کہیں صدیوں بعد اُس مقام پر پہنچتا ہے جس کے آغاز میں اسے شعور تک بھی نہیں ہوتا مثلاً چودہ سو سال پیشتر یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں (۲) چاند سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے (۳) زیر زمین کھارے اور میٹھے پانی کو الگ الگ رکھنے کے خاطر ہم نے دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ (۴) ہم نے ہر شخص کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

لہٰذا قرآنی دعوتِ فکر یہ ہے کہ

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

چودہ سو سال پیشتر قرآنِ حکیم کے پیش کردہ حقائق کی ایک اور مثال

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ وحی کے مقابلے میں عقل انسانی کو صدیوں کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہم یہاں محترم پرویز صاحب کی ایک تحریر قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جس سے قرآنِ حکیم کی اہمیت اور مقامِ عقل متعین طور پر سامنے آ جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ آج کے دور میں بھی قرآنِ حکیم کے مروّجہ تراجم اور تفاسیر قرآن فہمی کے سلسلہ میں کس قسم کی سوچ لیے ہوئے ہیں چنانچہ محترم پرویز صاحبؒ کا قصۂ آدم کی پیدائش کے سلسلہ میں کہنا یہ ہے کہ "یہ ٹھیک ہے کہ طبعی طور پر یہ سارے جتنے بھی انسان ہیں **و هو الذی خلق من المآء بشرًا** (25:54) بلکہ اس نے ہر زندہ چیز کی ابتدا پانی سے کی ہے۔" پانی حقیقت میں زندگی کی بنیاد ہے۔ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ جہاں بھی یہ سائنسدان جاتے ہیں، کہیں وہ چاند پہ جائیں، مریخ پہ جائیں، جہاں بھی وہ جا رہے ہیں، وہاں سب سے پہلے وہ مٹی لیتے ہیں اور مٹی میں دیکھتے ہیں کہ نم ہے یا نہیں۔ اگر اس میں نم ہو تو سمجھتے ہیں کہ یہاں لائف کا، زندگی کا امکان ہے اور اگر مٹی میں نم نہ نکلے تو وہ کہتے ہیں کہ یہاں آبادی یعنی زندگی **Life in any form** (کسی بھی شکل میں زندگی) نہیں ہو سکتی۔ چودہ سو سال پیشتر قرآن نے عرب جیسے مقام میں جہاں جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ان کا جو مرکزی شہر، بین الاقوامی شہرت کا شہر مکہ تھا،

اس سارے شہر میں سترہ آدمی تھے جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔تعلیم تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے'اس دور میں اس ملک میں ایک ان پڑھ (Unlettered)شخصؐ 'جسے اُمّی کہا گیا ہے'وہ یہ بات بتا رہا ہے کہ زندگی کی بنیاد پانی ہے'خود انسان کی ابتدا ایک ایسے جرثومے سے ہوئی ہے جو پانی اور مٹی کے ملنے سے نمود میں آیا تھا۔قرآن یہ کچھ چودہ سو سال پہلے بتا رہا ہے'پھر یہ Evolution (ارتقا) کی Stages (مراحل) طے کرتا ہوا پیکرِ بشریت تک آیا۔آج بیسویں صدی میں جا کے کہیں یہ معرکہ آراء سائنس کا انکشاف بتایا جاتا ہے جبکہ'وہ ایک اُمّیؐ چودہ سو سال پیشتر عرب کے علاقے کے اندر بیٹھا ہوا یہ بات کہہ رہا ہے۔کیا اس زمانے میں کسی انسان سے یہ ممکن تھا؟ کیا اس کی فکر میں یہ بات آسکتی ہے کہ وہ یہ کہے کہ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا (25:54) خدا نے اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق'انسان کی پیدائش قطرۂ آب[1] سے کی۔'' علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے کہ

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

اسی سلسلہ میں مروّجہ تفاسیر سے ایک دوسری مثال نبی اکرمﷺ کی سیرت کے متعلق ہے'جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ قرآنِ حکیم نے نبی اکرمﷺ کو جادو زدہ کہنے والوں کو ظالم قرار دیا ہے۔جبکہ ہم آج بھی نوعِ انسانی کو یہ باور کروانے میں مصروف کار ہیں کہ آپﷺ پر جادو کر دیا گیا تھا چنانچہ اس واقعہ کے سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن چھٹی جلد کا صفہ 554 دیکھا جا سکتا ہے'جبکہ مزید حوالہ جات کے لیے یہ تفسیری بیان کتاب ہذا کے صفحہ 85 پر پیش کر دیا گیا ہے۔

بہر حال اس قسم کی بعید از قرآنی تعلیم کے برعکس قرآنِ حکیم کی منزہ اور مشہود تعلیم کو تدریسی طور پر نوجوان نسل تک پہنچانے کی خاطر محترم پرویز صاحبؒ ایک کالج کی تعمیر کا خواب بوجوہ پورا نہ کر سکے۔چنانچہ 3 مارچ 1978ء کو آپ نے ایک درس میں فرمایا کہ

''کاش ایک کالج کی تعمیر کا خواب پورا ہو جاتا میری یہ آرزو بھی مرنے کے بعد مجھے نفس غیر شعور یہ کی طرح ستاتی رہے گی۔''

عزیزانِ من! یہ تھا وہ مردِ قلندر جس نے اپنی ساری زندگی قرآنِ حکیم کو سمجھنے اور دوسروں تک پہنچانے میں صرف کی۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ

غم سے مرتا ہوں کہ دنیا میں نہیں ہے کوئی
کہ کرے تولیت مہر و وفا میرے بعد

آخر پر بزمِ طلوعِ اسلام کا ایک ایک فرد محترم ڈاکٹر منظور الحق صاحب سے لے کر جناب محمد علی فارق تک اُن تمام حضرات کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ جن کا علمی اور ادبی تعاون تفسیر ہذا کے مکمل ہونے تک شامل حال رہا۔

محمد اشرف ظفر

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور

نومبر 2007ء

1۔مزید تفصیل کے لیے دیکھئے سورۃ فاطر درس نمبر 2 مورخہ 23 مئی 1980 از پرویزؒ

پہلا باب: سورۃ الفرقان (آیت 1: تمہید)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ①

عزیزانِ من! آج دسمبر 1977ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان سے ہو رہا ہے: (25:1)

لفظ برکت کا قرآنی مفہوم اور انسانی سوچ کی کیفیت

سورۃ کی پہلی آیت ہے: **تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا** (25:1)۔ عام ترجمے کی رو سے کہا جاتا ہے کہ ''بابرکت ہے وہ ذات کہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا' قرآن نازل کیا' تا کہ یہ انسان کے لیے' تمام لوگوں کے لیے' ڈرانے کا موجب ہو جائے۔'' آپ کو ہر جگہ یہی ترجمہ نظر آئے گا۔ اس سورۃ کا آغاز ہی **تَبٰرَكَ الَّذِيْ** (25:1) سے ہوتا ہے۔ برکت کا لفظ تو ہمارے ہاں صبح سے شام تک ہر زبان پر ہوتا ہے۔ ہم دعا بھی دیتے ہیں کہ اللہ برکت عطا فرمائے۔ تبرک وہی اللہ ہے جو خود بابرکت اور برکات عطا کرنے والا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ برکت ہوتی کیا ہے؟ سوچیے تو سہی۔ کیا اس سے آپ کے ذہن میں کوئی متعین چیز آتی ہے؟ ''اے چیزاں تے بچپن اچ ای سندے آئے نا: جے بسم اللہ پڑھ کے روٹی نہ شروع کریئے' تے فیر برکت ای نئیں رہندی۔'' ❶ اس پر سوچیے کہ یہ ہوتی کیا ہے؟ میں عرض کر رہا ہوں کہ برکت کہتے کسے ہیں اس پر سوچیے۔ یہ ایک ذہنی' موہوم سی تصوراتی چیز لگتی ہے۔ آپ صرف اس ایک لفظ پر ہی نہیں' کبھی سوچیے گا کہ صبح سے شام تک ہم کتنے ہی الفاظ بولتے ہیں جن کا کوئی متعین مفہوم' ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا' بس ساری عمر بولتے رہتے ہیں' ساری قوم بولتی رہتی ہے' ساری دنیا بولتی رہتی ہے لیکن ذرا کھڑے ہو کر سوچیے تو سہی کہ ہم کہتے کیا ہیں؟ ''برکت عطا کرے'' برکت ہوتی کیا ہے اور یہ چیز ہے جس پہ قرآن زور دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ

---

❶ یہ چیزیں تو بچپن سے ہی سنتے چلے آئے ہیں کہ اگر بسم اللہ نہ پڑھ کر کھانا شروع کیا جائے تو ''برکت'' ہی نہیں رہتی۔

تَتَفَكَّرُوْا (34:46) جولفظ بھی زبان سے بولو کھڑے ہو کر سوچو کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے، ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ جو اعلیٰ تعلیم ہے، جو اعلیٰ اقدار ہیں، ان کو تو چھوڑ یئے، روزمرہ کی زبان میں جو الفاظ آپ بولتے ہیں، ان کے متعلق تو آپ کو معلوم ہو کہ میں کہتا کیا ہوں۔

بڑی مشکل تو یہ ہے کہ یہ کوئی سوچتا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ انسان سوچنے والا جانور بھی ہے لیکن جسے Herd Instinct (گروہی جبلت) کہتے ہیں، جسے بھیڑ چال کہتے ہیں، اس میں بہت زیادہ یہی چیز ہے کیونکہ انسان کی زندگی کا نمایاں حصہ تو حیوانی زندگی میں گزرتا ہے۔ اسے ہی Herd Instinct (گروہی جبلت) کہتے ہیں۔ سارے بولتے ہیں، ہم بھی بولتے ہیں، بولتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن اسی Herd Instinct (گروہی جبلت) کو تو ہٹانے کے لیے آیا تھا۔ اس کو ہٹا کر اسے Reason (استدلال) پر لانے کے لیے قرآن آیا تھا۔ قرآن میں خدا کہتا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (12:2) تاکہ تم عقل سے کام لینا سیکھو۔ قرآن کی غرض وغایت یہ ہے۔ **لَعَلَّكُمْ** ایک عام لفظ ہے۔ عربی جاننے والے بھی جانتے ہیں کہ **لَعَلَّكُمْ** وہاں آتا ہے جہاں کسی چیز کی غایت بتائی جائے تاکہ یہ چیز ہو یعنی **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (12:2) تاکہ تم عقل سے کام لینا سیکھو۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ عقل سے کام لینے میں تو یہی ہے کہ آپ کھڑے ہو کر سوچیں۔ سوچنے کے دو الگ الگ طریقے ہیں۔ وہ میں ابھی عرض کروں گا لیکن بہرحال قرآن کہتا یہ ہے کہ **تَتَفَكَّرُوْا** (34:46)۔ قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے ایک ہی بات کہی تھی کہ سوچا کرو۔ سوچنے کی پہلی ابتدا تو ہونی چاہیے کہ صبح سے شام تک ہم جو الفاظ زبان سے بولتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے؟ یہ جو ہم بلاسوچے بولتے چلے جاتے ہیں یہ اس طرح سے Herd Instinct (گروہی جبلت) ہوتی ہے۔ اس کو عربی زبان میں تقلید کہتے ہیں۔ قلادہ وہ پٹہ ہوتا ہے جو جانور کے یا مویشی کے گلے میں ڈالا جاتا ہے اور اس سے کھینچ کے اس کو لیے چلے جاتے ہیں [1]۔ جبلی طور پر (Instinctively) حیوانات میں یہ چیز ہوتی ہے۔ جسے

---

[1] امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ قِلَادَۃٌ کے معنی بٹی ہوئی ڈور یا چاندی وغیرہ کا تار ہے جو گلے میں ڈالا جائے لیکن بعد میں ہر اس چیز کو کہنے لگے جسے گلے میں پہنا جائے یا جو کسی چیز کا احاطہ کر لے۔ اُسے اپنے گھیرے میں لے لے۔ تاج العروس اور محیط المحیط میں ہے کہ اَلْقَلِیْدُ اونٹنی کی ناک کی نتھنی جس میں نکیل کی رسی ڈالی جائے۔ اس سے تقلید کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی نکیل کی نتھنی جسے ناک میں، یا پٹا جسے اپنے گلے میں ڈال لیا جائے اور رسی دوسرے کے ہاتھ میں دے دی جائے، اور پھر اس کے پیچھے انسان جانور کی طرح چلتا جائے۔ چنانچہ بقول صاحب تاج العروس اسی نہج سے کہتے ہیں تَقْلِیْدُ الْوُلَاۃِ الْاَعْمَالَ یعنی والیوں کا ملازموں کو مختلف کاموں پر تعینات کرنا۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے نزدیک ان عقائد اور شعائر کو کہتے ہیں جو ان کی کتابوں میں کہیں مدوّن نہیں لیکن جنہیں انہوں نے اپنے اسلاف سے زبانی حاصل کیا اور یہ سلسلہ اسی طرح متوارث چلا آرہا ہے۔ (دیکھیے: پرویزؒ (1991): لغات القرآن جلد سوم۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص ص۔ 1382 تا 1384)۔

ہم بھیڑ چال کہتے ہیں اس میں اگلی بھیڑ جس طرف چلی جا رہی ہوتی ہے اسی طرف پچھلی بھیڑ چلی جا رہی ہوتی ہے۔ جب سے پہلی بھیڑ ہوئی ہے اور جب تک ہمارے ہاں آخری بھیڑ ہے ان کی یہ ایک ہی روش چلی آ رہی ہے۔ اسے Herd Instinct (گروہی جبلت) کہتے ہیں۔ اسے ہی تقلید کہتے ہیں۔ یہ جو تقلید ہے یہ آپ کے ہاں کا کوئی فقہی مسئلہ نہیں ہے' یہ کوئی فروعی مسئلہ نہیں ہے کہ یہ مقلدین ہیں یا یہ غیر مقلدین ہیں۔ سوال ہی یہ ہے کہ کیا آپ نے Herd Instinct (گروہی جبلت) پر چلنا ہے یا Reason (استدلال) پر چلنا ہے؟ اور Herd Instinct (گروہی جبلت) کی جو بات ہے' جس کا عام ترجمہ ہمارے ہاں بھیڑ چال کیا جاتا ہے' اس میں پہلی چیز یہاں سے شروع کرو کہ وہ جو دن بھر آپ الفاظ بولتے ہیں' کھڑے ہو کر سوچو کہ اس کے معنی کیا ہے۔

یہاں برکت کے لفظ سے ایک چیز آئی ہے جو اپنے مقام پہ محکم ہو' جم کے کھڑی ہو مگر اس میں نشوونما ہو رہی ہو۔ اب جم کے کھڑے ہونے میں تو پتھر بھی ہے۔ وہ ایک ہی مقام پہ جم کے کھڑا ہوتا ہے' پہاڑ بھی ایک ہی مقام پہ جم کے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں نمو یا نشوونما نہیں ہوتی یہ جامد ہوتا ہے لیکن ایک شے جو اپنے مقام پہ محکم بھی ہو' مستحکم بھی ہو اور اس میں نشوونما بھی ہو رہی ہو' عربی زبان میں اسے برکت کہتے ہیں جیسے درخت اپنے مقام پہ بھی جم کے کھڑا ہے اور نشوونما بھی ہو رہی ہے۔ سوچ رہے ہیں آپ کہ ایک لفظ میں کیا کچھ کہہ جاتے تھے! زبان بنانے میں یہ عرب پتہ نہیں کیا کر گئے۔ برکت یہ ہے کہ اپنے مقام کے اوپر محکم اور مستحکم بھی کھڑا ہو اور اس میں نشوونما بھی ہو رہی ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا** (41:30) جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس دعوے پر جم کر کھڑے ہو گئے **تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ** (41:30) ان پر فرشتے اترتے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ محض جم کے کھڑے ہونا نہیں ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ تو پتھر اور پہاڑ بھی اپنے مقام پہ جم کے کھڑا ہوتا ہے۔ ایک مقام پر جم کے کھڑے رہنا اور نشوونما ہوتے چلے جانا یعنی ساتھ کے ساتھ اس کا جو بڑھنا پھولنا پھلنا ہے' اسے برکت کہتے ہیں۔ ''اللہ برکت عطا فرمائے'' کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے محکم اصولوں پہ بھی جم کے کھڑے رہو اور زندگی کی ارتقائی منازل بھی طے کرتے چلے جاؤ۔ اب سوچیے گا کہ ہم میں سے کسے برکت حاصل ہوتی ہے؟

تبٰرک کا مفہوم ہوا کہ وہ ذات جو خود اس صفت کی مالک ہے اور وہ دوسروں کو یہ چیزیں عطا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے برکت کا یہ جو اصول' جو کلیہ' جو طریقہ' عطا کیا وہ کس طریق پہ کام کرتا ہے۔ یہاں کہا کہ **نَزَّلَ الْفُرْقَانَ** (25:1) فرقان نازل کیا گیا تاکہ برکت عطا فرمائے۔ یہ وہ ہے جسے ثبات و تغیر کا امتزاج (Combination of permance and change) کہتے ہیں۔ اس میں اپنے مقام پہ محکم بھی کھڑا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نشوونما (Development) بھی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

الفرقان کے لفظ کی بلاغت

کس مقصد کے لیے یہ نازل کیا؟ کیا نازل کیا؟ کہا کہ **الفرقان** نازل کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم کی خصوصیات بیان کرنے کے لیے قرآن میں بہت سے الفاظ آئے ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اگر صرف یہ ایک ہی لفظ آتا تو کافی ہو جاتا۔ یہ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے اتنا جامع لفظ ہے۔ اس ایک لفظ فرقان کا مادہ تو ''ف ر ق'' ہے یعنی فرق۔ ہمارے ہاں بھی تو فرق کہتے ہیں: ایک چیز کا دوسری چیز میں فرق کرنا۔ فارسی زبان میں یہ لفظ ''سر'' (Head) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ فرق' تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم' سر سے پاؤں تک۔ یہ بھی ذرا سا ہٹا ہوا ہے۔ عربوں کے ہاں فرق بالوں کی مانگ کو کہتے تھے اور مانگ کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر ایک بال بھی اِدھر سے اُدھر ہو جائے' دوسرے سے الگ نہ ہو تو مانگ ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ اس طرح دو چیزوں میں امتیاز' تفریق' Distinction کرنا کہ ان میں بال برابر فرق نہ رہے' ایسی نمایاں طور پہ دو چیزیں الگ الگ ہوں کہ ان میں بال برابر فرق نہ رہے تو اسے ان کے ہاں فرق کہا جاتا تھا۔ مانگ کو سیدھی ہونا چاہیے۔

آپ کو پتہ ہے کہ مانگ سیدھی کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ قرآنِ کریم کے اعمالِ قرآنی ایک چیز ہوتی ہے۔ اعمال تو کام کا نام تھا لیکن ہمارے ہاں اعمالِ قرآنی کے معنی ہوتے ہیں: قرآن کی آیتوں پہ تعویذ لکھنا' ورد وظائف بتانا۔ اس کے اوپر کتابیں لکھی ہوئی ہیں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کی بھی اس پہ ایک کتاب ہے۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت صاحب کے ہاں شکایت کرنے کے لیے ایک بی بی بھی آئی کہ میری مانگ سیدھی نہیں نکلتی تو آپ نے فرمایا کہ **اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ** (1:5) سات دفعہ پڑھ کر کنگھی پہ پھونک مارو' مانگ سیدھی نکل آئے گی۔ ''تہانوں استعمال ای نئیں پتہ اپنا آیتاں دا۔ ساڈیاں منڈیاں دے وال ای ایوں کر کے کر دے: پہلے کھبے پاسے کیتی مانگ۔ اتھے وی کم نا بنیا' اوناں نے سجے پاسے کیتی فیر وال ای کٹا لیے۔ اسی اینوں بی با کینے آں۔ چلو سیاپا ای مکایا وچوں۔''[1] نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ان کی ساری زندگی میں وہ مانگ ہی نکل گئی یہ فرق یعنی مانگ ہی نہیں رہتا۔ عزیزانِ من! تفریق ہی نہیں رہتی۔ عربی زبان میں فرق کہتے تھے ایسی نمایاں تفریق جس میں بال برابر فرق نہ ہو۔ الفرقان وہ فرقان ہے جو اس قسم کی تفریق پیدا

---

[1] آپ کو ان آیات کے استعمال کا علم ہی نہیں ہے۔ ہمارے بچوں کے بال بس یونہی سے کیے ہوتے ہیں: پہلے بائیں جانب مانگ نکالی۔ یہاں بھی کام نہ بنا' نہ بچے تو دائیں جانب نکال لی پھر سر منڈا لیا۔ ہم اسے بہت اچھا بچہ کہتے ہیں۔ چلو یہ مانگ وانگ کی مصیبت ہی ختم ہوئی۔

کر دے اور الفرقان تو صرف وہی ایک شے ایسی ہے جو اس قسم کی تفریق پیدا کر سکتی ہے۔ عربی زبان میں الف لام (ال) یوں آتا ہے: کسی چیز میں خاص تفریق کرنا۔ انسانیت کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ حق اور باطل میں تفریق' Truth & False میں تفریق' خیر اور شر میں تفریق' Good & Evil میں تفریق۔ یہ Ethics یا اخلاقیات کا بنیادی مسئلہ ہے کہ خیر کیا ہے؟ Good کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ Evil کسے کہتے ہیں؟ False کیا چیز ہے؟ Truth کیا چیز ہے؟ آپ کہیں گے کہ یہ کون سا ایسا مسئلہ ہے۔ یہ اسی لیے ہے کہ آپ نے کہیں' کبھی کھڑے ہو کے سوچا نہیں۔ کبھی ان سوچنے والوں سے پوچھو۔ جب سے سوچنے والوں کی تاریخ سامنے آئی ہے وہ یونان کے فلاسفر ابوالحکمت کہلاتے ہیں۔ ان کے ہاں اس زمانے سے یہ خیر اور شر' حق اور باطل کی تفریق کی بات شروع ہوئی کہ کسے خیر کہتے ہیں' کسے شر کہتے ہیں' حق کیا ہے' باطل کیا ہے؟ یہ اس زمانے سے شروع ہوئی اور آج تک چلی آ رہی ہے لیکن آج تک انسان یہ فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا اور آپ حیران ہوں گے کہ آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ یہ بات تو کوئی ایسی ہے ہی نہیں کہ جس میں یہ کچھ ہو۔ بعض حالات کے اندر بعض چیزیں اچھی ہوتی ہیں' دوسرے حالات میں وہ اچھی نہیں رہتیں۔ اس کے برعکس اچھی ہو جاتی ہیں۔ ایک وقت میں ایک چیز کو آپ حق کہتے ہیں دوسری چیز میں وہی باطل ہو جاتا ہے۔ خیر کو اچھا کہیے' شر کو برا کہیے تو حالات کے بدلنے کے ساتھ یہ چیزیں بدلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں اضافی (Relative) ہیں۔ مثلاً یہ چیز عام طور پہ کہی جائے گی کہ سچ بولنا اچھا ہے' جھوٹ بولنا برا ہے' مگر بوقت ضرورت یہ سچ اور جھوٹ اضافی (Relative) رہے گا' مطلق (Absolute) نہیں ہوتا کیونکہ وہاں مصلحت کا تقاضا یہی ہو گا کہ جھوٹ بول دیا جائے۔

بدلتے ہوئے حالات میں حق اور باطل کی تعریف

عزیزانِ من! اب اگر یہاں پہلی چیز یہ پوچھی جائے کہ صاحب! یہ جھوٹ بولنا برا کیوں ہے؟ آپ وہیں کھڑے ہو جاتے ہیں کہ صاحب! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ برا کیوں ہے۔ بتا دیجیے کہ کیا یہ پوچھنے کی بات نہیں؟ ''مجھے نہیں پتہ۔'' آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے کہ صاحب! سوسائٹی اس کو بڑا مذموم سمجھتی ہے اس لیے یہ بری چیز ہے۔ اگر کل کو سوسائٹی اس کو اچھا سمجھنے لگ جائے تو پھر یہ اچھی ہو جائے گی۔ تاریخ میں کتنی ہی سوسائٹیاں ایسی گزری ہیں جن کے ہاں جھوٹ بولنا بہت بڑی اچھائی کی بات سمجھا جاتا تھا' بڑا جوہر سمجھا جاتا تھا۔ دھوکا دینا' فریب دینا بڑے نیکی کے کام سمجھے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں ابھی کل تک ٹھگوں کی جماعت تھی۔ وہاں ایک پورا مذہب تھا۔ ان میں درگاہ' یا کالی دیوی کے پجاری تھے' ان کے ہاں بنیادی چیز یہ تھی کہ نوجوان لڑکے کی شادی اس وقت تک

نہیں ہوتی تھی جب تک وہ کسی کو دھوکا دے کر مار نہ آئے۔ ❶ ہمارے ہاں تو عام طور پہ ماں باپ کی عزت و تکریم کی جاتی ہے مگر کئی قبائل ایسے گزرے ہیں جو ماں باپ کو کچا کھا جانا بہت بڑی نیکی سمجھتے تھے۔ رومنز کے ہاں، رومنز کو دھوکا دینا بری بات تھی مگر غیر رومن کو دھوکا دینا بڑی نیکی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے ہاں بھی غیر یہودی سے سود لینا بالکل شیر مادر کی طرح حلال ہے۔ یہودی یہودیوں سے سود نہیں لیتے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں دھرم شاستر کے اندر عصمت بڑی چیز ہے لیکن غیر برہمن لڑکی پر اگر برہمن دست درازی کرتا ہے تو اس میں کوئی چیز معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ❷

یہ کیا چیزیں تھیں؟ آپ نے ان مثالوں سے کیا سمجھا؟ یہ کہ یہ چیزیں جو ہیں مثلاً سچ بولنا، عصمت کی حفاظت کرنا، دغا نہ دینا، فریب نہ دینا، یہ کچھ ٹھیک نہ تھا۔ یعنی ہم نے دیکھا یہ ہے کہ بعض سوسائٹیوں کے اندر اس کے بالکل برعکس تھا، حالات کے تابع یہ چیزیں بدلتی چلی جاتی تھیں۔ جو چیزیں اس طرح سے بدلنے والی ہوں، ان کو یا تو Relative (اضافی) کہتے ہیں یا مشروط ہوتی ہیں کہ ان حالات کے تابع ہوں یہ اچھی بات ہے، اگر یہ حالات بدل جائیں تو پھر یہ اچھی بات اچھی نہیں رہتی، بری ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں یہ چیز بری ہے اگر وہ حالات بدل جائیں یا یہ شرائط بدل جائیں تو وہ ایک بری چیز اچھی ہو جاتی ہے۔ یہ Relative (اضافی) چیز ہوئی لیکن حق یا Truth تو وہ ہے جو اضافی نہ ہو بلکہ Absolute (مطلق) ہو۔ ہر حالت میں وہ حق ہو، باطل ہر حالت میں باطل ہو، ہر دور میں باطل ہو، ہر قوم میں باطل ہو، ہر تمدن میں باطل ہو۔ یہ Absolute (مطلق) اور Relative (اضافی) دو Terms (اصطلاحات) آئیں۔ اب ہمارے

---

❶ ڈاکٹر رتھ بینی ڈکٹ (Ruth Benedict) نے اپنی کتاب Patterns of Culture میں بحر الکاہل کے نزدیک ایک قبیلہ کے متعلق لکھتی ہے کہ ان کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق شمار کی جاتی ہے اور جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہو، اسے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ خود ہندوستان میں ٹھگوں کی یہی حالت تھی۔ سپارٹا میں چوری کرنا بہت بڑی خوبی سمجھا جاتا تھا۔ ازمنہ مظلمہ (Dark Age) میں لوٹ مار کو ہمیشہ عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا...... ازٹکس (Aztecs) کا خیال تھا کہ اگر پوجاریوں کو باقاعدہ انسانی گوشت نہ کھلایا جائے تو سورج کی روشنی مدھم پڑ جائے گی۔ (پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 2002ء، ص ص 156 تا 157)

❷ راشڈل (Rashdall, Hostings) نے اپنی کتاب The Theory of Good and Evil کی پہلی جلد میں اسی طرح کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ مثلاً ''بہت سے ایسے کام جنہیں اقوام عالم جرم قرار دیتی ہیں، یونانیوں کے ہاں انہیں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ مقدس (Puritans) حبشی بچوں کو چرا کر لے جانے اور آئرستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے (ص۔84)''۔ اس باب میں پروفیسر میور ہیڈ (J.H. Muirhead) اپنی کتاب The Elements of Ethics (عناصر اخلاقیات) میں لکھتا ہے کہ ''ان اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقیات ہر جگہ اور ہر زمانہ میں حالات کے مطابق بدلتے رہے ہیں اور اخلاق ہمیشہ اپنے ماحول کے اندر ہی اخلاق رہتا ہے''۔

(جو قارئین اس باب میں مفصل مواد سمجھنا چاہتے ہیں وہ مطالعہ فرمائیں: پرویزؒ (2002)۔ انسان نے کیا سوچا؟ باب اخلاقیات ص ص 136 تا 197۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ رجسٹرڈ)

ہاں مطلق اور اضافی' یہ جتنی بحثیں آج تک آئی ہیں' یہ فلسفہ اخلاق Ethics[1] ہے' فلسفے کی ایک چیز ہے۔ اس میں یہی چیزیں آئی ہیں کہ مطلق حق Absolute Truth کیا ہے؟ یا Absolute Good مطلق خیر کیا ہے؟ یہ وہ ہے جو کسی حالت میں نہ بدلے' کسی شرط سے مشروط نہ ہو' Relative (اضافی) نہ ہو' Absolute (مطلق) ہو یعنی اپنے مقام کے اوپر محکم ہو تو وہ حق مطلق ہے۔

حق ہمیشہ حق ہوتا ہے

میں کہتا ہوں کہ عربی زبان میں تو حق کے ساتھ مطلق کے لفظ کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ تو حق کہتے ہی اسے تھے جو ہر مقام پہ' ہر شرط پہ' ہر حالت میں' حق ہو' اٹل ہو۔ حق کا لفظ ہی وہاں بولتے تھے جو Absolute (مطلق) ہو۔ ان کے ہاں Relative حق یعنی اضافی حق کا تصور ہی نہیں تھا۔ یہ کیا ہی خوب بات ہے! وہ تو جب ہمیں اس اضافی یا Relative کو الگ کرنا پڑا تو ہم حق مطلق اپنے ہاں بولتے ہیں۔ یہ زبان کے اعتبار سے غلط ہے' حق ہے ہی The Truth۔ یہ جو چیز ہے کہ ایک چیز بعض شرائط کے تابع شر ہے ذرا حالات بدل جائیں وہی خیر ہو جاتا ہے' بالکل غلط ہے۔

جھوٹ بولنے کی اجازت کا فتویٰ

معاف رکھیے گا کہ شاید آپ کے ذہن میں آج یہ ہو کہ اس نے یہ کچھ فلسفیانہ گفتگو چھیڑ دی' اس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آیئے ہم نیچے کی سطح پہ گفتگو کریں۔ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ ٹھیک ہے' ہر ایک ہم میں سے کہے گا کہ قرآن کی رو سے جو کذب ہے' یہ باطل ہے' شر ہے۔ ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مطلق (Absolute) باطل ہے' مطلق شر ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں یہاں کیا چیز جاری ہوئی؟ پرانے زمانے میں آپ کی ملوکیت کے دور کے اندر تو یہ چیزیں تھیں کہ جھوٹ ہے تو بری بات لیکن زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن میں جھوٹ بولنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ پرانی تفسیروں کو تو چھوڑیئے۔ آج کے دور میں آپ کے ہاں مولانا مودودی صاحب[2] تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے کہا ہے زندگی کی بعض عملی ضروریات ایسی ہیں جن میں جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے یعنی آدمی جھوٹ نہ بولے تو گناہگار ہو جاتا ہے' اور یہ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے تو گویا سچ جو ہے یہ حق مطلق نہ رہا' Absolute Truth نہ رہا' Relative (اضافی) ہو گیا' Conditional (مشروط) ہو گیا۔ زندگی کی بعض ضرورتوں کے تابع جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ اب جھوٹ بولنا شر مطلق یا باطل مطلق نہ رہا' Absolute نہ رہا' اضافی ہو گیا' ضرورت کے تابع مشروط ہو گیا

---

[1] انگریزی میں Morality عام اخلاق کو کہتے ہیں اور Ethics اُس سائنس یا فلسفہ کو جو Morality سے بحث کرتا ہے۔ ہمارے یہاں ان کے لیے الگ الگ اصطلاحات موجود نہیں ہیں اس لیے ان دونوں کو اخلاق سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے (پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 2002' ص۔ 141 (فٹ نوٹ 1)۔

[2] سید مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)

پوچھیے ان سے کہ دنیا میں کون سا جرم ہے جس کے لیے مجرم سے پوچھیے تو وہ یہ نہ کہہ دے کہ میں نے ضرورت کے تابع یہ کیا ہے۔ پھر میں دہرادوں جو برسوں سے دہرایا کرتا ہوں: ہمارے ہاں تو روز کہتے ہیں کہ اوتو جھوٹ بولیا ہیگا؟ کہن لگا: مینوں کی لوڑ پئی ہوئی ہیگی سی کہ میں جھوٹ بولدا۔ مینوں کی لوڑسی؟ ❶ جھوٹ بولا تم نے' جواباً کہا کہ جی! مجھے کیا ضرورت تھی' گویا ضرورت نہ ہوتو کوئی بھی جھوٹ نہیں بولتا' ضرورت نہ ہوتو کوئی بھی کوئی جرم نہیں کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک چیز اس کے نزدیک ضرورت ہو' آپ کے نزدیک وہ ضرورت نہ ہو لیکن اس سے پوچھیے تو وہ ضرورت بتادے گا۔

جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں ارتکاب کا عمل

ایک ضرورت تو Physical(طبعی) ضرورت ہے۔ اس سے روپیہ پیسہ ملتا ہے۔ یہ چیزیں جذبات کی تسکین ❷ کرتی ہیں۔ زنا کارکو

---

❶ ارے' کیا تم نے جھوٹ بولا؟ کہنے لگا: مجھے کیا ضرورت لاحق تھی کہ میں جھوٹ بولتا۔ مجھے کیا ضرورت تھی؟

❷ اخلاقی مفکرین کا ایک گروہ ہے جس کا خیال ہے کہ انسان کا مقصد زندگی حصولِ لذت ہے۔ یعنی ہر کام کا جذبہ محرکہ' حصولِ لذت کا خیال ہوتا ہے لہٰذا جو اعمال حصولِ لذت میں ممد و معاون ہوتے ہیں خیر (Good) کہلاتے ہیں اور جو اس مقصد کے حصول کی راہ میں مانع ہوتے ہیں شر (Evil) کہلاتے ہیں۔ اس نظریہ کو Hedonism کہتے ہیں۔ Hedone یونانی لفظ ہے جس کے معنی Pleasure (لذت) کے ہیں' ہابز (Hobbes) نظریہ لذتیت (Hedonism) کی انتہائی شکل Egoism کے نظریہ کا قائل تھا...... یعنی اپنی ذات کے لیے حصولِ لذت۔ اسپنوزا (Spinoza; 1637-1677) نے اس میں اتنی تبدیلی کی کہ انسان کو لذت (Pleasure) اپنی ذات کے تحفظ اور اس کی تکمیل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اعمالِ خیر وہ ہیں جن سے انسان تحفظ نفس اور اس کی تکمیل کر سکے...... اس کی بنیاد بھی اسی جذبہ خود غرضی (Selfishness) پر ہے جس پر ہابز (Hobbes) کا نظریہ Egoism مبنی تھا...... یہی وہ تصور ہے جس پر رہبانیت کی عمارت قائم ہے...... یہی تجرد و انفرادیت تھی جو یونان میں رواقیت (Stoicism) کی بنیاد قرار پائی...... تصوف اسی کے ایک حسین پیکر کا نام ہے...... اخلاقیات میں دوسرا نظریہ افادیت (Utilitarianism) ہے۔ اس میں عمل خیر وہ ہے جس سے زیادہ سے زیادہ افراد کا زیادہ سے زیادہ فائدہ مرتب ہوتا ہے...... اس سلسلے میں نظریہ افادیت کے آئمہ فکر میں سے مل (John Stuart Mill) ہمیں بتاتا ہے کہ ''لذت (Pleasure) کا حصول اور درد (Pain) سے نجات ہی مقصودِ زندگی ہے۔'' ...... راشڈل (Rashdall) نے افادیت کا ایک اور نظریہ وضع کیا جسے وہ مثالی افادیت (Ideal utilitarianism) کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ نظریہ ارتقا کا حامی ہربرٹ اسپنسر (1820-1903) بقاء اصلح (Survival of the Fittest) کا موجد بنا اور طبیعات کے دائرے سے نکال کر اسے اخلاقیات کے دائرے میں لے آیا۔ اس نظریہ کا نام ارتقائی اخلاقیات (Evolutionary Ethics) ہے جس میں نوعِ انسانی کا باقی رہنا (Survival) ہی خیر (Good) ہے۔ اس بقا کے لیے ماحول سے مطابقت (Adaptablity to Environment) ضروری ہے۔ اس کا قول ہے کہ ''اخلاقیات کی بنیاد' انتقام کا خوف ہے۔'' اس پر پرویزؒ نے کہا کہ ''جب انتقام کا خوف نہ رہے تو پھر اخلاق کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔'' G.G. Simpson نے اس نظریہ کی تردید کی' اس کے طرزِ فکر کو فطریت (Naturalism) یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ نظریہ انسانیت (Humanism) بھی کہتے ہیں۔ علم الانسان (Anthropology) اور علم المعاشرت (Sociology) کی رو سے اخلاقی ضوابط ان رسوم کے مجموعہ کا نام ہے جنہیں سوسائٹی نے وقتاً فوقتاً اختیار کیا اور جو پھر نسلاً بعد نسلٍ متوارث منتقل ہوتے چلے آئے۔ اس سے اخلاق بدلتے رہتے ہیں۔ پال (Leslie Paul) کے الفاظ میں ''اخلاقیات'' کامیابی کا دوسرا نام ہے (The Meaning of Human Existence. P-210) اسی روش کا نام مصلحت کوشی (Expediency) ہے اور جھوٹ اچھی چیز ہے۔ اسے کہتے ہیں نظریہ وجدانیت (Intuitionistic Theory of Ethics)۔ یہ ایک لمبی بحث ہے اور بہت سے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ فرمائیے: پرویزؒ (1955)۔ انسان نے کیا سوچا؟ کراچی: ادارہ طلوع اسلام۔ ص ص: 118 تا 168۔

جذبات کی تسکین کی زیادہ اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اسے قرآنِ کریم نے حرامِ مطلق قرار دیا ہے یعنی کوئی بھی حالت ایسی نہیں کہ جس میں اس کی اجازت ہو۔ اب یہ جو زبان سے اس کا ارتکاب کرتے ہیں وہ یہ کچھ نہ کہیں تو بھی ایک اشد ضرورت ہے جس کے تابع یہ کیا جاتا ہے اور وہ ہے جنسی جذبے کی تسکین۔ اگر اس میں میری بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں' جنسی جذبے کا اشتعال ہی نہ ہو' انگیخت ہی نہ ہو تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' خیال ہی نہیں ادھر آ سکتا۔ وہ تو اس جذبے کی شدت ہے جس سے یہ عمل سرزد ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ جسے آپ ضرورت کہتے ہیں' یہ جذباتی ضرورت ہے۔ زندگی کی ساری ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ جتنا کچھ ایک کے پاس ہے یہ جو ہوسِ زر ہے اس کو مارے مارے لیے پھر رہی ہے' بھاگے بھاگے چلا جا رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ** (102:1-2) اور زیادہ سمیٹنے کی' دوسروں سے اور آگے بڑھنے کی' یہ جو ہوس ہے' یہ انسان کو لیے چلے جا رہی ہے تاوقتیکہ وہ قبر تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ آپ کے نزدیک ضرورت نہیں ہے۔ ہم روز کہتے ہیں کہ صاحب! اس کے پاس اتنی دولت ہے' اس کے بعد اس کو اور کیا ضرورت ہے جو یہ جھک مار رہا ہے' فریب دے رہا ہے' چوری کر رہا ہے' دغا کر رہا ہے' غلط الاٹمنٹیں لے رہا ہے۔ کیوں یہ کچھ کر رہا ہے؟ آپ کے نزدیک اس ''کیوں'' کا کوئی جواب نہیں ہے کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس کے اندر ایک جذباتی ہوس ہے اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ جذباتی ضرورت تو طبعی ضروریات سے بھی کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔

ہر جرم کا ارتکاب ضرورت کا رہینِ منت ہوتا ہے

عزیزانِ من! ضرورت کے بغیر کسی بھی جرم کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ آپ ضرورت کی نوعیت میں فرق کر سکتے ہیں۔ اگر تصور اور نظریہ یہ ہو جائے کہ ضرورت کے مطابق ایک چیز جو غلط ہے وہ صحیح ہو جاتی ہے' اس کے کرنے کی اجازت ہو جاتی ہے' تو دنیا میں کوئی چیز بھی باطل مطلق یا شر مطلق نہیں رہتی۔ بڑے سے بڑے قاتل سے بھی آپ پوچھیے' وہ بھی اپنے اس جرمِ قتل کے جواز میں کچھ نہ کچھ کہے گا کہ میں نے یہ کیوں کیا۔ اس ''کیوں'' کا جواب ہی تو ''ضرورت'' ہوتی ہے۔ مثلاً میں نے انتقام لینا تھا یہ ایک جذباتی ضرورت ہے۔ ٹھگ اگر مال لینے کے لیے کچھ کرتا تھا یا اپنا جو عقیدہ تھا اس کی ضرورت کے ماتحت دوسرے کو قتل کرتا تھا تو یہ انتقام لینے کے لیے قتل کر رہا ہے' یہ اُس ضرورت کے تحت ہو رہا ہے۔ یہ اضافی (Relative) چیزیں ہیں۔ مطلق حق کیا ہے؟ وہ جو ہر حال میں حق ہے' یہ Absolute (مطلق) ہے' یہ Relative (اضافی) نہیں ہے' Conditional (مشروط) نہیں ہے' کسی حالت میں بھی بدل نہیں سکتا' بس اتنی سی چیز ہے۔

الحق کے لیے وحی کی راہنمائی کی ضرورت لازم ہے

عزیزانِ من! یہاں آ کر آپ اس کا نام کچھ بھی رکھ لیجیے وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ایسی چیزیں دیتی ہے جو Absolute

(مطلق) حق ہوتی ہیں اور یہی مسئلہ ہے جو یونان سے لے کر آج تک چلا آ رہا تھا کہ حق یا خیر مطلق کیا چیز ہے۔ تنہا عقل انسانی ضرورت کے تابع حق یا باطل، خیر یا شر کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ جو آپ کسی مجرم سے پوچھتے ہیں کہ تم نے کیوں کیا تو اس کے لیے وہ عقل کی رو سے دلائل دیتا ہے۔ جس کی عقل اپنے مقام پہ قائم نہیں ہوتی، اُسے آپ دیوانہ کہتے ہیں۔ دیوانے کی Definition (تعریف) یہ کی جاتی ہے کہ اسے اپنے نفع نقصان کا بھی پتہ نہیں ہوتا، وہ (عقل) دلائل دیتی ہے۔ وہ دلائل ہی ہیں جن کی رو سے آپ کے ہاں کے یہ جتنے نظام آج تک دنیا میں چل رہے ہیں یہ سیکولرازم کے اوپر مبنی ہیں۔ یعنی انسان بیٹھ کر اپنی ضرورتوں کے تابع کوئی قانون بناتے ہیں، کل کو ضرورتیں بدل جاتی ہیں پھر وہ اس قانون کے خلاف دوسرا قانون بنا لیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بدلتے بدلتے وہ ضرورتیں ہی ہیں جن کے تابع مثلاً آج وہاں انگلینڈ میں Homo Sexuality (ہم جنسی) بھی قانوناً جائز قرار پا گئی ہے۔ میں ان پہ تنقید نہیں کر رہا۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ کل ہی ایک چیز ان کے ہاں جرم تھی، ایک قانون کے تابع وہ جرم جرم نہیں رہا تو گویا وہ چیز جو کل جرم قرار پائی تھی، معیوب تھی، ان کے ہاں شر تھی، باطل تھی، مطلق شر یا مطلق باطل نہ رہی کیوں کہ دوسرے ہی دن، دوسرے ہی وقت میں انہوں نے اسے بدل دیا، اس کے خلاف قانون بنا دیا۔ سیکولرازم کہتے ہی اسے ہیں جس میں کوئی قدر، یا حق مستحکم (Established) نہ ہو، Absolute نہ ہو، مطلق نہ ہو، جو بدل سکتی ہو اور جب مختلف قومیں اپنے ہاں اس نظریئے کو ہی رائج کریں کہ اپنی ضرورت کے تابع جو چیز کل وہ حق سمجھتے تھے آج اس کو بدل سکتے ہیں اور اس کے خلاف چل سکتے ہیں اس کا نتیجہ وہ فساد ہے جو ساری دنیا میں اس وقت قائم ہے۔ آپ کسی قوم کے متعلق کہہ ہی نہیں سکتے کہ آج جس چیز کو اس نے باطل قرار دیا ہے، کل کو بھی وہ اسے باطل ہی قرار دے دے۔ یونان کے فلاسفروں سے لے کر آج تک پوری انسانیت اسی کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی کہ یہ معلوم کر سکے کہ مطلق حق یا مطلق خیر کیا ہے جو ہر حالت میں Absolute (مطلق) ہو لیکن آج بھی انسان وہیں کھڑا ہے۔

میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ روز قوانین بدلتے رہتے ہیں۔ آپ کے ہاں اس بات کی دلیل یہ ہے کہ مطلق حق یا خیر کے اوپر انسان نہیں پہنچ پایا۔ اگر مطلق ہوگا تو اُسے بدلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مطلق کے متعلق تو قرآن کے الفاظ میں کہا ہی یہ جائے گا کہ **لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (10:64) مطلق حق تقاضوں کے مطابق، ضروریات کے مطابق، بدلتا نہیں۔ آج بھی یہی صورت ہے۔ روز تجربے ہوتے ہیں، انسان Trial & Error (سعی وخطا) کی رو سے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ابھی تک حق مطلق پر نہیں پہنچا۔ اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ

آدمی اندر جہانِ خیر و شر
کم شناسد نفعِ خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوبِ کار چیست
جادۂ ہموار و ناہموار چیست

انسان ابھی تک مطلق خیر اور حق پر نہیں پہنچ پایا۔ یہ جو ابھی ابھی میں نے بات کہی ہے کہ یہ جس چیز کو بھی بدلتے ہیں' اس میں ہوتا یہ ہے کہ ہر وہ چیز جسے معیوب کہا جاتا تھا' آج اسے مستحسن قرار دیا جاتا ہے۔ ان سے بات کیجیے تو وہ اس کے حق میں ہزار دلائل دیں گے۔

آج الحق کی تلاش میں سائکولوجسٹ فلاسفروں سے بہت آگے ہیں

میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ قرآنِ کریم سکھاتا ہی یہ ہے کہ تم کس طرح عقل سے کام لو۔ اب وہ جو دلائل دیتے ہیں وہ تو عقل کی رو سے ہی دیتے ہیں۔ یہ مسئلہ پھر مشکل آ پڑا۔ اس کے لیے غور و فکر کرنے والے مغرب کے بھی فلاسفر ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ جو آج فلاسفر سے سائیکولوجسٹ آئے ہیں' یہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہ جسے میں ''فرقان'' کہوں گا یہ فرق کر رہے ہیں۔ حقیقت میں ان کے ہاں دو Terms (اصطلاحات) آئی ہیں اور بڑی عمدہ Terms (اصطلاحات) ہیں۔ ان کے ہاں ایک چیز Reason (استدلال) ہے اور دوسری چیز Rationalizing Intellect (منطقیانہ عقل) ہے۔ یہ لوگ Reason (استدلال) بولتے ہیں Absolute (مطلق) شے کے متعلق جو بات کہی جائے اور یہ جو اضافی چیزیں روز بدلتی ہیں اس کو حق ثابت کرنے کے لیے' اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ یہ جو Intellect (عقل) ہے یہ اپنے فیصلوں کو Rationalize (منطقی) کرتی ہے۔

دانشِ نورانی اور دانشِ برہانی میں بنیادی فرق ہے

معاف رکھیے گا' بات ذرا مشکل ہے لیکن غور سے سمجھتے جائیے' بڑے اہم مسائل ہیں۔ عزیزانِ من! عقل اور عقل میں یہ جو فرق ہے اس کے لیے ہمارے ہاں یہ دو Terms (اصطلاحات) آئی ہیں۔ اقبالؒ (1938-1877) کی نگاہ تو بہت دور جاتی ہے۔ اس کی قرآن پہ نگاہ ہے۔ قرآن میں یہ جو دو قسم کی عقلیں ہیں' ان میں فرق کیا ہے۔ باطل کے حق میں' یہ جتنے بھی باطل پر چلنے والے لوگ ہیں' دلائل دیتے تھے' قرآن ان کے دلائل کو بیان کرتا ہے لیکن اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ یہ ان کی عقل فریب کار کا کام تھا جو یہ کر رہے ہیں کیونکہ یہ جو باطل ہے یہ اس کو حق ثابت کر رہے ہیں۔ قرآنِ کریم کی اس حکمت کی رو سے' اقبالؒ (1938-1877ء) کو جو بصیرت حاصل تھی' اور ادھر وہ فلسفے میں بھی آپ جانتے ہیں' جو اس کا مقام تھا' وہ ان چیزوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ہمیں دو Terms (اصطلاحات) دیں: ''دانش نورانی اور دانش برہانی'' اور میں کہتا ہوں کہ آج جو سائیکولوجسٹ نے Rationalizing Intellect (منطقیانہ عقل) کہا ہے اسے اس شخص نے دانش برہانی کہا ہے۔ کیا بات ہے! ایک دانش نورانی ہے کہ جسے ان ماہرین نفسیات نے Reason (خرد) کہا ہے اور یہی ہے وہ چیز جسے وہ کہتا ہے کہ وحی حق مطلق دیتی ہے اور اس کے حق میں جو دلائل دیتی ہے وہ دانش نورانی ہے۔ قرآن اپنی کسی بات کو بغیر دلیل کے نہیں منواتا۔ وہ کتاب کے ساتھ حکمت کو نازل کرتا ہے۔ یہ جو سائیکولوجسٹ کی دو اصطلاحیں آج آئی ہیں' ان کی رو

سے ہم کہیں گے کہ قرآن یہ جو Absolute (مطلق) حق کے حق میں دلائل دیتا ہے' وہ Reason کہلا سکتی ہیں اور یہ جو باطل کو حق ثابت کرنے کے لیے دلائل دیئے جاتے ہیں' Rationalizing Intellect کہلا سکتی ہے جسے اقبالؒ دانش برہانی کہتا ہے اور دوسری جگہ وہ انہی کو عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے صاحب!

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

ایک عقل تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنے مفاد کے لیے اپنے آپ کو استعمال کرتی ہے' دوسرے کے مفاد کا اس کو کوئی خیال نہیں رہتا۔ یہ جو دوسرے کو دھوکا دینا' جھوٹ بولنا' فریب کرنا ہے یا اپنے لیے کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے ہے اور اس سے پوچھیے تو وہ ہزار دلائل دے دے گی صاحب! یہ ہے:

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سُودِ خود بیند نہ بیند سود غیر

اور اس کے مقابلے میں ''وحیٔ حق بینندہ سودِ ہمہ'' ہے۔ وحی کی رو سے جو Absolute (مطلق) اقدار یا Values ملتی ہیں وہ تمام نوعِ انسانی کی منفعت کو دیکھتی ہیں:

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اور یہ فرق کر دیا۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ وَاَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) بقا اسی عمل کے لیے ہے جو پوری کی پوری نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو ورنہ اپنی ذات کے لیے' اپنے خاندان کے لیے' اپنے قبیلے کے لیے' اپنی قوم کے لیے' منفعت کی تو ہر ایک سوچتا ہے۔ یہ دانش برہانی ہے یہ Rationalizing Intellect کہلاتی ہے' تمام نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے سوچنے کی جو بات ہوگی اسے ہم دانش نورانی کہیں یا عقل جہاں بیں اور اس کے لیے آج کی سائیکولوجی کی اصطلاح میں اسے Reason کہا جائے گا۔ یہ چیز Absolute (مطلق) ہوگی۔ آج کے انسان کے متعلق اقبالؒ نے یہ لکھا ہے کہ

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار

وحی سے محروم ہو کر اپنی عقل کی رو سے جو چیزیں یہ طے کرتا ہے' وہ سانپ کی طرح اس کو ڈسنے لگ جاتی ہیں۔ وہ اس لیے کہ یہ اپنی عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا اور اس نے وحی کی روشنی میں عقل سے وہ کام لینا تھا۔ یہ اس نے نہیں سیکھا لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

وحی کی شکل میں قرآنِ حکیم کی تعلیم کا ماحصل

عزیزانِ من! دین اور قرآن کا سارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ مطلق حق کیا ہے اور مطلق باطل کیا ہے؟ مطلق حق یا خیر وہ ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہے اور اس کے لیے خیر کا اور برکت کا موجب ہے۔ شر وہ ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لیے نقصان دہ ہو یعنی اپنے دائرے کے اندر، اپنی قوم کے اندر، وہ خیر ہو ذرا اس سے باہر دوسرے جو انسان ہیں، ان کے لیے وہ شر ہو جائے۔ اگر یہ چیز ہے تو یہ خیر مطلق یا حق مطلق نہیں ہوا بلکہ اضافی (Relative) ہو گیا۔ الفرقان وہ ہے جو Absolute (مطلق) حق اور باطل میں فرق کر کے ایسا فرق بتائے جس میں بال برابر بھی ابہام نہ رہے، الجھن نہ رہے، جو خیر اور شر میں، حق اور باطل میں، اس طرح سے فرق کر کے بتائے کہ اسے مانگ کے متعلق کسی دلیل کی ضرورت نہ ہو، اسے دیکھنے سے ہی پتہ چل جائے کہ سیدھی ہے یا ٹیڑھی، کچھ بال ادھر آ گئے ہیں یا نہیں، کس قدر صحیح ہے۔ یہ عرب ایسی قوم تھی جو فلسفیانہ Abstract talk میں نہیں جاتی تھی، یہ محسوسات کے مشاہدے سے نتائج اخذ کرتی تھی۔ اس لیے اس زبان کے سمجھانے کے لیے ہمیشہ محسوس مثال دی جاتی تھی: دو چیزوں میں ایسا نمایاں Distinction (فرق) کہ جس میں دیکھتے ہی پتہ چل جائے کہ سیدھی ہے یا نہیں، ادھر اُدھر فرق تو نہیں۔ اب اس کے لیے مانگ کی تشبیہ دینا کیا بات ہے! قرآن ان کے ان الفاظ کو استعمال کرتا ہے اور یہی ہے وہ فرق کرنے والی شے: حق بھی Absolute اور حق کو بتانے والے، یہ جو وحی کی روسے اقدار دی گئی ہیں یہ بھی، الفرقان ان میں جو فرق کر کے دکھائے۔ اب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم کا ہے کے لیے آیا ہے اور پھر یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (10:64) کیوں کہتا ہے۔ اگر یہ حالات کے تابع مشروط ہو، اگر یہ ضروریات کے تابع بدل جاتا ہو، تو یہ بدلنے والی شے تو پھر مطلق رہ ہی نہیں سکتی، وہ تو Absolute (مطلق) ہوتی نہیں ہے۔ Absolute (مطلق) تو ان شرائط اور تقاضوں اور ضروریات سے بالا ہوتا ہے۔ ہر حالت میں، ہر آن میں، ہر زمانے میں، وہ حق حق رہتا ہے، خیر خیر رہتا ہے، یہ پوری نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے ہوتا ہے۔ اب برکت کے معنی بھی آ گئے۔ تَبٰرَکَ الَّذِیۡ (25:1) میں اب آ گیا کہ وہاں لفظ قرآن نے اپنے خدا کی صفت (تبٰرک) کیوں کہی ہے۔ اس میں پہلی بات یہ تھی کہ وہ اپنے مقام پہ محکم کھڑا ہو اور آگے (الفرقان) میں ہم نے دیکھا کہ حق مطلق ہو، اپنے مقام پہ اٹل ہو لیکن اپنے مقام پہ اٹل اور اس کے ساتھ ہی جتنی زمانے کی ضروریات ہوں ان کو ساتھ پورا کرتا چلا جائے۔ تبٰرک میں یہ چیز بھی تھی کہ پتھر کی طرح جامد نہ ہو بلکہ اس میں نشوو ارتقا بھی ہو۔

خدا تعالیٰ کی صفت تبٰرک کے مفہوم کی وضاحت

یہ مسئلہ پھر بڑا مشکل ہے کہ ایک چیز اپنے مقام پہ محکم بھی ہو اور زمانے کے تقاضوں کا بھی ساتھ دیتی چلی جائے۔ سنیے! عرب اس قسم کی چیز کو کیا کہتے تھے۔ اس کے لیے پھر وہی محسوس مثال ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں آج کل کے دروازے ہیں ان میں تو وہ چول نہیں لگی ہوتی، البتہ پرانے زمانے کے جو دروازے ہوتے تھے ان میں نیچے وہ چوکھٹیں سی ہوتی تھیں، نیچے ایک ایسی لکڑی ہوتی تھی اور اسی طرح سے اوپر اس میں ایک چول سی ہوتی تھی تو وہ دروازے اس طرح کے ہوتے تھے۔ عربوں کے ہاں یہ چیز جس کے اندر یہ آ کے رکھی جاتی تھیں یہ تو اپنے مقام کے اوپر مستحکم ہوتی تھی اور دروازہ ضرورت کے مطابق کھلتا بھی تھا اور ضرورت کے مطابق بند بھی ہوتا تھا تو وہ اسے حق کہا کرتے تھے یعنی جو اپنے مقام پہ اٹل ہو۔ اگر وہ جو اس کی چوکھٹ ہے وہ وہاں سے نہ ہلے، وہ اپنے ہاں جامد ہو جائے یعنی بند ہے تو بند رہے، کھلا ہے تو کھلا رہے، وہ دروازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ تو دیوار ہو گئی۔ محکم اس قدر ہو کہ ذرا اِدھر اُدھر نہ ہل سکے اور ضرورت کے مطابق جب اندر جانا چاہے کھل جائے، باہر آنا چاہے بند کر دیں، جب جی چاہے بند ہو جائے، جب جی چاہے کھول دیں۔ وہ اپنے مقام کے اوپر اٹل کھڑا ہوتا ہے یہی برکت ہو گی۔ یہاں کہا کہ تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ (25:1) [1] عزیزانِ من! یہ قرآن ہے:

این کتاب نیست چیزے دیگر است

یہ عربوں کی زبان تھی جو ان حقائق کی متحمل ہو سکتی تھی۔ کیا بات تھی! سوچیے کہ اس دور میں چودہ سو سال پیشتر سمجھانے کے لیے اس مثال سے بہتر مثال کوئی ہو سکتی ہے! آج بھی نہیں ہو سکتی: اپنے مقام پہ بھی مستحکم رہے، ضروریات کا ساتھ بھی دیتا چلا جائے۔ یہ حق ہے، پتھر کی طرح جامد نہیں ہے، درخت کی طرح مستحکم ہے، جما ہوا بھی ہو اور اس کے ساتھ تغیرات میں اس کی نشو و نما بھی ہوتی چلی جائے: نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ (25:1) اللہ تعالیٰ نے کئی ایک مقام پہ قرآن کو ''الفرقان'' کہا ہے۔ میں اس کے لیے ایک ریفرنس دے دینا ضروری سمجھتا ہوں سورۃ دخان 44ویں سورۃ میں ہے کہ حٰمٓ ۚ [2] وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ [3] اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ (44:1-3) ہم نے اسے لیلۃ مبارکۃ میں نازل کیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہی تَبٰرَکَ الَّذِیۡ (25:1) والی بات ہے۔ یہاں قرآن کے نزول کے زمانے کو لیل کہا ہے کہ اس میں تاریکیاں ہی تاریکیاں تھیں۔ یہ نہیں ہے کہ جسے ہم ایک رات یعنی شام سے صبح تک کہتے

---

[1] کس قدر فراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل، اور حق و باطل اور غلط اور صحیح میں امتیاز (Distiction) کر دینے والی ہے۔

[2] خدائے حمید و مجید کا ارشاد ہے کہ

[3] یہ کتاب مبین، یہ واضح ضابطہ حیات، اپنی صداقت پر آپ شاہد ہے۔ (حوالہ برائے فٹ نوٹ 3`2`1: پرویزؒ: مفہوم القرآن)

ہیں۔اس سے مقصد یہ تاریکیوں کے دور کے اندر کا ہے لیکن وہ تاریکیاں کس قدر بابرکت ثابت ہوئیں کہ اس قسم کا سپیدہ سحر اس سے نمودار ہوگیا۔کیا چیز نازل کی؟ **فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ** (44:4) ❶۔یہاں یفرق کہا ہے۔یہ بھی وہی اب ''ف رق'' کا Verb یعنی فعل کا صیغہ آ گیا جس میں دیکھیے کہ وہ اس کے متعلق دوسرے مقامات کے اوپر کیا کہتا ہے' فرقان کہا۔یہاں Verb (فعل) کے طور پہ استعمال کر کے بتا دیا کہ اس میں کیا کیا ہے۔

شبِ برات کی شرعی حیثیت

میں نے اس لیے خاص طور پہ یہ کہا کہ **اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰـرَكَةٍ** (44:3)۔وہ جو شب برات کی رات آیا کرتی ہے اس کی کوئی شرعی حیثیت ہے ہی نہیں۔ویسے تو ہمارے جو ہر تہوار مناتے ہیں کچھ نہ کچھ تو بتاتے ہیں کہ اس میں یہ ہوا' اس میں یہ ہوا' شب برات کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس میں کیا ہوا' یہ تقریب کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ہاں بی بی حلوہ تے ونڈن۔❷ اب تو شاید یہ بھی بات ختم ہوگئی ہے۔کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ شروع کہاں سے ہوئی تھی؟ یہ جو عباسیوں کے خلفاء (1258-750ء) تھے' یہ مجوسی تھے' مسلمان ہو کر ادھر آئے' اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا۔''رام جاندا ای جاوے' رحیم اوندا ای آوے'' ❸ مجوسیت کی جو آتش پرستی تھی وہ بھی ساتھ آئی اور ان کے ہاں کا یہ عقیدہ بھی آیا کہ سال میں جو نوروز ہے اس دن سال بھر کے فیصلے ہو جاتے ہیں' موت کے' زندگی کے' بیماری کے' ہر شخص کی قسمت کا آنے والے سال کا فیصلہ اس ایک رات میں ہو جاتا ہے جس کے بعد نوروز ہوتا ہے اور وہ آتش پرست قوم تھی اس میں پھر یہ بہت زیادہ آگ جلاتے تھے۔اب یہ ادھر آئے تو اسلام میں اس کی کہیں بھی گنجائش نہ تھی: نہ یہ وہ قسمت کا مسئلہ نہ یہ آگ کا کھیل تو انہوں نے یہ تقریب وضع کی۔

آپ کو معلوم ہے کہ شب برات کی اس اصطلاح برات کے معنی ہی تقدیر ہوتے ہیں: ''میری برات اچ ای' اے نئیں سی ہیگا تے' میں کی کراں؟'' ❹ شب برات تو وہ آئی: مجوسیوں کی تقدیر والی رات' قسمت بانٹنے والی رات۔خود لفظ قسمت کے معنی تقسیم کرنا ہے۔یہ تو ہوئی وہاں کی وہ تقریب۔اب ان کی ہوئی وہ آتش پرستی کی ہوس۔تو یہ ساری جتنی آتش بازی آپ چلاتے ہیں' یہ وہاں سے آئی ہوئی ہے۔اب آپ کے ہاں یہ چلا آ رہا ہے۔یہ مذہب کا جزو ہوگئی۔مذہب کا جزو کس طرح ہوئی تھی اس کے لیے کوئی تو دلیل دینی چاہیے۔

---

❶ اس میں ان تمام امور کو جو آسمانی حکمت پر مبنی ہیں (غلط امور سے) الگ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1157)

❷ البتہ حلوہ تو ضرور ہی تقسیم کیا جاتا ہے۔

❸ نہ رام جلدی جاتا ہے اور نہ رحیم جلدی آتا ہے' ''رام'' کی ''رحیم'' سے تبدیلی بڑا وقت لیتی ہے۔

❹ میری قسمت میں ہی یہ نہیں تھا تو میں کیا کروں؟

واعظ کے نزدیک دلیل لانا کون سا مشکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھیے! یہ تو قرآنِ شریف میں ہے۔ یا اللہ! شب برات کا ذکر قرآن شریف میں!!! کہ بھئی! قرآن شریف میں کہاں ہے؟ میں نے تو ریڈیو پہ تقریریں سنی ہیں۔ بڑے بڑے علامہ آتے ہیں۔ جی! قرآن شریف میں ہے۔ جی؟ یا اللہ؟ ہم بھی سنیں بھئی! کہنے لگے یہ دیکھیے: **اِنَّـآ اَنْزَلْنٰهُ فِـىْ لَيْـلَـةٍ مُّبٰـرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ o فِيْهَا يُفْـرَقُ كُـلُّ اَمْـرٍ حَكِيْمٍ** (44:2-3) ہم نے اس کو رات میں نازل کیا ہے' جس میں تمام معاملات کے فیصلے سال بھر کے لیے کیے جاتے ہیں۔ چل بھئی! کہنے لگے کہ وہ یہ ہے۔ عرض کیا گیا کہ حضور! یہ جو شب برات ہے' یہ شب برات تو شعبان میں آتی ہے اور قرآنِ کریم کے متعلق خود قرآن میں ہے کہ **شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ** (2:185) یہ رمضان کے مہینے میں نازل ہوا ہے' تو وہ رمضان کے مہینے میں کوئی رات' اگر آپ کہتے ہیں' تو آنی چاہیے! یہ پہلے ہی آ گئی۔ یہ کیسے ہو گیا؟ کہنے لگا ''جی تہانوں جتّاں بڑیاں اونڈیاں ہیگیاں نیں ایہدا کی علاج اے!!''❶ یعنی دلیل تاریخ سے کوئی لایا نہیں۔ انہیں کہا کہ بھئی! قرآن میں یہ ہے کہ **شَهْـــــرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ** (2:185) کوئی رات ایسی تم نے بنانی تھی' رمضان میں تو بناتے۔ وہ رمضان کے آخری عشرے کے اندر اس رات کی تلاش کرتے ہیں۔ ''تے شب برات تو ٹردے نیں تے عید تیکر رات ای لبدے ترے جاندے نہیں۔''❷ میں کہہ یہ رہا تھا کہ آپ قرآن کا مصرف دیکھتے ہیں کس طرح ہوتا ہے۔ یہ مسجد کے اندر وعظ نہیں تھا' یہ ریڈیو کے اوپر ساری دنیا کو سنا رہے تھے اور ہر سال یہ کچھ کرتے ہیں۔ قرآن تو الفرقان کہتا ہے۔ بہت اچھا جی! قرآن تو ہے۔ الفرقان حق و باطل میں اس طرح سے فرق کرتا ہے۔ ہمیں فرقان نے کیا دیا؟ کہا کہ تمہیں بھی دیا: **يٰٓـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَـنُـوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا** (8:29) اے جماعت مومنین! اگر تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو گے تو تمہیں دنیا کے اندر امتیازی زندگی حاصل ہو جائے گی: ''فرقان''۔ ساری دنیا دور سے دیکھ کر کہہ دے گی کہ یہ ہے وہ امت جو اخرجت للناس نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ یوں باقی دنیا سے تمہاری تفریق ہو جائے گی' امتیازی نشان ہے Distinction حاصل ہو جائے گی: **يَـجْـعَـلْ لَّـكُـمْ فُرْقَانًا** (8:29) تمہیں امتیازی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ کیسا امتیاز؟

مومنِ بالائے ہر بالا ترے

جو بھی دنیا میں جس بلندی کے اوپر بھی کوئی قوم ہے' مومن اس سے بھی آگے ہے اس لیے کہ

غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے ❸

---

❶ آپ کو بڑی عجیب وغریب حجتیں آتی ہیں۔ اس کا کیا علاج!!

❷ شب برات سے چلتے ہیں تو عید تک وہ اس رات کی تلاش میں ہی چلتے چلے جاتے ہیں۔

❸ دنیا میں کوئی انسان کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو' مومن کا مقام اس سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ مومن کی غیرت گوارہ ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی اور انسان اس کا ہمدوش ہو جائے۔

کسی دوسرے کا آگے چلے جانا یا اوپر ہو جانا تو ایک طرف' اس کی غیرت تو اس کو بھی پسند نہیں کرتی کہ دنیا کے اندر کوئی اس کا ہمدوش ہو۔ آگے بڑھنا یا بلند ہونا تو ایک طرف رہا' وہ تو کسی کو غیرتِ او برنتابد ہمسرے اقبالؒ (1877-1938) یہ چیزیں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ یہ فرقان کی تفسیر ہے۔ یہی **يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا** (8:29) ہے۔ یہی امتیازی نشان ہے۔

روزِ محشر امتیازی نشان رکھنے والی قوم کی نشانی: بھوک اور محکومی؟

ان سے پوچھیے کہ قرآن تو یہ کہتا ہے۔ آج ہمارا ساری دنیا میں امتیازی نشان کیا ہے؟ ساری دنیا میں ہم ہی بھوکے ہیں' ساری دنیا میں ذلیل' ساری دنیا کے محکوم ہم ہی تو ہیں' اس میں کوئی قوم ہماری ہمدوش نہیں ہے۔ انہوں نے امتیاز تو دیا۔ ''بدنام نہ ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔'' یہ ہے امتیازی نشان؟ معاف رکھیے گا' بیچ میں کبھی کبھی ایسی چیزیں بھی آجاتی ہیں۔ فرقان یا امتیازی نشان؟ کہ حشر کے دیہاڑے ❶ مختلف قومیں آتی جائیں گی' تعارف کے لیے آواز آئے گی کہ یہ وہ قوم آئی ہے' یہ وہ قوم آئی ہے۔ اس کے بعد ایک قوم آئے گی صاحب! سوکھی ہوئی' ہڈیاں نکلی ہوئی' زرد رو' کپڑا ابھی پورا پہننے کے لیے نہیں ملا۔ نظر آرہا ہے کہ بالکل فقر وفاقے کی حالت میں چلی آرہی ہے۔ آواز آجائے گی کہ ہاں یہ آرہی ہے اللہ کے محبوب کی امت۔ دیکھیے سارے! وہ پوچھیں گے کہ یہ کس قسم کی قوم ہے' انہوں نے کہا کہ آپ نے دیکھا کہ یہ باقی ساروں سے الگ ایک ممتاز قوم ہے۔ کہنے لگے کہ اس کا کیا امتیاز ہے؟ وہ کہنے لگے کہ یہ اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے' نہ وہ کھاتا ہے نہ انہیں کھانے کو ملتا ہے' نہ وہ پہنتا ہے نہ انہیں کپڑا ملتا ہے' وہ بھی لا مکان ہے ''اینا داوی گھر گھاٹ کوئی نہیں ہیگا ایتھے۔'' ❷ **يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا** (8:29) امتیازی زندگی ہے۔ ''بس تھوڑا جیا آدمی نوں ڈھیٹ ہونا پیندا اے۔'' ❸

اس دنیا میں مومن کی زندگی کے آثار

عزیزانِ من! قرآن نے واضح زبان میں یہ کہا ہے کہ یہ کبھی نہیں ہو سکے گا کہ کفار کو مومنین کی جماعت کے اوپر غلبہ حاصل ہو جائے' کبھی نہیں ہو سکے گا۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی کسی خطہ میں الگ قومیں کہنا ہی اسلام کے خلاف ہے۔ وہ تو امت ہی واحدہ تھی لیکن آج چونکہ یہ بٹ چکی ہے' کہنا پڑتا ہے کہ کوئی ایک قوم بھی دنیا میں ایسی نہیں ہے جس پر کفار کا بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی نہ کسی طرح سے غلبہ نہ ہو۔ یہ مادی نہیں تو ذہنی سہی' سیاسی سہی' ساری دنیا کی مغلوب قوم ہے۔ اس نے کہا تھا کہ کفار کو کبھی مومنوں کے اوپر غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

---

❶ روز

❷ ان کا بھی کوئی گھر گھاٹ نہیں ہے۔

❸ بس انسان کو تھوڑا سا ڈھیٹ ہونا پڑتا ہے۔

فرقان اسے کہتے ہیں لیکن یہ فرقان حاصل کیسے ہوتا ہے؟ اس کے متعلق بھی فرقان دینے والے نے جو وعدہ کیا تھا' اسی نے بتایا کہ فرقان حاصل کیسے ہوتا ہے؟ تیرہ سالہ مکی زندگی دنیا بھر کے مصائب اور مشکلات اور نا مساعدات اور تکالیف برداشت کرنے والی قوم اپنے مقام کے اوپر جم کے کھڑی ہوئی' کیا تھا ایمان ان لوگوں کا صاحب! اس قدر تکالیف سے آج بھی جب کوئی سنتا ہے تو انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے مقام سے ہلا ہو۔ ایک فرد ہی نہیں' پہلے تو اس قسم کی ایک جماعت ہے۔

جماعت مومنین ہر آن صفتِ فرقان کی ایک نئی شان سے مزین ہوتی ہے

پہلا فرقان یہ ہے کہ اس مقام میں جہاں نظامِ خداوندی یا حکومتِ خداوندی کے تمکن کے امکانات بظاہر ابھی نہیں تھے' یہاں سے سارے کے سارے الگ ہو کر مدینے چلے گئے۔ اسی لیے قرآن نے اسے اتنی اہمیت دی ہے کہ مکے کے رہنے والے یا کسی اور جگہ کے رہنے والے استطاعت کے امکان کے باوجود اگر وہاں سے ہجرت کر کے یہاں نہیں آتے تو وہ جماعت مومنین میں شامل نہیں ہیں۔ فرقان کی یہ کیفیت! وہ ان کو وہاں چھانٹ کے الگ کر دینا چاہتا تھا' وہاں پناہ گزینوں کی حیثیت سے جا پہنچے۔ وہاں یہ بیچارے ابھی پہنچے ہیں کہ ان مکے والوں نے یورش کر کے اس دور کے معیار کے مطابق ایک لشکر جرار لے کر اپنے ساتھ ہزار آدمی کا لشکر پورا ہتھیاروں سے لیس' مدینے پہ چڑھائی کے لیے آ گئے۔ ارے بابا' یہاں بیٹھے ہوئے بیچارے یہ پناہ گزین تمہیں تو وہاں کچھ نہیں کہتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ ان کچھ نہ کہنے والوں کا اگر نظام دنیا کے کسی خطے میں بھی متمکن ہو گیا تو یہ کسی دوسرے نظام کو نہیں چھوڑے گا۔ پھر وہ یورش کر کے یہاں آ گئے۔ اب وہ وقت آ گیا۔ یہ جو چھوٹی سی تین سو کی جماعت تھی دنیا کے ہر معیار کے مطابق نظر آتا تھا کہ ان کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں جائے گی تو ان میں سے شاید ایک بھی باقی نہیں بچے گا۔ دیکھتے ہیں کہ یہ امتحان کتنا کڑا تھا' کتنا سخت تھا' منزل کتنی کڑی تھی۔ کیا انھوں نے ان کے ساتھ کچھ مفاہمت کر لی' مداہنت برتی' مصالحت پہ اتر آئے' Compromise میں آ گئے؟ کیا انہوں نے یہ کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں' حق بھی اضافی ہوا کرتا ہے' ضرورت کا آج تقاضا یہ ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ صلح کر لی جائے؟ میں کہتا ہوں اس سے بڑی ضرورت بھی کوئی اور ہو سکتی تھی جو اس مقام کے اوپر آ پڑی تھی۔ ضرورت کے ہر معیار اور تقاضے کے مطابق اس سے اشد ضرورت ہی کوئی نہیں ہو سکتی تھی لیکن اگر اب ضرورت کا ہمارا ہی معیار ہوتا تو حق و باطل کا فرقان تو دنیا میں نہ ہو سکتا۔ فیصلہ یہی ہوا کہ کامیابی نہ بھی ہوگی تو دنیا کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ حق پر جم کر کھڑے ہونے والے جان دے دیا کرتے ہیں' Compromise (مفاہمت) نہیں کیا کرتے کہ حق Compromise (مفاہمت) کر ہی نہیں سکتا' وہ ایسے وقت میں کم درجے کی ضرورت تو ایک طرف رہی' جان کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کے بھی قائل نہیں ہوتے۔ میدان میں جا نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

جنگ بدر ❶ میں عملی طور پر صفتِ فرقان کی ایک زندہ مثال

وہ جو تاریخ میں آیا ہے' میں سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ کی وہ دعا ہیرے کی طرح جگمگا رہی ہے' جو انہوں نے کی ہے۔ وہ ہے حقیقت میں فرقان کی صحیح تفسیر۔ کہا یہ گیا ہے کہ صفیں باندھ کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ اس زمانے میں' جسے یہ آج مذہبی پیشوا کہتے ہیں' جسے آج رسول کہتے ہیں' وہ مسجد میں صرف نماز پڑھانے والا نہیں' جماعت کرانے والا نہیں' یا وعظ کہنے والا نہیں ہوتا تھا' فوج کا کمانڈر ان چیف بھی وہی ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اپنی اس فوج کے سربراہ' کمانڈر ان چیف' تھے۔ صفیں کھڑی کرنے کے بعد' حدیث میں ہے' کہ حضور ﷺ ایک طرف تنہائی میں کھڑے ہوگئے۔ ایک محویت کے عالم میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ محویت کا یہ عالم تھا' تاریخ کہتی ہے' کہ حضور ﷺ کی چادر جو اوپر لی ہوئی تھی' وہ سر کے نیچے ڈھلک کر جا رہی تھی' اور حضور ﷺ رب العزت کی درگاہ میں فریاد کر رہے تھے یا التجا کر رہے تھے کہ بارِ الٰہا! یہ مٹھی بھر جماعت' اس آسمان کے نیچے جو حق کی علمبردار ہے' اِس کے علاوہ کوئی اور حق کا علمبردار آج ہے نہیں۔ یہ تو حق کی شہادت دینے کے لیے میدان میں آ گئی۔ انہوں نے تو اپنی جان دے دینی ہے۔ اس سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا یہ سب کچھ سمجھ سوچ کر یہاں آئے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آج یہ جماعت اس میدان کے اندر ختم ہوگئی تو پھر میں چونکہ خاتم النبیین ہوں' اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آنا۔ یا اللہ! یہ سوچ رکھ کہ اس کے بعد قیامت تک تیرا نام لینے والا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔ کیا بات ہے اس دعا کی! ذمہ داری اس پہ ڈال دی: ''میرا تو کچھ نہیں جانا۔'' آپ اِن چند فقروں کو سوچیے یعنی یہ کہ جماعت تو اپنا سب کچھ بیچ بچا کر کفن بدوش آ گئی ہے۔ انہوں نے جان دے دینی ہے۔ اگر یہاں یہ سب ختم ہوگئے تو ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا' یہ تو اس مقصد کے لیے آئے ہیں' تو سوچ لے کہ اس کے بعد پھر دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔

دو قومی نظریہ کی مکمل محسوس تفسیر

یہ وہ مقام ہے جہاں خدا نے کہا کہ آج کا دن بدر کی جنگ میں یوم الفرقان ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا یَوۡمَ الۡفُرۡقَانِ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ** ❷ (8:41)۔ یوم الفرقان یعنی فرقان کا وقت آتا ہے' جب آمنے سامنے جتھہ کھڑا ہو جائے' لشکر کھڑے ہو جائیں۔ یہاں یوم الفرقان آیا ہے۔ وہ جو تھا کہ ہم تمہیں فرقان عطا فرمائیں گے' عزیزانِ من! وہ وردو وظائف اور نفل پڑھنے

---

❶ سترہ رمضان 2ھ (مطابق 13 مارچ 624ء)

❷ اور ان احکام پر (ایمان رکھتے ہو) جو ہم نے اپنے بندے پر اُس دن نازل کیے تھے جب دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل آئے تھے اور جب حق و باطل نکھر کر سامنے آ گیا تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔404)۔

سے نہیں آ جاتا۔ یہاں آیا ہے یوم الفرقان' محسوس تفریق۔ آپ سننا چاہتے ہیں تو تاریخ سے پوچھیے کہ فرقان کسے کہتے ہیں۔ آج تک یہ بات طے نہیں ہو سکی کہ دوقومی نظریہ کیا ہوتا ہے۔ جی' دوقومی نظریہ یوم الفرقان میں سامنے آتا ہے۔ فرقان کی پہلی چیز یہ ہے کہ چھٹ کے الگ ہو جایئے۔ یہ سارے مکے کے رہنے والے یا بیشتر مکے کے رہنے والے عرب ہی تھے' جو مکے سے اِدھر آ گئے تھے۔ یہ مدینے میں کاہے کے لیے آ گئے تھے؟ یہ ایک الگ قوم بن گئی تھی۔ اب یہاں ان دو قوموں کا نظریہ تھا یا جسے فرقان کہا جاتا ہے' یہ تھا۔ دوقومی نظریے کے معنی ہی فرقان کے ہیں: حق کے علمبردار اور باطل کے علمبردار میں محسوس تفریق ہے۔ اور وہ یہ صورت تھی کہ ایک طرف حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے تو مقابل کی صف میں ان کا بیٹا کھڑا تھا' اِدھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے تو ان کے سامنے ان کا حقیقی ماموں جس کے خون میں ان رضی اللہ عنہ کی تلوار بعد میں رنگی ہوئی نظر آئی' اِدھر حضرتِ علی رضی اللہ عنہ تھے تو سامنے ان کا بھائی (عقیل) تھا' اِدھر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو اُدھر حقیقی چچا (حضرت) عباس تھے' نہیں! اور آگے جایئے اِدھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے تو دوسری طرف بیٹی کا سہاگ لٹ رہا تھا' داماد [1] کھڑا تھا۔ یہ تھا یوم الفرقان۔ [2]

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

''چوں می گویم مسلمانم بلرزم'' یعنی جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کیوں کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را: میں جانتا ہوں کہ لا الٰہ کی مشکلات کیا ہوتی ہیں۔ یہ منظر آسمان کی آنکھ نے کبھی دیکھا تھا! عزیزانِ من! کہ فرقان' دوقومی نظریہ ہے۔ اور باپ کا وہ واقعہ تاریخ میں رقم ہے کہ اس بیٹے نے باپ [3] سے یہ کہا کہ ابا جان! بدر کے میدان میں ایک وقت ایسا بھی آ گیا تھا کہ آپ بالکل میری شست میں تھے' تیر میں نے چڑھا رکھا تھا' آپ سامنے آ گئے' میرا ہاتھ کانپ گیا اور میں نے کمان وہیں رکھ دی' تیر نہیں چلایا۔ آپؓ [3] نے کہا کہ بیٹا! اگر ایسا وقت مجھ پہ آتا اور میرے سامنے تم آتے تو میرا ہاتھ کبھی نہ کانپتا' اس لیے کہ میرے سامنے ابوبکرؓ کا بیٹا نہیں تھا' ایک باطل پرست حق کے مقابلے میں کھڑا تھا۔ یہ تھا' یوم الفرقان [4]

---

[1] ابوالعاص

[2] یہ یوم الفرقان یوں بھی تھا کہ اِدھر حضرت حذیفہؓ تھے تو صف غنیم میں ان کا باپ عتبہ تھا' اِدھر ام المومنین حضرت سودہؓ تھیں تو سامنے ان کا عزیز سہیل بن عمر تھا۔

[3] حضرت ابوبکر صدیقؓ (573-634AD)

[4] یہ تھی وہ حقیقی تقسیم جو وطن' رنگ' زبان' نسل وغیرہ کی غیر فطری حدود و ثغور سے ماوراء ''دانم مشکلاتِ لا الٰہ لا'' تھی۔ حبش کا رہنے والا بلالؓ اپنوں میں سے تھا' لیکن حقیقی چچا عباس غیروں میں سے' روم کا صہیب یگانہ لیکن حقیقی بیٹا بیگانہ۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یہ مجاہدین اور مہاجرین سب کے سب مومنِ حقہ تھے

عزیزانِ من! یہ تین سو کون تھے جن کے ایمان کی شہادت تو ابھی سامنے آ گئی؟ یہ درجہ اول کے صحابہ مہاجرین اور مجاہدین ہی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ مومنِ حقہ ہیں' خدا ان کے مومن حقہ ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ یہ وہی ہیں جن کے لیے اس نے کہا ہے کہ ہم نے ان کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے۔ سوال ہی نہیں کہ ان کے متعلق شبہ ہو۔ یہ سارے کھڑے ہیں' اس طرف ملاحظہ ہو کہ عین اس وقت کیا کہا گیا۔ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ یہ جو کچھ ہم نے نازل کیا وہ یوم الفرقان پہ کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم نے یوم الفرقان پہ کیا نازل کیا تھا۔ یوم الفرقان پہ کہا یہ تھا کہ یاد رکھو! **وَ مَنۡ یُّوَلِّهِمۡ یَوۡمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوۡ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدۡ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاۡوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ** (8:16) سن رکھو کہ آج اس میدانِ جنگ میں تم میں سے اگر کسی نے پیٹھ دکھائی' بجز اس کے کہ وہ جنگ کے کسی تقاضے کے لیے' سٹریٹجی (Strategy) کے لیے' ایسا کرنا ضروری ہو جائے یا اپنی جماعت سے ملنا ہو' شکست خوردگی کی ذہنیت میں نہیں۔ (یہ صحابہ سے کہا جا رہا ہے) کہ اگر آج کسی نے پیٹھ دکھائی تو خدا کا غضب اس کے اوپر ہو گا' وہ سیدھا جہنم میں چلا جائے گا۔ اس طرح سے فرقان حاصل ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! دنیا میں یہ تھے جن کو وہ فرقان حاصل ہوا۔ تاریخ کے اوراق سے پوچھیے۔ اس زمانے میں دنیا میں دو ہی صاحبِ فرقان قومیں تھیں: ایران کی تہذیب اور روم کی تہذیب۔ چند سالوں کے عرصہ کے اندر اندر ان کے تختے الٹ کر رکھ دیئے۔ ان کے وارث بن گئے صاحب! اب یہاں کہا ہے کہ **تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِهٖ** [1] (25:1)۔ اور اس کے بعد کہا تھا کہ **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا** [2] (8:29)۔ ''فرقان'' ملتا تھا۔ جنگ بدر میں یوم الفرقان کہا گیا ہے اور اس کی کیفیت یہ تھی کہ صحابہ جیسے صاحبانِ ایمان اور اعمال سے بھی اگر ایک مقام کے اوپر کسی کے قدم میں کسی طرح سے کہیں لغزش آتی ہے تو وہ بھی سیدھے جہنم میں جا پہنچتے ہیں۔ سنتے ہیں آپ' قرآن کیا کرتا ہے۔ کہا کہ **نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِهٖ** [3] (25:1)۔ ایک

---

1. کس قدر فراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل' اور حق و باطل اور غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینے والی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔815)۔
2. اگر تم ان کی بیجا کشش و جاذبیت سے بچتے' اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے رہے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کر دے گا۔
3. اس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار کی حامل' اور حق و باطل اور غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینے والی ہے۔

ایک لفظ پہ غور کیجیے اس کے سامنے مذاہب عالم کی تاریخ تھی' خدا کے سامنے تو ہوتی ہے۔ یہ چھوڑ دیجیے کہ ہر رسول خدا کی طرف سے آیا' اس نے خدا کا دین دیا' بعد میں اس کی امت نے اس دین کو مذہب سے بدل دیا۔ جتنے بھی مذاہب عالم آ رہے ہیں' ان میں آپ ایک چیز دیکھیں گے۔ وہ ہے جسے قرآن نے غلو کہا ہے۔ خاص طور پہ یہودیوں سے کہا کہ یاد رکھو! دین میں غلو نہ کرنا۔ غلو کے معنی ہوتے ہیں ''کسی کو اپنے مقام سے بڑھا دینا' مبالغہ کر دینا''۔ کوئی قوم بھی اپنے بانی مذہب کی توہین نہیں کرتی' کبھی بھی نہیں' برداشت ہی نہیں کر سکتی' اس کو اس کے مقام سے نہیں گراتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم نے اسے اس کے مقام سے اوپر کر دیا' بڑھا دیا۔ ہندوؤں نے تو اپنے بانیانِ مذہب کو اوتار' خدا' بشکل انسانی دنیا میں آئے ہوئے کہہ دیا تو وہ بھی ان کا مقام نہ رہا' بڑھا کے اوپر لے گئے۔ یہودیوں نے عزیر کو ابن اللہ کہہ دیا۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہہ دیا۔ وہ بھی اس مقام سے ان کو بڑھا دیا' اس مقام پہ نہیں رکھا۔ یہ تاریخ چلی آ رہی تھی' اس خدائے علیم و خبیر کی' کہ جو جانتا ہے کہ پھر جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو کس طرح سے اس کے مقام کو اوپر لے جاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند ترین مقام ''علیٰ عبدہ'' کہہ کر متعین کر دیا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ **الفرقان** کے لفظ کی کیا بات تھی! بات یہ تھی کہ انہیں فرقان حاصل ہو' اس قوم کو باقی قوموں کے مقابلے میں بہت بلندی حاصل ہو۔ تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ قومیں اپنے بانیِ مذہب کو اس مقام سے بہت اونچا لے جایا کرتی ہیں' اس مقام سے بھی بہت اونچا جہاں ان کے لیے فرقان کا ایک وعدہ دیا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ جو تمہارے ہاں ہمارا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے' یہ جو تمہارے ہاں کا امام ہے' تمہارا سربراہ ہے' جس پر ایمان لانے سے تم مومن ہوتے ہو' سن رکھو! اس کا مقام کیا ہے۔ **عَلٰی عَبۡدِہٖ** (25:1) یہ خدا کا عبد ہے۔ متعین کر دیا اس کا مقام' کلمۂ شہادت میں جز بنا دیا: **اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ**۔ خدا کا عبد ہے اور بہت بڑا مقام عبودیت خداوندی یا عبدیت خداوندی ہے۔ انتہا یہی ہے اسے متعین کر دیا: **عَلٰی عَبۡدِہٖ** (25:1)۔ میں اس وقت اس میں نہیں جانا چاہتا کہ پھر ہم نے کیا کیا۔ مقام بھی نازک ہے اور تفصیل طلب بھی ہے کہ ہم نے پھر اسے کیا بنایا۔ خدا نے تاکید کے ساتھ' تصریحاً بار بار' قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا عبد کہا ہے: **عَلٰی عَبۡدِہٖ** (25:1)۔ اس کے بعد اگلا لفظ ہے کہ کاہے کے لیے نازل کیا؟ تمہارے لیے فرقان دینے کے لیے: **لِیَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا** (25:1)۔ عالمین یہ ہے کہ جی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قیامت تک کے لیے ختم نبوت ہے لہٰذا ان میں مباحثوں اور مناظروں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ لفظ قیامت تک تمام دنیا کے انسانوں کے لیے آتا ہے۔ جب آپ اس دنیا کو عالم کہیں گے تو دنیا کے تمام انسان اس میں آ جائیں گے' عالمین کہیں گے تو ہر دور کے انسان اس میں آ جائیں گے اور قرآن کو اس نے کہا ہے کہ مکمل بھی ہے' غیر متبدل بھی ہے' محفوظ بھی ہے تو جب یہ مکمل غیر متبدل محفوظ قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہے تو پھر اس کے بعد رسول کا ہے کے

لیے آئے گا؟ اس میں لمبی چوڑی آیتیں پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں‘ تمام اقوامِ عالم‘ تمام نوعِ انسانی کے لیے‘ قیامت تک کے لیے یہی رسول ہے۔ اسے یہاں ’’نذیر‘‘ کہا ہے۔

ذاتِ خداوندی انسانوں کو ڈراتی نہیں بلکہ آگاہ کرتی ہے

نذیر‘ بڑا عجیب لفظ ہے۔ ہمارے ہاں ہمیشہ اس کا ترجمہ آتا ہے: ڈرانے والا۔ عزیزانِ من! بات پھر کہیں اور چلی جائے گی۔ ڈر (Fear) ❶ تو کسی کا بھی ہو‘ جوہر انسانیت کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس سے تباہی آتی ہے وہ ہے انسان کی ذات (Self)‘ خودی‘ انا‘ تشخص (Personality)‘ انسانیت (Humanity) پہ ڈر۔ یہ تباہی ان کے اوپر خوف سے آتی ہے اور قرآن نے تو مومن کے متعلق یہی کہا ہے کہ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** (2:38) خوف بھی نہیں اور حزن بھی نہیں۔ خوف تو پھر بھی آپ کے محسوسات کی دنیا میں ہوتا ہے۔ پوچھو آج کے سائیکولوجسٹ سے کہ قرآن نے چودہ سو سال پہلے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آج کا سائیکولوجسٹ بتائے گا کہ اس نے حزن کیوں کہا ہے۔ حزن کا تعلق انسان کی Personality (شخصیت) سے ہوتا ہے‘ خوف کا تعلق انسان کے محسوسات سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن وہ ہے جس کو نہ عالمِ محسوسات میں کوئی خطرہ ہوگا نہ اس کی Personality (ذات) کے لیے کوئی چیز گھٹن کی ہوگی۔ حزن گھٹن کو کہتے ہیں۔ اس میں حزن نہیں پیدا ہوگا۔ اقبالؒ (1877-1938) اسی لیے تو کہتا ہے:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے یہ جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

خوف و حزن تو انسانی صفات کو جلا کر خاک کر دیتا ہے

حزن‘ زندگی میں گھٹن پیدا کر دیتا ہے۔ جوئے کم آب تو کیا وہ تو بالکل سراب بن کر رہ جاتی ہے‘ فریب ہی فریب ہوتی ہے۔ اس لیے اس نذر (ن ذ ر) کے معنی ڈرانے کے نہیں ہیں۔ اس کے معنی ’’آگاہ کرنے‘‘ کے ہیں۔ تقویٰ کے یہی معنی ہیں: محتاط رہنا‘ زندگی کی شاہراہ پہ جتنے خطرناک مقامات آتے ہیں‘ جن سے اس میں گھٹن پیدا ہوتی ہے ان سے محتاط رہنا‘ آگاہ رہنا۔ نذیر کے معنی ہیں ’’ان مقامات سے آگاہ کر دینے والا کہ یاد رکھو! ان ان چیزوں سے زندگی کی یہ جو ’بحرِ بے کراں جُو‘ ہے یہ ’جُوئے کم آب‘ بن جائے گی‘ ان سے محتاط رہو۔ یہ چیزیں راستے میں آئیں گی‘ یہ ان چیزوں سے آگاہ کر دینے والا ہے۔ یہ قرآن نے شروع میں کہا ہے کہ **ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** (2:2)۔ ہمارے ہاں ان پر اعتراض چلا آتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ متقی کسے کہتے ہیں؟ اعتراض یہ چلا

---

❶ FEAR= False Evidence Appearing Right

آتا ہے کہ صاحب! جو متقی ہوگیا اُس متقی کا تو مومن سے بھی ہمارے ہاں اعلیٰ مقام ہوتا ہے۔ یعنی تقویٰ شعار۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** (2:2) تو یہ جو متقی ہو چکے ہیں' ان کے لیے کہا ہے کہ ان کو ہدایت کی ضرورت ہے۔ وہ تو متقی ہو گئے۔ متقی کے یہ معنی نہیں ہیں۔ یہ بڑا عجیب لفظ ہے۔ انگریزی زبان میں ایک چیز Curative ہے۔ یہ Curative ہوتا ہے کہ جب کوئی مرض میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس کی اصلاح کر دینے والا ہو اور ایک چیز یہیں سے ہے۔ یہ Curative نہیں بلکہ Caring for ہے۔ یہ بڑی اچھی اصطلاح ہے یہ بھی سائیکولوجی کی اصطلاح ہے: وہ اس مصیبت میں مبتلا ہو کر اس کی اصلاح نہیں کرتے' Caring for life ہے۔ میں اس کا کیا ترجمہ کروں۔ اس کا عربی زبان میں ترجمہ تقویٰ ہے۔ پہلے سے ہی اس بات کے لیے محتاط رہنا کہ اس قسم کی کوئی بات نہ ہو جائے جس سے لائف (زندگی) میں گھٹن پیدا ہو جائے۔ He cares for his life ہے۔ تقویٰ' اور نذیر کے معنی یہ ہیں کہ ان مقامات سے ان لوگوں کو آگاہ کر دینا جو اپنی زندگی کے لیے Care کرتے ہیں کہ یہاں یہاں خطرناک گھاٹیاں ہیں اور پھر اس طرح سے آگاہ کیا کہ الفرقان یعنی وہاں Sign board (نشاناتِ راہ) لگا دیئے جہاں Pit falls (گڑھے) تھے وہاں کسی کو کھڑا کر دیا' سرخ بتی جلا دی' وہاں پہرے دار کھڑا کر دیا' وہ آگاہی دینے والا ہو گیا۔ اس طرح نذیر اس کو کہیں گے کہ جو اس سے محتاط و آگاہ کر دے کہ اِدھر نہ آنا اُدھر سے جانا۔ کہتا ہے: یہ ہے نذیر' تمام نوعِ انسانی کے لیے' قیامت تک کے لیے زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرنے والا۔

اب سورۃ الفرقان کی ابتدا اس سے ہوئی کہ **تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا**[1] (25:1)۔ بہت بڑی چیز ہے جو کچھ کہا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کہنے والا کون ہے۔ **الذی لہ ملک السموت و الارض** (25:2) یہ کہنے والا وہ ہے جس کے قانون کی کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کارفرمائی جاری وساری ہے' کسی اور صاحب کی نہیں۔ اسی کو حق پہنچتا تھا کہ یہ کہے لیکن اس بات کی تفصیل آئندہ درس میں سہی کیونکہ آج درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی پہلی آیت پہ ہم تھے' خدا کرے کہ میں اس کو سمجھا سکا ہوں۔ سمجھانے کے لیے تو میں نے کہا ہے کہ قرآن نصاب کی کتاب ہے۔ یاد رکھیے! یہ تو کلاسز کے اندر پڑھانے کی کتاب ہے۔ بہرحال جتنا وقت بھی ملا' میں نے عرض کیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀......❀......❀

---

[1] کس قدر رفراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل' اور حق و باطل اور صحیح و غلط میں امتیاز کر دینے والی ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھیجی گئی تھی تا کہ اس کے ذریعے تمام اقوام عالم کو آگاہ کر دیا جائے کہ ان کے سفرِ زندگی میں کون کون سے خطرناک مقام آتے ہیں اور ان سے بچ کر چلنے کا طریق کیا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 815)۔

دوسرا باب: **سورۃ الفرقان** (آیت:2)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ②

عزیزانِ من! آج دسمبر 1977ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی دوسری آیت سے ہو رہا ہے:((25:2

سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ **تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا** [1] (25:1)۔ سارا درس اسی ایک آیت کی نذر ہو گیا تھا اور اس کے بعد بھی میں سمجھتا ہوں' یوں کہیے کہ میرا تو جی نہیں بھرا تھا۔ اس کے اندر ایک نکتہ ہے' اسے پھر دہرا دوں۔ وہ ہے **عَلٰی عَبْدِهٖ**((25:1۔ اس نے اپنے عبد پر اس الفرقان کو نازل کیا۔ قرآنِ کریم میں حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کو۔ ان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں' عبد کہا گیا ہے اور میں نے بتایا تھا کہ اس کی وجہ جاننے کے لیے آپ مذاہب عالم پہ نگاہ ڈالیے' تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں نے اپنے اپنے بانیانِ مذہب کو ان کے حقیقی مقام سے بہت بلند کر دیا۔ یعنی انہیں خدا بنا دیا' خدا کا بیٹا بنا دیا' غلو کیا۔

قرآن کہتا ہے کہ تم نے مبالغہ کیا' انہیں ان کے مقام سے نیچے لے آئے' اس سے تو ان کی تحقیر ہو جاتی ہے' تم جوشِ عقیدت میں انہیں ان کے مقام سے اونچا لے گئے اور انہیں مقامِ الوہیت میں داخل کر دیا۔ یہ بھی ظلم ہے کہ کسی شے کو اس مقام پہ نہ رہنے دینا' جس مقام کے لیے وہ بنی ہے یا جہاں اسے ہونا چاہیے۔ خواہ وہ اسے نیچے لے آئے خواہ اسے اوپر لے گئے' یہ ظلم ہے۔ اس کو اس کے صحیح مقام سے اوپر لے جانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک ہو گئے' اس کے اختیارات میں شریک ہو گئے تو توحید باقی

---

[1] کس قدر فراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل' اور حق اور باطل اور غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینے والی ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھیجی گئی ہے تا کہ اس کے ذریعے تمام اقوامِ عالم کو آگاہ کر دیا جائے کہ ان کے سفرِ زندگی میں کون کون سے خطرناک مقام آتے ہیں اور ان سے بچ کر چلنے کا طریق کیا ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 815)۔

مقام کے لیے وہ بنی ہے یا جہاں اسے ہونا چاہیے۔خواہ وہ اسے نیچے لے آئے خواہ اسے اوپر لے گئے' یہ ظلم ہے۔اس کو اس کے صحیح مقام سے اوپر لے جانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک ہو گئے' اس کے اختیارات میں شریک ہو گئے تو توحید باقی نہ رہی۔اسی لیے قرآنِ کریم نے حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کو جنہیں ان کے Followers یعنی متبعین اس درجے سے اوپر لے جا کے خدائی میں شریک کر لیتے تھے' عبد کہا۔یہ ہے ان کا صحیح مقام لیکن اس میں بھی ایک بڑی خصوصیت ہے۔بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ صاحب! یہ تو کوئی مقام نہیں ہے۔عبد کا عام طور پہ ترجمہ غلام کیا جاتا ہے' یعنی مطیع' فرماں بردار' محکوم' عبد۔تو سوال یہ ہے کہ یہ کیا مقام ہے۔اس میں ایک بڑا اہم نکتہ قابل غور ہے۔ہر جگہ کہا ہے: **عبدہ** یعنی اس کا غلام' اس کا عبد۔توحید کے معنی یہ ہیں کہ جو اس کا عبد ہے وہ دنیا میں کسی اور کا عبد ہو نہیں سکتا۔اسی لیے جہاں کہا' **عبدہ** کہا۔

اب آپ دیکھیے کہ قرآن ایک لفظ سے یا ایک لفظ کے ساتھ ذرا سی اضافت سے' بات کیا کہہ گیا۔ایک تو انہیں مقامِ الوہیت تک جانے سے روک دیا' وہیں رکھ دیا کہ مقامِ الوہیت تو ان کو حاصل ہی نہیں ہو سکتا وہ تو انہیں اس مقام تک آپ لے جا ہی نہیں سکتے اور اس کا عبد کہنے سے یہ بات واضح کر دی' جو اس کا ہو گیا' یہ کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا تو وہ عبد ہے۔اس نے کعبہ کو بیتی کہا یعنی میرا گھر۔اب میرے گھر کی نسبت سے کعبہ کسی اور کا گھر ہو ہی نہیں سکتا۔جس چیز کی نسبت خدا اپنی طرف کر لیتا ہے اس کے **وحدہ لاشریک** ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ شے کسی اور کی ہو نہیں سکتی۔یہ جو انبیائے کرام علیہم السلام کا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ عبدیت ہے یعنی جب انہیں عبدہ کہا ہے یعنی اس کا عبد' تو ساری دنیا کی عبدیت اور غلامی سے ان کو آزاد کر دیا۔وہ کسی اور کا محکوم' مطیع' فرماں پذیر' غلام' عبد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔یہ ہے صحیح مقام عبدہ کا اور یہی چیز ہے کہ آپ بھی کلمہ شہادت میں دیکھتے ہیں کہ **لا الہ الا اللہ** کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق **عبدہ ورسولہ** ہے تو یہ جو عبدیت ہے یہ اتنی بات ہے۔یہ عبدہ ہونا وجہ تخصیص ہے اور یہ ہے کائنات کے اندر ایک بلند تریں مقام۔اب یہ کسی اور کا عبد ہو نہیں سکتا۔صاحب! اتنی بڑی آزادی دنیا میں کیسے میسر آ سکتی ہے؟ اس کو آ سکتی ہے جو عبدہ' ہو جائے۔جب آپ کسی ایک کی طرف منہ کریں گے' باقی ساری دنیا کی طرف پشت کرنی پڑے گی۔آپ ایک وقت میں ایک سے زائد سمتوں کی طرف اپنا رخ نہیں کر سکتے' اسی لیے دعائے ابراہیمی علیہ السلام جو توحید کے لیے آئی ہے' یہ ہے کہ **اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ** [1] (6:79)۔غور کیجیے بات کیا کہہ گیا ہے: میں نے تو اپنا رخ

---

[1] میں اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو اس تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے (اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اُس سے نہ ستاروں کو مفر ہے' نہ چاند اور سورج کو مجالِ سرتابی) اس لیے میں' اُس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔یہ میرا دوٹوک فیصلہ ہے۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔305)۔

اس طرف کرلیا۔ اب سوال ہی نہیں ہے کہ اس رخ میں کوئی دوسرا شریک ہوسکے۔ رخ تو ایک وقت میں ایک ہی سمت کی طرف رہے گا۔ جو عبدہ ہے' وہ عبدہ رہے گا۔ کسی اور کا عبد ہو نہیں سکتا' اس لیے کہ سورۃ الفرقان کی اگلی آیت میں یہ کہا کہ **الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (25:2) اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اقتدار اور اختیار اسی کا ہے' کسی اور کا نہیں ہے۔

دین صرف خدا کی طرف سے ملتا ہے' کوئی رسول دین کا بانی نہیں ہوتا

یہ جو کہا کہ باقی اہل مذاہب اپنے اپنے بانیانِ مذہب کو ان کے صحیح مقام سے اوپر لے گئے' صحیح نہیں ہے۔ یہ بانیان مذہب کا لفظ تو میں ان کی اپنی اصطلاح میں استعمال کر رہا ہوں' ورنہ یہ رسول دین کے بانی نہیں ہوتے تھے' یہ رسول ہوتے تھے۔ اس نکتے کو بھی سمجھ لیجیے کہ دین کسی پیغمبر کا نہیں ہوسکتا۔ قرآنِ کریم نے بھی اسلام کو دین اللہ کہا ہے' خدا کا عطا کردہ دین۔ اور اگر آپ دین کا ترجمہ نظامِ حیات کرتے ہیں تو یہ نظامِ خداوندی ہوسکتا ہے' کسی رسول کا نہیں ہوسکتا۔ رسول تو دین خداوندی کو پہنچانے والا' اس کو قائم کرنے والا' اس کو متشکل کرنے والا ہے۔ دین اس کا بنایا ہوا نہیں ہوتا' وہ خدا کے دین کو لاتا ہے' پہنچاتا ہے' دیتا ہے' قائم کرتا ہے۔ اس لیے کہا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اقتدار اور اختیار اس کا ہے اور آگے کہا کہ **وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ**[1] (25:2)۔ اس کے اس اختیار و اقتدار میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔

ابن اللہ کا غلط تصور

یہ جو تم حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہتے ہو کہ وہ ابن اللہ تھے' خدا کے بیٹے تھے۔ بیٹا تو باپ کی ہر شے میں شریک ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابن اللہ کہا تو جھٹ سے یہاں آ گئے' یعنی باپ بیٹا روح القدس۔ ان تین میں ایک' ایک میں تین۔ خدائی کا مرتبہ انہیں دے دیا' الوہیت کا مرتبہ انہیں دے دیا۔ کہا کہ یہ غلط ہے۔ اُس کے اقتدار اور اختیار میں اس کائنات میں دوسرا شریک ہی نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے بیٹا کیا حیثیت رکھتا ہے؟

یہودیوں کے ہاں نبوت اور عزیر کے تصورات کی حقیقت

ضمناً ایک بات سامنے آ گئی۔ قرآنِ کریم نے یہودیوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ عزیر کو ابن اللہ کہتے تھے (9:30)۔ اس کے علاوہ قرآن میں عزیر کا کسی اور جگہ ذکر نہیں آیا اور عام طور پہ وہ اس پہ اعتراض بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں عزرا نبی گزرا ہے۔ نبی کا لفظ وہ

---

[1] اُسے نہ تو اپنی امداد کے لیے اولاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی اُس کے اقتدار میں کوئی اور قوت شریک ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 815)

اپنے ہاں کے جو کاہن ہوتے تھے ان کے لیے بولتے تھے۔ وہ نبی کا لفظ پیشین گوئی کرنے والے کے معنی میں لیا کرتے تھے اور یہ ان کے ہاں جو ٹیمپل تھا، معبد تھا، مقدس تھا، اس میں ایک بہت بڑا کہانت کا منصب تھا۔ یہ قسمتیں بتانے والے، فالیں نکالنے والے، پیش گویاں کرنے والے کاہن کہلاتے تھے۔ ان کو وہ نبی کہا کرتے تھے۔ ایک تو ان کے ہاں وہ عزرا نبی ہیں، وہ عزرا [1] ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ عزرا کو تو ہم ابن اللہ نہیں کہتے۔ عزیر کا لفظ کہیں اور آیا نہیں، تو اصل میں یہ جو عزیر ہے، یہ مصریوں کا دیوتا Osiris (عزیرس) [2] تھا جس کی بیل کی سی شکل تھی۔ وہ اس کی پرستش کرتے تھے اور اسے ابن اللہ مانتے تھے۔ بنی اسرائیل نے مصر میں اپنے تمام اعتقادات انہی مصر میں بسنے والے بت پرست مشرکین کے اپنا لیے تھے اور انہی میں یہ Osiris (عزیرس) دیوتا کی بھی پرستش کرتے تھے، اسے خدا مانتے تھے۔ یہ

---

[1] عزرا نبی (یا عزرا فقیہ)۔ عزیر یہودیوں میں بڑی عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ جب یہودی بابل کی اسیری کے بعد، یروشلم میں واپس آئے تو کتاب مقدس (تورات کا مجموعہ کتب) ان سے ضائع ہو چکا تھا۔ کتاب نحمیاہ (باب 8) میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ تورات کے سلسلہ اوّل کی پانچ کتابوں کو عزرا نبی (یا عزرا فقیہ) نے دوبارہ مرتب کیا۔ موجودہ تورات میں خود کتاب عزرا بھی موجود ہے جس میں عزرا نبی نے بتایا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو کیسے از سر نو مرتب کیا۔ یہ قریب ساڑھے چار سو سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ [پرویزؒ (1961)۔ لغات القرآن جلد سوم، لاہور: ادارہ طلوع اسلام، ص ص۔ 1159 تا 1160] ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی نے The Qur'an as it explains itself میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

Some Jews in the Arabian Peninsula used to believe that Osiris, the Egyptian idol, was God's son while others thought of Ezra, who restored The Torah after it had been lost in the Balylonian Exile, as Good`s son (p.128). Some Jews in Arabia, still under the influence of ancient Egyptian traditions during the times of the exalted Messenger, used to believe in UZAYR or OSIRIS, the bull- god as God's son (p.225). Shabbir Ahmad (2003). The Qur'an as it explains Itself. USA, Lawderhill, FL: Galaxy Publications).

[2] ہیروڈوٹس نے آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل، اس دیوتا کا نام Osiris یعنی عزیرس لکھا ہے۔ یونان میں اسماء کے بعد ''س'' ہمیشہ زائد ہوتی ہے۔ اس صورت میں اس دیوتا کا نام عزیر ہے جو قرآنی عزیر کے بالکل مشابہ تھا۔ مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا نام ''ایزاری'' آیا ہے۔ اس کے نام پر جو سانڈ بیل پوجا جاتا تھا اس کا نام ''ایزار ہاپی'' یعنی عجل عزیر تھا۔ اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور ''فتاح'' یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا (ابن اللہ) مانا جاتا تھا۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں شروع کر دی تھی۔ (اس کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے۔) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود کو اس گئوسالہ پرستی سے روک دیا۔ لیکن آپؑ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہو گئی۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد، شمالی سلطنت کے بادشاہ یربعام اوّل (933 ق م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کر دی۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے اشارہ کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے تراجم کی جو تصحیح ہوئی ہے اس کے پیش نظر اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود تھا لیکن (غلطی سے) لفظ عزیر کو ''اسیر'' سمجھ کر اس کا ترجمہ ''قیدی'' کر دیا گیا۔ اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے۔ (حوالہ پرویزؒ (1961)۔ لغات القرآن جلد سوم، لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص۔ 1161)۔ اسی کے بارے میں **(باقی اگلے صفحہ پر)**

عبرانی زبان میں عزرا(Ezra) ہوگیا۔ مصری بھی اسے ابن اللہ مانتے تھے' یہ بھی اسے ابن اللہ کہنے لگے۔ یہ ہے وہ عزرا جس کو یہ یہودی ابن اللہ کہتے تھے: مصر کا Osiris دیوتا۔ اور ہماری جہالت دیکھیے کہ ہم عزیر نام رکھتے ہیں۔ کبھی کوئی کھڑا ہو کر سوچتا نہیں' تحقیق نہیں کرتا۔ ہم کرتے کیا ہیں؟ بھئی! یہ عزیر؟ کہ جی' وہ ایک نبی تھے۔ ارے! کہاں لکھا گیا ہے؟ نبیوں کے نام تو قرآنِ کریم میں' قریباً سب کے سب جن کی بستیوں کے کھنڈرات سے عرب گزرتے تھے' دے دیئے۔ اس میں تو یہ نام کہیں نہیں لکھا' انبیائے کرام میں اس کا نام تو ہے نہیں۔ اور جہاں عزیر کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ وہ اسے ابن اللہ کہتے تھے اور یہ ہے مصر کا دیوتا۔ یہ ضمنی بات تھی۔

خدا کے صحیح تصور کی اہمیت

عزیزانِ من! اس ضمنی بات سے پہلے بات یہ ہو رہی تھی کہ کائنات میں ہر جگہ اُسی کا قانون کارفرما ہے اور کہا یہ تھا کہ اس کے اقتدار اور اختیار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا پھر فوراً ہی قرآن نے کہا تھا کہ **وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ** (25:2) [1]۔ شریک کیسے ہوسکتا ہے؟ اس نے تو ہر شے کو پیدا کیا ہے۔ مخلوق تو خالق کی شریک نہیں ہوسکتی اور آگے ہے کہ **فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا** (25:2)۔ لیجیے صاحب! یہ دو الفاظ ہیں جن کے اندر پورا دین اسلام اور خدا سمٹ کر آجاتا ہے۔ غالباً یہ مغرب کا مشہور فلاسفر ہے جس نے کہا ہے کہ تم مجھے یہ بتادو کہ فلاں قوم نے اپنے لیے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا تھا اور میں اس قوم کے متعلق بتادوں گا کہ اس کا تمدن کیا

ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی نے The Quran as it explains itself میں یوں لکھا ہے:

" As-Samiri originally hailed from northern India. Babu Rajindra's treatise "Casting of a Caste" shows Samiri belonging to the "Untouchable". Fed up with apartheid he tried to lay down the foundation of a new mixed caste that could socialize with all four castes of Hinduism. As a consequence he was exiled by the powerful Brahmins and ended up in Egypt and later followed Moses in the Exodus. Cow worship was running in his blood stream. Side by side, the golden calf of the Israelites symbolized centuries old Egyptian inflence. The Egyptians used to worship the sacred bull APIS who was considered to be a god-incarnate. The soul of the sacred bull upon death was supposed to transmigrate into another idol called OSIRIS whom they worshiped as God's son. (p.225)"

[1] اُسے' نہ تو اپنی امداد کے لیے اولاد کی ضرورت ہے' اور نہ ہی اس کے اقتدار میں کوئی اور قوت شریک ہے۔ اس نے ہر شے کو ایک خاص ترتیب دے کر پیدا کیا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔815)۔

تھا؟ تہذیب کیا تھی؟ ثقافت کیا تھی؟ خیالات کیا تھے؟ معتقدات کیا تھے؟ بس اتنا بتا دو کہ انہوں نے اپنے لیے خدا کس قسم کا تجویز کر رکھا ہے۔ خدا کے تصور کی اہمیت اتنی بڑی ہے اور یہ حقیقت ہے۔ اس میں ساری بات سمٹ کر آ جاتی ہے۔ تمہارے ہاں خدا کا تصور کیا ہے؟

جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے وہ تو کسی کے تصور میں، وہم میں، گمان میں، قیاس میں، آ ہی نہیں سکتی۔ جنہیں خدا کی صفات کہتے ہیں، انہی سے اس کا تعارف ہوتا ہے، انہی صفات کی رو سے ہمارے ذہن میں اس کا ایک تصور قائم ہوتا ہے۔ اسلام کی یا قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا کی صفات اس قسم کی دیتا ہے جن کی رو سے خدا کا ایک تصور قائم ہوتا ہے۔ وہ کہیں اور سے نہیں ملتا۔ یہ ہے قرآن اور اسلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت۔ ہمارے ہاں چونکہ اسلام کے متعلق دین کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے، یہ بھی ایک مذہب شمار کیا جانے لگا ہے، ہم نے بھی اسے ایک مذہب ہی کہا ہوا ہے: مذہب اسلام۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ Religion ہو گیا ہے۔ اب Christianity (عیسائیت) بھی Religion، ہندومت بھی Religion، اسلام بھی Religion، یہودیت بھی مذہب، انہوں نے اسلام کو بھی اس کی صفت میں کھڑا کر دیا اور اس کے بعد مذاہب عالم کے مناظرے ہونے لگے۔ انہی میں اسلام بھی شریک ہو گیا۔ اب یہ اپنے مذہب کو، اسلام کو، دیگر مذاہب کے مقابلے میں افضل ثابت کرتے تھے یعنی اسلام جو مذہب ہے ہی نہیں، اسے مذاہب سے زیادہ افضل ثابت کرتے تھے۔ ثابت کیا ہو سکتا تھا، وہ مذہب تو ہے نہیں۔ بس چلے ہوئے ہیں اسی طرح سے۔

اصل چیز یہ ہے کہ قرآن نے خدا کا تصور کس قسم کا دیا ہے۔ یہ ہے بنیادی نکتہ عزیزانِ من! اسی بنیاد پہ دین کی اور انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے: خدا کا تصور کس قسم کا دیا ہوا ہے۔ وہ تصور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، اس کی صفات سے قائم ہوتا ہے اور یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے صفاتِ خداوندی کو اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور وہ صفات دینے کے بعد یہ کہا ہے کہ **فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا** (2:137) اگر یہ اس کے مطابق خدا کو مانیں جس طرح تم مانتے ہو تو سمجھا جائے گا کہ یہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہیں، ورنہ خدا کو تو چند دہریوں، ملحدوں کے سوا ساری دنیا مانتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کا خدا کا ماننا بالکل نہیں ہے، خدا پر ایمان ہے ہی نہیں۔ یہ اس خدا کا ماننا ہے جس کا تصور اس کی ان صفات کی رو سے قائم ہوتا ہے جو اس نے خود بیان کی ہیں، اپنے متعلق دوسرا کوئی بیان ہی نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے ہاں پایا جانے والا تصورِ خدا اور اُس کے اثرات

آج ہمارے سامنے ایک ایسی چیز آتی ہے جو ان صفات میں بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایسی خصوصیت کبریٰ ہے جو خدا کے متعلق کہیں اور نہیں ملتی۔ خدا کے متعلق کہیں بھی آپ دیکھیے، تصور یہ ہوتا ہے کہ اسے ہر قسم کا اقتدار حاصل ہے، اختیار حاصل ہے، وہ جو

چاہے کرے، اس کے فیصلے میں دم مارنے کی جا نہیں ہے، وہ قادرِ مطلق ہے، مرضی مولا برہمہ اولیٰ، اس کے مقابل میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج کی صطلاح میں اسے Authoritarian God کہا جائے گا یعنی اختیارِ مطلق کا مالک۔ آپ نہ Question (سوال) کر سکتے ہیں، نہ اعتراض کر سکتے ہیں، بلکہ یہ بھی نہیں کہ آپ اسے یہ کہیے کہ حضرت! یہ سمجھا ہی دیجیے کہ آپ نے کیوں حکم دیا ہے۔ میں نے Authoritarian اس لیے کہا کہ آج کل ذرا ڈکٹیٹرشپ سے کچھ لوگ جھینپ رہے ہیں۔ اس کی بجائے انہوں نے Authority کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسے Authoritarian کہا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں خدا کا یہی تصور تھا۔ ہمارے ہاں جو آئے تو میں نے کہا ہے کہ ہم نے سارے تصورات ان سے لیے ہیں۔ قرآن کی رو سے جو تصور قائم ہوتا ہے وہ ہمارے ذہنوں میں ہے ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یورپ نے عیسائیت اور یہودیت کے متعلق انگریزی زبان میں جب ترجمے کیے تو انہوں نے خدا کے لیے Lord (لارڈ) کا لفظ استعمال کیا۔ Lord سے تو آپ سمجھتے ہی ہیں کہ کیا ہے، اگلی نسل تو شاید نہ سمجھے۔ ہم تو جانتے ہیں کہ جب لارڈ صاحب کیندے سن، تے مطلب کی ہونداسی؟ ❶ یہ کہ Lord of the Kingdom ❷ دیکھا آپ نے، وہ کتنا بڑا Authoritarian God نظر آتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ہمارے قرآنِ کریم کے جو ترجمے ہوئے، وہاں بھی رب کا ترجمہ Lord کیا جاتا ہے۔ دیکھیے **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (1:1) کا انگریزی ترجمہ ہوتا ہے:

Prayer be to Allah, the Lord of the world ❸

اور جتنا کوئی اس کو زیادہ Lord مانتا جائے، اتنا ہی زیادہ وہ خدا پرست تسلیم کیا جاتا ہے۔ قرآن نے آکر یہ کہا کہ یہ تو نہیں ہے کہ یہ پہلی دفعہ کہا ہے۔ وحی کی رو سے تو یہ ہے کہ پہلے بھی تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف وحی آتی تھی۔ وحی کی رو سے تو اسی خدا کا تصور دیا گیا

---

❶ ہم تو جانتے ہیں کہ جب لارڈ صاحب کہتے تھے تو اس کا مطلب و معنی کیا ہوتا تھا۔

❷ (وہ) سلطنت کا مالک کل ہے۔

❸ پکتھال (Marmaduke Pickthall) نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے:

Praise be to Allah , Lord of the Worlds

آغا محمد یعقوب نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

All praise is due to Allah, the Lord, the Cherisher and the Sustanier of the worlds (Printed at: JAWED BLOCK, Pakistan Chowk, Karachi. P.26)

محمد ایوب خان نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

Praise be to God, the Lord of the World (ادارہ اشاعت القرآن، لاہور کینٹ۔ ص۔ 12)

تھا جو تصور آخر میں قرآن میں ہے لیکن چونکہ وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں نہیں رہیں اور ان کے بھی ترجمے در ترجمے ہوتے چلے آئے' یہ چیز کہ وہ مذاہب کیا ہیں' ان کی کتابوں کے ساتھ کیا ہوا' وہ میری کتاب ہے: ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں۔'' اس میں ان کی یہ ساری تاریخ (History) دی ہوئی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے' جس کی کتاب اپنی اصلی شکل میں آج اس دنیا میں موجود ہو۔ اس کی گواہی وہ اہل مذاہب خود دیتے ہیں کہ ہمارے پاس وہ اصلی کتاب نہیں ہے۔ اس لیے ان کے ہاں تو اس کی تلاش غلط ہے۔ قرآنِ کریم اپنی شکل میں تھا اور آج بھی ہے۔ انہوں نے بھی رب کے لیے یہ Lord ترجمہ کیا۔ Authoritarian God کا تصور اور عقیدہ انہوں نے دیا۔ آج کی اصطلاح میں' میں یہ کہوں گا کہ قرآن نے پہلی دفعہ آکر خدا کے متعلق Authoritarian God نہیں کہا' Constitutional God کہا۔ ہمارے ہاں ایک کہتا ہے کہ یہ کیا کر دیا تم نے؟ دوسرا جواب میں کہتا ہے کہ میں نے تو کچھ نہیں کر دیا' یہ تو خود خدا نے کیا ہے کیونکہ پہلی چیز اس نے یہی کہی کہ **الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (25:2) ساری کائنات کے اندر اقتدار اور اختیار اسی کا ہے۔ دیکھتے ہیں آپ کہ ذہن میں وہ Lord والا تصور آ رہا ہے کہ **لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ** (25:2) اور اس کے اقتدار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ اتنا بڑا تصور آیا اور کہا کہ **وَ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ** (25:2) اور ہر شے کو' جس میں انسان بھی شامل ہے' اس نے پیدا کیا ہے۔ یہ اس کی مخلوق ہے اس لیے یہ شریک نہیں ہو سکتے تو اس سے یہ اتنا بڑا تصور آیا Authoritative تصور اس سے قائم ہوتا ہے لیکن ابھی فقرہ ختم نہیں ہوا' نتیجہ اخذ کرنے میں اتنی جلدی نہ کیجیے۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں ہی خدا تعالیٰ کا حقیقی تصور ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا کہ **خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ** (25:2) تخلیق کیا اس نے ہر شے کو اور **فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا** (25:2) ان سب کے لیے قانون اور پیمانے اور اندازے اور معیار مقرر کر دیئے جو کبھی نہیں بدلیں گے' جن کو ہم بھی نہیں بدلیں گے۔ میں نے کہا ہے کہ آج کی صطلاح میں اُسے Authoritarion God کی بجائے Constitutional God کہیں گے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ دو لفظ آ گئے ہیں جن میں سارا تصور سمٹ کے آ جاتا ہے۔ معاف رکھیے گا مجھ میں تو کچھ وجد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ **الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ** (25:2)۔ دیکھا ایک ایک لفظ سے اتنی بڑی اتھارٹی قائم ہو رہی ہے۔ صاحب! اس کے اقتدار اور اختیار کائنات میں کوئی شریک ہی نہیں ہے اس لیے کہ **خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ** (25:2) وہ خالق ہے ہر شے کا۔ اور آگے ہے کہ **فَقَدَّرَہٗ** (25:2)۔ کیا بات ہے اس ''ف'' کی! **فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا** (25:2) پیدا کرنے کے بعد ہر ایک کے لیے قانون مقرر کر دیا' اور قانون ایسا مقرر کر دیا جسے ہم بھی نہیں بدلیں گے۔ صدقے جایئے ایہو جئے رب دے۔ ہے

ناچھی پان نوں جی کردا۔ [1] اس تضاد کو دیکھیے' معاف رکھیے' کیا کہوں! میرا تو جی چاہتا ہے ہزار بار دہراؤں کہ **الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ** (25:2)۔ایک طرف تو اقتدار اور اختیار کی یہ کیفیت اور اس کے بعد ہے کہ **فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا** (25:2) پھر ہم نے ہر شے کے پیمانے' اندازے' معیار' قانون مقرر کر دیئے اور یہ بھی کہ **لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ** (10:64) ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی' ہم بھی تبدیلی نہیں کریں گے۔ وہ اتنا بڑا اصاحب اختیار ہے' کتنی بڑی پابندی اپنے اوپر عائد کر رہا ہے۔ ہر شے کے لیے قانون اور معیار مقرر کر دیا اور کہتا ہے کہ ہم بھی اس کو نہیں بدلیں گے۔

خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا تعلق اس کے مقرر کردہ قوانین سے ہوتا ہے

عزیزانِ من! دیکھیے آپ' خدا کا یہ تصور کہیں اور بھی ملتا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ پھر آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو اس تصور کی خصوصیت اور انفرادیت ہے اس کی رو سے خدا کے ساتھ ہمارا تعلق کس بنا پہ رہ جاتا ہے؟ اس کے قوانین کی بنا پہ۔ جب اس نے کسی معاملے میں دخل ہی نہیں دینا' قانون بنا دیئے اور ان میں وہ کہتا ہے کہ ہم دخل نہیں دیں گے' ہم انہیں بدلیں گے ہی نہیں' تبدیل نہیں کریں گے' تو ہمارا تعلق تو صرف قوانین خداوندی کے ساتھ رہ گیا۔ آج بھی مملکت کے اندر جو قانون چلتا ہے' ہم کبھی پوچھتے ہی نہیں کہ کس پارلیمنٹ نے اس کو بنایا' ویسے بھی ہمیں اس چیز کے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ یہ قانون ہے' اس کا اتباع ہم نے کرنا ہے' اس نے قوانین بنا دیئے۔ جہاں تک خارجی کائنات کے ساتھ انسان کا تعلق ہے' وہ تو یہ ہے کہ یہ جو Discover (انکشاف) کرنے والے علوم ہیں' ان میں سے ایک ایک قانون کو Discover (بے نقاب) کرتے چلے جاتے ہیں' منکشف کرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق تھا' وہ قوانین اس نے اپنی الکتب کے اندر دے دیئے۔ کتاب کا معنی ہی ضابطہ قوانین ہوتا ہے اور اس کے بعد خود اپنا اختیار یہاں تک ہی رکھا کہ یہ قوانین جو ہم نے دیئے ہیں' یہ اسی طرح سے اٹل چلتے رہیں' ان میں کسی قسم کا کوئی نقص یا حرج واقع نہ ہو۔

دو حصوں میں اقتدار کی تقسیم: عالمِ امر اور عالمِ خلق

اس نے یہ جو اپنا ملک کہا ہے' مملکت کہا ہے' دائرہ اقتدار کہا ہے' اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو ''عالمِ امر'' ہے جہاں وہ کائنات کی تخلیق کرتا ہے' اشیاء کی تخلیق کرتا ہے' ان کے لیے قانون متعین کرتا ہے۔ یہ وہ عالمِ امر ہے جس کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہاں یہ کس طرح کرتا ہے' اسی لیے اس دائرہ کے متعلق اس نے کہا کہ **یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ** (5:1)

---

[1] اس خدا پر ہزار جان نثار ہو۔ اسے بغلگیر ہونے کو جی چاہتا ہے' ہے نہ یہی؟

جس طرح ہمارا ارادہ کرتا ہے' ویسے وہاں ہم کرتے ہیں' حکم دیتے ہیں' **یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ** (3:40) جیسی ہماری مشیت ہوتی ہے اس کے مطابق ہم کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہاں تو ہونا ہی یہ چاہیے' وہاں ہے کون جس سے وہ مشورہ کرتا پھرے۔ وہاں کسی پابندی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے ارادے اور مشیت کے مطابق جس چیز کو جس طرح سے چاہتا ہے' اس کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ ہے اس کا عالمِ امر۔ اس نے تو خود بتایا ہے کہ **بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ** [1] (2:117)۔

کائنات کی ابتدا کے متعلق موجودہ تحقیق اور قرآنِ حکیم کا ارشاد

یہ خود جو بڑے بڑے Scientists (سائنسدان) ہیں' وہ اس کائنات کے اندر جو خدا کا قانون یا قوانین فطرت رائج ہیں' ان میں سے ایک ایک کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں' کرتے چلے جاتے ہیں کہ یہ کیسے کام کر رہا ہے' اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یہ کرتے کرتے وہ پیچھے چلے جاتے ہیں۔ اسے وہ Law of Cause & Effect (قانونِ علت ومعلول) کہتے ہیں۔ Cause (علت' سبب) یہ ہوتا ہے یعنی ہر نتیجہ جو پیدا ہوتا ہے' اس کا ایک سبب ہوتا ہے' Cause ہوتا ہے۔ اس کائنات کے اندر یہ چیزیں ہیں اور وہ اس کی تحقیق کرتے چلے جاتے ہیں' Discover (بے نقاب) کرتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی Scientists کوئی قانون بناتے نہیں ہیں۔ غالباً سلیوان [1] (Sullivan) کا بڑا اچھا فقرہ ہے:

We only read the Book of nature, we can't write it. [2]

یہ بہت خوبصورت ہے کہ ہم کتابِ فطرت لکھتے نہیں ہیں' ہم کتابِ فطرت کو پڑھتے ہیں۔ یہ پڑھتے پڑھتے' جب پیچھے (ماضی میں) چلے جاتے ہیں تو اس مقام پہ پہنچ جاتے ہیں جہاں کائنات وجود میں آئی۔ معاف رکھیے گا وہاں بات یوں ہی بنتی ہے کہ وہاں حیرت ہی حیرت ہوتی ہے۔ پھر بات دوسری طرف چلی جائے گی کہ جہاں قرآن نے سدرۃ المنتہیٰ کہا ہے۔ انتہا ہے یہ بات کہ اس سے پہلے وہ سمجھتے تھے کہ یہ Cause (علت) ہو تو اس کا یہ نتیجہ (Effect) ہوتا ہے۔ اب جب کائنات کی ابتدا ہے تو وہاں وہ کیا کریں گے؟ یہ کس طرح وجود میں آ گئی؟ وہاں جا کے یہ سب حیرت میں ہوتے ہیں کہ یہ وہ مقام ہے جس سے ہم آگے جا ہی نہیں سکتے۔ Effect یعنی نتیجہ تو

---

[1] تمہارا محدود ذہن تمہیں یہی بتا سکا ہے کہ خدا کا طریق آفرینش بھی تولید (Procreation) کا ہے یعنی وہ طریق جس کی رو سے ایک باپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ خدا وہ ہے جو ساری کائنات کو پہلی مرتبہ (عدم سے) وجود میں لایا ہے۔ اُس کا اندازِ تخلیق یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کے پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے' تو اس کے ساتھ ہی اس شے کی تخلیق کا آغاز ہو جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔42)۔

[2] ہم صحیفہ فطرت کو صرف پڑھ سکتے ہیں' لکھ نہیں سکتے۔ دراصل شین (F.J.Sheen) نے اپنی کتاب Philosophy of Religion:p.156 (مذہب کا فلسفہ ص 156) میں لکھا تھا کہ ''سائنس' کتابِ فطرت کو پڑھتی ہے' اسے لکھتی نہیں''۔ غالباً سلیوان (Sullivan) نے شین کے ہی حوالے سے یہ بات کہی ہے۔

سامنے ہے علت (Cause) کا پتہ نہیں چل رہا۔ یہ اتنی بڑی کائنات ہے' اس کائنات کا ابھی تک ذہن انسانی احاطہ ہی نہیں کر سکا۔ خود جتنی موجود ہے' اس کا بھی احاطہ نہیں کر سکا۔ نیوٹن تو کہتا ہے کہ ہم علم کے سمندر کے کنارے پہ گھونگھے چن رہے ہیں' سیپیاں چن رہے ہیں' علم کا سمندر تو ابھی آگے آتا ہے لیکن جتنی کائنات کا احاطہ کر چکے ہیں' اسے جیمز جینز (James, Jeans) تو The Expanding Universe کہتا ہے یعنی یہ Universe (کائنات) پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ اس نے کیا کہنا تھا' چودہ سو سال پہلے کا ایک عرب [1] کہتا ہے کہ **یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ** (35:1)۔ ہم اپنی تخلیق میں اضافے کرتے چلے جاتے ہیں۔

رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

عدم سے وجود میں لانے والی ہستی کسی Cause (سبب) کی محتاج نہیں

وہاں پہنچنے کے بعد یہ جو Cause & Effect (علت و معلول) کا سلسلہ ہے' وہاں Effect (معلول' نتیجہ) تو سامنے ہے' اس کائناتِ محسوس کا کوئی Cause (سبب) معلوم نہیں اور یہ مقام ہے جہاں اس نے کہا کہ **بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (2:117)۔ بدع کے معنی ہوتے ہیں Nothingness (عدم) سے کسی چیز کو وجود (Being) میں لے آنا۔ ہر شے جو وجود میں آتی ہے' اس میں ہوتا یہ ہے کہ پہلے کچھ چیزیں ہوتی ہیں' ان کو ملاتے ہیں' تو اس طرح سے ایک نئی چیز بن جاتی ہے۔ اسے عربی زبان میں خلق کہتے ہیں۔ مثلاً ہائڈروجن اور آکسیجن کو ایک خاص نسبت سے ملایئے' پانی کا قطرہ وجود میں آ جاتا ہے۔ پہلے وہ دو چیزیں موجود ہوں گی تو پانی کا قطرہ بنے گا لیکن سوال یہ ہے کہ ہائیڈروجن کیسے وجود میں آ گئی؟ اس کے لیے عربی زبان میں بدع کا لفظ ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد' اس کنارے پہ جہاں یہ محو حیرت کھڑے تھے' وہاں اس نے کہا کہ کیا سوچ رہے ہو؟ سنو! **بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (2:117)۔ وہ Nothingness (عدم) سے اشیاء کو وجود میں لانے والا ہے۔ صرف عدم وہ مقام ہے جہاں ہم Cause (سبب) نہیں معلوم کر سکتے اور ہونا بھی یہی چاہیے۔ اس سلسلے کو پیچھے لے جایئے' کہیں تو کوئی مقام ایسا آئے گا ہی کہ پیچھے Cause (سبب) نہ ہو اور Effect (نتیجہ) ہو۔ یہ ہے اس کی صفت: **بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (2:117)۔ اس کے بعد وہاں کیا ہوتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **وَ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا** (2:117) جب وہ' ہمارے الفاظ میں' یہاں ''امر'' کا لفظ آیا ہے' ارادہ کر لیتا ہے تو پھر **فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَهٗ کُنۡ** (2:117) بس وہ اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ کہتا ہے ''ہو جا'' **فَیَکُوۡنُ** تو (2:117) ہو جاتی ہے۔ عربی زبان میں ''کان'' آتا ہی وہاں ہے' جہاں کوئی تصوراتی چیز' محسوس شکل اختیار کر لے۔ یہ تو وہ عالم ہے جہاں کسی قاعدے اور قانون کا وہ پابند نہیں ہے' ہو ہی نہیں سکتا' قانون وہاں

---

[1] یہ اشارہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین نبی اکرم کی طرف ہے۔

چل ہی نہیں سکتا۔ قانون وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں Cause (سبب) سے Effect (نتیجہ) آتا ہے۔ وہ مقام ایسا ہے جہاں کوئی Cause (سبب) نہیں ہے' وہاں Effect (نتیجہ) ہے۔ اس نے کہا کہ تم صرف Cause (سبب) سے Effect (نتیجہ) سمجھ سکتے ہو اور وہ مقام ایسا ہے جہاں Cause (سبب) نہیں' Effect (نتیجہ) ہے۔ وہاں کے متعلق یہ سمجھ لو کہ وہاں تو **يَحۡكُمُ مَا يُرِيۡدُ** (5:1) اور **يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ** (3:40) ہے اور جب وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے تو پھر **خَلَقَ كُلَّ شَيۡءٍ** (25:2) کا عمل ہے۔ یہاں آ گئے۔ کہا کہ **فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا** (25:2) پھر اس کے متعلق ہم قانون بنا دیتے ہیں کہ اب کوئی Cause (سبب) ظہور میں آئے یعنی Effect (نتیجہ) میں آئے بغیر نہیں رہے گا۔ قرآنِ کریم میں قدر "ق د ر" کا لفظ ہے' قانون کا لفظ نہیں آیا اور یہ بڑی چیز ہے۔ بھلا قرآنِ کریم میں کون سی چیز بڑی نہیں ہے! سب بڑی ہیں۔ یہ جو "ق د ر" ہے' اسی سے یہ قدر اور تقدیر ہے۔ عربی زبان میں اسی مادہ "ق د ر" سے تقدیر کا لفظ بنا ہے اور بڑا ہی غور طلب ہے۔

بیج کی تقدیر

عزیزانِ من! یہ چیزیں زیادہ غور طلب ہیں۔ اتفاق سے سامنے آ گئی ہیں' بیان ہو جانی چاہئیں۔ جو شے بھی وجود میں آتی ہے' وہ مکمل طور پر بنی بنائی نہیں ہوتی۔ جو بیج (Seed) ہے' وہ بنا بنایا درخت نہیں ہوتا۔ اس میں درخت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے' درخت بھی اپنی تکمیل تک نہیں پہنچا۔ محض درخت بن جانا تو کوئی شے نہیں ہے۔ درخت میں پھل لگے گا۔ یہ جو پھل لگنا ہے' یہ بیج کا منتہیٰ ہے یعنی بیج کے اندر یہ امکانی صلاحیت (Realizable Potentiality) رکھ دی گئی۔ اسے انگریزی میں Realizable Potentiality کہتے ہیں یہ Potential (صلاحیت)' ان کی خصوصیات میری بیٹیاں سمجھیں گی جو طالب علم ہیں۔ یہ Potentialies (خصوصیات) Actualize (بارز) ہوتی چلی جاتی ہیں تا آنکہ وہ اپنے انتہا پہ پہنچ جاتی ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ آم کی گٹھلی کی انتہا یہ ہے کہ وہ آم کا پھل بن جائے۔ اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے آگے کچھ انتہا نہیں ہے۔ عربی زبان میں' غور سے سنیے' عزیزانِ من! سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں' یعنی وہ عرب اس پھل کو گٹھلی کی "تقدیر" کہتے تھے یعنی جو کچھ بننے کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے' اس کا وہ کچھ بن جانا یہ اس کی تقدیر کہلاتا ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ جب لفظوں کا استعمال بگڑتا ہے تو بات کیا سے کیا بن جاتی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں تقدیر کا لفظ کہاں بولا جاتا ہے یعنی جس میں نہ کوئی ہمارا دخل ہو' نہ اختیار ہو' نہ قاعدہ ہو' نہ قانون ہو۔ "تقدیر ہی ایہو جئی ہیگی سی' تقدیر پھٹے' تقدیر اچ لکھیا ہووے گا' تا مل جائے گا۔" [1] ہم روز تقدیر کا لفظ بولتے ہیں۔ اس مقام پہ جہاں نہ کوئی قاعدہ' نہ کوئی

---

[1] تقدیر ہی ایسی تھی' پھٹی تقدیر! اگر اس میں لکھا ہو گا تو مل جائے گا۔

قانون' نہ یہ کیا بنا تھا کیا بن گیا' کچھ نہیں' جو جیسے ہوا ہو گیا اور جو آگے کہا جائے کہ یہ کیسے ہو گیا تو وہ خدا کی مرضی۔ اب آپ سوچیے کہ یہ کیا ہوا' اور کیا بنا!

قرآن فہمی کے سلسلہ میں میرے لیے علامہ اقبالؒ کی راہنمائی

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے الفاظ پر' جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) نے مجھے سمجھایا کہ قرآنِ حکیم محاورہ عرب کی رو سے کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآن سمجھا ہی اسی طرح جاسکتا ہے' جو یہ پتہ چلے کہ مثلاً یہ قدر اور تقدیراً جو قرآن نے **فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا** (25:2) میں کہا ہے' سے یہ سمجھا جائے کہ اس زمانے کا عرب اس لفظ سے سمجھتا کیا تھا۔ ان عربوں نے حضور ﷺ سے کہ سرکار! سمجھا تو دیجیے کہ یہ **فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا** (25:2) میں آپ ﷺ نے کیا لفظ بول دیا۔ تقدیر تو ہم مانتے ہیں۔ ''جیہڑی مقدر اچ لکھی ہوئی ہوندی اے۔''❶ تو یہ کیا بات ہے؟ یہ لکھی ہوئی کیا چیز آپ کہہ رہے ہیں؟ حضور ﷺ سے کسی نے یہ نہیں پوچھا۔ یہ اس لیے کہ ان کی زبان میں یہ باتیں تھیں اور وہ انہیں ان معنوں میں روز بولتے تھے۔

قرآن اس صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے' عزیزانِ من! جب یہ معلوم ہو کہ عرب ان الفاظ کا' اس دور میں' کیا مفہوم لیتے تھے۔ اس سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے' کسی تفسیر کی ضرورت نہیں رہتی۔ تفسیروں کی ضرورت ہو تو کتابِ مبین کیا ہوئی!! تفسیر' ایک ہی تفسیر ہے: قرآن کی آیت کا مفہوم دوسری آیات کی روشنی میں۔ یہ خود قرآن نے بتایا ہے کہ میرے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے۔ اسی لفظ تقدیر کو لے لیجیے تو عزیزانِ من! ساتھ ساتھ میں کہتا چلا جاؤں تاکہ آپ احباب کو سمجھنے میں آسانیاں ہو جائیں۔

لغات القرآن' مطالب الفرقان اور تبویب القرآن کی افادیت

میں نے اپنے لغات القرآن میں ان الفاظ کے معنی اس طرح سے متعین کر کے بتائے ہوئے ہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں عرب ان سے کیا مفہوم لیتے تھے اور اس کے بعد جو میں نے اب پھر یہ تفسیر کا سلسلہ شروع کیا تو قرآن نے خود کہا ہے' تصریف آیات سے ہم اپنے معنی واضح کرتے ہیں۔ تصریف آیات کے معنی ہی ہوتے ہیں ''پھیر پھیر کے ان کو لانا' مختلف مقامات پہ بیان کرنا۔'' مطالب الفرقان مرتب ہی میں نے اس طرح سے کیا ہے اور اس کے بعد آپ احباب کی سہولت کے لیے تبویب القرآن بھی اب شائع ہو گئی ہے۔ کسی ایک لفظ کے متعلق یا قرآن کے ایک تصور کے متعلق اس میں' میں نے وہ سارے قرآن کے حوالے دے دیئے ہیں کہ کہاں

---

❶ جو قسمت میں لکھی ہوتی ہے:

چاہے تم پاؤں گھسو' یا کہ رکھو سر بسجود — بات پیشانی کی جو ہے' سو پیش آنی ہے

کہاں یہ لفظ آیا ہے۔ دیکھ لیجیے ان حوالوں کو لغات سے ابتدائی مفہوم ذہن میں لے آیئے' تبویب سے یہ دیکھیے کہ قرآن کے کس کس مقام پہ یہ لفظ آیا ہے' وہ آیات اکٹھی کر لیجیے' بنیادی معنی وہاں سے لے لیجیے' قرآن واضح ہو جاتا ہے۔

تقدیر کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن میں ہے کہ **خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا** (25:2) یہ قدر' یہ تقدیر بھی یہ ہے کہ جہاں اس نے تکمیل تک' انتہا تک پہنچنا ہے وہاں تک پہنچ کے بننا ہے' جو کچھ بننے کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا۔ وہ یونہی نہیں بنتی۔ اس کے لیے قدرہ ہے۔ اس کے لیے قاعدے مقرر ہیں' قانون مقرر ہے۔ ان قاعدوں کے مطابق اگر یہ چلی جائے گی تو یہ اپنی تقدیر تک پہنچ جائے گی۔ عجیب چیز ہے کہ انگریزی زبان میں ایک لفظ آیا۔ میں نے دیکھا کہ کہاں ان کی نگاہ پہنچتی ہے۔ یہ بن جائے گی تقدیر۔ انگریزی میں اس کو Destination کہیں گے۔ اس کا آخری مقام جہاں پہنچنا ہے یعنی منزل اخروی' آخری منزل اور آپ کو معلوم ہے کہ وہاں انہوں نے Destiny کا لفظ لیا ہے اور اس کے معنی مقدر یا قسمت کے لیے ہیں۔ Destination سے Destiny وہ تو لے آئے اور ہم تو جن کے ہاں یہ لفظ اس معنی میں آیا تھا' ہم نے کبھی اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال ہی نہیں کیا۔ ہم جب Destiny کہیں گے تو ہمارے نزدیک بھی وہی تقدیر ہوگی: ''جیہڑا متھے دا لکھیا ہویا پھٹ پیندا اے ہن۔''[1] ان کے ہاں بھی Destiny کا لفظ Faith کے ہی معنی میں آتا ہے۔ یہ بھی بھول گئے کہ یہ اصل میں Destination ہے۔ اس لیے کہ ان کے ذہن میں یہ تصور ہی نہیں تھا کہ یہ خدا کا قانون کیا ہے: **فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا** (25:2) اس کی تقدیر کے لیے ہم نے پیمانے' اوزان' معیار' قانون مقرر کر دیئے ہیں۔ اس کی تقدیر کے لیے یعنی جو کچھ اس کا انتہا میں پہنچ کر بننا مقصود ہے اس کے لیے قانون مقرر کر دیئے ہیں۔ یہ ہیں **فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا** (25:2)۔

الذی خلق فسوىٰ کا مفہوم

دوسری جگہ ایک آیت میں یہ آیا ہے کہ **اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى** (87:2)۔ جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن یعنی یہ جی چاہتا ہے کہ قرآن کی یہ آیتیں آئیں' فرصت ہو' نصاب کی بات ہو' تو پھر میں عرض کروں کہ قرآن یہ کیا کہہ گیا: **اَلَّذِيْ خَلَقَ** (87:2)۔ میں نے کہا ہے کہ خلق کے معنی ہوتے ہیں مختلف چیزوں کو اکٹھا کر کے ایک نئی چیز بنا دینا' ہائیڈروجن اور آکسیجن کو یوں جمع کر کے پانی بنا دینا لیکن ہائیڈروجن اور آکسیجن خاص Proportion (تناسب) سے ملے گی تو پانی کا قطرہ بنے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ آپ اتنی ہائیڈروجن

---

[1] جو پیشانی میں لکھا ہوتا ہے وہی پیش آتا ہے۔

لے لیں اور آکسیجن، جتنی جی چاہے لے لیں، ان کو ملا دیں، تو وہ پانی کا گلاس بن جائے، بالکل نہیں۔ اس میں سے جتنی وہ آپ کے ہاں مقدر میں پڑی ہوئی ہے، اس میں سے تراش کر اس Proportion (تناسب) کے مطابق دو چیزوں کو آپ لیں گے، تو پھر بنے گی تیسری چیز۔ یہاں (87:2) میں کہا کہ تراش کے الگ کیا اور ان کی جو Proportion (تناسب) تھی، وہ قائم کی۔ یہ فسوٰی ہے۔ یہاں تو ہمارے ہاں اب ''چک جنوں کیندے سن'' ❶ ہے ہی نہیں، اور کمہار جو چاک کے اوپر رکھ کے کرتے تھے، نئی نسل والے ہمارے بچوں نے وہ چاک دیکھا ہی نہیں ہوگا۔ وہ بہت بڑا پہیہ گھماتے تھے تو وہ کرتا کیا تھا؟ مٹی گوندھی ہوئی رکھی ہوتی تھی، وہ اتنا سا وہ سادہ مٹی کا تھوبہ سا، لے کے اس کے اوپر رکھ دیتا تھا۔ پھر اس کے بعد اس میں سے اِدھر اُدھر سے گھماتے گھماتے وہ چھیلتا جاتا تھا، اس کی زائد مٹی کو چھیلتا بھی جاتا تھا اور کچھ وہ انگوٹھوں انگلیوں سے یوں یوں بھی کرتا چلا جاتا تھا۔ وہ جتنی زائد مٹی ہوتی تھی، وہ ساری چھیل کر اسی مٹی کے تھوبے میں سے کبھی لوٹا بنا دیتا تھا، کبھی پرات بن جاتی تھی، کبھی صراحی بنا دیتا تھا، کبھی پیالہ بنا دیتا تھا۔ وہی مٹی ہوتی تھی۔ وہ کیا کرتا تھا: **فَسَوّٰی** (87:2)۔ یہ کرنے کے بعد وہ ایک شکل اختیار کرتی تھی۔ یہ ہے **خَلَقَ فَسَوّٰی** (87:2)۔ یہ خلق ہے۔ اس سے اخلاق کا لفظ آپ کے ہاں آیا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں انسانی قوتوں میں صحیح Proportion (تناسب) پیدا ہو جانا، صحیح توازن پیدا ہو جانا۔ عربوں کی یہ قوم کیا بلا تھی! اخلاق نام ہی اس کا ہے کہ کوئی انسانی صلاحیت یا اس کی قدرت یا اس کا اختیار، اپنی ذات سے بڑھا ہوا ہو تو وہ اخلاق کے خلاف ہے، گھٹا ہوا ہو تو اخلاق کے خلاف ہے، حمیت میں ضرورت سے زیادہ تیزی آ جائے، تو غصہ ہو جاتا ہے، کمی ہو تو کمزوری ہو جاتی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **خَلَقَ فَسَوّٰی o وَ الَّذِیْ قَدَّرَ** (87:2-3)۔ پھر اس کے بعد اس نے اس کے لیے قوانین مقرر کر دیئے: **فَهَدٰی** (87:2) پھر اس کی راہنمائی کر دی کہ تم اس راستے پہ چل کے اپنی تقدیر تک پہنچو۔ چار لفظوں میں یہ سب کچھ بتا دیا۔ ❷

ذاتِ خداوندی اپنے آپ کو از خود پابند کرتی ہے

عزیزانِ من! ساری بات کر دی کہ **لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (25:2) کائنات میں وہ سارا اقتدار و اختیار اس کا ہے۔ جو اتنا بڑا صاحب اقتدار ہے، اس پر کسی پابندی کا سوال ہی عائد نہیں ہوتا اس لیے قرآن نے کہا کہ **وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ** (25:2) اس کے اقتدار میں کوئی شریک ہی نہیں ہے، تو اس میں کون ہے جو پابندیاں عائد کرے گا۔ اس نے کہا کہ ہم تو کوئی اور

---

❶ جسے چاک کہتے تھے۔

❷ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، پارہ 30 (مکمل): (سورۃ الاعلیٰ) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2006ء، ص ص۔ 380 تا 401۔

پابندی عائد نہیں کر سکتے البتہ ہم نے اپنے آپ پہ خود کچھ پابندیاں عائد کر لی ہوئی ہیں۔ میں اس کے لیے لفظ یہی استعمال کروں گا۔ بڑے ہی جگرے کی ضرورت ہے کہ بے پناہ اختیارات ہوں اور پھر اپنے اوپر وہ پابندیاں عائد کر لے۔ مثلاً کہا کہ **كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ** (6:12)۔ کتب عربی زبان میں کہتے ہی یہ ہیں جہاں کوئی قانونی پابندی کسی کے اوپر عائد کی گئی ہو۔ اسی طرح **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (2:138) اور **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ** (2:216) میں یہ لفظ کتب ہے۔ اس کتب سے مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ چیز مقرر کی گئی ہے، پابندی عائد کی گئی۔ وہاں تو یہ ہے کہ عائد کی گئی تو کسی دوسرے کی طرف سے عائد کی گئی ہے۔ یہاں اپنے متعلق یہی لفظ ہے کہ **كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ** (6:12) ہم نے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر دی کہ جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے ان کا سامان نشو ونما بھی ہم دیں گے، ہم نے یہ پابندی اپنے اوپر عائد کر لی یا اللہ! اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ عزیزانِ من! کوئی دوسرا کسی پر پابندی عائد کرے تو وہ اس کی محکومیت ہو جاتی ہے، جو اپنے اوپر خود کوئی پابندی عائد کر لے تو یہ تو بہت بڑا شرفِ انسانیت ہے۔ اسی کو تو بااصول آدمی کہتے ہیں۔ میرا یہ اصول ہے بھئی! کسی تھانیدار نے اس کو حکم نہیں دیا ہوا کہ صبح پانچ بجے اٹھ کے اس بستر میں سے نکل کے تین میل چلو پھر واپس آؤ۔ وہ خود اپنی صحت کی خاطر اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لیتا ہے اسی لیے یہ ہے کہ **كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ** (6:12) اور **حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ** (30:47) مومنین کی مدد کرنا ہم پر فرض ہو جاتا ہے۔ یا اللہ! کیا خدا ہے یہ اور **لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ** (3:9) یہ جو ہم اپنے اوپر پابندی عائد کر لیتے ہیں، اس کی خلاف ورزی ہم کبھی نہیں کرتے۔

انسانی دنیا کی طرف آیئے۔ ہم اپنے متعلق تو یہ کیفیت کبھی نہیں کریں گے لیکن خدا کہتا ہے کہ **لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (33:62)۔ جو ہم نے اپنے اوپر یہ پابندی کر کے اپنے لیے ایک روش متعین کی ہے اس میں تم کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ معاف رکھیے گا کہ الفاظ یوں ہو گئے کہ اس کے اختیارات ہی سلب ہو گئے، اس کی آزادی ہی سلب ہو گئی، وہ ان چیزوں کا پابند ہو گیا اور ایسا پابند کہ وہ کبھی اس کی خلاف ورزی کرتا ہی نہیں ہے۔ یعنی ہم کہیں گے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرتا نہیں ہے جو اس نے کہا ہے۔ اب اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خارجی کائنات کے متعلق بھی تو اس نے یہ کہا کہ **لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ** [1] (16:49) پہلی چیز تو یہ محکومیت کی ہے، انہیں اس کا اختیار نہیں ہے کہ اس کی خلاف ورزی کر سکیں۔ پہلے حصے میں تو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، یہ خدا سے الگ ہو گئیں۔ اس نے ان کے اوپر پابندی عائد کی، کسی دوسرے نے عائد نہیں کی۔ جو دوسرا حصہ ہے کہ یہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے، اس خلاف ورزی نہ کرنے میں تو یہ دونوں برابر ہو گئے۔ تیسری چیز، اس کائنات میں انسان ہے۔

---

[1] کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

اقدار کے سلسلہ میں حضرتِ انسان کی عملی کیفیت

عزیزانِ من! تیسری چیز یہ ہے کہ اس کائنات میں انسان ہے۔ ایک خالق ہے' ایک خارجی کائنات کی اشیاء ہیں۔ ایک یہ حضرت صاحب ہے یعنی یہ انسان۔ انسان کو اس نے صاحب اختیار وارادہ بنایا ہے۔ جس طرح اس نے خارجی کائنات کے متعلق قوانین مقرر کیے' اس کے لیے بھی قانون مقرر کیے لیکن وہاں (خارجی کائنات میں) انہیں اجازت نہیں ہے کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکیں۔ یہاں خارجی کائنات اور خدا جو ہے جیسے اس نے کہا کہ ہم بھی خلاف ورزی نہیں کریں گے تو دونوں ایک ہو گئے۔ یہ جو اس نے اپنے اوپر پابندی عائد کی تھی اس کے متعلق تو کہا ہے کہ ہم اس کی خلاف ورزی کبھی نہیں کریں گے۔ انسانوں کے اوپر پابندی عائد نہیں کی' صرف یہ بتایا کہ یہ ہیں وہ قوانین' جو ہم نے تمہارے لیے وضع کیے ہیں یا اختیار کیے ہیں' یا دیئے ہیں۔ اس بتانے کے بعد کہا کہ **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40) تمہارا جو جی آئے' تم اس کے مطابق عمل کرو یعنی وہاں عالم امر میں تو مشیت ہماری تھی' **یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ** (3:40) وہاں ہماری مشیت تھی جیسا ہم جی چاہتے تھے کرتے تھے' یہاں **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40) اب تمہاری مشیت ہے' جیسے تم جی چاہو کرو' ہم دخل نہیں دیں گے۔ معاف رکھیے گا اس معنی میں انسان خدا سے ایک قدم آگے چلا گیا' اس کے اوپر خود کوئی پابندیاں عائد نہیں ہوئیں' پابندیوں کا بتا دینا یعنی قانون کی کتاب دے دینا' اور قانون کسی کے اوپر جبراً لگانا' دونوں میں بڑا فرق ہے۔ قانون کی کتاب دے دی اور اپنے متعلق اس نے کہا کہ ہم نے جو اپنے اوپر پابندی عائد کی ہے' اب ہماری آزادی (معاف رکھیے گا) سلب ہو گئی۔ ہم اس کے خلاف نہیں کرتے' اسے (انسان کو) کہا کہ تمہارا جو جی آئے کرو' ہم اس میں دخل ہی نہیں دیں گے۔ تو صاحب اختیار تو یہ ہوا' عزیزانِ من! مناظرے اور مباحثے کیا کرتے ہیں۔ کہیے اقوامِ عالم میں اہل مذاہب ہی کو نہیں' اہل دانش کو بھی کہیے' سائنٹسٹ کو بھی کہیے' مفکرین کو بھی کہیے' کہ خدا کا یہ تصور کہیں اور سے لا کے بتا دے۔ یہ ہے قرآن کی انفرادیت کہ **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40) تمہارا جو جی آئے' تم اس کے مطابق عمل کرو۔

انسانی اعمال کے نتائج کو بدلنا انسان کے اختیارات سے باہر ہے

لیکن آگے ایک بات کہی جہاں پھر انہیں جکڑ لیا۔ کہا یہ کہ تمہاری مشیت پہ منحصر ہے کہ یہ ہے مصری کی ڈلی' یہ ہے سنکھیے کی ڈلی' جو تمہارے جی میں آئے اُس کو اٹھا کے کھا لو' ہم دخل نہیں دیں گے' لیکن جب کھا چکو گے تو سنکھیے کی تاثیر کا بدل دینا تمہارے اختیار میں نہیں رہے گا۔ کیا الفاظ ہیں: **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40) جو تمہارا جی چاہے کرو **اِنَّہٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ** (41:40) لیکن ہم پھر دیکھتے ہیں کہ جو تم کرتے ہو' اس کا وہ نتیجہ نکلے گا' تم اسے نہیں بدل سکتے۔ اب انسان کا اختیار یہاں تک ہوا' یہ آگے نہیں ہوا کہ کھائے سنکھیا'

تاثیر مصری کی ہوئیہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک تو تم صاحب اختیار ہو کہ جی چاہے سنکھیا کھاؤ، جی چاہے مصری کھاؤ لیکن اگلی بات جو ہے، کیا بات ہے ان الفاظ کی! کہا کہ **اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ** (41:40) ساتھ موج ہوگئی راوی عیش لکھتا ہے۔ لکھتا ہے کہ **اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ** (41:40) پھر ہم کرتے کیا ہیں؟ ہمارا قانون کیا کرتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ جس راستے پہ تم چلتے ہو، وہاں ہم دخل نہیں دیتے کہ تم اِدھر مڑتے ہو یا اُدھر مڑتے ہو۔ جدھر جی چاہے مڑ جاؤ لیکن اس مڑنے کے بعد پھر ہمارا قانونِ مکافات تمہارے پیچھے لگ جاتا ہے، وہ نہیں چھوڑتا۔ جو راستہ تم نے اپنے لیے اختیار کیا ہے، وہ راستہ جس منزل کی طرف جاتا ہے، وہ ہم نے مقرر کی ہوئی ہے۔ اب یہ تمہارے اختیار کی بات نہیں ہے۔ راستہ تو تم نے اختیار کر لیا، یہ نہیں کہ چلو تم اس سمت کو، پہنچ جاؤ تم کہیں دوسری طرف، یہ بات نہیں ہے۔ آج کی اصطلاح میں ہم یہ کہیں گے کہ جی! یہ تو انسان کے بس میں ہے کہ وہ کیا Initiative لیتا ہے یعنی ابتدا یہ کرتا ہے جیسا بھی اپنے لیے کرے، ابتدا صرف یہ کرتا ہے اور جب ابتدا کر لیتا ہے تو پھر اس کے لیے جو تقدیر مقرر ہے، اس کے لیے جو منزل مقرر ہے، اس کا جو نتیجہ مقرر ہے، اس کی طرف سے اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

سنیے! خدا پھر اس باب میں کیا کہتا ہے۔ قوم بنی اسرائیل کا قصہ چلا آ رہا ہے۔ ان کو ہدایات دیں، ان کو ہم نے راہنمائی دی، ان کو قانون بتائے، رسول آئے، سب کچھ ہوا، وہ چلے ایک راستے پہ۔ اس راستے کی خوشگواریاں ان کے حصے میں آئیں، سعادات آئیں، برکات آئیں، ملک عظیم ملا، شوکت سلیمانی ملی، حشمت داؤدی ملی۔ یہ سارا کچھ بھی ہے۔ کہا کہ **فَلَمَّا زَاغُوْٓا** (61:5)۔ اب یہ ان کے اختیار کی بات ہے۔ جب وہ ٹیڑھے ہوگئے یعنی پہلے وہ ہوئے ہیں، جب وہ غلط راستے کی طرف چلے، ٹیڑھا اس کے معنی ہوتا ہے، سیدھے راستے کو چھوڑ کے جب خود وہ ٹیڑھے ہوگئے تو **زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ** (61:5) خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ یہ پیچھے پیچھے ہے۔ جب تم ٹیڑھے ہوگئے، کہنے کی بات ہے، تو ہم نے تمہارے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا اس لیے تم ٹیڑھے ہوگئے۔ ہمارے ہاں تقدیر کے یہ معنی ہیں کہ یہ سب خدا کرتا ہے صاحب! آپ نے دیکھا کہ تقدیر کے تصور یا معنی یا مفہوم بدلنے سے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ وہ کہتا ہے کہ جب یعنی یہ اختیار انسان کا ہے Initiative اس کی ہے **فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ** (61:5) جب تم نے کج روی اختیار کی، خدا کے قانون کے مطابق تمہارے قلوب ٹیڑھے ہوگئے۔ تم نے جب یہ کیا، تو اگر یہ نہ کرتے تو وہ یہ کرتا ہی نہیں لیکن جب تم نے یہ کیا تو پھر اس کے بدلنے کا اختیار تمہارے پاس نہیں ہے۔ یہ ہے وہ **اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ** (41:40)۔ یہ بڑے اہم مقامات ہیں۔

خدا تعالیٰ انسانی عمل کے ذریعے اپنی مدد کا متمنی ہے

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں یہ چیزیں آئی ہیں۔ میں نے تو یہاں چند ایک کا حوالہ دیا ہے۔ میری کتاب ''کتاب التقدیر'' ہے' اس میں آپ اس کے بہت سے حوالے دیکھیں گے' بہت سے حوالے ہیں حتیٰ کہ وہ جو کہا تھا کہ **حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ** (30:47) ہم نے جماعت مومنین کی نصرت' مدد دینے کا اپنے اوپر فرض عائد کر لیا ہے' تو پھر مومنین جو ہیں ان کو تو خوش ہو جانا چاہیے کہ بس مومن ہوئے اور خدا نے اپنے اوپر فرض عائد کر لیا ہے اور اس کی خلاف ورزی وہ کرتا نہیں ہے تو پھر راوی عیش لکھتا ہے کہ ملتا چلا جائے گا۔ کہنے لگا کہ نہیں' ذرا تھوڑی سی بات اس میں اور Add کر لو۔ جی' فرمایئے: **اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ** (47:7) اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ کیا بات ہے! وہی پھر Initiative۔ خدا کی مدد کے معنی یہی ہیں کہ دینِ خداوندی کو قائم کرنے کے لیے اگر تم کوشش کرو گے تو پھر ہم تمہاری مدد کریں گے۔ وہ بھی اپنے مقام پہ ٹھیک ہے کہ ہم نے اپنے اوپر فرض اور واجب قرار دے دیا ہے تمہاری مدد کرنا لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ پہلے تم ہماری مدد کے لیے اٹھو' تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ معنی کیا ہوئے؟ کہ جس قسم کے تم ہو جاؤ گے یا کرو گے' اسی قسم کا ہمارا قانون تم پر لاگو ہو جائے گا۔ سنکھیا کھاؤ گے تو قانونِ ہلاکت کے تابع آ جاؤ گے' پانی پیو گے تو وہ ممد حیات ہوتا ہے۔ اس لیے زندگی بخشنے والے قانون کے تابع آ جاؤ گے وہ قانون تم پہ لاگو ہو جائے گا۔ اب بات یوں ہوئی کہ جو طریق' روش' عمل تم اختیار کرو گے' اس کے مطابق تم پہ وہ قانون لاگو ہو جائے گا اور اس کے ذریعے سے جس مقام تک تم پہنچو گے وہ تمہاری تقدیر ہوگی۔ قرآن کہتا ہے کہ **فَهَدٰى** (87:3) راستہ اس نے بتایا ہوا ہے۔ سائن پوسٹ (نشانِ راہ) اس نے لگا دیئے ہوئے ہیں: یہ راستہ اِدھر جاتا ہے' یہ اُدھر جاتا ہے۔ جس منزل تک بھی ہم پہنچنا چاہیں وہ راستہ اختیار کر لیں۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ''تقدیر کے تو معنی یہ آخری منزل ہیں جہاں تک کسی شے نے پہنچنا ہے''۔ اس کا یہ انتخاب ہم کریں گے اس کے مطابق راستے پہ چلو یعنی راستے کا ہم انتخاب کریں گے۔ اس نے بتا دیا تھا کہ یہ راستہ اِدھر جاتا ہے' وہ اُدھر جاتا ہے جو راستہ ہم اختیار کریں گے اس کے مطابق پھر یہ الفاظ ہیں: اس کے مطابق ہم پہ قانون لاگو ہو جائے گا اور اس کے مطابق تمہاری آخری منزل یا تقدیر متعین ہوگی۔ وہاں تم پہنچ کے رہو گے۔ سنکھیا کھاؤ گے تو اس کی آخری منزل ہلاکت ہے' وہاں پہنچ کے رہو گے۔ مصری کھاؤ گے' خوشگواریاں حاصل ہو جائیں گی۔ یہ اقبالؒ (1938-1877) جسے قرآن نے بصیرت عطا کی تھی اور اسے کہنے کا بھی حسین طریق آ گیا تھا اس نے کیا خوب کہا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے ہاں تو پھر وہی فارسی آ جاتی ہے اردو کے لیے بھی ہمیں کہا جاتا ہے کہ صاحب! اس کا

بھی ترجمہ کیجیے۔ ''اوہدا اردو دا ترجمہ پنجابی اچ کروتے اے کیندے نے جی اک لفظ وی سمجھ نئیں اوندا۔'' [1] ہماری اگلی نسل' عزیزانِ من! گونگی ہوگئی ہے۔ اس کے پاس زبان ہی کوئی نہیں رہی' مجھے دکھ ہوتا ہے۔ کہنے کو تو یہ ہے کہ ہم نے مغرب کی بڑی تقلید کی ہے' ان کے ہاں تو انگریزی بھی نہیں رہی' اچھے سے اچھے پڑھے لکھے سے کہیے کہ چار فقرے لکھ کے بتائے! خیر فارسی میں ہی ہے لیکن پوچھو نہیں' اقبالؒ (1877-1938ء) کیا بات کہہ جاتا ہے!

لفظ تقدیر کی کیفیت اقبالؒ کی زبانی سنیے

حرفے باریکش بہ رمزے مضمر است

بات بڑی گہرائی کی ہے۔ تقدیر کے متعلق اشارے میں ہی کہی جا سکتی ہے' اور وہ یہ ہے کہ

تُو اگر دیگر شوی او دیگر است

تُو کچھ اور ہو جائے' وہ اور ہو جائے: تُو اگر دیگر شوی او دیگر است۔ یہ وہی ہے جسے انگریزی میں Initiative کہا گیا ہے۔ اگر تم یہ ہو جاؤ' تمہاری تقدیر وہ ہو جائے گی۔ اب وہ اشاروں میں یا مثالوں سے سمجھاتا ہے:

خاک شوٗ نذرِ ہوا سازد ترا

سنگ شو برشیشہ اندازد ترا

غبار بن جا' تمہیں ہوا اڑائے اڑائے پھرے گی' کوئی مقام ہی کہیں نہیں ہوگا' تمہارا ثبات ہی نہیں ہوگا' استحکام ہی نصیب نہیں ہوگا' تم اگر یہ ہو جاؤ گے۔ پتھر بن جاؤ۔ اسے ہر کچی چیز کے اوپر مارو گے تو وہ کچی چیز ٹوٹ جائے گی' تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ پتھر ہو جاؤ' ہم نہ تمہیں غبار بنائیں گے' ہم نہ تمہیں سنگ بنائیں گے۔ یہ کچھ ہو جانے کی صلاحیتیں (Potentialities) تمہارے اندر موجود ہیں۔ تم چاہو تو غبار بھی رہ سکتے ہو' تم چاہو تو پتھر بھی ہو سکتے ہو۔

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست

شبنم ہو جاؤ گے تو زمین پہ گرنا تمہاری تقدیر ہو جائے گی

قلزمی! پائندگی تقدیرِ تست

سمندر بن جاؤ گے تو ہمیشگی تمہاری تقدیر ہو جائے گی۔ کہا کہ

گرز یک تقدیر خوں گردد جگر

غلط روی سے ایک راستے پہ چلے' اور وہ جو ہلاکت کی تقدیر ہے وہ سامنے آ گئی تو یہ چیز تو واقعی بڑی سوزِ جگر کا موجب بن گئی: ہلاکت سامنے آ گئی۔

---

[1] اگر اس اردو کا ترجمہ پنجابی میں کریں تو کہتے ہیں کہ اس کا ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا۔

کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں ہے:

خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر ❶

اور دوسری تقدیر مانگتے ہو

تُو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست
زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست ❶

تُو اگر اس کے بعد کہے گا کہ نہیں، میں کوئی دوسری منزل چاہتا ہوں۔ دوسری منزل اختیار کرلو۔ جتنا جی چاہے منزلیں مانگتے چلے جاؤ، اختیار کرتے چلے جاؤ، لا انتہا ہیں۔ اس کے قوانین کو بدلتے جاؤ، تقدیر تمہاری جتنی بھی ہے وہ بدلتی جائے گی۔ کیا بات ہے!

تقدیر کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مثال

تقدیر کو سمجھنے والے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ (45/644-584ء) کو دیکھیے۔ وہ رضی اللہ عنہ اس لشکر کی خبر لینے کے لیے گئے جو باہر ایران کی سرحد پہ ایک مقام پہ چلا گیا تھا۔ وہاں گئے تو وہاں طاعون پھوٹ پڑی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ جلدی یہاں سے نکل چلو۔ اس مقام پہ چلے چلو، جہاں طاعون نہیں ہے۔ وہاں کسی نے ❷ پوچھا، ان کے ذہن میں تقدیر کا وہ پہلا مسئلہ تھا کہ تقدیریں لکھی ہوئی ہوتی ہیں، بدل نہیں سکتیں۔ اس نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہ خدا کی تقدیر سے بھاگ رہے ❸ ہیں؟ کیا بات ہے ان لوگوں کی! جواب ملاحظہ کیجیے: کہا کہ ہاں، خدا کی تقدیر سے، خدا ہی کی تقدیر کی طرف بھاگ رہا ہوں ❹۔ سنو! تقدیر یہ ہے کہ طاعون زدہ حصے میں جاؤ گے تو Infection (آلودگی) ہو جائے گی، طاعون ہو جائے گا، دوسری تقدیر یہ ہے کہ اگر اس جگہ چلے جاؤ جہاں یہ نہیں ہے تو اس Infection (آلودگی) سے تم محفوظ رہو گے۔ یہ بھی خدا ہی کی تقدیر ہے، وہ بھی خدا ہی کی تقدیر ہے، تو میں کوئی اپنی تقدیر تو نہیں بنا رہا، خدا کی ایک تقدیر سے خدا ہی کی دوسری تقدیر کی طرف بھاگ رہا ہوں۔ ان سے قرآن سمجھیے، عزیزانِ من!

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست
زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست ❶

---

❶ اقبالؒ (1938-1877ء) کے ان تمام اشعار اور تقدیر کے مفہوم کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: کتاب التقدیر، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور، 1986ء ص ص۔ 57 تا 60

❷ یہ اشارہ حضرت ابوعبیدہؓ کی طرف ہے۔

❸ افرار من قدر الله. کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟

❹ نعم. افر من قضاء الله الی قضاء الله. ہاں میں خدا کی (ایک) تقدیر سے بھاگ کر (دوسری) تقدیر کی طرف جانا چاہتا ہوں۔

اور اس قدر؛ اس نے انسان کو اس معاملے میں اختیار و ارادے والا بنایا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ دخل نہیں دیتا۔ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ** (13:11) جب تک کوئی قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتی' خدا بھی اس کی حالت کو نہیں بدلتا۔ بدل تو سکتا ہے' صاحبِ اختیار ہے' اس نے شروع میں **لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (25:2) کہا ہے مگر یہاں جو آغازِ کار ہے' جو Initiative ہے' وہ تو انسان کے پاس ہے۔ جبھی تو یہ چیز کہی' قوم ہو جب بھی یہ چیز کہی کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر داخلی تبدیلی نہیں کر لیتی خدا بھی اس کے حالات میں تغیر نہیں پیدا کرتا۔

بے عملی کی دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں

عزیزانِ من! دیکھ لیا آپ نے' پچیس تیس برس سے' حریم کعبہ کے اندر لاکھوں کی تعداد میں' جبل رحمت کے تابع' رو رو کر' گڑگڑا کر حاجی' جن کے متعلق کہا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتے ہیں' اس حالت میں مقدس سرزمین پہ' ایسے خشوع وخضوع سے دعائیں کر رہے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کی توپوں میں کیڑے پڑیں' اس کو تباہ کر دے برباد کر دے مگر وہ ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے' ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ کیوں نہیں آ رہی؟ اسے کہتے ہیں کہ تو کرتا جا: ''تہاڈے پیو دا نوکر لگا ہویا ہیگا اے''[1] یعنی آپ انسان کی کیفیت سن لیں۔ ''ذرا جنا پھوڑا نکلا اویا' یا اللہ! بڑی پیڑ ہوندی اے۔ تُو آرام دے دے۔ جو کم ہیگا جناب۔ یا اللہ! تُو کر دئے تے فیر او کر دیندا ہیگا اے؟''[2] لگے ہوئے ہیں پچیس تیس برس سے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں نہی ہوتا۔ انہوں نے خدا ہی کے اس اٹل فیصلے کو نظر انداز کیا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ** (13:11)۔ کہتے جاؤ' مانگتے جاؤ دعائیں' گڑگڑاتے جاؤ' روتے جاؤ' ہماری تو شرط یہ ہے کہ اپنے اندر داخلی تبدیلی پیدا کرو' خود قوم کے اندر تبدیلی پیدا کرو' تو پھر باہر بھی تبدیلی ہوگی' نہیں پیدا کرو گے تو مانگتے جاؤ دعائیں' دعا تو یہ ہے کہ ہم وہ نہیں کریں اور تُو وہ کر دے۔ آپ سوچتے ہیں کہ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ وہ بڑا ''ڈاڈا'' ہے۔ ڈاڈا کیا ہوتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ جو قانون کا خدا ہے' اسے ایسا ڈاڈا ہونا چاہیے۔ اگر وہ میرے گڑگڑانے پہ میرے حق میں فیصلہ کرنے لگ گیا' مقدمہ ہو دو کے درمیان' ہائی کورٹ میں گیا ہوا ہو' کل ہو وہ پیشی' ادھر مدعی ہے' وہ دعائیں کرتا ہے کہ یا اللہ! میرے حق میں کامیابی عطا کر دے۔ جناب! وہ وہاں مدعا علیہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یا اللہ! میرے حق میں کامیابی دے دے' میں مصیبت اچ پھنس گیا۔ اوا گاں ودھیا۔ اینے کہیا: جے مینوں کامیابی ہوگئی تے میں سو نفل پڑھانگا۔ او کیندا اے: میں دو سو نفل پڑھانگا۔ اے کیندا: میں تیرے نیاز دیاں گا' یارہ دیگاں دیاں گا۔ او کیندا:

---

[1] یہ تمہارے باپ کا نوکر لگا ہوا ہے۔

[2] ذرا سا پھوڑا نکلا (دعائیں مانگتے ہیں کہ) یا اللہ! بڑی تکلیف واذیت ہے تو آرام فرما دے۔ جو بھی کام ہوتا ہے (کہتے ہیں کہ) یا اللہ! تو آرام عطا فرما۔ تو کیا پھر وہ آرام عطا کر دیتا ہے؟

اے میں اٹھونجا دیگا دیاں گا۔اودواں نوں فیر کی وکھونداا ے؟‘‘ ❶

خدا اپنے اٹل قوانین کو کبھی نہیں بدلتا

میں تو جب ان الفاظ پہ غور کرتا ہوں‘ خاص طور پر جب اِنَّ پڑ‘ تو سمجھ جاتا ہوں کہ یہ یقینی بات ہے کہ یادرکھو! **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ** (13:11) خدا اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا **حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ** (13:11) تا آنکہ وہ اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرلے اور جب اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلے تو اس نے کہا ہے کہ ہم نے اپنے اوپر واجب قرار دیدیا ہے کہ تمہاری حالت میں تبدیلی پیدا کردیں یعنی یہ انسان خدا کو (معاف رکھیے گا الفاظ یہی ہیں) اس طرح مجبور کرسکتا ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق وہ کرے‘ قانون کا مالک ہے اس کا قانون ہے کہ آگ پانی کو کھولا دے گی‘ آگ جلائے‘ کیتلی اس کے اوپر رکھ کے آپ جو جی میں آئے‘ کام کرتے پھریں۔ مجبور ہو گیا ہے اس کا قانون کہ اس کے پانی کو کھولا کے اس کے لیے چائے پکائے۔ اور اگر یہ آگ نہ جلائے اور کیتلی رکھ دے تے نفل پڑھنے شروع کردئے تے فیر پی لوے گرم گرم؟ ❷ یہ تو ہوا کہ یہ نہ کرے۔

وجودِ کائنات کا یہ سارا سلسلہ تقدیر کے مستحکم ہونے پر ہی موقوف ہے

اگلی بات کی‘ عزیزانِ من! کہ یہ آگ بھی جلا دے اور کیتلی بھی رکھ دے‘ گھنٹا بھر تک اوپر رکھی بھی رہے اور پانی ویسے ٹھنڈے کا ٹھنڈا رہے تو نظامِ کائنات بگڑ جائے گا۔ کیا ہوا؟ جس نے یہ قانون بنایا تھا کہ آگ اس طرح پانی کو گرم کردے گی‘ اس نے دخل دیدیا‘ آگ کو کہہ دیا کہ پانی کو گرم نہ کرنا۔ اگر وہ یہ کرنا شروع کردے‘ تو کائنات تو چل ہی قانون پہ رہی ہے۔ یہاں کہا کہ **فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا** (25:2)۔ اور پھر ہم بدلتے نہیں۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچائے‘ پانی کی تقدیر یہ ہے کہ جب وہ 100 ڈگری سنٹی گریڈ پہ پہنچے‘ تو ابلنا شروع ہوجائے۔ چاول کی تقدیر یہ ہے کہ اس میں جب وہ ڈالا جائے تو وہ پکنا شروع ہوجائے۔ اسے ہم نہیں بدلتے لیکن نہ ہم بغیر آگ جلائے ہوئے تمہارا پانی اُبالتے ہیں‘ نہ اس میں چاول ڈالے ہوئے ’’تہاڈی کھیر پکاوندے ہیگے‘‘ ❸ نہ اس کے کھائے بغیر تمہاری بھوک مٹاتے ہیں لیکن جب تم کھا لیتے ہو تو پھر تم ہمارے قانون کو مجبور کردیتے ہو کہ تمہاری بھوک مٹا دے۔ اف! کیا کہوں‘

---

❶ میں مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ وہ آگے بڑھا کہنے لگا: اگر مجھے کامیابی ملی تو میں سو نفل ادا کروں گا۔ دوسرا کہنے لگا: میں دو سو نفل ادا کروں گا۔ یہ کہنے لگا: میں تیرے ہاں نیاز دوں گا‘ گیارہ دیگیں دونگا۔ دوسرا کہتا ہے: میں اٹھاون دیگیں دوں گا۔ (بھلا بتاؤ کہ) وہ ان دونوں کو کیا دکھائے گا؟

❷ پھر نفل ادا کرنے شروع کردے‘ اسے کبھی بھی گرم گرم چائے نہیں ملے گی۔

❸ آپ کی کھیر پکاتے ہیں۔

عزیزانِ من! وقت ہی ختم ہو جاتا ہے! لہٰذا تقدیر کا مسئلہ آپ نے دیکھا کس طرح سے حل ہو جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے:

تُو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

یہ ہے عزیزانِ من! جو جیسا جی چاہے اس پہ لکھ لیجئے یہ جبیں خامۂ حق نے خالی رکھی ہے۔ یہ ہے انسان کا مقام اس دنیا میں! یہ ہے خدا کا تصور جو قرآن نے دیا ہے اور یہ ہے قانون اور اس کے نتیجے کا باہمی تعلق یہ ہے انسان کی Initiative اور خدا کا Follow-up کرنا یہ ہے جہاں انسان صاحب اختیار ہے یہ ہے مقام جہاں اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے وہ ہے مقام جہاں پہ اپنے اختیار پہ خود پابندیاں عائد کر دیتا ہے۔ ان چیزوں کو قرآن سے سمجھ لیجئے عزیزانِ من! کون سی چیز باقی رہ جاتی ہے سمجھنے کے لیے صاحب!

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

یہی ہے نکتۂ توحید قانون کی وحدانیت یہ ہے خدا کی توحید اور اسی لیے وہ کہتا ہے کہ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

بت خانوں کو دماغ میں لیے ہوئے یہ چاہتے ہیں کہ اسی گھر کے اندر پھر خدا بھی آ جائے۔ وہ بڑا غیور ہے۔ نیا کرایہ دار اس وقت تک اندر نہیں جاتا جب تک وہ مالک سے یہ نہیں کہتا کہ "پہلاں اوناں نوں کڈ فیر میں جاواں گا اندر۔" [1] ایسا نہیں ہے کہ وہ ہزار بتوں کے باوجود آ جائے گا کہ "کوئی گل نئیں باہر مینہ پیندا ہیگا اسیں وی ایویں گزارا کرلاں گے۔" [2] نہیں عزیزانِ من! وہ یہ نہیں کرتا۔ یہ مقام لا ہے۔ اس کا قانون اٹل ہے وہ اسے نہیں بدلتا وہ جو اتنا صاحب اختیار و ارادہ ہے جس نے اپنے اوپر پابندی عائد کی ہوتی ہے وہ اپنے قانون کے متعلق کہتا ہے کہ ہم اسے نہیں بدلیں گے۔ وہ ہمارے لیے قانون بنائے ہوئے ہے۔ کیا وہ ان کو بدلتا چلا جائے گا؟" نہیں صاحب! قطعاً نہیں۔

اب وقت ہو گیا اور اسے دہرا دوں کہ **الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** [3] (25:2)۔ اب آپ اس آیت پر غور کیجیے اور آگے کہا کہ **لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا** [4] (25:2) اور **وَ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ** (25:2) نہ ہی اس کے اقتدار میں کوئی اور قوت

---

[1] پہلے انہیں باہر نکالو پھر میں اندر جاؤں گا۔

[2] کوئی بات نہیں باہر بارش ہو رہی ہے ہم بھی یونہی گزارہ کر لیں گے۔

[3] یہ کتاب اس خدا کی طرف سے آئی ہے جس کے حیطہ اقتدار سے کائنات کی کوئی شے باہر نہیں۔ کائنات میں ہر جگہ اسی کا قانون کارفرما ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔815)۔

[4] اُسے نہ تو اپنی امداد کے لیے اولاد کی ضرورت ہے۔

شریک ہے **خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ** (25:2) اس نے ہر شے کو پیدا کیا' اور وہ خدا اتنی بڑی لامتناہی حاکمیت کا مالک ہے کہ **فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِیۡرًا** (25:2) اور پھر اس پیدا کی گئی ہر شے کے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے وہیں مقرر کر دیئے۔ اسی لیے کہا کہ **لَهٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** [1] (25:2) اور اس کے بعد کہا کہ **فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِیۡرًا** (25:2)۔ اور پھر اس کے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے مقرر کر دیئے۔ انہی پیمانوں کو ان اشیا کی تقدیر کہا جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ کا اس قسم کا تصور قرآنِ حکیم کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا

یہ ہے' عزیزانِ من! قرآن کا تصور۔ یہ ہے وہ بات جو سمجھانے کی ہے' دیگر اہل مذاہب ہی کو نہیں' اہلِ علم و دانش کو بھی' کہ لاؤ کہیں سے خدا کا یہ تصور۔ تمہارے ہاں جو علم و دانش ہے وہ یہ نہیں بتا سکتا۔ یہ تصور صرف وحی دے سکتی تھی' یہ صرف خدا اپنے متعلق بتا سکتا تھا۔ اس کے معنی خدا کی معرفت یعنی خدا کیسا ہے نہیں ہیں۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ اس کی ذات کو کوئی پہچان ہی نہیں سکتا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اپنا تعارف اس نے خود اپنی ان صفات سے' جو قرآن کے اندر ہیں' کرا دیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

عزیزانِ من! جسے یہ معرفت لیے پھرتے ہیں' وہ تصور نہیں ہے۔ خدا نے تو اپنا تعارف آپ کرا دیا ہے اور وہ تعارف خود بخود اس نے آپ کرایا ہے۔ یہ صرف وحی ہے' اس کے بغیر تو ذریعہ علم ہی کوئی نہیں ہے۔ وحی کی ضرورت اس لیے تھی کہ خدا کا اس قسم کا تصور کوئی فکر انسانی دے ہی نہیں سکتی تھی۔

عزیزانِ من! اس آج کے درس میں سورۃ الفرقان کی یہ ایک ہی دوسری آیت' ہم نے لی' آئندہ تیسری آیت سے ہم آگے چلیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

---

[1] یہ کتاب اس خدا کی طرف سے آئی ہے جس کے حیطۂ اقتدار سے کائنات کی کوئی شے باہر نہیں۔ کائنات میں ہر جگہ اسی کا قانون کارفرما ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔815)۔

تیسرا باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 3 تا 10)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا
وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿٣﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ
اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ﴿٤﴾ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ
الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٥﴾ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٦﴾ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ
الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ﴿٧﴾ اَوْ يُلْقٰٓى
اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا
مَّسْحُوْرًا ﴿٨﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
سَبِيْلًا ﴿٩﴾ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَاۗءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿١٠﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1977ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی تیسری آیت سے ہو رہا ہے:

(25:3)

قوانین خداوندی کی نتیجہ خیزی کا دوسرا نام ہی اقتدارِ خداوندی ہے

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ **الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (25:2) اس ساری کائنات میں اقتدار صرف خدا کے قوانین کو حاصل ہے، اس طرح پوری کائنات میں اسی کا اقتدار ہے۔ **وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ** (25:2) اور وہ اپنے اس اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہ قوانین، خدا ہی کے تجویز فرمودہ ہیں، اسی کا ان پر کنٹرول ہے۔ کنٹرول کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنا صحیح صحیح

عزیزانِ من! آج دسمبر 1977ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی تیسری آیت سے ہو رہا ہے: (25:3)

قوانین خداوندی کی نتیجہ خیزی کا دوسرا نام ہی اقتدارِ خداوندی ہے

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ **الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (25:2) اس ساری کائنات میں اقتدار صرف خدا کے قوانین کو حاصل ہے' اس طرح پوری کائنات میں اسی کا اقتدار ہے۔ **وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ** (25:2) اور وہ اپنے اس اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہ قوانین' خدا ہی کے تجویز فرمودہ ہیں' اسی کا ان پر کنٹرول ہے۔ کنٹرول کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنا صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر کے رہیں اور اس میں کسی دوسرے کا کوئی قانون شامل نہیں ہے۔ اسی کو اقتدارِ مطلق کہتے ہیں۔ آج کل کی سیاسی اصطلاح میں' اسے Sovereignty کہتے ہیں۔ اقتدارِ کامل و مطلق خدا کا ہے اور اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ خدا کی تو یہ شان ہے اور اسی لیے اگلی ہی آیت میں کہا کہ ان لوگوں کی جہالت دیکھو کہ **وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِہَۃً** (25:3) یہ لوگ خدا کے علاوہ اوروں کو بھی اپنا الٰہ بنا لیتے ہیں جو اس پر قطعاً قادر نہیں کہ کسی شے کو پیدا کر سکیں۔ وہ تو خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

مذہب میں پرستش ہوتی ہے جبکہ دین میں اطاعت

مذہب کی دنیا میں تو الٰہ سے مراد صرف معبود ہے۔ یعنی وہ جس کی پرستش کی جائے' اسے الٰہ کہا جاتا ہے۔ دین میں پرستش کا تصور نہیں ہے' اطاعت یا محکومیت کا تصور ہے۔ اس میں جس کی محکومیت اختیار کی جائے وہ الٰہ ہوتا ہے۔ اب اس سے آپ سمجھ لیجیے کہ جب کہا گیا کہ **لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ** [1] (47:19) تو یہ کتنی بڑی عظیم انقلاب آفریں حقیقت کا اعلان ہے کہ ''کوئی شخصیت' کوئی ہستی' کوئی نظام' کوئی ادارہ' ایسا نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے' صرف خدا کے قوانین کی محکومیت اختیار کی جائے۔'' یہ بہت بڑا انقلابی نعرہ ہے لیکن جب دین مذہب سے بدل گیا تو بڑی آسانیاں پیدا کر لیں۔ الٰہ کا ترجمہ کیا معبود۔ معبود کے معنی ہوئے جس کی پرستش کی جائے اور یہ کر دیا کہ صاحب! خدا کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں ہے۔ یہ کام بڑا آسان ہو گیا۔ اطاعت اور محکومیت جس کی جی چاہے کرتے رہے۔ یہ تو دنیا داری کے معاملے ہوئے۔ خدا کے ساتھ یہ تعلق کہ اسی کی پرستش کی جائے گی' ہم اس کی پرستش میں کسی اور کو شریک نہیں کریں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس ذرا سے تصور کے فرق سے کس قدر بنیادیں تک بدل گئیں۔ دین کا تصور ہوتا تو کیا یہ جماعتِ مومنین' یہ جماعتِ مسلمین' یہ امتِ مسلمہ' انہیں کچھ بھی کہہ لیجیے' اس دنیا میں کسی کی بھی محکوم رہ سکتی تھی؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ غیر تو ایک طرف رہے' جنہیں آپ اپنے کہتے

---

[1] کائنات میں خدا کے سوا کسی کا غلبہ و اقتدار نہیں۔

ہیں' اِن اپنوں کی محکومیت بھی تو شرک ہوتا ہے۔اس میں کسی انسان کی محکومیت جائز ہی نہیں تھی' محکومیت صرف خدا کے قوانین کی تھی۔ جسے آپ بڑی سے بڑی حکومت' مملکت' سلطنت یا اختیار کہتے ہیں' ان کا فریضہ اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ خدا کے قوانین کو نافذ کریں' خود بھی ان کی اطاعت کریں دوسروں سے بھی ان کی اطاعت کرائیں لیکن جب یہ دین مذہب میں بدل گیا تو خدا کی پرستش کی گئی' مسجدوں میں آ گئے نماز پڑھ لی' خدا کی پرستش ہوگئی اور ساری زندگی کے تمام کاروبار میں وہ ساری اطاعت ومحکومیت انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی کرتے رہیں۔ جھگڑا اسی میں ہی رہا کہ صاحب! ملوکیت ٹھیک ہے یا جمہوریت ٹھیک ہے یا ڈکٹیٹر شپ ٹھیک ہے۔یعنی وہ جو انسانوں کی محکومیت کا طرز واسلوب وطریق ہے' اسی پہ بحث ہوئی۔سب سے بڑے اسلام پسند وہ ہوئے' جنھوں نے کہا کہ صاحب! آمریت نہیں' جمہوریت چاہیے۔یعنی ایک شخص کے بنائے ہوئے قوانین کی محکومیت نہیں' انسانوں کی ایک پوری بھیڑ ہے' وہ اگر قوانین بنا لے' تو پھر ان کی محکومیت جائز اور اسلام کے مطابق ہو جائے گی۔یعنی خدا کا جو ایک شریک بنانا ہے' وہ تو شرک ہے اور تین سو کے قریب ''مغز دو صد خر'' اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں' انہیں معبود بنا لینا عین مطابق اسلام۔آپ دیکھتے ہیں یہ کیا ہے۔

یاد رکھیے! جنہیں آپ Basic concepts (بنیادی تصورات) کہتے ہیں جب تک یہ درست نہیں ہوتے' اس وقت تک ہم کبھی اسلام کے پابند ہو ہی نہیں سکتے۔الٰہ کے تصور میں پہلی چیز یہ کلمہ ہے۔اسے پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں۔ لا الٰــہ کا یہ تصور یہی قرآن کا تصور ہے' اسے لے آیئے تو سوال ہی نہیں ہے کہ کوئی مسلمان' کوئی مومن' کوئی مسلم انسانوں کے کسی بھی اندازِ حکومت یا قانون کی اتباع اختیار کر لے۔اس کے برعکس الٰــہ کے معنی معبود بنا دیجیے' بس پرستش ہوگئی' پھر آگے بڑھے' تو معبود کے لیے فرق ہی نہیں کیا ہے: رام بھی وہی' رحیم بھی وہی۔ اُس نے اپنے طریق پہ کر لی' آپ نے اپنے طریق پہ کر لی۔ٹھیک بات تو یہ ہے کہ صحیح جواب صرف ایک ہوتا ہے اور غلط جواب سینکڑوں ہوتے ہیں۔معبود تو سینکڑوں اور ہزاروں بن سکتے ہیں الٰہ تو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔

لا الٰہ کے بعد الا اللہ کا اقرار لازم ہے

لا الٰــــہ بڑی عظیم الشان انقلابی چیز ہے۔اس نے دنیا میں' ہر اس شخص کا' ہر اس اتھارٹی کا' جو یہ چاہے کہ ہم اپنے جیسے انسانوں پہ حکومت کریں' پہلے ہی گلا کاٹ کر رکھ دیا ہے' عزیزانِ من! طرزِ حکومت کوئی بھی کیوں نہ ہو' لا الٰہ ہو تو یہ تو انارکی (Anarchy) ہو گی۔ اگر لا الٰہ ہو گا تو ہم کسی کی محکومت اختیار نہیں کریں گے' فوضویت ہوگئی' انارکی ہوگئی' تمدنی زندگی بسر کیسے کی جائے۔محکومیت تو اختیار کرنا ہوگی اس کے لیے ضرورت ہے الا الــلٰہ کی۔آپ نے دیکھا کہ ان چار الفاظ کے جوڑنے سے بات کہاں جا پہنچی ہے جس کو ہم لا الٰہ کہتے ہیں اس میں الٰہ کا مفہوم عملی معنی رکھتا ہے اسی لیے اس [1] کہنے والے نے کہا تھا کہ

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

چوں می گویم مسلمانم بلرزم

جب میں کہتا ہوں کہ ''میں مسلم ہوں' مسلمان ہوں'' تو کانپ اٹھتا ہوں۔ کیوں کانپ اٹھتا ہوں؟ اس لیے

کہ دانم مشکلاتِ لا الہ را

میں لا الہ کہنے کی مشکلات سے واقف ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی شان تو یہ ہے لیکن ان لوگوں کی جہالت دیکھو کہ یہ **وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖۤ اٰلِہَۃً** (25:3) ان ہستیوں کو صاحب اقتدار تسلیم کر لیتے ہیں' اپنا الٰہ بنا لیتے ہیں۔ دیکھیے' خدا کی الوہیت' اس کی حاکمیت' ساری کائنات کو محیط ہے اور یہ ہیں کہ یہ اس کے علاوہ دوسروں کو اپنا الٰہ بناتے ہیں۔ اب قرآن بیچارگی اور بے بسی کا بڑا محسوس سا ثبوت یا دلیل سامنے لایا۔ وہ دلیل وثبوت تخلیق اشیاء کا ہے۔

انسانی صلاحیتوں کی کم مائیگی اور بے بسی کی کیفیت

فرمایا کہ **لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّ ھُمْ یُخْلَقُوْنَ** (25:3)۔ پہلی چیز یہ ہے کہ یہ کسی کو بھی معبود بنائیں' کسی انسان کو معبود بنائیں' انسان کے علاوہ کسی اور کو بنائیں' پتھر کی مورتی کو بنائیں' کسی قبر کو بنائیں' وہ اشیاء تو اس پر قادر ہی نہیں ہیں کہ کسی شے کو پیدا کر سکیں' وہ تو ویسے ہی انسانوں کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں۔ خود انسان سے بھی یہ کہا کہ یہ پیدا شدہ ہیں' یہ پیدا کرنے والے نہیں ہیں' انسانی بے بسی کی سب سے بڑی مثال خود انسان کی پیدائش ہے' اس پہ اس کو کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ کیا کہیں انسانی بچے سے وہاں پوچھا جاتا ہے کہ کہیے صاحب! آپ کو دنیا میں بھیجیں یا آپ یہیں رہنا چاہتے ہیں' جانا چاہتے ہیں تو کس کے گھر بھیجیں' کس جگہ بھیجیں' کس قسم کا بنائیں آپ کو؟ اس سے کوئی نہیں پوچھتا۔ وہ بڑے سے بڑا بھی الٰہ ہو جس انسان کو آپ تجویز کر لیں گے' وہ حکومت کی دنیا ہو یا یہ طریقت کی دنیا کہ جسے آپ روحانیت کی دنیا کہتے ہیں' وہ حضرت صاحب ہوں یا My Lord, His Excellency ہوں۔ کوئی اس سے نہیں پوچھتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن جو دلیل پیش کرتا ہے وہ تیرہ چودہ سو سال پہلے کے ایک بدو کی سمجھ میں بھی آتی ہے اور آج کا فلاسفر بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ کسی انسان کو بھی آپ حاکم تسلیم کیجیے' پہلی بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ تو اپنی پیدائش میں بھی صاحب اختیار نہیں ہے۔ دوسروں کا حاکم بننا تو ایک طرف رہا' وہ تو کسی کو پیدا ہی نہیں کر سکتا۔ یہ ہے اس کے اختیار کا عالم' یہ ہے اس کی بے اختیاری کی کیفیت' اور اس حالت میں بھی تم اسے خدا بنا رہے ہو؟ اسے صاحب اقتدار مان رہے ہو؟

سود و زیاں کا لالچ یا نقصان

عزیزانِ من! بات یہ ہو رہی تھی کہ یہ ان ہستیوں کو اپنا الٰہ بنا لیتے ہیں یعنی ان کی محکومیت اختیار کر لیتے ہیں جو اس پر قطعاً قادر نہیں

کہ کسی شے کو پیدا کر سکیں۔ وہ تو خود خدا کی پیدا کردہ ہیں۔ ان کی بے بضاعتی کا یہ عالم ہے کہ **وَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا** (25:3) وہ اوروں کے لیے تو ایک طرف، خود اپنی ذات کے لیے بھی، قانونِ خداوندی کے خلاف، کسی نفع یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتے۔ آپ قوانین خداوندی کے خلاف، ان میں سے کسی کو لے لیجیے۔ انسان کے لیے دو ہی چیزیں ہیں یعنی جب وہ دوسروں کی محکومیت، تابعداری، اطاعت اختیار کرتا ہے تو دو چیزیں ہوتی ہیں: یا تو دفع مضرت، یا جلبِ منفعت۔ یعنی یہ ڈر کہ مجھے یہ نقصان پہنچائے گا یا کچھ اس سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں کہ مجھے یہ مفاد حاصل ہوں گے۔ دوسروں سے نقصان یا تکلیف کا ڈر، اور ان سے کچھ امیدیں وابستہ۔ ڈر ہو یا امیدیں وابستہ کریں، یہ احتیاج کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ ہمیں کچھ احتیاج ہوتی ہے، اسی وجہ سے ہم یہ کرتے ہیں۔ جس کو کوئی احتیاج نہ ہو، وہ ان چیزوں سے مستغنی ہو تو وہ تو کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتا۔ یہی چیز ہے جو اس [1] نے کہا ہے کہ:

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس

ایسا نظام کہ کوئی شخص کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ ہو

نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

(پس چہ باید کرد و مسافر)

"دین دا تت کڈیا ہویا اے جے۔" [2]

دین خداوندی یا قانونِ خداوندی کا ماحصل طبقات کی نفی ہے

بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ ہو۔ محتاج نہ ہو تو نہ اس کا اس کو ڈر ہوگا، نہ اس سے کوئی امیدیں وابستہ کرے گا: "اوئے اسی کسے گھر کھان جانے آں۔ سانوں کی لوڑ ہیگی اے، اے گل کرن دی! اسی کسے دے گھر کھان جانے آں۔" [3]

دیکھا، احتیاج ہے جو یہ سب کچھ کراتی ہے:

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس نظام میں نہ کوئی سائل ہوگا، نہ محروم ہوگا، نہ کوئی آقا ہوگا، نہ اس کا کوئی غلام ہوگا، نہ حاکم ہوگا، نہ کوئی معبود ہوگا۔ **وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا**

---

1. یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔
2. جناب! یہ دین کا ملخص دیا گیا ہے۔
3. ابے کیا ہم کسی کے گھر سے کھاتے ہیں! ہمیں یہ بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کسی کے گھر کھانے کو جاتے ہیں!

بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) ہر انسان' انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہوگا۔ بڑے سے بڑا بھی' اس کے قوانین کا محکوم ہوگا۔ چھوٹے سے چھوٹا بھی ہوگا۔ اس طرح یہ چھوٹے اور بڑے کی تمیز ہی اٹھ گئی۔ نہ محتاجی ہوئی' نہ محکومیت ہوئی۔ یہاں طبقات یوں مٹتے ہیں۔

مادّیت کی دنیا میں انسان کی بے بسی کی محسوس مثال

کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے۔ کسی انسان کو لے لیجیے۔ وہ جو خدا کے قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے' اگر اس کا سورج طلوع نہ ہو تو ان میں سے جو بڑے سے بڑا خدا بنا ہوا ہے وہ بھی اندھا ہو جاتا ہے' اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر آج وہ اس ہوا کو روک لے تو ایک متنفس باقی نہیں رہ سکتا' خواہ وہ بڑے سے بڑے حضرت صاحب ہوں' یا بڑے سے بڑا فرعون ہو' دم گھٹ کے مرجائے گا۔ کہا: یہ تو اس کے قوانین کی کارفرمائی ہے جو یہ خود بھی زندہ ہیں' خود بھی چلتے پھرتے ہیں' اس کے قوانین کو چھوڑ کے دوسروں کے لیے تو ایک طرف' وہ خود اپنے لیے بھی **لَایَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا** (25:3) قوانین خداوندی کے خلاف کسی نفع یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتے۔ دوسرے تو ایک طرف رہے' خود اپنے آپ کے متعلق بھی ان کی کیفیت یہ ہے: ہوا روک دی جائے' سانس بند ہو جاتا ہے۔ کہیے تو ان میں سے بڑے سے بڑا جو خدائی کا دعویدار ہے' اس ہوا کے بغیر سانس لے کر بتائے۔ ویسے کتنی بظاہر پیش پا افتادہ سی مثالیں ہیں لیکن وہ ہیں جو قیامت تک کے لیے صداقت پر مبنی ہیں' کبھی جھوٹی نہیں ہو سکتیں۔ قرآن کے حقائق یا اس کی Values (اقدار) تو ایک طرف رہیں' اس نے تو سمجھانے کے لیے جو مثالیں دی ہیں' وہ بھی ابدیت در کنار ہیں۔ کہا کہ بتایئے' ان سے کہیے تو سہی' یہ اللہ بننے والے دو ہی گوشے ہیں یا حکومت کے گوشے میں فرعون بنے گا' یا لوگوں کے عقل و فکر کو ماؤف کر کے' روحانیت کے گوشے میں' حضرت جی بنے گا۔ ذرا اس کو کہیے کہ وہ ہوا کے بغیر سانس لے کر دکھائے۔

مردہ بدست زندہ کی کیفیت

ان کی یہ کیفیت ہے کہ **وَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّ لَا حَیٰوۃً وَّ لَا نُشُوۡرًا** (25:3) نہ ہی انہیں موت اور زندگی پر کنٹرول ہے اور نہ ہی مر کر جی اٹھنے پر۔ ان سے کہیے جو بڑے سے بڑا ہے کہ موت سے بچ کے دکھائے' اسے زندگی و موت پہ اختیار نہیں ہے۔ اگر ہوا روک لی جائے تو تڑپ تڑپ کے مرجائیں۔ یہاں کی زندگی اور موت پہ اختیار ہی نہیں ہے۔ کہا کہ مرنے کے بعد جی اٹھنے کا کیا اختیار ہوگا۔ کہنے لگا کہ یہ سوچتے ہی نہیں۔ جن کی بے بسی کا یہ عالم ہے انہیں اپنا معبود اور حاجت روا بنائے ہوئے ہیں۔ اور کتنی بڑی حماقت ہے جبکہ بڑی بدیہی بات ہے' انسانوں میں سے کون ہے کہ جس کو یہ اختیار حاصل ہے لیکن ہم ہیں کہ یہ کہتے ہیں کہ وہ انسان تو ایک طرف رہے جو انسان ہمارے سامنے مر گیا' وہ مردہ بدست زندہ ہے۔ حضرت صاحب بھی جب وفات پا جاتے ہیں تو وہ جو زندہ ہوتے ہیں' وہ ان کے

ہاتھ میں ہوتے ہیں۔اس سردی کے موسم [1] میں صبح صبح اٹھ کے حضرت نوں جوٹھنڈے پانی نال نہلو ادیں پتہ لگ جائے۔'' [2] جہاں ان کا جی چاہے ان کو دفنا دیں' جس کپڑے میں جی چاہے کفنا دیں' یہ بے بس ہیں لیکن جونہی ان کو آپ نے چار سو من مٹی کے نیچے دبایا' اور دبایا ہی نہیں' اس پہ بڑی بڑی سلیں رکھیں' دفنایا' اب آپ کی حاجت روائی یہ حضرت صاحب کریں گے۔

انسانیت کے بلند مقام سے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں کی جانب سفر

آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ انسانوں کے متعلق کہہ رہا تھا کہ ان کو تو موت وحیات پہ بھی کسی قسم کا اختیار نہیں اور ہم انہیں صاحب اختیار مان رہے ہیں کہ جو ابھی ابھی ہمارے ہاتھوں میں بے اختیار تھا۔اس مٹی کے نیچے دبنے میں بڑی تاثیر ہے۔اندازہ لگایئے کہ انسان جب جھکنے پہ آتا ہے تو پھر کہاں پہنچتا ہے۔قرآن تو کہتا ہے کہ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ** (95:4) انسان کو تو ہم نے حسین ترین' مکمل ترین' تقویم اور پیکر کے اندر پیدا کیا۔اس کی یہ کیفیت ہے کہ **ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ** (95:5) پھر جب پستیوں کی طرف جاتا ہے تو انتہا ہی نہیں کہ کہاں چلا جاتا ہے۔**اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ** [3] (95:5) پستیوں کی طرف جانے والوں میں' سب سے زیادہ پستی کی طرف جانے والا اور یہ کیفیت ہے۔میں نے کہا کہ چلو جی' جیتے جی تو پھر اس کا ڈر سہی جنہیں اپنے ہاتھوں سے ہم نے مٹی کے نیچے دبایا ہے' اس کے بعد ساری مرادیں لے کے ان کے پاس پہنچ رہے ہیں۔قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ صاحب! ان سے پوچھیے' انہیں خود اپنے متعلق کوئی احساس نہیں ہے۔جو مٹی کے نیچے مردہ دفن ہو گیا ہے' یہ اس کے پاس جا کے اپنی سناتے ہیں' اس سے کہتے ہیں: ہماری حاجت پوری کر۔اپنے متعلق اس کو یہ اتنی قوت حاصل نہیں۔قوت حاصل ہو تو اس سے کہیے کہ ذرا اس مٹی کو توڑ کے کھڑا ہو جائے۔او تمہارے جو مصیبتوں کے پہاڑ ٹالتا ہے' یہ اپنے اوپر سے یہ چند من مٹی کو نہیں الگ کر سکتا۔

وحی خداوندی کے سلسلہ میں دنیا بھر کے انسانوں کو ایک کھلا چیلنج

عزیزانِ من! افراد ہوں یا اقوام' سب کی زندگی قائم بھی خدا کے قانون کے مطابق رہتی ہے اور آگے بھی اُسی کے قانون کے مطابق بڑھتی ہے۔اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔اس لیے کہا کہ **وَ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْکُ اِفْتَرٰهُ وَ**

---

[1] یہ بات دسمبر 1977ء کی 30 تاریخ کو کہی گئی تھی۔اس دور میں پاکستان میں یہ سردی کی شدت کا مہینہ ہوتا تھا۔

[2] اگر علی الصبح حضرت صاحب کو ٹھنڈے پانی سے نہلا دیں تو انہیں پتہ چل جائے۔

[3] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور 2006ء' ص ص۔484 تا 498

اَعَانَهٗ عَلَیۡهِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ ۚ فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّ زُوۡرًا (25:4) ❶۔اندازہ لگائیے' ہم یہ کچھ تعلیم دیتے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ خدا کی وحی والی بات یونہی یہ کہہ دیتا ہے (معاذ اللہ) خود ہی گھڑ لیتا ہے' افترا کر لیتا ہے' اپنے جی سے کہہ دیتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔خود یہ گھڑتا ہے اور کچھ لوگ اور ہیں جو اس کی مدد بھی کرتے ہیں۔یہ مل بیٹھ کے جو کمیٹی بنا لیتے ہیں' ان میں یہ چیزیں گھڑ لیتا ہے' یہ وحی بنا کے پیش کر دیتا ہے۔**فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّ زُوۡرًا** (25:4) کس قدر ظلم و زیادتی کی بات کرتے ہیں' کس قدر راہِ راست سے ہٹی ہوئی بات کرتے ہیں! ابھی ابھی وہ بتائے گا جو یہ کہتے ہیں کہ خود بنا لیتا ہے اور ساتھ کوئی جماعت ہے۔انہیں چیلنج دیا گیا کہ اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ انسانوں کا بنایا ہوا ہے' تو تم اور اپنے ساتھ ساری دنیا کے دانشوروں کو اکٹھا کر لو اور اس قرآن کی دس آیتوں کی مثل تم بنا کے بتاؤ' پورا قرآن تو ایک طرف رہا' تم ایک آیت بنا کے بتاؤ۔تیئیس (۲۳) سال تک سارے عرب کو چیلنج دیا گیا۔وہ عرب جو زبان کے مسئلے میں اس قدر اپنے آپ کو بلندیوں پہ سمجھتے تھے کہ اپنے آپ کو تو یہ عرب فصیح اللسان کہتے تھے اور ساری دنیا کو عجم' گونگے کہتے تھے' انہیں چیلنج دیا گیا کہ بھائی! نہ لڑائی کرنے کی ضرورت' نہ میدانِ جنگ میں آنے کی ضرورت' نہ اس قسم کے بہتانات تراشنے کی ضرورت' تم کہتے ہو کہ یہ انسان کا ہے' اس نے آپ بنا لیا ہے' اس کے ساتھ کچھ آدمی ہیں' بہت اچھی بات۔یہ تو اُمی ہے۔اس سے پیشتر تو یہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔تم تو بڑے بڑے نامور شعراء ہو' دنیا بھر میں تمہاری زبان دانی کی دھوم مچی ہوئی ہے' تم آؤ اپنے ساتھ کچھ اوروں کو بھی بلا لو' دعوت دے دو' جتنے بھی اپنے حمایتی بلانا چاہتے ہو بلا لو' مگر **مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ** (2:23) بیچ میں خدا کو شامل نہ کرنا۔اور سارا قرآن نہیں' جسے کہتے ہو کہ یہ افترا ہے' اور کذب ہے' اس کی دس آیتیں بنا کے دکھا دو۔کسی نے اس چیلنج کا جواب نہیں دیا' اسے Accept (قبول) نہیں کیا اور وہ ہی دور نہیں' عزیزانِ من! چودہ سو سال ہو گئے' اسلام کی مخالفت کی یہ کیفیت ہے کہ تین سو سال تک یہ Crusades صلیبی لڑائیاں' تمام عیسائی مملکتیں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتی رہیں' ان میں عربی کے بڑے بڑے فاضل بھی ہوئے' قرآن کے اس چیلنج کو آج تک کسی نے Accept (قبول) نہیں کیا۔یہ لوگ عربی ادب (Arabic Literature) کے بڑے بڑے فاضل تھے۔

---

❶ جو لوگ قرآن کی صداقت سے انکار کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ (وحی وغیرہ کا دعویٰ یونہی ہے۔) یہ رسول اس قرآن کو اپنے جی سے گھڑ لیتا ہے اور پھر اسے خدا کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔(اور اس کام کو یہ تنہا نہیں کرتا) ایک اور پارٹی ہے جو اس معاملہ میں اس کی مدد کرتی ہے (اور یہ سب مل کر اسے وضع کرتے ہیں۔) ذرا سوچو کہ یہ لوگ کس قدر جھوٹ اور فریب سے کام لیتے ہیں! (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔816)

آج کے دور میں قرآن کے متعلق گِب (Gibb) کا اعتراف

چیلنج قبول کرنا تو ایک طرف' عزیزانِ من! گب (H.A.R. Gibb)' British Orientalist کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہ بہت بڑا فاضل ہے: عربی زبان کا بھی' انگریزی زبان کا بھی' وہ Historian (مؤرخ) بھی ہے اور یہ آج کل موجود ہے۔ ❶ اس کی Latest (جدید ترین) کتاب Modern Trends in Islam (اسلام میں جدید رجحانات) ہے' وہ دیکھیے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس قرآن کی کسی آیت کا مثل تو ایک طرف' وہ کہتا ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ان کے ہاں کے یہ عالم وغیرہ' جنھوں نے قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا ہے' وہ ان کو پھٹکارتا ہے' وہ کہتا ہے کہ او تم نے یہ کیا! کیا تمھیں اتنا بھی پتہ نہیں ہے کہ یہ کیا چیز ہے' جس کا ترجمہ تم نے کیا؟ اور مثالیں دیتا ہے کہ یہ ہے قرآن کی آیت' یہ ہے تمہارا ترجمہ۔ نظر ایسا آتا ہے کہ تم نے قرآن کی آیت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ تم عربی زبان سے بھی واقف نہیں ہو۔ ❷ اور وہ پانچ لفظوں کی صرف ایک آیت کو دے کے چیلنج کرتا ہے اور وہ جتنے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے ہیں' خود اپنے ہاں کے' وہ کہتا ہے کہ ان پانچ لفظوں والی آیت کا ذرا ترجمہ کر کے بتاؤ تو سہی۔ ترجمہ نہیں ہوسکتا' اس کی مثل بنانا تو ایک طرف رہا۔

---

❶ یاد رہے یہ بات دسمبر 1977ء کی 30 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

❷ قارئین کی سہولت کے لیے گب کے اصل الفاظ یہاں دیئے جارہے ہیں:

The Koran is essentially untranslatable, in the same way that great poetry is untranslatable. The seer can never communicate his vision in ordinary language. He can express himself only in broken images, every inflection of which, every nuance and subtlety, has to be long and earnestly studied before their significance breaks upon the reader -- images, too, in which music of the sounds plays an indefinable part in attuning the mind of the hearer to receive the message. To paraphrase them in other words can only be to mutilate them, to substitute clay for fine gold, the plodding of the pedestrian intelligence for the winged flight of intuitive perception ...... An English transtaltion of the Koran must employ precise and often arbitrary terms for the many - faceted and jewel - like phrases of the Arabic; and the more literal it is, the grayer and more colorless it must be ...... Even in so simple a sentence as

اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ اِلَیۡنَا الۡمَصِیۡرُ (50:43)

"Verily We give life and death and unto Us is the Journeying", it is impossible to present in English (or perhaps any other language) the forces of the five-times repeated "We" in the six words of the original (Modern Trends in Islam, 1945, P.4)

قرآن بتاتا ہے کہ **وَ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا** (25:5) اور پھر آ کر کہتے ہیں کہ اس میں ہے کیا؟ یہ پہلے وقتوں کے لوگوں کی کہانیاں اور قصے ہیں' جو بیان کی جاتی ہیں۔ کوئی آ کر اس کو بتا دیتا ہے' یہ لکھ لکھا لیتا ہے۔ یہ سارا کچھ چوری چھپے کرتے ہیں اور پھر باہر آ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ صاحب! مجھ پہ یہ وحی ہوئی ہے اور پھر اپنی وحی اپنے کاتبوں کو لکھا دیتا ہے یہ کاروبار صبح وشام ہوتا رہتا ہے۔ یہاں یہ ان کے اعتراضات ہیں جو نقل کیے گئے ہیں۔

چودہ سو سال پہلے کائناتی حقائق کے متعلق محیر العقول انکشافات

ان اعتراضات کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ **قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (25:6) ان سے کہو کہ یہ باتیں جو تم کر رہے ہو' یہ تو انسانوں کی ہیں۔ اسے اُس نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے پوشیدہ رازوں تک سے واقف ہے۔ جو چودہ سو سال پہلے یہ کہہ سکتا ہے کہ تم اس زمین کو ہی نہ دیکھو۔ یہ جو تمہیں سماوی کرّے نظر آتے ہیں' ان کرّوں کے اندر بھی تمہیں آبادیاں معلوم ہوں گی۔ وہاں بھی آبادیاں ہیں ❶ اور ایسا وقت آ سکتا ہے جب یہ آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ربط قائم کر دیں۔ ❷ قرآن چودہ سو سال پیشتر یہ کہتا ہے۔ بتاؤ کون سا انسان ہے جو اُس دور میں یہ بات کہہ سکتا ہے۔ اس نے یہ کہا کہ جو فرعون کی لاش تھی ہم نے اسے محفوظ رکھ دیا تا کہ آنے والوں کے لیے یہ آیۂ عبرت بنے۔ ❸ دنیا میں کوئی

---

❶ قرآنِ کریم کی متعلقہ آیت یہ ہے: **وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ط وَ هُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ** (42:29)۔ (خدا کے قوانینِ فطرت' اسی زمین تک محدود نہیں۔ یہ ساری کائنات میں جاری وساری ہیں۔ اسی لیے) زمین اور اجرامِ فلکی کی پیدائش' خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔ نیز وہ ذی حیات (چلنے پھرنے والی آبادیاں) جو اس نے ان میں (زمین و آسمانی کرّوں میں) پھیلا رکھی ہیں۔ یہ آبادیاں اس وقت تو الگ الگ ہیں لیکن وہ اس پر بھی قادر ہے کہ انہیں اکٹھا کر دے۔ (یعنی زمین اور ان کرّوں میں بسنے والی آبادیاں' باہمی ربط پیدا کر لیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ ص۔1134) سورۃ النحل میں کہا کہ **وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ** (16:49) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' یہ سب اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ خواہ وہ جاندار مخلوق ہو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔604)۔

❷ اس آیت (42:29) سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض آسمانی کرّوں میں زندگی موجود ہے۔ اب انسان نے جس انداز سے اجرامِ فلکی سے سلسلہ مواصلات شروع کر رکھا ہے اس سے اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کسی کرّے کی آبادی میں اور ہم میں ربط پیدا ہو جائے اور یوں یہ آبادیاں اکٹھی ہو جائیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1134 مع حاشیہ)۔

❸ **فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً** (10:92) اب تو تجھے غرق ہونا ہے۔ البتہ ہم ایسا کریں گے کہ تیری لاش کو سمندر کی موجوں سے محفوظ رکھ لیں تا کہ وہ ان لوگوں کے لیے جو تیرے بعد آنے والے ہیں' موجبِ عبرت ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔483)۔

شخص نہیں جانتا تھا کہ فرعون کی لاش کہاں ہے' کیسے محفوظ رکھ دیا' کیسے آیہ عبرت بنے گی؟ یہ کسی کو علم ہی نہیں تھا۔ مفسرین اس کی تشریح مختلف انداز سے کرتے رہے تآنکہ آج خود اس کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے جا کر وہ جو اہرامِ مصر کھودا' تو جا کر دیکھا اور اب کہہ رہے ہیں کہ یہ ہے وہ فرعونِ موسیٰ' اور یہ کہا ہے کہ یہ نظر آتا ہے کہ سمندر سے یہ لاش پکڑی گئی کیونکہ مچھلیوں نے اس کے اِدھر اُدھر سے کچھ گوشت کاٹا ہوا ہے۔ میں تو یونہی دو مثالیں دے رہا ہوں ورنہ قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ اُس خدا کا نازل کردہ ہے' جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے پوشیدہ رازوں تک سے واقف ہے۔

راز کیا ہیں؟ یہ مضمر صلاحیتیں (Potentialities) ہیں' یہ کائنات کی ان اشیا کے اندر پوشیدہ قوتیں ہیں۔ اس زمانے میں جب ابھی دنیا یہ مانتی تھی کہ زمین ساکن ہے اور اس کے گرد یہ سماوی کرّے چکر لگا لیتے ہیں۔ گیلیلیو[1] (Galileo: 1564-1642) نے ابھی کل ہی یہ بات کہی تھی کہ میں تو دیکھتا ہوں زمین گول ہے' گھومتی ہے تو اس پہ موت کا فتویٰ دے دیا۔ یہ کل کی بات ہے[2] قرآنِ کریم تو چودہ سو سال پیشتر یہ کہہ رہا ہے کہ **كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ**(21:33) ہر کرّہ اپنے اپنے Orbit (مدار) کے اندر محوِ گردش ہے۔ کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں' یہ بیٹھا ہوا ہے اور یہ لکھ لکھا لیتا ہے۔ ان سے کہو کہ یہ اس نے نازل کیا ہے جو کائنات کی ان پوشیدہ صلاحیتوں سے واقف ہے اور پھر اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس کائنات کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اگر میں اس عنوان پہ آ جاؤں' عزیزانِ من! تو کئی درس چاہئیں کہ یہ محفوظ کیسے رکھا ہوا ہے۔ یہ صرف محفوظ ہی نہیں رکھا ہوا کیونکہ یہ تو پھر جامد اور Static چیز ہوتی ہے کسی کو محفوظ رکھ لینا' Preserve کر دینا اس کے ساتھ **رَحِيْمًا** (25:6) بھی ہے' نشو ونما بھی کیے چلا جا رہا ہے وہ ان چیزوں کی۔ یہ ہستی وہ ہے جس نے قرآن نازل کیا۔ قرآن کے متعلق تو یہ کچھ کہا کہ خود بنا لیتا ہے' لکھ لکھا لیتا ہے' اگلوں کے افسانے ہیں' کہانیاں ہیں۔

---

[1] Galileo (1564-1642), He was Italian astronomer and mathematician. He developed his own telescope (1609), and discovered four satellites of Jupiter and the nature of lunar illumination. His belief that Copernicus was right to claim that the sun was the centre of our Universe led to his persecution by the Inguisition (1633). He recanted but is said to have mutered under his breath "But it (the Earth) does move". (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited, P. 625)

[2] یہ محاورۃً کہا گیا ہے۔ ان پر 1633ء میں فتویٰ لگا تھا۔

قرآنِ حکیم میں نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعارف

اس کے بعد وہ آئے رسول کی طرف کہ **وَ قَالُوۡا مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ یَاۡکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمۡشِیۡ فِی الۡاَسۡوَاقِ** (25:7) اور کہا کہ واہ، یہ رسول کس قسم کا ہے۔ بھئی، کھانا کھاتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ قرآن کتنی عظیم چیز کہہ گیا ہے! مذہب میں تصور ہی یہ چلا آ رہا تھا کہ جو خدا کی طرف سے، خدا کا نبی یا رسول یا اوتار، اس چیز کا دعویٰ کرے، اسے عام انسانوں جیسا نہیں ہونا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب نے اپنے بانی مذہب کو الوہیت کا درجہ دے دیا، اس کو خدا بنا دیا، عام انسانوں جیسا نہیں تصور کیا، وہ اس کی توہین سمجھتے تھے کہ اسے بھی کہا جائے کہ یہ عام انسانوں جیسا ایک انسان ہے۔ یہ رسول ہے کہ اس کے وہ بیوی بچے ہیں، گھر بار ہے، کھاتا پیتا ہے۔ وہ اعتراض کرتے ہیں کہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ ان کے لیے یہ بات بڑی وجہ تعجب تھی کہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور کیفیت اس کی یہ ہے کہ ہماری طرح کھاتا پیتا ہے، یہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، یہ کس قسم کا رسول ہے! انسان کا ذہن عجوبہ پرست واقع ہوا ہے۔ اس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز Superstitious (توہماتی)، کوئی نہ کوئی چیز Super-natural (مافوق الفطرت) سی ہونی چاہیے پھر تو وہ اس کو بڑا سمجھتا ہے۔

عقل و فکر سے ماوراتوہم پرستی اور کرامات کے قصے

یہ چودہ سو سال پہلے انسان کی بات نہیں ہے۔ آج بھی آپ اچھے سے اچھے مجمع میں درس دے رہے ہوں، عقل و فکر کی باتیں کر رہے ہوں، علم کی باتیں کر رہے ہوں، یہ سارا کچھ ہو اور کوئی یونہی آ کر کہہ دے کہ باہر ٹینکی کے پاس ایک بابا کھڑا ہے: لمبے لمبے بال ہیں، وہ بالوں کو یوں نچوڑتا ہے تو اس میں سے دودھ نکلتا ہے۔ سارے بھاگ کر اس کے پاس چلے جائیں گے۔ آ سائیں بوہڑ شاہ، تے گھوڑے شاہ، تے ککڑ شاہ۔ [1] ان کے گرد خلقت جمع ہے، وہ ننگ دھڑنگ، غلاظت میں لپٹے ہوئے پڑے ہوئے ہیں صاحب! اب ان کے ہاں کے جو اِدھر اُدھر کے دلال ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں: جی، آپ کو پتہ نہیں ہے حضرت صاحب کا، رات کو ہم دیکھتے ہیں: سر الگ سے ہوتا ہے، دھڑ الگ سے ہوتا ہے، وہ بھی اللہ ہُو کہتا ہے یہ بھی اللہ ہُو کرتا ہے۔ یہ پردے کی باتیں ہیں، نہ بتانا کسی کو۔ یہ جتنے بڑے بڑے آپ کے ہاں اونچے اونچے مزار نظر آتے ہیں اور جو ان کی کہانیاں ہیں، ان کی طرف کچھ کرامات منسوب ہیں۔

---

[1] یہ تمام حضرت جی ہیں۔ کوئی بوہڑ شاہ ہے تو کوئی گھوڑے شاہ اور کوئی ککڑ شاہ۔

جان نثاروں کی قربانیوں کا ماحصل اور ہماری احسان فراموشی کا نتیجہ

عزیزانِ من! جن کی طرف کرامات منسوب نہیں ہوتیں، کسی کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کا مزار کہاں ہے۔ جس کے تدبر اور جس کی جاں فشانیوں سے، اسلام کی اس گاڑی کو اتنا زوردار Push ہوا ہے کہ چودہ سو سال تک بغیر انجن کے بھی چلے آ رہی ہے۔ پوچھو، ان مسلمانوں سے بہرحال کہ آپ اپنے ہی خالد بن ولید، سیف اللہ، کا مزار کہاں ہے؟ عمر فاروق رضی اللہ عنہ (581-644/45 AD) کہاں دفن ہیں؟ کسی کو معلوم نہیں۔ سائیں گھوڑے شاہ کے متعلق پوچھیے۔ ''او تے اونہاں دے گھوڑے دا وی پتہ ہے۔'' ❶ آپ کو معلوم ہے کہ ایبٹ آباد کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک بہت بڑا مزار ہے، وہاں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں، بڑا عرس ہوتا ہے۔ یہ کس کا مزار ہے؟ جی اے کھوتے شاہ دا اے۔ ❷ میں مذاق نہیں کر رہا۔ جس کا جی چاہے وہ جائے یہ ایبٹ آباد سے ذرا ایک سڑک کے کنارے پہ ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ بھئی کچھ اور نام تھا۔ دبا دیا ہو گدھا ہی، بہرحال وہ تو کچھ انسانوں جیسا نام نہیں ہے مگر فخر سے کہا جاتا ہے: کھوتے شاہ دا مزار اے۔ ❷ تو میں نے عرض کیا ہے کہ تو اہم پرستیوں میں چودہ سو سال پہلے کا انسان ہی مبتلا نہیں تھا، ذرا سی کوئی خلافِ فطرت چیز کسی سے منسوب کر دی جائے تو اس کے گرد جھرمٹ جمع ہو جاتا ہے۔ آج بھی آپ کی یہ کیفیت ہے کہ انسانوں کی ہی نہیں، بلکہ یہ گدھوں کے مزاروں کی پرستش ہوتی ہے، وہاں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں، انسان کا تو پوچھو نہیں کہ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ (95:5) کم بخت نیچے گرتا ہے تو پھر کہاں تک چلا جاتا ہے یعنی جو گدھے سے جا کے مراد مانگتا ہے۔ ساڈے تے کیندے سی: منگتیاں کولوں منگنا لعنتیاں دا کم اے۔ او فیر وی کوئی انسان ای ہوندا ہیگا اے۔ کھوتے شاہ دے مزار تے جا کے منگنا کی آ؟ ❸

بہرحال یہ ان کا کہنا ہے کہ صاحب! یہ کس قسم کا رسول ہے: کھاتا پیتا بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ عزیزانِ من! میں اگر ذرا سی ذاتی چیز کو درمیان میں لے آؤں تو معاف فرمائیں۔ میں عرض کر دوں کہ یہ ذہنیت کیسی ہوتی ہے۔ میں سنٹرل گورنمنٹ میں ملازم تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنا انداز یہی رکھا ہے جو آج آپ دیکھ رہے ہیں: یہی شلوار اور کرتہ، پاجامہ اور کرتہ، ٹوپی سر پہ پہنے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ یہ 1931ء کی بات ہے جب میرا پہلا مضمون، بٹالہ انڈیا میں، سید سلیمان ندوی کے رسالہ معارف میں شائع ہوا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (1958-1888ء) نے جو تفسیر لکھی تھی، اس تفسیر پر میں نے تنقید لکھی تھی۔ وہ بڑی عجیب چیز تھی۔ میری وہ تنقید اس پرچے میں شائع ہوئی تو گویا یہ تعارف ہوا کہ

---

❶ وہاں تو ان کے گھوڑے کا بھی انہیں معلوم ہے۔

❷ جی! یہ گدھے شاہ کا مزار ہے۔

❸ ہمارے ہاں بھی یہ کہتے تھے کہ بھیک منگوں سے مانگنا لعنتیوں کا کام ہے۔ وہ تو پھر بھی انسان ہی ہوتے تھے مگر گدھے شاہ کے مزار پہ جا کر مانگنا کیا ہے؟

میں بھی اسلام کے متعلق کچھ جانتا یا لکھتا ہوں۔ میں اور میرے ساتھ یہ شیخ سراج الحق صاحب تھے جو میرے برادرِ مکرم کی طرح ہیں، ہم زندگی بھر اسی طرح اکٹھے ہی چلے آ رہے ہیں۔ کام کاج کے لیے ہم نئی دلی سے چلتے تھے، پرانی دلی میں چاندنی چوک جیسے یہ ہمارے ہاں انار کلی ہے، اس قسم کا وہ بازار تھا، اس میں سے ہم چلے آتے تھے۔ حسبِ معمول میں اسی طرح سے گرمی کے موسم میں کرتہ پاجامہ ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور ہم دونوں چلے جا رہے ہیں۔ وہاں ایک ہمارے جاننے والے خواجہ صاحب تھے۔ وہ ذرا زیادہ ہی اسلامی واقع ہوئے تھے، پروفیسر تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو مجھے بلایا۔ ایک طرف کر کے کہنے لگے کہ اب آپ اس لباس میں باہر نہ آیا کریں، کم از کم اچکن ضرور پہن لیا کریں۔ میں نے کہا: جی! اب آپ نے فرمایا ہے، اب کیا ہوا ہے کہ میں اب یہ کیا کروں؟ کہنے لگے: یہ دیکھیں، اب آپ کا شمار علمائے دین میں ہونے لگ گیا ہے۔ یعنی ان کا تصور یہ تھا کہ وہ جو ایک مقالہ لکھا گیا تھا اس کی بنا پہ میرا شمار اس میں ہونے لگ گیا۔ جب ان میں شمار ہونے لگ گیا تو پھر بغیر اچکن کے بازار میں نکل آنا صحیح نہیں ہے۔ یہ اس تصور کے منافی ہے۔ توبہ توبہ مجھ جیسے ایک ناداں کے متعلق یہ تصور میں نہیں آ سکتا کہ تم اب بازار میں نکلو تو صرف کُرتے میں نہ نکلو۔ وہ جو رسالت کا دعویٰ کرتے تھے، ان کے متعلق اِن کا یہ کہنا کہ یہ بازاروں میں پھرتا ہے، یہ وہی ذہنیت (Mentality) چلی آتی ہے کہ خدا کی طرف کسی کی کوئی نسبت ہوئی تو انہوں نے اسے انسانوں سے الگ کچھ تصور کر لیا: کس قسم کا ہے یہ رسول! کیا بات ہے: **مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ** (25:7)! کیسا ہے یہ رسول! کیا ہو گیا ہے اس کو؟ بازاروں میں پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے۔ **لَوْ لَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا** (25:7) اسے باہر نکلنا ہی نہیں چاہیے، نکلے تو ایک جلو میں ہو، اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہونا چاہیے، اس کے آگے آگے وہ چلے، با ادب با ملاحظہ ہوشیار کہتا ہوا۔ یہ ''نذیر'' بہت اچھا لفظ ہے: لوگوں کو ڈراتا ہوا، ہٹ جاؤ راستے سے، ادھر ہو جاؤ۔ کیا بات ہے قرآن کی! ایسا نقشہ کھینچتا ہے: پیچھے ساتھ ایک فرشتہ ہونا چاہیے، نذیراً ہو، لوگوں کو ڈراتا چلا جائے کہ ہٹو راستے سے، ادھر ہٹو راستے سے۔ یہ کہتے ہیں کہ اُسے کچھ ہونا چاہیے تھا۔ پھر قرآن ان کے یہ الفاظ Quote کرتا ہے کہ **اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ** (25:8) کوئی اشرفیوں کا خزانہ اس کے پاس بھیجا جاتا، جائے نماز کے نیچے سے حضرت صاحب یوں ہاتھ کر کے اُسے نکالتے کہ لو یہ سکہ اور اس کے پاس جناب! دینے کو یہ نوٹ ہوتے اور وہ نوٹ ہوتے۔ وہ انہیں دکھاتا اور مافوق الفطرت انداز میں دیتا چلا جاتا۔ ان کے ہاں یہ ذہنیت ہے اور آج بھی چلی آ رہی ہے۔

سخاوت اور درماندگی کے متضاد قصے

عزیزانِ من! پھر سے عرض کر دوں کہ ہم تو انہی وادیوں کے گھومنے والے، انہی بازاروں کے رہنے والے ہیں۔ یہ کچھ خود بھی کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ کہا کہ دیکھیے جب کوئی حضرت صاحب! جاتا ہے تو وہ اپنے جائے نماز کے نیچے سے ایک سو

روپے کا نوٹ دے دیتے ہیں۔ دیکھیے' اللہ تعالیٰ ان کو دیتا ہے' وہ کسی سے لیتے نہیں ہیں اور وہ اس طرح سے دیتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے مگر جو نوٹ وہ دیتے ہیں' کیا اس پہ نمبر ہوتا ہے؟ کہنے لگے: ہاں ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا: کیا وہ گورنمنٹ کے نوٹوں والا نمبر ہوتا ہے' یا کوئی خاص نمبر ہوتا ہے؟ اگر خاص ہوتا ہے تو حضرت صاحب بناتے ہیں اور اگر گورنمنٹ کے نوٹوں والا ہوتا ہے تو یا کسی نے دیا ہوا ہوتا ہے' یا انہوں نے کہیں سے چرایا ہوگا۔ اب بتاؤ کہ کیا شکل ہے اس کی؟ کہنے لگے کہ جب آدمی بے دین ہو جاتا ہے ''تے فیر ککھ نئیں رہندا اوہدا۔ ❶ او بابا! جواب دو' اس لیے کہ میں تو ان وادیوں کا خود چلا ہوا ہوں۔ ''ساڈے وی سرہانے نکلدے ہوندے ہیگے سن' روٹی منگ کے کھاندے ہوندے سن'' ❷ یعنی ان کو کوئی دوسرا آ کے روٹی نہ دے تو یہ تو کچھ کماتے ہی نہیں ہیں۔ تے ترے جاندے بخشش اپنی کردے ہیگے نیں۔'' ❸ یہ کہتے ہیں کہ ایک خزانہ اس کے ساتھ آنا چاہیے تھا: **اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا** (25:8) یا ہونا یہ چاہیے تھا کہ یوں یہ کپڑا اڈا لیتے اور کہتے: او آم کا درخت اُگ آ تا' اس میں یہ آم لگے ہوئے ہوتے۔

عقلِ انسانی کو قرآنِ حکیم کی روشنی ہی جلا بخش سکتی ہے

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا ہوں کہ یہ بات صرف چودہ سو سال پہلے کی ہی نہیں تھی یا رسالت کے عہد کی نہیں بلکہ آج بھی اس چودھویں صدی میں' جسے بڑا روشن خیالی کا زمانہ کہتے ہیں' یہ کیفیت ہے کہ یورپ جسے تہذیب وتمدن اور عقل کے معراج پہ سمجھا جاتا ہے' آج بھی وہاں تیرہ نمبر کا کوئی ہوٹل نہیں لیتا' تو یہ بات ہم مشرق کے جاہلوں کی نہیں ہے۔ جہالت سے تو صرف وہ نور اور روشنی نکال سکتی ہے جو خدا کی طرف سے ملتی ہے اور جو قرآن کے اندر موجود ہے۔ جہاں یہ نہیں ہے خواہ وہ مشرق کا مذہب پرست ہے یا مغرب کا الحاد پرست' کوئی بھی توا ہم پرستی سے نہیں نکل سکتا۔ اندازہ لگائیے کہ ان کے یہ اعتراضات جو رسول ﷺ کے اوپر تھے یہ وہ بیان کرتا ہے اور پھر وہ یہ نہیں کرتا کہ اچھا بھئی! اگر یہ مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ ہو جائے تو ہم اسلام لے آئیں گے تو چلو کوئی حرج نہیں' خدا کے لیے کیا مشکل تھا' یہ فرشتہ بھیج دے' خزانہ دے دے' باغ اگا دے' اس کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ یہاں ہی نہیں ہے قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پہ یہ ہے کہ وہ آپ سے معجزات طلب کرتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ **انا بشر مثلکم** میں تو تمہارے جیسا ایک انسان ہوں' مجھ سے تم معجزے طلب کرتے ہو؟ اور آپ کو معلوم ہے کہ پھر معجزہ آپ نے جو پیش کیا تھا وہ کیا معجزہ تھا! یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آنے

---

❶ پھر تو اس کے پاس تنکا تک نہیں رہتا' اس کے پلے کچھ نہیں ہوتا۔

❷ ہمارے سرہانے کے نیچے سے بھی نکلتے تھے' کھانا مانگ کر کھاتے تھے۔

❸ چلے جا رہے ہیں اور بخشش اس قدر کیے جاتے ہیں۔

والی ہے کہ ان کے سامنے کوئی فرشتہ آتا نہیں جس کو وہ دیکھ لیں' کوئی اور علامات ظاہری ایسی نہیں ہیں جن سے معلوم ہو کہ یہ واقعی خدا کی طرف سے یہ وحی اس پہ نازل ہوتی ہے' خدا کا رسول ہے۔ وہ کس طرح سے اس دعوے کو مانیں کہ میں خدا کا رسول ہوں' میں اپنے ذہن سے خود یہ کچھ پیش نہیں کر رہا بلکہ مجھ پہ وحی نازل ہوتی ہے۔ ثبوت کیا ہے اس کا؟ محسوس ثبوت تو کوئی ہے نہیں۔ وہ سابقہ روش کے مطابق کسی معجزے کا مطالبہ کرتے تھے اور معجزے کے مطالبے میں جواب ملتا تھا کہ میں تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں' تو پھر کیا ثبوت تھا ان لوگوں کے اطمینان کی خاطر کہ جو کچھ میں کہتا ہوں یہ سچ ہے' جھوٹ نہیں ہے' میں فریب نہیں دیتا' میں جھوٹ نہیں بولتا؟ کیا ثبوت تھا اس چیز کا؟

نبی اکرم ﷺ کی شخصیت بذاتِ خود ایک معجزہ تھی

عزیزانِ من! یہ بڑا غور طلب سوال ہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں' وہ سچ ہے' جھوٹ نہیں ہے' وہ میری تخلیق نہیں ہے۔ ان کا یہ اعتراض بظاہر بجا نظر آتا تھا کہ یہ کیسے مان لیا جائے کہ یہ تمہارے اپنے ذہن کی کاوش نہیں ہے' بلکہ خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے' کوئی کرامات نہیں' کوئی معجزات نہیں' کوئی فوق الفطرت بات نہیں' کوئی Super-natural (مافوق الفطرت) چیز نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کا جواب کیا دیا گیا تھا؟ یہ کہ سنو! فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16) میں کوئی نیا باہر سے نہیں آیا' اجنبی نہیں ہوں جو تمہیں میرے اس ماضی کا پتہ نہ ہو۔ میں نے اپنی ساری عمر تمہارے اندر گزاری ہے۔ تم عقل و فکر سے کام لے کر خدا کو شاہد کر کے کہہ دو کہ جس قسم کی عمر میں نے تمہارے اندر گزاری ہے کیا یہ عمر ایک جھوٹے کی ہوتی ہے' یا سچے کی ہوتی ہے؟ میرے اس دعوے کی یہی دلیل ہے کہ جو میں کہتا ہوں وہ صداقت پر مبنی ہے۔ تم کہہ دو کہ کیا یہ ایسا نہیں ہے۔ کیا بات ہے صاحب! مجھ سے نہ پوچھو' تم بتاؤ۔ چالیس سال' تمہارے اندر مِنْ قَبْلِهٖ (10:16) اس دعویٰ کرنے سے پہلے بھی' میں نے تمہارے اندر گزارے' میری اس چالیس سال کی زندگی پر نگاہ ڈالو اور پھر خدا کے لیے خود فیصلہ کرو کہ ایسی زندگی ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے۔ جس نے چالیس سال کبھی جھوٹ نہیں بولا' جس نے چالیس سال کبھی فریب نہیں دیا' کیا راتوں رات اس کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ اتنا بڑا جھوٹ بولنے لگ جائے گا؟ تم بتاؤ۔ اور ان میں سے کسی ایک نے یہ نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ نہیں' تمہاری پہلی زندگی میں بھی کچھ اس قسم کی کوئی بات ہمیں نظر نہیں آئی تھی۔

نوعِ انسانی کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت کا یہ اصول قیامت تک کے لیے راہنمائی ہے

یہ کچھ وہیں نہیں کہا بلکہ جب آپ ﷺ کے خلاف ابوسفیان ہرقل [1] کی مدد لینے کے لیے اس کے دربار میں گیا تھا تو اس وقت اس نے سب کچھ ان کے متعلق کہا تھا کہ یہ کرتے ہیں، وہ کرتے ہیں، رسالت کا دعویٰ کرتے ہیں، نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے وحی آتی ہے۔ اس پر ہرقل نے یہ پوچھا تھا کہ کیا یہ شخص تمہارے اندر کہیں باہر سے آیا ہے؟ کہنے لگے: جی نہیں، ہم میں سے ہے، ہمارا اپنا ہے، عزیز ہے، رشتہ دار ہے، وہاں کا رہنے والا ہے۔ ہرقل نے پوچھا ہی یہ تھا کہ بتاؤ اس کی پہلی زندگی کس قسم کی تھی؟ اس سے نبی ﷺ کے متعلق پوچھ رہا ہے جو آپ ﷺ کے خلاف مدد لینے کے لیے گیا تھا اور میں کہتا ہوں کہ عربوں کا کیریکٹر بھی بڑی چیز ہے۔ وہاں وہ پوچھتا ہے اور یہ اس سے کہتے ہیں کہ پہلی زندگی تو اس کی بڑی پاکباز تھی، تو اس نے کہا کہ پھر جس کی چالیس سال کی زندگی پاکبازی کی گزری ہے، وہ یکایک اس قسم کا نہیں ہوسکتا، جو تم اس کے خلاف کہتے ہو۔ جاؤ، نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ ہے معجزہ، یہ ہے شہادت، یہ ہے صداقت اور یہ چودہ سو سال پیشتر رسول اللہ ﷺ کی ذات پر ختم نہیں ہوگئی۔ عزیزانِ من! صداقت کا ثبوت آج بھی یہی ہے، آج بھی یہی معیار ہے، یہی میزان ہے جو بھی کسی قسم کے سچے ہونے کا دعویٰ کرے اس کی پہلی زندگی کو دیکھو کہ اس کی ماضی کی ساری زندگی کس قسم کی ہے، اس کے Past (ماضی) کو پرکھو۔ کہ یہ کہے کہ میں نے تمہارے اندر اپنی زندگی بسر کی ہے تم پہچانو کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ ہے کوئی ایک بھی ایسا کہنے والا! صداقت یہ ہے۔ معجزہ طلب کیا جا رہا ہے۔ چھوٹے پیمانے پہ جواب یہ دیا جا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

قلندریم و کرامات ما جہاں بینی است

مجھ سے کرامت مانگتے ہو تم، کرامت یہ ہے کہ میں نے پوری دنیا کو اپنی نگاہوں سے پرکھا ہے۔

زمانگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی

مجھ سے یہ کہتے ہو کہ سونا کیسے بنتا ہے۔ یہ نہ پوچھو مجھ سے۔ یہ پوچھو کہ سونے کو پرکھنے والی نگاہ کیسے پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] بعثتِ نبوی کے زمانے میں ہرقل، بازنطینی سلطنت کا شاہنشاہ تھا۔ شام، فلسطین اور مصر وغیرہ کے علاقے سب اس کے زیرنگیں تھے۔ حدودِ شام پر قدیم عربی قبائل بستے تھے جنہوں نے مذہب عیسائیت اختیار کرلیا تھا۔ انہی قبائل کے رؤسا ہرقل کی طرف سے ان علاقوں کے حکمران تھے۔ انہیں غسانی کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے جس قدر تصادمات ان علاقوں میں ہوئے وہ بالواسطہ ہرقل کے ساتھ تھے کہ وہی اس سرزمین کا شاہنشاہ تھا، لیکن بلاواسطہ غسانی حکمرانوں سے ہوئے جو وہاں ہرقل کی نیابت کرتے تھے (پرویزؒ (1987)۔ شاہکارِ رسالت۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، ص۔ 164)۔
وحیہ کلبی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک بصریٰ میں حارث غسانی کو لاکر دیا تھا۔ اس نے قیصر ہرقل، بازنطینی سلطنت کا شاہنشاہ کے پاس بیت المقدس میں بھیج دیا تھا (حوالہ شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ناشران قرآن، ص 475) ابوسفیان وہاں پہنچا تھا۔

نبی اکرم ﷺ کو جادوزدہ کہنے والوں کو قرآن نے ظالم کہا ہے

عزیزانِ من! اور آگے بڑھتے ہیں۔ آگے ایک اور بات آئی۔ کہا کہ **وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا** (25:8)۔ یہاں ظالم کا لفظ آیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص پہ تو کسی نے جادو کر دیا ہوا ہے' یہ جادو کا مارا ہوا ہے اور ان پاگلوں کو دیکھو کہ یہ اُس کی اطاعت واتباع کر رہے ہیں جو رجلِ مسحور ہے' جس پہ کسی نے جادو کر رکھا ہے' وہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ عزیزانِ من! رک جایئے' قرآن کے الفاظ پھر سن لیجیے۔ کہا کہ **وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ** (25:8) یہ ظالم' یہ بھی یہاں تک پہنچ جاتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ **اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا** (25:8) اس شخص پہ تو کسی نے جادو کر دیا ہے' اور یہ لوگ اس جادوزدہ یعنی مسحور کے پیچھے لگے ہوئے ہیں' اس کی اطاعت کر رہے ہیں' اس کا اتباع کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے: یہ رجلِ مسحور ہے جس پہ جادو کیا ہے اور یہ ایک جادوزدہ کا اتباع کرنے والے ہیں. **قَالَ الظّٰلِمُوْنَ** (25:8) یعنی ظالم یہاں تک کہتے ہیں۔

جادو کے سلسلہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا تفسیری بیان

بات سمجھ میں آ گئی کہ قرآن کی رو سے یہ سب سے بڑا اتہام ہے جو حضور ﷺ کے خلاف لگایا گیا۔ کفار نے یہ الزام لگایا۔ قرآن ان کو الظّٰلمون کہہ کر پکارتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے ہاں کے مفسر' آپ کے ہاں کے محدث' آپ کے ہاں کے علما' کیا کہتے ہیں؟ مجھ سے نہ سنیے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی [1] صاحب کی تفہیم القرآن [2] چھٹی جلد کے 554 صفحہ پہ اس کا لکھا ہے کہ ''صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم 7ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا۔'' گویا نبوت کی زندگی تیرہ سال مکے کی' سات سال یہ بھی' نبی ہوئے کل بیس سال ہو گئے۔ ہاں تو ''خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لبید ابن اعصم سے ملا جو انصار کے قبیلہ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے کہا کہ محمد ﷺ نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی' مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں' انہیں قبول کرو' اور محمد ﷺ پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں حضور ﷺ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضور ﷺ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں

---

[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1979-1903)

[2] تفہیم القرآن سورۃ الناس' سورۃ التحریم ---- جلد ششم' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی نمبر 6' 1993' ص 554۔ (7 جون 1972ء کو تفہیم القرآن کی آخری (چھٹی) جلد مکمل ہوئی اور اکتوبر 1972ء میں شائع ہوئی۔ حوالہ روزنامہ جسارت کراچی 25 ستمبر 2003ء' صد سالہ یوم پیدائش پر خصوصی اشاعت' ص۔3)

اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لبید ابن اعصم نے خود جادو کیا تھا' اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں' ان سے اس نے جادو کروایا تھا۔ بہر حال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو' اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر لبید نے بنی زریق کے کنویں ذروان یا ذی اروان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی ﷺ پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا۔ دوسری ششماہی میں کچھ تغیر مزاج محسوس ہونا شروع ہوا' آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے' مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضور ﷺ پر ہوا'' زیادہ سے زیادہ جو اثر ہوا' سنیئے' وہ بس یہ تھا کہ '' آپ گھلتے چلے جا رہے تھے' کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا تھا''۔ خدا کا نبی ﷺ دین کو پہنچانے کے لیے جو آیا ہوا ہے! یا للعجب !! بس اتنا اثر ہوا'' کہ آپ گھلتے چلے جا رہے تھے' کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا' اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوئے ہوتے تھے' اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا'' یہ ہے اثر' جو ان پہ ہوا۔ ماتھا پیٹئے' عزیزانِ من! قرآن کی آیت آپ کے سامنے ہے۔ گھر جا کے یہ نسخہ خود نکالیے' سورۃ الفرقان کی آٹھویں آیت **وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا** (25:8) ہے۔ یہ ظالم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس شخص پہ تو کسی نے جادو کیا ہوا ہے اور یہ جادو زدہ کا اتباع کر رہے ہیں۔ یہاں تک اس کے خلاف اتہام لگا رہے ہیں اور یہ ہیں کہ وہ اس جادو کی تفصیل دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یہ مسحور ہے' جادو کا اثر بتا رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا اثر ہو۔ گھلتے چلے جا رہے ہیں' کسی بات کے متعلق کہتے ہیں نماز کے متعلق سمجھتے ہیں' پڑھ لی ہے' نہیں پڑھی ہوتی۔ اس حد تک معاف رکھیں' میری بیٹیاں' میری بہنیں کہ ازواج مطہرات کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ﷺ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوئے' بعض اوقات آپ ﷺ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا۔

قرآنِ حکیم کے ارشاد کے برعکس یہ روایات شہادت قرار پا گئیں

جب ان پہ اعتراض کیجیے کہ صاحب! آپ نے یہ کیا لکھ دیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ ظالمین کفار کی طرف سے اتہام تھا جو حضور ﷺ پہ لگا۔ آپ اس اتہام کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں جو حضور ﷺ کے اوپر کفار اور ظالم لگاتے تھے کہ' آپ' رجلِ مسحور تھے اور اس کا یہ اثر بھی ہوا تھا۔ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ کہا کہ صاحب! یہ روایات میں آیا ہے۔ چل' بھئی! قرآن کی آیت پیش کر رہے ہیں' قرآن کہہ رہا ہے' خدا کہہ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ یہ فرما رہے ہیں کہ صاحب! روایات میں یہ آیا ہے۔

یہ بات عقیدت مندی کی نہیں بلکہ مفاد پرستی کی ہے

عزیزانِ من! یہاں سے ایک بڑی اہم بات سامنے آتی ہے۔ اسے سن رکھیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ حضرات روایات یا جنہیں

احادیث کہتے ہیں، ماننے پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن اور حدیث دو چیزیں دین کا ماخذ ہیں لہٰذا کسی کے خلاف سب سے بڑا الزام منکر حدیث ہونا ہے کیونکہ پھر وہ مسلمان بھی نہیں رہتا۔ کتنا زور دیتے ہیں۔ بظاہر یہ نظر آئے گا کہ انہیں واقعی جو یہ احادیث ہیں، جن کو آپ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات تھے، حضور ﷺ کے اعمال تھے، ان سے بڑا ہی لگاؤ ہے، بڑی عقیدت ہے، اس واسطے یہ اس پہ بڑا زور دیتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ انہیں حضور ﷺ کے خلاف (معاذ اللہ، معاذ اللہ، صد بار معاذ اللہ) حضور ﷺ کے خلاف، دین کے خلاف، یہ کچھ کہنے کے لیے گنجائش مل جاتی ہے، ان کا مشن یہ ہے، مجھے کہنے دیجیے کہ کم از کم آنے والی نسلوں کو اسلام سے برگشتہ کر دیا جائے اور اس کا نہایت لطیف، بڑا معصوم، بڑا مقدس سا طریقہ ہے کہ آنے والی نسل کے نوجوانوں کے پاس ایک حدیث یہ بیان کر دیجیے کہ یہ تھا تمہارا رسول ﷺ (معاذ اللہ)۔

جمع شدہ روایات کی کیفیت

حدیثیں وضع کرنے والوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ اتنی تعداد میں گھڑی گئیں، وضع کی گئیں [1]۔ امام بخاری [2] اپنے مجموعے میں لکھتے ہیں کہ مجھے چھ لاکھ حدیثیں ملیں۔ ان میں سے میں نے چھ ہزار اور کچھ حدیثیں ہیں جن کو صحیح سمجھ کر الگ کیا۔ پانچ لاکھ ستانوے ہزار دو سو اڑتیس (597238) کو انہوں نے مسترد کر دیا۔ یہ ایک جامع مجموعۂ حدیث ہے۔ باقیوں کے متعلق پوچھو نہیں۔ گویا اتنی زیادہ حدیثیں بنیں، اتنی زیادہ وضع ہوئیں۔ اسلام کے دشمنوں نے، حضور ﷺ کو بدنام کرنے والوں نے، یہ تمام وضع کیں۔ ان کتابوں کے اندر وہ لکھی گئیں۔ انہوں نے تو یہ کر دیا، اب ان کے بعد جو آئے، انہیں تو یہ چاہیے تھا کہ انہیں پرکھ کر دیکھتے اور پہلی چیز یہ کہتے ہیں کہ نہیں، یہ قابل قبول نہیں یہ قرآن کے خلاف ہیں۔ یہی جو حدیث ہے، میں کہہ رہا ہوں کہ قرآن کی یہ آیت موجود ہے کہ حضور ﷺ کے اوپر یہ کفار اور ظالم اتہام لگاتے تھے۔ اس روایت کو تو اٹھا کے پھینک دینا چاہیے تھا کہ یہ صحیح نہیں ہوسکتی۔ یہ کسی دشمنِ اسلام نے، حضور ﷺ کے کسی سب سے بڑے عدو نے وضع کی ہے۔ یہ افسانہ ہماری حدیثوں کی کتاب کے اندر، صحیح بخاری کے اندر، درج کر دیا ہے۔ یہ کہہ کے اس کو مسترد کر دینا چاہیے تھا کہ یہ قرآن کے خلاف ہے مگر یہ ہیں کہ اسے مسترد نہیں کرتے، رکھے ہوئے ہیں، نصاب میں شامل ہیں۔ آپ کے ہاں یہ کتابیں درسوں میں شامل ہیں، ان کے ختم ہوتے ہیں، ان کو غلط کہنے والا منکر حدیث قرار پاتا ہے۔ کیوں رکھی ہوئی ہیں؟ معاف رکھیے گا، ان میں بڑی گنجائش نکلتی ہے۔ اگر مودودی [3] صاحب اپنی طرف سے یہ کچھ کہتے، یہی مسلمان ان کا گلا پکڑ لیتے۔ انہوں نے کہا کہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: (پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الحج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005، ص ص 187 تا 242۔

[2] امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (260-194ھ)، مجموعہ حدیث صحیح بخاری

[3] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1979-1903)

صاحب! یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے' انہی جیسا کوئی بخاری میں رکھ گیا اور اب یہ اس کی حفاظت کرتے چلے آ رہے ہیں' اس لیے کہ اِس سے گنجائش نکلتی ہے۔ عزیزانِ من! یونہی کسی کے سر اتہام نہیں لگاتا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس سے گنجائش نکلتی ہے۔ سنیئے' گنجائش کیسے نکلتی ہے۔ بات چلی ہے تو پھر آج سن ہی لیجیے کہ اس سے اپنے بعض کاموں کے متعلق سند بہم پہنچانے کی گنجائش نکلتی ہے۔

حکایت قد آں یارِ دلنواز کنیم
بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

مودودی صاحبؒ کے طرزِ عمل پر بعض جیدّ حضرات کا اعتراض اور علیحدگی

مودودی ❶ صاحب نے اپنی جماعت تقسیم ہند سے پہلے 1941ء ❷ میں بنائی۔ بہت سے لوگ اس میں شامل ہوئے۔ تقسیم کے بعد ان میں سے بہت سے یہاں پاکستان میں بھی ساتھ آ گئے۔ یہ اچھے جیدّ لوگ تھے۔ انہوں نے 1956ء ❸ میں ان سے علیحدگی اختیار کی۔ وہ معرکہ بہت قابل ذکر تھا۔ انہوں نے ان سے یہ کہا کہ جماعت بناتے وقت آپ جو اصول ہمیں دیا کرتے تھے' وہ بڑے بلند اصول تھے۔ ہم اسی لیے اس جماعت کے ساتھ ہوئے تھے' آپ کے ساتھ ہوئے تھے۔ لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ آپ ان کی خلاف ورزی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ آپ کی روش کیا ہے' ہم کس طرح آپ کا یہ ساتھ دیں؟ آپ اقامت دین کا دعویٰ کرتے ہیں۔ عمل اور روش یہ ہے کہ بلند و بالا اصولوں کو اس طرح توڑتے چلے جا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! پتہ ہے اس کا جواب کیا دیا؟ کہا تھا کہ اگر میں یہ کر رہا ہوں تو اپنی طرف سے تو نہیں کر رہا۔ یہ تو اتباع سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ حضور ﷺ بھی تو ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ جی! سن لیجیے۔ ان کے جواب میں لکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کے اصولوں میں ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے' اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو' یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ یہ اصول تھا۔ اس چیز کو قرآنِ مجید میں بھی پیش کیا گیا ہے اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ حضور ﷺ نے یہ کیا۔ قرآن نے بھی یہ اصول بیان کیا۔ حضور ﷺ نے اس پر عمل بھی کیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن مودودی ❶ صاحب کے ساتھیوں نے ان پہ الزام یہ دیا تھا کہ آپ وہاں جب تک انڈیا میں تھے' اقتدار حاصل کرنے کی کوشش نہیں تھی'

---

❶ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1979-1903)

❷ 26 اگست 1941ء کو لاہور میں 75 افراد کا تاسیسی اجتماع ہوا اور جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی۔ اس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا جماعت اسلامی کے امیر کی حیثیت سے انتخاب ہوا۔ (حوالہ روزنامہ جسارت کراچی 25 ستمبر 2003ء' صد سالہ یوم پیدائش پر خصوصی اشاعت' ص۔ 3)

❸ 1957ء میں ماچھی گوٹھ میں جماعت اسلامی کا چوتھا کل پاکستان اجتماع ہوا۔ (حوالہ روزنامہ جسارت کراچی 25 ستمبر 2003ء ص۔ 3)

بڑے بڑے اصول دیئے۔ اب یہاں اقتدار کے حصول کے لیے جو آپ کوشش کر رہے ہیں، تو آپ نے وہ اصول توڑ دیئے۔ کیوں؟

اتباعِ سنت کے نام پر خودساختہ عمل کی دو ایک مثالیں

مودودی صاحب نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مساواتِ انسانیہ کے بڑے بلند اصول دیئے، قرآن نے بھی یہ کہا، حضور ﷺ نے کر کے بھی دکھایا لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ ﷺ نے ہدایت دی کہ امام قریش میں سے ہو۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملے میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیے کے طور پر پیش کیا گیا تھا، آپ کسی شخص کے متعلق کہیے کہ یہ بڑا بے اصولا ہے، اس کے بعد اس کے کیریکٹر کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ انہوں نے مودودی صاحب سے کہا کہ تم نے وہ سارے اصول توڑ دیئے جو ابتدا میں دیا کرتے تھے۔ جن کی بنا پر ہم ساتھ ہوئے تھے۔ اب کہہ رہے ہیں کہ میں نے توڑ دیئے ہیں تو کون سا جرم کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ کیا تھا۔ وہ ساری عمر مساواتِ انسانیہ کی تعلیم دیتے رہے، قرآنِ مجید کا یہ حکم تھا۔ کہتے ہیں کہ ابتدا میں کچھ قائم کرنے کی بھی کوشش کی لیکن جب مملکت کی فرمانروائی کا سوال آیا تو یہ کہا کہ مملکت کی فرمانروائی میرے خاندان کے اندر رہے گی، باہر نہیں جائے گی۔ کہا کہ یہ وہ سارا اصول، جو کلیے کے طور پہ تھا، توڑ دیا۔ میں نے کیا جرم کیا؟ یہ روایت اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ یہ وضعی ہے، بنائی ہوئی ہے، غلط ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ ان کے اپنے سند کے اعتبار سے بھی جو معیار ہیں، ان کے لحاظ سے بھی یہ غلط ہے لیکن انہوں نے یہ روایت رکھی ہوئی ہے۔ ''اے کھوٹا پیسہ کسے ویلے کم آئے۔'' [1] کام اس وقت آتا ہے کہ جب الزام دیا جاتا ہے کہ آپ نے سارے اصول توڑ دیئے، کیوں؟ کہا کہ یہ دیکھیے روایت موجود ہے، حضور ﷺ نے ایسا کر دیا (معاذ اللہ، معاذ اللہ)۔ اس کا ریفرنس (حوالہ) ہے: ''رسائل ومسائل'' حصہ چہارم، 329 صفحہ۔ جی اور سنیے۔ انہوں نے کہا کہ آپ تو کبھی کبھی جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے بولتا ہوں، بھئی۔ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ کہنے لگے: سنت نبوی کا بھی تو اتباع کرنا چاہتا ہوں۔ سنیے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہا کہ راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے، واجب ہو جاتا ہے جھوٹ بولنا۔ یعنی اگر اس وقت سچ بولا جائے تو انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ کہا کہ صاحب! اس کی سند کیا ہے؟ کہنے لگے: سند موجود ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ یہودی کعب بن اشرف کے قتل کے لیے، جب حضور ﷺ نے محمد بن مسلمہ کو مامور کیا، ایک یہودی کو خفیہ طور پر سازش کے ماتحت قتل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو متعین کیا، تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں۔

---

[1] (تاکہ) یہ کھوٹا سکہ کسی وقت کام آ سکے۔

حضور ﷺ نے باالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ ''سازش سے خفیہ طور پر قتل'' پہلی چیز ہے ''فریب دے کر'' دوسری چیز ہے۔ آگے وہ تشریح ہے کہ یہ گئے۔ انہوں نے اس کو گلے سے لگایا' اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ چاندنی رات ہے' چلو باہر جا کے شعر وشاعری کریں۔ کم بخت کہاں گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہ بہلا کر اسے تخلیے میں لے گئے۔ پھر وہاں جا کے ان کو کسی طرح قتل کیا۔ یہ کہتے ہیں کہ انہوں رضی اللہ عنہ نے فریب سے قتل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے اس چیز کی اجازت مانگی تھی یعنی (پہلے تو رسول اللہ ﷺ نے مامور کیا) انہوں نے اجازت مانگی کہ مجھے کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو جھوٹ بولدوں۔ آپ ﷺ نے باالفاظِ صریح اس کی اجازت دی۔ یہ روایت کا ہے کے لیے انہوں نے رکھی ہوئی ہے۔ اس کو سچ کہتے ہیں' تا کہ اپنا جو جھوٹ ہے' اس کے لیے سند مل جائے۔

مجھے تو تجھ سے گلہ ہے اے مسلمان' ان سے نہیں

عزیزانِ من! ہمارے ساتھ تو یہ ہوا ہے۔ یہ آپ کے ہاں کی روایات جنہیں کتب احادیث کہتے ہیں' ان میں یہ سب کچھ موجود ہے اور ان کی موجودگی پر مجھے تعجب نہیں ہے اس لیے کہ اس زمانے میں پتہ نہیں کہ بیچارے جامعینِ حدیث نے کس قسم کی حدیثیں رکھیں۔ اس زمانے میں تو چھاپے خانے بھی نہیں تھے۔ چھپی ہوئی کتابوں میں آج یہ کچھ کر دیتے ہیں تو اس زمانے میں اس قسم کی حدیثوں کو ان کتابوں کے اندر داخل کر دینا مشکل کیا تھا۔ تعجب تو آگے یہ ہے کہ ان تمام چیزوں پہ زور دیا جاتا ہے کہ ان کو سچ مانو۔ آپ حیران ہوں گے کہ اہل حدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ صحیح بخاری' مذکورہ حدیث بھی صحیح بخاری کی ہے' اور مسلم [1] کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ ان حدیثوں سے اگر آپ انکار کریں تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ میں کہہ صرف یہ رہا ہوں کہ یہ نہیں ہے کہ ان حدیثوں سے' اس قسم کی چیزوں سے' ان کو بڑی محبت ہے۔ وہ کون ایسا کم بخت ہے کہ جو نبی اکرم ﷺ کی ذات پر ایمان لانے سے مسلمان ہو اور حضور ﷺ کا اس قسم کا کردار وہ اپنے ذہن میں رکھے۔ کون مسلمان اس کو گوارا کر سکتا ہے! انہوں نے یہ چیزیں اس لیے رکھی ہوئی ہیں کہ جب خود اپنا اصول توڑنا ہو تو اس کے لیے یہ سند مل جائے۔ جب خود جھوٹ بولنا ہو تو اس کے لیے گنجائش رکھ دی جائے کہ جی' روایت میں یہ آیا ہے اور یہ نہیں سوچتے کہ اپنا تو ذرا سا ہی اس میں کچھ فائدہ ہوگا' اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے متعلق غیر مسلم دنیا کیا تصور قائم کرے گی۔ کوئی حمیت نہیں' کوئی غیرت نہیں' ناموسِ رسالت ﷺ کا کوئی پاس نہیں' اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ جو کم بخت یہ کہے کہ نبی اکرم ﷺ کا احترام اور عزت اور حضور ﷺ کی ناموس مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں یہ چیزیں آپ کی طرف منسوب کروں کہ آپ ﷺ ایسے تھے' اسے کہا جاتا ہے کہ یہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ عزیزانِ من! جو میرے خلاف بیس سال

---

[1] امام مسلم بن حجاج (261-204ھ)' وطن نیشاپور' مجموعہ حدیث صحیح مسلم۔

سے ڈگڈگی بج رہی ہے کہ یہ مرتد ہے' ملحد ہے' بے دین ہے' وہ یہ ہے کہ میں ان حدیثوں کے متعلق' ان روایتوں کے متعلق' یہ کہتا ہوں کہ یہ وضعی ہیں' یہ اسلام اور حضور ﷺ کے دشمنوں نے وضع کی ہوئی ہیں' یہ سچی نہیں ہوسکتیں۔

حدیث کو پرکھنے کا معیار

میرے نزدیک حدیث کے پرکھنے کا یہ معیار ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف جاتی ہے' وہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہوسکتی۔ میں رسول اللہ ﷺ کی کسی سچی حدیث سے انکار نہیں کرتا۔ پہلی چیز یہی حدیث جو جادو والی ہے' قرآن کہتا ہے کہ یہ ظالم کافر حضور ﷺ کے خلاف اتہام لگاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو حدیث یہ کہتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہ جادو ہوا تھا اور اثر ہوا تھا' قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے۔ دوسرا معیار یہ ہے کہ اگر قرآن کی آیت صریح نہ بھی ہو' تو بھی ہر وہ روایت جس سے رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ اقدس ﷺ پہ کوئی طعن پڑتا ہو' یا صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی ناموس کو' یا حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کو' داغدار کرتی ہو' میرے نزدیک وضعی ہے' افسانہ ہے' دشمنوں کی بنائی ہوئی ہے' سچی نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ چیز کفر ہے' میں اپنے اس کفر پہ نازاں ہوں۔ ان حدیثوں' ان کے راویان اور ان کے جامعین میرے نزدیک اگر ان کی ان چیزوں سے رسول اللہ ﷺ کی ذات پر ذرا سا بھی داغ آتا ہے تو میرے نزدیک حضور ﷺ کے احترام کے مقابلے میں ان کا احترام کوئی شے نہیں ہے۔ میں حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کے اوپر ایمان لا کر مسلمان ہوا ہوں اور ایمان کے معنی یہ ہیں کہ میں حضور ﷺ کے کیریکٹر کو حضور ﷺ کی سیرت کو' دنیا کے سب سے بلند ترین انسان کی سیرت مانتا ہوں لیکن یہ یاد رکھیے جو میں نکتہ بیان کرتا ہوں کہ یہ بضد ان چیزوں کو رکھے ہوئے ہیں۔

حدیث کے متعلق مودودی صاحبؒ کے تصورات اور قرآنِ حکیم کی تعلیم کے نتائج

آپ حیران ہوں گے کہ انہی مودودی صاحب [1] کا بیان یہ ہے کہ میں ہر اس حدیث کو صحیح نہیں مانتا' جو ان کتابوں میں درج ہو چکی ہے' میں اپنی بصیرت سے ہر حدیث کو پرکھتا ہوں' میں مزاج شناسِ رسول ہوں' میری بصیرت جس حدیث کو سچا کہتی ہے میں اسے سچا مانتا ہوں۔ تو مودودی صاحبؒ کی بصیرت ان حدیثوں کو سچا مان رہی ہے۔ اہل حدیث کی تو مجبوری ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں جو آ گیا ہے ہم اس کو سچا ماننے پہ مجبور ہیں۔ چھوڑ دیجیے ان کو۔ میں ان سے کچھ بھی تعرض نہیں کرتا۔ یہ تو کہتے ہیں کہ میں ان میں سے بھی اس حدیث کو صحیح مانتا ہوں جسے میری بصیرت صحیح قرار دیتی ہے' تو گویا انہیں جب وہ Quote (حوالہ دینا) کرتے ہیں' درج کرتے ہیں تو

---

[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)

انہوں نے جنہیں اپنی بصیرت کے مطابق صحیح سمجھا ہے تو جو بصیرت ان کی رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو پیش کرتی ہے' خدا کرے کہ وہ آنکھیں اندھی ہو جائیں۔

عزیزانِ من! یہ ہے سارا مسئلہ حدیث کے اقرار و انکار کا۔ اس معاملے میں قرآن کہتا ہے کہ **وَ قَالَ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا** (25:8) [1]۔ ظالم یہ بھی کہتے ہیں اور قرآن **اُنۡظُرۡ** (25:9) کہتا ہے کہ ارے دیکھو لوگو! او دیکھو لوگو! کہ **کَیۡفَ ضَرَبُوۡا لَکَ الۡاَمۡثَالَ** (25:9) اے رسول! تیرے خلاف یہ کس کس قسم کی باتیں کرتے ہیں' کیسے کیسے اتہام لگاتے ہیں: **اُنۡظُرۡ** (25:9) دیکھو تو سہی۔ یہ خدا کہہ رہا ہے۔ **فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا** (25:9)۔ ان لوگوں نے صحیح راستے چھوڑ دیئے' یہ گمراہ ہوئے ہیں' اور جب تک یہ کچھ کہتے رہیں گے' ان کو صحیح راستہ مل ہی نہیں سکے گا۔ چودہ سو سال سے پیشتر زمانے کے جو لوگ تھے ان کی بھی یہ صورت تھی' آج بھی جو ان چیزوں کو صحیح مانتا ہے قرآن کے اس فیصلے کے مطابق' وہ **فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا** (25:9) گمراہ ہے' اسے صحیح راستہ مل نہیں سکتا' جب تک کہ وہ ان چیزوں کو سچا مانتا چلا جا رہا ہے۔ کہا کہ **تَبٰرَکَ الَّذِیۡۤ اِنۡ شَآءَ جَعَلَ لَکَ خَیۡرًا مِّنۡ ذٰلِکَ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۙ وَ یَجۡعَلۡ لَّکَ قُصُوۡرًا** (25:10) یہ کہہ رہے ہیں کہ خزانہ کیوں نہیں مل رہا' باغات کیوں نہیں آ رہے۔ کہا کہ یہ خزانے اور باغات معجزہ کے طور پر' کرامات کے طور پر' مل جائیں؟ یہ ایسے نہیں ہوگا' ذرا انہیں انتظار کرنے دو اور پھر دیکھو کہ یہ تو ایک بات کہتے ہیں' قیصر و کسریٰ کی تہذیبوں اور ان کی زمینوں کے کتنے باغات تمہارے پاؤں کے نیچے آتے ہیں۔ ذرا انتظار کرو۔ ان سے کہو کہ دیکھو تو سہی' کیسے آتے ہیں؟ یہ ہے معجزہ! کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ خزانے نہیں' کچھ بستیاں نہیں' ان سے کہو: **وَ یَجۡعَلۡ لَّکَ قُصُوۡرًا** (25:10) دیکھنا کیسے کیسے محلات آتے ہیں' میں تو ایک طرف رہا' میرے غلاموں کے پاؤں کے نیچے دیکھو گے کہ قیصر و کسریٰ کا تخت آ جائے گا۔ خدا کہہ رہا ہے کہ ان سے کہو کہ ذرا انتظار کریں لیکن آسمانی معجزے کے طور پہ نہیں بلکہ اس معجزے سے جو تم اور تمہارے ساتھی اپنے قوتِ بازو سے دکھاؤ گے کیونکہ **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ** (24:55) ہمارا یہ وعدہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ' اس دنیا کے اندر مملکت' سلطنت' حکومت' ہے۔ یہ تم لوگوں کو مل کر رہے گی' اور تاریخ اس چیز کی شاہد ہے کہ حضور کی حیاتِ طیبہ میں سارا عرب حضور کے زیرِ نگیں تھا۔ اتنی بڑی مملکت کے مالک حضور ہوئے تھے اور اس کے بعد جو حضور کے ساتھی معہ تھے' وہ چند سالوں کے عرصے میں چھا گئے۔

---

[1] یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایسے شخص کی پیروی کیوں کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے (اور اس طرح اس کا دماغ چل گیا ہے۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔817)۔

عزیزانِ من! پوری تاریخ عالم آج تک انگشت بدنداں ہے کہ چند سال کے عرصے میں ہزار ہا سال سے متمکن چلی ہوئی' ایران اور روما کی دونوں تہذیبیں' جو دنیا میں' اس زمانے میں' دو ہی تہذیبیں تھیں' کا تختہ الٹ کے رکھ دیا۔ صاحب! حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45AD) میں ایک مدائن ❶ کی جو فتح ہے اسے دیکھو کہ انہیں اس ایک ایران سے کیا کچھ ملا تھا۔ ❷ یہاں (25:10) میں جَـنّٰـتٍ آیا ہے تو یہ باغات کہہ رہے ہیں۔خزانے کتنے ملے تھے' کیا کچھ وہاں سے حاصل ہوا تھا' بڑی لمبی چوڑی تفصیل ہے اس کی۔ اور یہ ساری عراق کی زمینیں' مصر کی زمینیں' بازنطینی ایمپائر کی زمینیں' ان کے باغات یہ سب کچھ ملا تھا۔

قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ تَبٰرَکَ الَّذِیۡۤ (25:10)۔ وہ تَبٰـرَکَ ہے جہاں سے یہ سورۃ الفرقان شروع ہوئی ہے۔ یاد ہے' جو میں نے بتایا تھا کہ وہ جو اپنے مقام کے اوپر جم کے بھی کھڑا ہو اور نشوونما بھی پاتا چلا جائے اسے تبارک کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وہ ہے خدا کی ذات جو ایسی فراوانیوں اور خوشگواریوں کی مالک ہے۔تم اپنے اصولوں پر مستحکم رہو۔تم دیکھو گے کہ تمہارے اس شجر طیب' قرآن نے (14:24) میں یہ کہا ہے' کی جڑیں پاتال میں ہوں اور اُس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔تمہارا یہ نظام جس کے متشکل کرنے کی تم کوشش کر رہے ہو' اس قسم کے پھل لائے گا اور آپ دیکھیں گے۔ان سے کہو کہ تھوڑا سا انتظار کریں۔اس انقلاب کو آنے دیں کہ جس کے نتیجے میں یہ کچھ ملے گا اور جسے یہ کہہ رہے ہیں کہ بَلۡ کَذَّبُوۡا بِالسَّاعَۃِ (25:11) نہیں' یہ غلط ہے' یونہی دھمکیاں ہیں' وہ انقلاب کیسے آئے گا۔ یہ لوگ اس انقلاب کو جھٹلاتے ہیں۔

عزیزانِ من! اب درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ہم سورۃ الفرقان کی آیت 10 تک آ گئے' 11 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

---

❶ مدائن مملکت ایران کا دارالسلطنت (Capital) تھا۔ فتح مدائن 16ھ بمطابق 637ء کو حضرت سعدؓ کے زیر کمان ہوئی۔ اس وقت یزدگرد سلطنت ایران کا حکمران تھا۔

❷ ہیکل اور دیگر مورخین کی بیان کردہ تفاصیل کے مطابق حضرت سعدؓ کو کسریٰ کے خزانوں سے تیس کھرب دینار ملے اور محل (قصر ابیض) میں جو ساز و سامان تھا' اس کی قیمت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ساٹھ مربع گز کا تو صرف ایک قالین تھا جس پر مملکت کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی' جا بجا موتیوں کی نہریں تھیں' کناروں پر چمنستان تھا جس پر منقوش درختوں کے تنے سونے کے' پتے ریشم کے اور پھل جواہرات کے تھے۔ حضرت سعدؓ نے عمر فاروقؓ کو لکھا تھا کہ یہ تمام زر و جواہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہ تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لا کر قائد کے سامنے رکھ دیا۔ یہ معلوم ہونے پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکے گی؟ اس کے جواب میں جو کچھ حضرت علیؓ نے فرمایا اس دیانت اور امانت کا راز اس میں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ
''چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لیے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو اس کی نیت میں فرق آ جاتا (حوالہ ہیکل)۔''
پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' (1987)' ص ص۔ 181 تا 182)

چوتھا باب: سورۃ الفرقان (آیات 11 تا 16)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿١١﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ
مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴿١٢﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ
دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿١٣﴾ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿١٤﴾ قُلْ
اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ﴿١٥﴾ لَهُمْ
فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿١٦﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1978ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 11 سے ہو رہا ہے: (25:11)۔

سابقہ درس کی بازگشت: نبی اکرم ﷺ کی معاشرتی زندگی

سابقہ آیات میں بیان یہ چلا آ رہا تھا کہ نبی اکرم ﷺ معاشرہ میں ایک عالمگیر انقلاب کا پیام دے رہے تھے اور مفاد پرست گروہ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مکی زندگی کا آخری دور ہے جس میں ان کی مخالفت ابھی میدانِ جنگ تک نہیں پہنچی تھی۔ اس سے پہلے جس قدر حربے استعمال کیے جاتے تھے' وہ کر رہے تھے۔ ان میں تکذیب سب سے بڑی چیز تھی' یعنی ہر بات کو جھٹلانا' اعتراضات کرنا' الزامات لگانا' استہزا کرنا' مذاق اڑانا اور پھبتیاں کسنا۔ آخری چیز اس میں یہ آئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ دعویٰ کر رہا

کہ یہ خدا کا رسول ہے اور کیفیت اس کی یہ ہے کہ یہ عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا ہے' بازاروں میں سودا سلف لینے بھی جاتا ہے' تو یہ اس قسم کا آدمی خدا کا رسول کیسے ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی بات تو فوق البشر ہونی چاہیے' الوہیت کا کوئی انداز ہونا چاہیے' اس کے جلو میں فرشتے آئیں' گویا آگے آگے گل پوش کرتے ہوئے' پائلٹ کی طرح لوگوں کو آگاہ کرتے ہوئے چلے جائیں کہ پیچھے ہو جاؤ' صاحب چلا آ رہا ہے' اور اس طرح وہ لوگوں کو ڈرائیں۔

یہاں کہا ہے کہ **اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مَلَکٌ فَیَکُوۡنَ مَعَہٗ نَذِیۡرًا** (25:7)۔ کیا بات ہے! لوگوں کے آگے وہ چلے جا رہے ہوں' لوگوں کو ڈراتے جا رہے ہوں: بچنا' دیکھنا' ہوشیار رہنا' باملاحظہ' باادب' ہوشیار۔ اس کے ساتھ یہ کچھ نہیں ہے۔ یہ خود ہی جاتا ہے' خود ہی جا کر بازاروں سے سودا سلف لے کر آتا ہے' کوئی خزانہ اس کے پاس نہیں ہے' اور کچھ نہیں تو عربوں کے ہاں تو سب سے بڑی متاعِ حیات جاگیر' باغات ہوتے تھے' وہ تو جہاں پانچ سات کھجور کے پیڑ ہوتے تھے' اسے باغ کہا کرتے تھے' تو انہوں نے کہا کہ اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کچھ باغات ہی ہوتے۔ ان چیزوں میں سے ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں' یہ کس قسم کا رسول ہے اور جواب میں صرف اتنا سا فقرہ کہا تھا کہ ان سے کہو کہ تھوڑا سا انتظار کریں۔ یہ دیکھیں گے کہ انہی کے اردگرد دو تہذیبیں' جو ایران اور بازنطینی ایمپائر کی ہیں' ان کے کتنے لہلہاتے باغات اس کے پاؤں تلے آ جاتے ہیں۔ بس تھوڑا سا انتظار کریں' انہیں یہ سب کچھ نظر آ جائے گا۔ وہ کہتے تھے کہ تم تو بس ایک ہو' کوئی بڑا گروہ بھی تمہارے ساتھ نہیں ہے اور کہتے یہ کچھ ہو۔ کتنے دن انتظار کریں۔ جواب تھا کہ بس تھوڑا سا انتظار کرو اور دیکھو کہ کتنے ہی دفائن اور کتنے ہی خزائن اس کے قبضے میں آ جاتے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ **بَلۡ کَذَّبُوۡا بِالسَّاعَۃِ** ؕ **وَ اَعۡتَدۡنَا لِمَنۡ کَذَّبَ بِالسَّاعَۃِ سَعِیۡرًا ۚ اِذَا رَاَتۡہُمۡ مِّنۡ مَّکَانٍۭ بَعِیۡدٍ سَمِعُوۡا لَہَا تَغَیُّظًا وَّ زَفِیۡرًا ۚ وَ اِذَاۤ اُلۡقُوۡا مِنۡہَا مَکَانًا ضَیِّقًا مُّقَرَّنِیۡنَ دَعَوۡا ہُنَالِکَ ثُبُوۡرًا ؕ لَا تَدۡعُوا الۡیَوۡمَ ثُبُوۡرًا وَّاحِدًا وَّ ادۡعُوۡا ثُبُوۡرًا کَثِیۡرًا** (25:11-14)۔ یہ عجیب آیات آ گئیں۔ کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ ''الساعۃ'' کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو میں نے دہرا دیئے ہیں۔ یعنی یہ جھٹلاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ غلط بات ہے' ایسا نہیں ہو سکے گا۔ تکذیب کرتے ہیں۔

اب لفظ آ گیا ''الساعۃ''۔ یعنی ساعت کی تکذیب کرتے ہیں اور آگے یہ ہے کہ جب ''الساعۃ'' آئے گی تو پھر انہیں پتہ چلے گا کہ وہ ہوتی کیا ہے' یہ سچ بن کر بھی سامنے آ جائے گی اور پھر یہ چیزیں بھی انہیں نظر آ جائیں گی۔ دور سے ہی اس کی آواز سنیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قدر ہوش ربا چیز ہے اور جب اس کے اندر گر جائیں گے تو یہ دیکھیں گے کہ زنجیریں پہنائی ہوئی ہیں' کوٹھڑیوں کے اندر بند کیے ہوئے چیختے چلاتے ہیں۔ اس وقت وہاں یہ ایک تباہی کو آواز دیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ ایک تباہی نہیں' بہت سی تباہیاں ہیں۔ یہ ملخص ہے' ان آیات کا۔

قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کو روزِ قیامت پر اٹھا رکھنے کا نتیجہ

بات ہے الساعۃ کی اور کہا یہ ہے کہ یہ الساعۃ کی تکذیب کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو جب دین نے مذہب کی شکل اختیار کی تو قرآنِ کریم کی یہ جو قیامت' الساعت اور مکافاتِ عمل' انسانی اعمال کے نتائج کے ظہور وغیرہ کی اصطلاحات تھیں ہم نے ان سب کو مرنے کے بعد کی جو قیامت ہے' اس پر اٹھا رکھا ہے کہ یہ سب کچھ وہاں ہوگا۔ اس لیے کہ یہاں تو پھر مذہب میں جو بھی مذہبی امور ہوتے ہیں' اعمال ہوتے ہیں' رسوم ادا کی جاتی ہیں' پرستش کی جاتی ہے' عبادت کی جاتی ہے' اُن کا کوئی مرئی (Visible) نتیجہ یہاں تو سامنے آتا ہی نہیں' تو اس پہ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ تم کراتے ہو' کرتے بھی ہو' لیکن بے نتیجہ ہے جب کہ دوسری طرف سے جواب یہ ہوتا ہے کہ نہیں' یہ بے نتیجہ نہیں ہیں' اس کا نتیجہ ضرور نکلے گا' اس دنیا میں نہیں نکلے گا' آخرت میں جا کے نتیجہ نکلے گا۔ اب اس کو تو کوئی جھٹلا ہی نہیں سکتا' نہ Verify (تصدیق) کر سکتا ہے۔ اس کے لیے تو آپ کو صرف ایک عقیدے کی ضرورت ہے کہ وہاں جا کے نکلے گا اور یہاں تو کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں جب دن بدن حالت غیر سے غیر ہوتی گئی' پستیاں اور ذلتیں اس قوم پہ مسلط ہوتی گئیں' تو کہہ دیا کہ خدا اپنے نیک بندوں کو آزماتا رہتا ہے۔ چلیے' تو اب اس چیز سے ہی کہ ہم ذلیل وخوار ہو گئے' ایک ذہنی Satisfaction (طمانیت) ہو گئی کہ ہم خدا کے اور محبوب بندے بنتے چلے جا رہے ہیں۔ یوں اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا اور کہا گیا کہ یہ جو دنیا ہے یہ ان مفاد پرستوں کے لیے ہے' باطل پرستوں کے لیے' کفار کے لیے' ملحدین کے لیے' فاسق وفاجر کے لیے ہے بس قیامت میں' جنت سب تمہارے لیے ہے' یہ چند دن کی بات ہے' انہیں سب کر لینے دیجیے' بس آخرت میں یہ سب جہنم میں جائیں گے اور تم سب جنت میں چلے جاؤ گے۔ یہ ایک عقیدہ ہے۔

انسان کی موجودہ زندگی نتائج کے لحاظ سے ایک کسوٹی ہے

یہ ٹھیک ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی برحق ہے۔ اس پہ ہمارا ایمان ہے لیکن قرآنِ کریم اقوام کے اعمال کے لیے ظہورِ نتائج کا وقت' مرنے کے بعد قیامت کا' اور حشر کا دیہاڑہ' ہی نہیں مانتا' وہ اس دنیا کے اندر ان کے نتائج کو سامنے لاتا ہے اور یہی ہے وہ کسوٹی جس سے یہ چیز پرکھی جا سکتی ہے کہ ہمارے کام خدا کے پروگرام کے مطابق ہیں یا ان کے خلاف جاتے ہیں۔ اگر ان کا نتیجہ وہ نہیں ہے جو خود خدا نے بتا دیا ہے تو ہم کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ یہ خدا کی منشا کے مطابق نہیں ہو رہا۔ یہ ٹیسٹ ہو جائے گا' کسوٹی پہ کسا جائے گا۔ یہ معیار ہے پرکھنے کا' سچ اور جھوٹ کا' غلط اور صحیح کا' حق اور باطل کا۔ یہاں پتہ لگنا چاہیے کہ یہ جو انہوں نے مجھے سوال دیا تھا اس کا جواب صحیح نکلا ہے یا نہیں۔ جواب اس کتاب کے پیچھے ہونا چاہیے ورنہ یہ کہہ جانا کہ تم سوال نکالتے چلے جاؤ اور جواب کے لیے جب تم فیل ہو جاؤ گے تو اس کے بعد بتایا جائے گا۔ قرآن ان کے جواب یہاں بتاتا ہے اور اسی کے مطابق قرآن سے اس کی اصطلاحات کا

مفہوم متعین کرنا چاہیے۔ ان اصطلاحات میں قیامت بھی ہے۔ ذہن میں اس کا مفہوم ہی یہ آتا ہے کہ مرنے کے بعد جب مردے اٹھائے جائیں گے اور وہاں وہ حشر کے میدان میں جو کچھ ہوتا ہے وہ قیامت ہے۔ قیامت کا یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے' کوئی دوسرا مفہوم آتا ہی نہیں۔

انقلاب' ملک عظیم اور زبانِ عربی

قرآن سے پوچھیے تو وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ وہ تو مردوں کا جینا ہے۔ اسی دنیا کے اندر ایک انقلاب آتا ہے اور آج تو اسے ہم Revolution (انقلاب) کہتے ہیں۔ آپ اس قوم کا اندازہ لگائیے جو میں بار بار کہا کرتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام [1] کی اولاد میں سے حضرتِ اسحٰق علیہ السلام کی اولاد' بنی اسرائیل' تو شوکتِ داؤدی اور سطوتِ سلیمانی کی مالک بنی' ملک عظیم کی مالک بنی اور ان کے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قوم وادی غیر ذی زرع میں جا بسی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ان ہزار سالوں میں کیا کرتی رہی؟ یہ ایک زبان بناتی رہی جو قرآن کے حقائق کی متحمل ہو سکتی تھی' انہوں نے خود سختیاں برداشت کیں' یہ وہیں وادی غیر ذی زرع میں رہے جہاں کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ سامنے نظر آتا تھا کہ وہ حضرت اسحٰق کی اولاد' چچے اور چچا کے بیٹے تھے' ان کے پاس اتنی بڑی حکومتیں' اتنی بڑی مملکتیں ہیں اور یہ اس وادی غیر ذی زرع میں زندگی بسر کر رہے ہیں' لیکن معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ فطرت کا ایک متعین پروگرام تھا۔ اس کے لیے یہ ساری دنیا سے Cut-off (منقطع) ہو کر اس پروگرام میں لگے رہے اور زبان وہ بنا دی کہ دنیا میں جس کی نظیر نہیں ہے۔ بڑے بڑے مستشرق' جو عربی زبان کے بڑے فاضل ہیں' وہ اعتراف کرتے ہیں کہ جو زبان نزولِ قرآن کے وقت ان عربوں نے بنا دی تھی' دنیا کی کوئی زبان' وسعت میں بھی' گہرائیوں میں بھی اور بلندیوں میں بھی' اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

لفظ قیامت کا مفہوم

اب آپ اس زبانِ عربی کی یہ مثال دیکھ لیجیے: ''قیام'' کا لفظ ہمیں معلوم ہے۔ عرب بھی اسے ''کھڑے ہونا'' کے لیے بولتے تھے اب اگر میں اسی لفظ کے اندر اس کی خصوصیات بتاتے ہوئے چلا جاؤں تو اس کے لیے پورا درس چاہیے۔ یہ وہی ''ق و م'' تو ہے۔ آدمی کھڑا نہیں ہو سکتا جب تک اس کا توازن برقرار نہ ہو۔ ذرا توازن بگڑے' کھڑا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کہتے ہیں کہ ''قوام'' صحیح ہو گیا ہے۔ یہ لفظ توازن کے لیے ہے۔ کھڑے ہو جانا کہ اس میں قیام آ گیا۔ توازن ہو تو آدمی کھڑا ہو سکتا ہے۔ پہلی شرط تو یہی ہوئی اور یہ اسی مادے ''ق و م'' کے اندر لفظ موجود ہے۔ یہ تو ہو گیا ''کھڑے ہو جانا''۔ اس ''قیام'' کے آگے انہوں نے وہ ''ۃ'' لگائی۔ وہ بنا

---

1. تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ 2200 ق م کا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ 1000 ق م ہے۔

قیامۃ۔ اوراس کے معنی ہوگئے: یکبارگی کھڑا ہونا' یکلخت کھڑے ہوجانا' فوراً کسی چیز کا اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ عربی زبان کے اندر ''ۃ'' کا نتیجہ ہے۔ جسے آج آپ Revolution (انقلاب) کہتے ہیں وہ ہوتا کیا ہے؟ ان اصطلاحات کا مفہوم اور معنی خود قرآن نے اپنے ہاں واضح کر دیئے۔ مثلاً کہا کہ **یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (83:6)۔ اس دنیا کے اندر القیامۃ کیا ہے؟ جب الناس یعنی پوری کی پوری نوعِ انسانی' جسے آج عوام (Masses) کہتے ہیں' عالمگیر ربوبیت کے پروگرام کی تکمیل کے لیے یکبارگی اٹھ کھڑے ہوں گے' اسے اس دنیا کے اندر قیامت کہا گیا ہے۔ آج آپ کے ہاں جو اصطلاح Evolution (ارتقاء) ہے' یہ Revolution (انقلاب) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس وقت جب یہی لفظ جو قیام ہے' اس کے بعد وہ عرب ''ۃ'' لگا دیتے ہیں تو قیامۃ بنا دیتے ہیں اور اس کے بعد ہے: کسی کا یکبارگی کھڑے ہوجانا اور خدا یہ کہتا ہے کہ **یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (83:6) جب انسانیت ربوبیت عالمینی کے پروگرام کی تکمیل کے لیے یکبارگی By Revolution (انقلاب کے ذریعے) کھڑی ہوجائے گی لیکن یہ جو کھڑے ہونا ہے یہ فساد کے لیے نہیں ہوگا۔ اس کے لیے کہا کہ **وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا** (39:69) اور یہ کرّہ ارض خدا اور ربوبیت کے ضامن خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔ یہ اس زندگی کا القیامۃ ہے اور قرآن نے اس کے لیے اتنی تفصیل دی ہے کہ آپ اس میں جائیے تو نظر آجاتا ہے کہ پھر یہ القیٰمۃ اس زندگی کے اندر کیسے برپا ہوتی ہے۔

لفظ الساعۃ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اسی کے لیے ان کے ہاں ایک لفظ الساعۃ ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ ساعۃ کا مادہ ''س و ع' بھی ہے اور ''س ی ع'' بھی لیکن الساعۃ واوی ہے' یائی نہیں۔'' ان کے ہاں ''ساع'' کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا ایک مقام پہ جامد کھڑے نہ رہنا' بلکہ اس میں تبدیلی ہوتے چلے جانا۔ اب یہ جو تبدیلی ہے' میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ تو یہ فلسفیانہ تجریدی' Abstract (غیر محسوس) بحثیں جانتے ہی نہیں تھے' یہ محسوس چیزوں کے اندر بات سمجھاتے تھے۔ آپ یہ دیکھیے کہ یہ تبدیلی کے لیے کیا کہتے تھے؟ آج تو ہمارے ہاں گھڑیاں ہیں' ان سے ہم وقت پہچانتے ہیں۔ اُس زمانے میں تو گھڑیاں نہیں تھیں۔ اب بھی ان لوگوں کے ہاں جو صحرائی باشندے وغیرہ ہیں وہ دھوپ کے سائے سے وقت پہچانتے ہیں اور اس تجربے سے ان کو اتنی مشق ہوجاتی ہے۔ راتوں کو وہ ستاروں سے وقت پہچانتے ہیں۔ دن کے وقت وہ دھوپ سے وقت پہچانتے ہیں۔ دھوپ گھڑیاں' اب بھی ہمارے ہاں' پرانے زمانے کی کہیں رکھی ہوئی موجود ہوتی ہیں لیکن اس سے آپ دیکھیے' صحرا کے اوپر یہ سایہ بڑھتا جاتا ہے' محسوس نہیں ہوتا کہ کب بڑھ رہا ہے۔ آج بھی اگر آپ کی گھڑی کی جو منٹ کی سوئی ہے' وہ اس میں سے غائب ہوجائے' سیکنڈ کی ہو ہی نہیں اور منٹ کی ہوجائے غائب۔ آپ رکھیے سامنے اس گھڑی کو۔ ایک سے دو' دو سے تین' تین

سے چار، تو اس میں وہ چلتی جائے گی، کبھی محسوس نہیں ہوگا کہ یہ گھنٹے کی سوئی چل کیسے رہی ہے۔ یہ جو اس طرح سے سایہ بڑھتا تھا جس میں محسوس ہی نہ ہو، یہ بھی ایک تبدیلی تھی لیکن وہی اس ''ساع'' کے بعد جب ''ساعۃ'' کہتے تھے تو اس کے معنی ہیں کہ اس قسم کی تبدیلی کا یکبارگی ہو جانا۔ جسے آپ یکبارگی کہتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ وہ بھی اصل میں یکبارگی نہیں ہوتا۔ عجیب چیز ہے قرآن کی یہ۔ کہتا ہے کہ پہلے غیر محسوس طور پر اس کے جو امکانات ہیں وہ غیر محسوس طور پر آتے رہتے ہیں، انسان کو پتہ نہیں چلتا وہی دھوپ گھڑی کی طرح جو صحرا میں چل رہی ہوتی ہے، پتہ نہیں چلتا۔ ایک وقت آجاتا ہے جب اس میں Maturity آجاتی ہے، وہ پختگی پیدا ہوتی ہے تو اس کی نمود ہو جاتی ہے۔ عام نگاہیں کہتی ہیں کہ یہ یکبارگی ہو گیا حالانکہ اس کا جو طریق عمل یا پروگرام تھا، بہت پہلے سے شروع ہوا تھا۔ جس وقت یہ اس قسم کا تبدیلی کا عمل محسوس شکل میں، نمود کی صورت اختیار کر لے، یوں سامنے آجائے، وہ اسے ساعۃ کہتے تھے۔ قرآن نے اس پہ ''ال'' لگایا، اس اسم نکرہ کو اسم معرفہ بنایا The definite ہے۔ اب یہ جو قرآنی انقلاب ہے اس کے لیے یہ الساعۃ آگیا۔

بنی اسرائیل کی داستان کے تفصیلی بیان میں لفظ الساعۃ کا استعمال

آیئے ذرا قرآن سے سمجھیں کہ پھر وہ الساعۃ کسے کہتا ہے۔ یہ جو انقلاب کا عظیم واقعہ ہے، قرآنِ کریم اس کے لیے داستانِ بنی اسرائیل کو پیش کرتا ہے یا کشمکش صاحب ضربِ کلیم اور فرعون، بڑی تفصیل سے قرآن بیان کرتا ہے۔ فرعون استبداد کا مجسمہ، دنیا میں ضرب المثل، فرعونیت استبداد کی ایک شکل جو مغلوب اور مفتوح قوم کے جسموں کو مسلط کرتی ہے، قارون جو Economically (معاشی طور پر) ان کو غلام بناتی ہے، اقتصادی طور پہ ان کو اپنا محتاج رکھتی ہے، پھر غلام بنا دیتی ہے اور مذہبی پیشوائیت ہامان، جو اس سارے استبداد کو اور اس سرمایہ داری کے نظام کو مقدس سند عطا کر کے کہتی ہے کہ یہ سب غریبی اور امیری، مفلسی اور دولت مندی خدا کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ لکھ کے رکھ دیا ہے۔ جس کے حصے میں وہ دیتا ہے، تمہیں اس کے خلاف شکایت کرنے کی کوئی بات نہیں۔ فرعون، ہامان اور قارون بیک زمانہ ایک دور میں اکٹھے ہوئے اور ان کے نیچے بنی اسرائیل کی قوم تڑپتی پھڑکتی کچلی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کس قسم کا تقابل کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ، جسے کہتے ہیں آگ لینے وہ گئے تھے پیغمبری مل گئی تھی، وہاں جب آپ علیہ السلام سے کہا گیا کہ جاؤ فرعون کی طرف کیونکہ **اِنَّهٗ طَغٰى** (20:24,43) وہ حدود فراموش ہوتا چلا جا رہا ہے، وہ پانی ساحلوں کے اندر گھرا ہوا نہیں رہا، اس نے ساحلوں کو توڑ دیا ہے، سیلاب بن رہا ہے، بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں، جاؤ فرعون کی طرف، روکو اسے اس سے۔ عرض کیا کہ یہ تو اس قدر مجسمے استبداد کے اور پھر وہ تینوں قوتیں جو انسانیت کش ہوتی ہیں وہ وہاں جمع ہیں۔ میری کیفیت یہ ہے کہ میں تو یہاں ایک چرواہا، اس ملک سے بھاگ کے آیا ہوا، ایک ''جرم'' بھی میرے ذمے لگا دیا گیا ہے، میری قوم جو وہاں بستی ہے وہ ان کی محکوم ہے، اس نے استبداد سے یہ کیا ہے کہ اس قوم کے اندر

جتنے بھی سرکردہ ابنائے قوم اسے نظر آتے تھے **یَذْبَحُوْنَ** (2:49) ان کو اس نے ذبح کر دیا ہوا ہے' کچل کے رکھ دیا ہے' کسی ایک کو بھی ابھرنے نہیں دیتا' جوان کے اندر باقی رکھے ہوئے ہیں ان میں ایسی صفتیں پیدا کر دی ہوئی ہیں کہ وہاں جوہرِ مردانگی رہا ہی نہیں۔ مجھے آپ اس قوم کے اندر اس کی طرف بھیج رہے ہیں' اس ساز و یراق کے ساتھ کہ میں ایک تبدیلی پیدا کروں' انقلاب پیدا کروں' جو ہو رہا ہے اُسے الٹ کے رکھ دوں۔ انقلاب کے تو یہی معنی ہیں۔ یہ میں کروں؟ کہا کہ موسیٰ علیہ السلام! سنو۔ بڑی غور طلب چیز ہے۔ کہا کہ **اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ** (20:15) **السَّاعَةَ** کے معنی قرآن سے سمجھیے کہاں آیا ہے یہ **السَّاعَةَ**؟ موسیٰ **السَّاعَةَ** کی گھڑی آ گئی ہے۔

اس کائنات کے اندر کوئی امر یکبارگی نہیں ہوتا

یہیں سے یہ نظر آتا تھا کہ وہ کچھ ہو رہا تھا تو اب اس کے ظہور کا وقت آ گیا ہے' الساعۃ کی گھڑی آ رہی ہے۔ آگے ہے کہ **اَكَادُ اُخْفِيْهَا** (20:15) یہ اس سے پیشتر غیر مرئی (Invisible) طور پہ' کچھ اندر ہی اندر' ہو رہا تھا۔ غور کیجیے' عزیزانِ من! یعنی قرآن کس طرح یہ بات سمجھاتا ہے کہ جسے نظر بظاہر یہ دیکھا جاتا ہے کہ یکبارگی ایک چیز ہو گئی ہے' وہ یکبارگی نہیں ہو رہی ہوتی۔ پہلے وہ نگاہوں سے پنہاں ہوتی ہے۔ کہا جو الساعۃ ہے' اس کے نمود کا وقت آ گیا ہے: **اَكَادُ اُخْفِيْهَا** (20:15)۔ وہ چلی تو آ رہی تھی ایک عرصے سے لیکن غیر محسوس طور پر' اندر ہی اندر' وہ ایک لاوا پک رہا تھا۔ اب ہمارا پروگرام یہ ہے کہ اس کو بے نقاب کر دیں۔ بس یہ ہے جو کچھ ہے۔ وہ محسوس طور پہ سامنے آ جائے گی' یہ ہو جائے گا۔

اس انقلاب کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟

عزیزانِ من! بات دوسری طرف نکل جائے گی لیکن کیا کروں آیت کے دو الفاظ آگے بھی تو ہیں۔ کاہے کے لیے یہ انقلاب ہو گا؟ اس نے یہیں بتا دیا کہ فساد اور انقلاب میں کیا فرق ہوتا ہے؟ فساد میں بھی تو ایک نظام ہوتا ہے' اس کو بدلا جاتا ہے' اکھیڑا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کاہے کے لیے اکھیڑا جاتا ہے؟ یہ جوان ہاتھوں سے' انقلاب لانے سے تبدیلی آتی ہے' وہ تبدیلی جو خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے وجود میں لاتے ہیں' جسے قرآن نے کہا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں یہ انقلاب آتا ہے' اس سے کیا ہوتا ہے؟ جھوم جائیے' عزیزانِ من! بات ایسی ہے جیسے کوئی داستان بیان کر رہا ہے' قرآن تاریخ کا واقعہ بیان کر رہا ہے لیکن وہ صرف واقعات بیان نہیں کرتا' وہ تو ہر واقعہ کے ساتھ' جو اس کا نتیجہ ہے' مقصد ہے' منتہا ہے' مطلوب ہے' مقصود ہے' واقعہ کے ساتھ ہی اس کو بیان کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ ''الساعۃ'' آ رہی ہے۔ کاہے کے لیے آ رہی ہے؟ اس لیے کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ انقلاب آ جائے' الساعۃ نمود ہو جائے تا کہ **لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى** (20:15) ہر محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلا ملے' اس لیے ہم یہ انقلاب لا رہے

ہیں۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ یہ جو الساعۃ کا لفظ ہے یہ انقلاب کا وہ Process (عمل) ہے جو پہلے غیر محسوس طور پر، مضمر طور پر، اندر ہی اندر چلا آ رہا ہوتا ہے، اس کے نمود کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ فوراً ہو گیا۔ وہ فوراً یہی بات ہے جیسے میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جو ''ۃ'' لگا کے فوراً بنا دیتے ہیں، اصل میں تو وہ پروسیس (عمل) ہوتا ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہوتا ہے۔

لفظ الملوک کے سلسلہ میں اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا اظہار

قرآنی بصیرت رکھنے والے ہمارے دور کے اقبالؒ (1877-1938) نے بڑے حسین انداز میں اس چیز کو کہا ہے۔ یہ بانگ درا[1] میں ہے۔ بہر حال خوش ہو جایئے کہ آج وہ شعر اردو میں ہیں اگر چہ اب مجھ سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اردو کا بھی ترجمہ کیا کرو:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک

یہ قرآنِ کریم کی ایک تنبیہ ہے اور وہ سورۃ النمل کی 34 ویں آیت ہے، جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ ہے جب وہ یمن کی طرف، ملکہ سبا کے ملک کی طرف چلے جا رہے تھے۔ یہ اطلاع پہنچی تو ملکہ نے اپنے مشیروں کو بلایا، Cabinet (کابینہ) کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ بقول ان کے، دشمن حملہ آور ہو رہا ہے تو کیا کیا جائے؟ جیسے کہ ان لوگوں کا جو مصاحب ہوتے ہیں قاعدہ ہے کہ صاحب! ہم کوئی چوڑیاں پہنے ہوئے نہیں بیٹھے ہیں، ہم مقابلہ کریں گے، جائیں گے، لڑائی کریں گے لیکن کچھ نظر آتا ہے کہ ملکہ ان سے زیادہ سمجھدار تھی۔ اس نے کہا کہ **قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا** (27:34) اس نے کہا کہ تمہیں پتہ نہیں ہے جب بادشاہ، یہاں ملوک کا لفظ آیا ہے، کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں، کسی ملک میں چڑھائی کر کے آتے ہیں، اور اس کو فتح کر لیتے ہیں اُسے تہ و بالا کر دیتے ہیں، وہاں ہر چیز کو الٹ کے رکھ دیتے ہیں: اوپر کے نیچے اور نیچے کے اوپر۔ پنجابی اچ کیندے نیں ہیٹھ نوں اُتے کر دیندے نیں۔[2] **اَفْسَدُوْهَا** (27:34) کیا لفظ ہے جو یہاں آیا ہے! فساد کے معنی ہی یہ ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ اس کے لیے کہا کہ **وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً** (27:34) جو صاحب عزت اور صاحب اقتدار نظر آتا ہے، اس کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں، کمزور بنا دیتے ہیں۔

---

[1] یہ ''خضر راہ'' میں ''جوابِ خضر'' کے ذیلی عنوان ''سلطنت'' میں ہے۔ اقبالؒ (1996)۔ اقبالؒ (1996)۔ بانگِ درا۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ ص۔ 271 تا 272

[2] اسے پنجابی میں کہتے ہیں کہ اعلیٰ طبقہ (Elite) کو پست (Down-Trodden)، اور پست طبقہ (Down-Trodden) کو اعلیٰ (Elite) میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

مومن کے انقلاب کی پہچان: امن کا پیغام

عزیزانِ من! اس میں بھی ایک بڑی چیز ہے کہ ملوک کیا کرتے ہیں‘ ملوکیت کیا کرتی ہے؟ ٹھیک ہے کہ دوسرے کو مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ مغلوب کرنے کے بعد وہ جو اُن کا انتقام کا جذبہ ہوتا ہے‘ ملوکیت اس جذبہ انتقام کی تسکین اس طرح کرتی ہے کہ جو صاحب عزت نظر آتا ہے‘ وہ اسے ذلیل کرتی ہے حالانکہ یہ بھی انسان ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو انقلاب خدا کے بندوں کے ہاتھ سے ہوتا ہے وہ اس نظام کو تو الٹتا ہے‘ انسانوں کو ذلیل نہیں کرتا۔ اس کا مقصد انسانوں سے انتقام لینا نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد باطل نظام کی جگہ حق کے نظام کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ ملوکیت یہ کرتی ہے کہ **وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً** (27:34) وہ اربابِ عزت واقتدار کو ذلیل کرتا ہے۔ سمجھ رکھو کہ ملوکیت یہ کیا کرتی ہے اور آگے فقرہ ہے کہ **وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ** (27:34) یہ بات کوئی خاص بات نہیں ہے‘ ایسا ہی ہوتا ہے‘ ملوکیت کی ذہنیت ہی ایسی ہے کہ وہ یہ کرتی ہے اس لیے تم سمجھ لو کہ یہ جو کہتے ہو کہ کوئی بات نہیں ہے‘ اس سے ہم ٹکر لیں گے‘ جنگ کریں گے‘ مجھے جو اطلاعات پہنچی ہیں ہم اس کے حریف نہیں ہو سکتے‘ ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے‘ اور مقابلے میں جب مغلوب ہو جائیں گے‘ مفتوح ہو جائیں گے‘ تو اس پہ کچھ سوچ رکھو کہ بادشاہ چلا آ رہا ہے۔ اس کے نزدیک تو وہ سلیمان علیہ السلام بادشاہ ہی تھا حالانکہ یہی داستان جب سامنے آئے گی تو پھر میں عرض کروں گا کہ حضرتِ سلیمان علیہ السلام نے اس سے کیا کہا تھا۔ کہا یہی تھا کہ میں بادشاہ نہیں ہوں‘ صرف خدا کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں‘ صرف میں اقبالؒ (1877-1938ء) کے ان اشعار کی بات کر رہا تھا:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک

اب دیکھ لیا کہ کس آیت کی یہ شرح بیان کر رہا ہے‘ یہی ملکہ سبا ہے۔ جس نے کہا تھا کہ **اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً** (27:34)

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو الساعۃ ہے‘ معلوم یہ ہوتا ہے کہ By Revolution (انقلاب کے ذریعے) ہوتی ہے‘ یکلخت و یکبارگی آتی ہے۔ یہ تو کوہِ آتش فشاں کا لاوا ہوتا ہے‘ اندر پک رہا ہوتا ہے‘ کسی ایک وقت میں وہ پھٹ کر باہر آ جاتا ہے۔ یہ جو دور ہوتا ہے‘ وہ اندر اندر رہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے ملوکیت کرتی کیا ہے؟ سنیئے اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادُوگری

وہ ان محکوموں کے اوپر‘ مفتوحوں کے اوپر‘ سحر کرتی رہتی ہے مگر انداز یہ ہوتا ہے کہ حکومت نے تمہیں آزادیاں دی ہیں‘ ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں مگر

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

اور اس کی مثال یہ ہے:

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

محمود کا جادو یہ ہے کہ وہ محکوم کی گردن میں غلامی کا طوق پہنا تا ہے۔ انداز دیکھیے کہ ایاز کہتا ہے کہ کیسا خوشنما گلوبند ہے جو آپ نے مجھے عطا کر دیا۔

اقبالؒ کہتا ہے کہ یہ کچھ تو اندر اندر ہوتا رہتا ہے: پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری۔ دیکھا اس نے ساحری کا کیا عجیب لفظ استعمال کیا ہے! جادو کوئی محسوس قسم کی استبداد کی چیز نہیں ہوتی۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کسی قسم کا تشدد ہو رہا ہے، ظلم ہو رہا ہے، خاموشی ہی خاموشی ہے ہوا جاتا ہے لیکن وہ ''الساعۃ'' آ گئی، پھر وہی جو قرآن نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا ہم نے کہا کہ ''الساعۃ'' آ رہی ہے:

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

اور اسے ''الساعۃ'' کہتے ہیں۔

طلسمِ سامری کو توڑنے کا طریق حضور ﷺ کی عملی زندگی کا نمونہ ہے

یہ ہوتا کیسے ہے؟ اقبالؒ ہے، عزیزانِ من! ٹھیک ہے آمروں کو سامری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی اس کا طلسم توڑ دیتا ہے۔ کیسے؟ خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں۔ یہ ضرورت ہے کہ اس مفتوح قوم کا خون جوش میں آئے تو پھر کوئی موسیٰ علیہ السلام طلسم سامری توڑتا ہے اور جب طلسم سامری ٹوٹتا ہے تو وہ ہے وقت کہ جس کو قرآن الساعۃ کہتا ہے: **اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا** [1] (20:15)۔ یہ طلسم، یہ جادوگری، یہ استبدادِ فرعونی، یہ پیشوائیت، یہ قارونیت خاموش ہی خاموش چلی آ رہی تھی، اپنا اثر کیے چلے جا رہی تھی۔ کہا کہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ اب اس کی نمود کی گھڑی آ جائے جب یہ طلسم ٹوٹتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، قرآن کہتا ہے کہ **بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ** [2] (25:11)۔

---

[1] (اس حقیقت کو یاد رکھ کہ تیرے ہاتھوں ایک) عظیم انقلاب (Revolution) رونما ہونے والا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب، جو اس وقت تک ظاہر بیں نگاہوں سے پوشیدہ تھا، ابھر کر سامنے آ جائے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 705)۔

[2] لیکن یہ لوگ اس آنے والے انقلاب (Revolution) کے متعلق کہتے ہیں کہ یونہی دھمکیاں ہیں۔ یہ اسے جھٹلاتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 817)۔

اب' عزیزانِ من! ساعۃ کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ حضور ﷺ کی نبوت کا زمانہ تیئیس سال کا ہے۔ یہ نبوت بھی آخری نبوت ہے' جو قیامت تک کے لیے پھیلی ہوئی ہے۔ نبوت کا ایک ایک لمحہ' ایک ایک سانس' صدیوں پر بھاری ہے' قیامت تک کے لیے تیئیس سال کا عرصہ ہے۔ اس میں تیرہ سال کا مکی دور کا عرصہ ہے۔ اس کے اندر ایسا نظر آتا ہے کہ جیسا کچھ ہوا ہی نہیں۔ آج کے پیمانوں سے کسی سے پوچھیے۔ ہمارے ہاں یہ زمانہ Speed (تیزی) کا آ گیا ہے: برق رفتاری کا' تیزی کا۔ یہ اسپیڈ (Speed) صرف ہوائی جہازوں میں ہی نہیں ہوئی' آسمان تک پہنچنے والے ان آلات میں ہی نہیں ہوئی' یہ ذہنوں میں بھی ہوگئی ہے۔ اب ذہن لمبا عرصہ برداشت ہی نہیں کرتا۔ یہ فٹا فٹ شبا شب (Over-night) چاہتے ہیں کہ انقلاب آئے۔ شبا شب فساد تو پیدا ہو سکتا ہے' انقلاب نہیں آ سکتا۔ جسے آپ باہر کے زمانے کی نمود کہتے ہیں' وہ کڑیاں کہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ رات کو درخت ٹنڈ منڈ ہوا دیکھا' ایک پتہ بھی نہیں' صبح اٹھے تو یکلخت اس میں سے جناب! ہزاروں نئی کلیاں حیاتِ تازہ کا پیغام لیے ہوئے ابھرتی چلی آ رہی ہیں۔ یہ راتوں رات نہیں ہوتا۔ بہت پہلے سے یہ پروسیس (عمل) شروع ہوتا ہے۔ وہ تیرہ سال کا جو عرصہ تھا' وہ اس بہارِ نو کی کلیوں کی تیاریوں کا زمانہ تھا' نظر نہیں آتا تھا' نہایت خاموشی سے یہ کچھ ہو رہا تھا' اور اس کے بعد آتے ہی مدنی زندگی ہے۔ خزاں کا آخری پتہ جھڑ گیا اور صبح ہوتے ہی بہارِ تازہ کے پیغامات آنے شروع ہو گئے۔ قرآن کہتا ہے کہ **كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ** (14:24) یہ شجرِ طیب کی طرح ہے' جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور اس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ بہارِ تازہ کے پیغامات آنے شروع ہو گئے۔ یہ تھی جو مدینے کی زندگی میں جانے کے بعد' دوسرے ہی سال الساعۃ شروع ہو گئی۔ کہا کہ یہ الساعۃ کی تکذیب کر رہے ہیں۔ مکی زندگی میں ایک طرف' یہ مختصر سی جماعت' چند نفوس پر مشتمل ہے۔ ان میں بھی بیشتر ایسے ہیں جو غلام تھے' محکوم تھے' غریب تھے' مفلس تھے' کمزور تھے' اور وہ بھی چند نفوس۔ تیرہ سال کی رسالت' کا دور ہے' صرف تیرہ سال کی رسالت' ان کی نگاہوں میں ''کوشش'' ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ آج کا ذہن' جس تیزی سے جا رہا ہے' اس میں ہر شخص Frustrated (ناامید) ہو کر بیٹھ جائے کہ صاحب! ہوتا ہی کچھ نہیں ہے: اوکر کی لیا؟ اے تیرہ ورے ہو گئے ٹکراں ماردیاں نوں۔ سانوں تے لگدا اے ماردتا ہویا اے۔ او ہویا کی اے؟ ❶

عزیزانِ من! روز میرے پاس یہ فساد کے خوگر ذہنیتوں کے مارے ہوئے نوجوان آتے ہیں کہ صاحب! تم نے چالیس سال غرق کر دیئے' کیا کر دکھایا تم نے؟ معاف رکھیے گا' یہ میں درمیان میں آتا ہے اس لیے کہ میں اور کوئی مثال نہیں پاتا۔ کہتے ہیں کہ کیا کر لیا تم نے؟ انہیں دیکھیے کس طرح سے علی علی کر کے آ گئے' انہیں دیکھیے ہلا بول دیا' انہوں نے یہ کر دیا' وہ کر دیا۔ اس کے بعد اگلی بات

---

❶ ارے' کیا تیر مار لیا؟ سر کھپاتے اور جدوجہد کرتے تیرہ سال بیت گئے۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ ہمارا تو ستیاناس ہو چکا ہے اور ہوا کچھ بھی نہیں' جہاں تھے وہیں ہیں۔

نہیں کہ ہلا ہلا کر دیا‘ تین مہینے میں۔اس کے بعد دیکھیے آندھی کی طرح اٹھے ہیں‘ آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئے۔عزیزانِ من! یہ تو اس گھڑی کی طرح ہے جس کے منٹوں کی سوئی ٹوٹی ہوئی ہو‘ گھنٹے کی سوئی چل رہی ہوتی ہے‘ تمہاری آنکھیں محسوس نہیں کر رہی ہوتیں۔یہ جو انقلاب ہے یہ تو قلب کی تبدیلی کا نام ہے۔اس کا تو مادہ (Root) ہی قلب (ق ل ب) ہے۔یہ جو Physical (طبعی) تبدیلی ہوتی ہے‘ طبعی تبدیلی‘ یہ لوٹ مار‘ توڑ پھوڑ‘ تخریب وغیرہ ہے۔یہ Physical (طبعی) ہے اس کے لیے کسی قلب ونظر کی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔یہ تبدیلی اگر پیدا کرنی ہے تو یہ چڑیا گھر کے پنجرے سے ایک شیر کو شہر میں لے آیئے اور دیکھیے۔یہ قلب ونگاہ کی تبدیلی تو ذہنیتوں کا بدلنا ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ آخری نبوت کے تئیس سالہ زندگی کے تیرہ سال کا عرصہ‘ خاموشی ہی خاموشی میں بسر ہو گیا‘ بظاہر کوئی تبدیلی نظر نہ آئی لیکن تبدیلی وہ ہوئی کہ پھر جب بدر کے ❶ کے میدان میں پہلی ہی دفعہ یہ سامنے آئے ہیں تو یورپ کے مورخوں سے ہی پوچھ دیکھیے۔وہ یہ لکھتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں دنیا کی تاریخ میں بدر کا میدان ایک ایسا انقلاب آفریں واقعہ ہے جس کی مثال تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔وہ اس لیے کہ وہ شباشب تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔وہاں وہ تھے جن کے متعلق ان کا خدا کہہ رہا تھا کہ **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ** ❷ (48:29)۔

نبی اکرم ﷺ پر فرشتے تحسین وآفرین بھیجتے ہیں

یہ تھے وہ اور یہ تھا تیرہ سال کی اس محنت کا ماحصل‘ ثمر اور پھل۔یہ تھے وہ جن کے متعلق کہا کہ **هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ** ❸ (33:43)۔ہم تو نبی اکرم ﷺ کے متعلق جانتے ہیں کہ خدا نے ان کے متعلق کہا تھا کہ **اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ** (33:56)۔وہ جماعت مومنین ہے۔اسی طرح سے خدا اور اس کے فرشتے تم پر بھی درود بھیجتے ہیں۔تیرہ سال کی اس غیر محسوس محنت نے‘ عزیزانِ من! یہ نفوس پیدا کیے تھے کہ خدا اور اس کے فرشتے ان کے اوپر بدر کے میدان میں تہنیت کے پھول برسا رہے تھے‘ ان کی تائید ونصرت کر رہے تھے‘ حوصلہ افزائی (Encouragement) کر رہے تھے‘ ان پر تبریک وتہنیت (Appreciation) کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔انقلاب ان کے ہاتھوں سے آتا ہے۔اب یہ مکی زندگی کا آخری دور ہے‘ اور اُدھر مخالفین مذاق اڑا رہے ہیں‘ وہ استہزا کر رہے ہیں۔

---

❶ سترہ رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں۔جانثاروں کی یہ کل جماعت 313 نفوس پر مشتمل تھی اور بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ان کے پاس کل دو گھوڑے تھے۔مقابلے میں قریش بڑے کروفر اور شان وشوکت سے نکلے تھے۔ہزار سپاہیوں کی جمعیت‘ سو سواروں کا رسالہ‘ تمام رؤسائے قریش (باستثنائے ابولہب) شریک فوج‘ رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔

❷ محمد رسول اللہ اور اس کے رفقائے کار کی جماعت بھی کیا عجیب وغریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلے میں چٹان کی طرح سخت ہیں‘ لیکن باہمد گر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد (5:54)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔1203)۔

❸ قوانین خداوندی کی برکات‘ اور اس کی کائناتی قوتوں (Cosmic Forces) کی تائید ونصرت تمہارے ساتھ رہے گی (33:56)۔ان کی طرف سے تم پر تبریک وتہنیت کے پھول برسیں گے۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔977)۔

اس انقلاب کی تکذیب کرنے کا نتیجہ

یقین مانیے' مخالفت کی سب سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما جو چیز آتی ہے' وہ استہزا ہوتا ہے۔ کہا کہ **بَلۡ كَذَّبُوۡا بِالسَّاعَةِ** (25:11) آنے والے انقلاب کی تکذیب کرتے ہیں۔ تکذیب کر رہے ہیں کہ کہاں کا انقلاب ہے اور کون لا رہا ہے صاحب!! کوئی بات ہے بھلا!! **وَ اَعۡتَدۡنَا لِمَنۡ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيۡرًا** (25:11)۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ جو اس آنے والے انقلاب کی تکذیب کر رہے ہیں' جسے کس قدر بھسم کر دینے والی آگ کہتے ہیں' یہ وہ تیار کی جا رہی ہے۔ یہاں اعتدنا آیا ہے: یعنی وہ بھی یہی نہیں ہے کہ جھٹ سے بھڑکا دی جاتی ہے' بلکہ ان کے لیے یہ سب کچھ تیار کی جا رہی ہے **اِذَا رَاَتۡهُمۡ مِّنۡ مَّكَانٍۢ بَعِيۡدٍ سَمِعُوۡا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيۡرًا** (25:12)۔ دُور سے نگاہ جائے گی تو اس کی آواز ان کے کان میں پڑے گی۔ یہ ہوش اڑا دینے والی آواز ہے۔ اس سے انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ تصادم' یہ انقلاب کس قدر مہیب ہے' **وَ اِذَاۤ اُلۡقُوۡا مِنۡهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيۡنَ** (25:13) اور اس کے بعد جب یہ اس میں آئیں گے تو پھر تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کے اندر' زنجیریں لپٹے ہوئے' جکڑے ہوئے اس کے اندر آئیں گے۔ میں نے کہا تھا کہ وہاں یہ ہلاکت اور تباہی کو پکاریں گے۔ ہمارے ہاں تو جو قرآنی تفسیر چلی آتی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ تو قیامت کا سارا نقشہ ہے جو جہنم میں جا کر ہوگا۔

قریش کے تکبر کی کیفیت

عزیزانِ من! یہ یہاں کی جنگ تھی' یہیں وہ ٹکراؤ ہونے والا تھا' یہ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں سامنے آنے والا تھا۔ یہی دشمن تھے جو قیدی بن کر آنے والے تھے۔ یہ ان کی کیفیت ہو رہی ہے۔ یہ قریش کے ایسے ایسے سرکردہ تھے کہ جن کی نخوت اور تکبر کی یہ کیفیت تھی کہ بدر کے میدان میں جب ایک نوعمر لڑکا[1]' ابوجہل کی چھاتی پہ بیٹھا' اور اس کا گلا کاٹنے لگا' تو اس نے یہ کہا کہ یہ گلا ذرا نیچے سے کاٹو۔ اس نے کہا کہ یہاں سے تو آسانی سے کٹ جاتا ہے' تکلیف بھی نہیں ہوتی' اور نیچے یہاں ہڈیاں بھی ہیں' تکلیف ہوگی۔ وہ کہنے لگا کہ کچھ بھی ہے' ذرا نیچے سے کاٹو۔ وہ لڑکا کہنے لگا کہ بتاؤ تو سہی کہ کاہے کے لیے نیچے سے کاٹوں۔ ان کے ہاں یہ رسم تھی کہ جنگ کے بعد یہ جو کٹے ہوئے سر تھے ان کو نیزوں کے اوپر اٹھا کے ایک جلوس نکالا کرتے تھے۔ کہنے لگا کہ جب اس کے بعد یہ کٹے ہوئے سروں کا جلوس نکلے گا تو ابوجہل کا سر باقیوں کے مقابلے میں تین انچ اونچا ہوگا۔ صاحب! ان قریش کی کیفیت یہ تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ جن کے تکبر اور فخر کا یہ عالم

---

[1] انصار میں عفراء کے بیٹے معوذؓ اور معاذؓ تھے (سیرۃ النبی۔ ص 331) انصار کے ان دو نوجوان بھائیوں کی تلوار سے ابوجہل پیوست زمین ہو گیا (معراج انسانیت (1949ء)' ص۔ 524)۔ اس سلسلے میں معاذؓ کا نام لیا جاتا ہے۔

ہے' تو کل آ کر دیکھ لینا کس طرح سے تمہارے سامنے یہ سرنگوں ہوں گے' سر وہاں خاک کے اوپر رکھے ہوئے ہوں گے۔ انہیں معلوم نہیں کہ الساعۃ کیا ہے اور کیا اس کی تیاری ہو رہی ہے۔ عزیزانِ من! یہیں کی وہ افتاد نمودار ہوئی' اس کے نتائج سامنے آئے اور یوں دنیا نے دیکھ لیا کہ حق کیسے غالب آتا ہے' باطل کیسے مغلوب ہوتا ہے۔

کسی کا مغلوب ہو جانا جہنم ہی کا دوسرا نام ہے

مغلوب کی بات ہے تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ خود مغلوب ہونا بجائے خویش ایک جہنم کی سزا ہے۔ دیکھیے' مجھے یاد آ گیا۔ یہ بدر کے میدان کا ہی واقعہ ہے جس میں قرآن بیان کرتے ہوئے یہ بتا رہا ہے کہ یہ جہنم کیا ہے جو آنے والی ہے۔ سورۃ الانفال آٹھویں سورۃ ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ بدر کے میدان کی آواز کو دبانے کے لیے مال و دولت بے دریغ خرچ کیے چلے جا رہے ہیں۔ کہا کہ کوئی بات نہیں۔ **فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً** (8:36) تھوڑے وقت کے بعد تم دیکھو گے کہ انہیں افسوس ہو گا کہ خوامخواہ کے لیے اتنا مال و دولت بھی ہم نے ضائع کیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ **ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ** (8:36) یہ اس جنگ کے اندر مغلوب ہوں گے۔ یہ لفظ آپ دیکھ لیجیے' یہ وہی ہے' جسے ہم مغلوب کہتے ہیں' مفتوح کہتے ہیں اور اس کے بعد ہے کہ **وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ** (8:36) اور یہ ہے پھر وہ جہنم' جس کی طرف ہانک کر لے جائے جائیں گے۔ مغلوب اور محکوم تو اس دنیا میں جہنم میں ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ یہاں کی جہنم کا ذکر ہو رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے جہنم کے داروغوں کے متعلق بتایا ہے' اس کی بڑی تفصیل ہے۔ وہ جیل خانے کے وارڈن وغیرہ کا نقشہ ذہن میں لائیے۔ وہاں کا جو ہیڈ داروغہ ہے' اسے مالک کہا ہے۔ یہاں کسی کا مالک ہو جانا' کسی کا ماسٹر ہو جانا' ملک سے ہی ہے۔ یہ چیز کسی انسان کا دوسرے انسان کا مالک ہو جانا ہے۔

جہنم کا عذاب موت سے ختم نہیں ہو گا

جہنم کے داروغے کا نام مالک ہے' اور یہی ہے وہ جہنم کا داروغہ' جس کے متعلق کہا ہے کہ وہ اس سے کہیں گے کہ او بابا! تو ہی خدا سے کہو کہ اس عذاب سے تو اچھا ہے کہ ہمیں موت دے دے۔ وہ کہے گا کہ پھر وہ عذاب ہی کیا' جو موت سے ختم ہو جائے گا۔ اسی لیے وہاں جہنم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں نہ زندگی ہو گی' نہ موت ہو گی۔ دیکھتے ہیں کہ یہ جہنم کیا ہے۔ عزیزانِ من! نہ زندگی ہو گی' نہ موت ہو گی بلکہ موت کے متعلق تو دوسری جگہ یہ ہے کہ **يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ** (14:17) انہیں چاروں طرف سے موت آتی نظر آئے گی' جیسے چاروں طرف سے موت چلی آ رہی ہے' لیکن موت آئے گی نہیں۔ آپ عذاب کی شکلیں دیکھیے جو قرآن بیان کر رہا ہے: چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے گی' لیکن انہیں موت آئے گی بھی نہیں۔

محکوم قوموں کے لیے تو پورا پورا ملک ہی جیل خانہ ہوتا ہے

مغلوب اور مفتوح کی جہنم یہ ہے عزیزانِ من! جو قرآن بتا رہا ہے۔ محکومیت سے بڑھ کے دوزخ اور جہنم اور کیا ہوگا! یہاں سب سے پہلی چیز یہ کہی تھی کہ صاحبِ عزت کو ذلیل کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا عذاب اس کے اندر ہوتا ہے کہ وہ دعائیں مانگتے ہیں، ہیڈ وارڈن کے پاس، مالک کے پاس یا سپرنٹنڈنٹ جیل کہہ لیجیے کے پاس درخواستیں پیش کر رہے ہیں، کہ خدا سے کہیے کہ ہمارا خاتمہ کر دے۔ اس قدر مفتوح اور مغلوب کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ سچ مچ کے جیل خانے کی بند کوٹھڑی میں ہو، محکوم قوم کے لیے تو پورا ملک جیل خانہ ہو جاتا ہے۔ کس خوب صورتی میں اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہا ہے:

ز دوزخ واعظِ کافر گرے گفت

ایک ''واعظ کافر گر'' دوسروں کو کافر بنانے والا، یہ پیشہ ہے، دوزخ کی بات بیان کر رہا ہے۔ یہ شخص [1] ایک ایک لفظ میں بھی کمال کر جاتا ہے۔ دوسروں کو کافر بنانے والا، دوزخ کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ عجیب عجیب بڑی دلچسپ باتیں کر رہا تھا تو سنیے کہ پھر دوزخ کے متعلق کیا باتیں کر رہا ہے؟ کہتا ہے:

حدیثے خوشتر ازوے کافرے گفت

ایک کافر، جو سچ مچ کا فر تھا، اس نے اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات کہی۔ اس نے کیا بات کہی؟ کہا:

نداند آں غلام احوالِ خود را

یہ شخص جو غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے، کم بخت اپنے متعلق کچھ نہیں جانتا۔

کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت

دوزخ کو دوسروں کا مقام بتا رہا ہے۔ اپنے متعلق اتنا بھی نہیں جانتا۔

یہ ہے عزیزانِ من! وہ الساعۃ اور وہ جہنم، جس کا ذکر قرآن یہاں کر رہا ہے۔ **بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ** (25:11) بلکہ یہ لوگ اس آنے والے انقلاب کے متعلق کہتے ہیں کہ یونہی دھمکیاں ہیں۔ یہ الساعۃ کی تکذیب کرتے ہیں جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ آنے والا انقلاب ہے۔ کہا: ان سے پوچھو کہ یہ کیفیت جو ہم نے انہیں بتائی ہے کیا وہ اچھی ہے؟ **قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ** (25:15) یہ زندگی بہتر ہے یا وہ زندگی کہ جو متقیوں کے متعلق ہم بتا رہے ہیں، جس کا وعدہ ہم نے کر رکھا ہے کہ انہیں اس کے بعد وہ زندگی میسر ہوگی۔ ان سے کہیے کہ **كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِيْرًا** (25:15) بہشت کی یہ زندگی، ہماری طرف سے فی سبیل اللہ،

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) کی طرف ہے۔

اللہ واسطے' نہیں ملے گی' بخشش کے طور پر نہیں ملے گی۔ ایسی گداگری ہماری فطرت کے اندر گویا حلول کر چکی ہوئی ہے کہ ہر وقت ہم خدا سے بھی بخشش مانگتے رہتے ہیں' سب سے بڑی چیز یہی مانگتے ہیں: اللہ بخش دے یعنی اللہ واسطے دے دے اور وہ تو کہتا ہے کہ یہ جنت اللہ واسطے نہیں ملا کرتی۔ بغیر اعمال کے جزا کے' ایک جنت آدم کو اللہ واسطے ملی تھی۔ ایک ذرا سی لغزش ہوئی' کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب وہ تیرے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگی تو وہ حقیقت میں ایک متاع ہوگی: **جَـنَّةُ الْـخُـلْـدِ** (25:15) سدا بہار شادابیوں کی زندگی ہوگی۔ پھر تمہیں وہاں سے کوئی نکالے گا نہیں **كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً** (25:15) وہ حسین وشاداب معاشرہ ان کے اپنے حسنِ عمل کا نتیجہ ہوگا۔ قرآن ایک ایک لفظ میں بات کر جاتا ہے۔ یہاں متقین کی جنت کہی' تو ذہن میں شاید ان کے آیا کہ بھئی! ٹھیک ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا اور ان کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ کہا کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ **كَـانَتْ لَهُمْ جَزَآءً** (25:15) یہ جنت ان کے اپنے حسنِ عمل کا نتیجہ ہے۔ ایک لفظ میں اصل بات بتا دی۔ صاحب! یہ اسلوبِ بیان کا اعجاز ہے۔

قرآن کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہمارے تراجم نے کیا ہے

عزیزانِ من! بظاہر یہاں یہ نہ بھی آتا تو ہمارے آپ کے نکتہ نگاہ سے کچھ حرج واقع نہیں ہوتا لیکن اس نے تو مقصد پہ نگاہ رکھی ہے اور کہہ دیا کہ یہ **كَـانَتْ لَهُمْ جَزَآءً** (25:15) تمہارے اپنے حسنِ عمل کا پھل ہے۔ اور اگلا لفظ مَصِيْرًا ہے۔ میں نے گزارش کی ہے کہ ہمارے ہاں ہم پہ یا قرآن پہ سب سے بڑا یہ ظلم ہوا کہ اس کے ترجمے ہونے لگ گئے۔ جیسا میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کے الفاظ کا تو عربی زبان میں کوئی مرادف بھی نہیں ملتا چہ جائیکہ دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو جائیں مثلاً وہ جو ہے: **اِنَّـا لِـلّٰـهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** (2:156) ہم خدا کے ہیں' خدا کی طرف پھر جائیں گے۔ اسی طرح **وَ مَصِيْرًا** (25:15) کا ترجمہ بھی کرتے ہیں کہ ہم پھر وہیں جانے والے ہیں تو بس گویا یہی چیز ہے کہ وہاں سے ہم آئے تھے یہاں آ کے اس دلدل میں پھنس گئے اور یہاں سے کسی طرح چھٹکارا ہوگا تو پھر وہیں چلے جائیں گے' As you were ہو جائیں گے [1]۔ یہ سارا چکر' یہ انسانوں کا سلسلہ رشد و ہدایت' یہاں آنا' حق و باطل کی تمیز' اتنی جانکاہ مشقتیں' یہ سارا کچھ' کاہے کے لیے ہے؟ کہ جیسے پہلے تھے ویسے ہی پھر ہو گئے۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون کا قرآنی مفہوم لفظ المصیر میں مضمر ہے

قرآن تو ارتقائی منازل بتا رہا ہے۔ زندگی اوّلیں جرثومے سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسانیت میں پہنچی۔ یہ یوں سمجھیے کہ طبعی ارتقا تھا۔ اب اس کے بعد انسان کی ذات کا ارتقا شروع ہوتا ہے۔ یہ آگے بڑھتا ہے' تدریجاً اگلی منزلیں طے کرتا ہے' یہ مرنے کے

---

[1] جیسے تھے ویسے ہی ہو جائیں گے۔

بعد کی زندگی' اس زندگی سے اگلی منزل ہے' ارتقا کی اونچی بلند منزل اس سے آگے کی ہے۔ اور اس طرح سے آہستہ آہستہ کسی ایک مقام کے اوپر پہنچنا ہے۔ وہ جو میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ تقدیر کے معنی Destination ہے' جسے انگریزی میں Destiny کہا گیا یعنی کسی چیز کا وہاں پہنچ جانا' جو اس کا منتہا ہے' جو اس کا آخری مقصود ہے' اسے فلسفے میں کہتے ہیں: کسی Becoming کا Being ہو جانا۔ Becoming وہ Process ہوتا ہے جس میں وہ کچھ آہستہ آہستہ بن رہا ہوتا ہے اور Being ہوتا ہے وہ جو کچھ وہ بن جاتا ہے۔ یہ لفظ مصیراً ہے۔ قرآن میں ہے کہ **وَ اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ** (3:28)۔ مصیر کے معنی ہوتے ہیں ''وہ مقام جہاں انسان اِدھر اُدھر سے چلتا چلتا' جس آخری منزل پہ پہنچ کے تکمیل حاصل کر لے' اسے مصیر کہتے ہیں یعنی لفظ ایک ہے مگر قرآن اس کے اندر زندگی کا اتنا بڑا فلسفہ بیان کر جاتا ہے اور پھر یہ مصیر کیسے حاصل ہوتا ہے؟ یہ جو انتہائی مقام ہے' یہ انسانی ذات کو کس طرح سے حاصل ہوتا ہے اس کے لیے کہا کہ **وَ اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ** (3:28) اپنے اندر خدائی صفات کو منعکس کرتے چلے جانے سے یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ **وَ اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ** (3:28) کے معنی ''خدا کی طرف آخر میں جانا ہے۔'' تو طرف کے تو معنی ہوں گے کہ خدا کو کسی مقام کے اوپر بٹھا دیا جائے' پھر ہی آپ اس کی طرف جائیں گے۔ وہ تو اطراف اور سمتوں سے بلند و بالا ہے۔ اس کی طرف جانے کے کیا معنی ہیں؟ عام الفاظ میں یوں کہیے کہ بہ حدِ بشریت خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا' اگر چھوٹے پیمانے پہ کہیے تو انسان کا اپنے حد بشریت میں خدائی صفات کا حامل بنتے جانا' انسان خدا تو نہیں بن سکتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آہستہ آہستہ خدائی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا تآنکہ وہ آخری منزل جہاں تک یہ پہنچ سکتا ہے' یہ پہنچ جائے۔ یہ وہ چیز ہے جو قرآنِ کریم کے متعلق یہ شخص [1] کہہ گیا ہے اور اس سے آگے کیا کوئی اور کہے گا! پوچھا یہ گیا کہ قرآن کرتا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

جیسا خدا چاہتا ہے کہ تو بن جائے قرآن تجھے ویسا بنا دیتا ہے۔ یہ ہے و مصیراً!

انسان کا بلند ترین مقام کا حاصل کر لینا المصیر جسے جنت کہا جائے گا

عزیزانِ من! مصیر وہ آخری منزل ہے کہ جس میں جیسا خدا چاہتا ہے کہ تُو بن جائے جہاں پہنچ کے تُو ویسا بن جائے گا۔ یہ ہے جنت۔ خدائی صفات کا اپنے اندر منعکس کرتے جانا۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ خدا کی سب سے بلند ترین صفت جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے اختیار و ارادہ ہے' باقی تمام صفات اس کے نیچے رہتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور اختیار تو لامحدود ہے۔ اس کائنات میں' اپنی مخلوق میں'

---

[1] یہ اشارہ مفکرِ قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

ایک حد تک یہ اپنی جو خصوصی صفت اختیار و ارادہ کی تھی یہ انسان کو دی۔ یہ صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ کائنات کی کسی دوسری شے کو اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا' اسے دیا گیا ہے تاکہ **فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ** (18:29) ہم نے دنیا میں اس کی طرف حق بھیج دیا ہے' ان میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے' جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ یہ بڑی چیز ہے اور یہ جو انسانی ذات کا نشوونما پانا ہے' یہ جسے میں نے خدائی صفات کہا ہے' یہ ان کا اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا ہے۔

انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت اختیار و ارادہ کی وسعتیں ہیں

سب سے بڑی چیز اختیار کی وسعتیں ہیں۔ اس کا اختیار بڑھتا چلا جاتا ہے' جتنا زیادہ یہ خدا کی صفات کا حامل ہوتا جاتا ہے۔ سب سے پہلی صفت اختیار و ارادے کی ہے۔ اس کا اختیار و ارادہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہ مقام جسے جنت اور مصیر کہا ہے اس کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ **لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُوْنَ** (16:31)۔ جس میں یہ جو چاہیں گے ہو جائے گا۔ یہ وہ کیفیت ہے۔ جنت مقام نہیں ہے زندگی کی کیفیت ہے' وہ ارتقائی حالت ہے۔ کیا بات ہے صاحب! **لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُوْنَ** (16:31) کتنی بڑی چیز ہے' عزیزانِ من! ان کا اختیار و ارادہ اس حد تک بڑھے گا۔ قرآن منفرد ہے۔

پہلی چیز تو اس میں یہ دو باتیں لے لیجیے جن کو واضح کرنا ضروری ہے۔ ذہن میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب کہا جائے کہ جو چاہو گے ہو جائے گا' جو مانگو گے ملے گا' تو پھر تو یہ ہوتا ہے کہ یہ ساری حرام خوریوں کی چیزیں' جتنی بھی ہیں' جو چاہو گے ہو جائے گا تو پھر یہاں تو یہی سیاپا ہے۔ یہاں کا جو صاحب اختیار ہے' وہ تو یہ کہتا ہے کہ صاحب! اس میں کوئی قانون نہیں' کوئی آئین نہیں' کوئی Constitution نہیں' کوئی Law (قانون) نہیں' کوئی کچھ نہیں' جو ہماری مرضی ہے کریں گے۔ کہا کہ اس کو تو بدترین قسم کا استبداد کہتے ہیں' تو کیا یہ وہاں مستبد قسم کے ڈکٹیٹر اکٹھے ہو جائیں گے؟ اک ڈکٹیٹر مان نئیں جنت نوں جہنم بنا دیندا اے تے' او جنت اچ جے سارے ڈکٹیٹر اکٹھے ہو گئے تے پتہ نئیں تے فیر اللہ میاں تے' اوناں دے فرشتیاں نوں کتھے تھاں لبھے گا۔ [1] قرآن ہے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ **لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُوْنَ** (25:16) اس میں جو یہ چاہیں گے ہو گا۔ پھر کہا: یہ ہوں گے کون؟ کہا: وہ یہ ہوں گے جو **وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ** (76:30) چاہیں گے ہی وہی جو ان کا خدا چاہے گا۔

---

[1] ایک آمر ہی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ تو جنت کو جہنم میں بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اگر جنت میں وہ تمام آمر اتحاد کر کے آ دھمکے تو پھر تو معلوم نہیں کہ اللہ میاں اور اس کے فرشتوں کو کہاں جگہ ملے۔

انسانی چاہتوں سے بھی آگے کی منزل

اس کے آگے ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا** ❶ (76:30)۔ہم نے جو کہا تھا کہ جو چاہیں گے'وہاں ملے گا اس لیے کہ **کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا** (76:30) اے گل اسی سوچ سمجھ کے کہی۔ایہدا ترجمہ اے ہووے گا۔ ❷ ایک بات اور بڑی خوبصورت کہی ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں یہ جو مانگیں گے ملے گا' جو چاہیں گے وہ ہوگا' اور اس کے بعد کہا کہ یہ انسان لامحدود تو نہیں ہے' محدود ہے۔اس لیے اس کا جو چاہنا ہے وہ بھی تو محدود ہوگا' اس کی جھولی جو مانگنے کی ہے وہ ماپی ہوئی' تولی ہوئی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ بڑی توں بڑی کھنڈ کرے گا تے کی منگ لیے گا۔ ❸ یعنی جسے ہم یہ کہتے ہیں جو انسان کی تمنا اور آرزو کی آخری حدود ہے وہاں تک ہی جائے گا' اس سے آگے تو نہیں جائے گا اس لیے کہ یہ ٹھیک ہے **لَهُمۡ مَّا يَشَآءُوۡنَ فِيۡهَا** (50:35) اس میں یہ جو چاہے گا اس کو ملے گا لیکن یہ تو پھر بھی محدود ہوگا اور اسے کیا پتہ ہے کہ اس کے بعد **وَ لَدَيۡنَا مَزِيۡدٌ** (50:35) اور ہمارے پاس تو اس کو آگے دینے کے لیے بھی بہت کچھ ہوگا۔ دینے والا ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری مانگ کی جو انتہا ہے' وہ تو کہتا ہے کہ وہ تو ہوتی ہی جائے گی' اور ہمارے پاس اس سے آگے بھی دینے کے لیے' کچھ اور ہوگا۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جس منزل کو' یہ اپنے ذہن میں' اپنی آخری منزل سمجھے گا' وہ بھی آخری منزل نہیں ہوگی' اس سے آگے اور منزلیں ہوں گی:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

(اقبالؒ)

جنت میں انسان کی پیشانی کا نور مزید اگلے راستوں کو منور کرتا جائے گا

عزیزانِ من! ایک لفظ اور آیا ہے۔(18:31) میں نعمائے جنت کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ ساری جتنی بھی نعماء تم دیکھ رہے ہو' جو گنائی گئی ہیں اور اس میں ان کا بہت تذکرہ ہے کہ یہ ہوگا اور وہ ہوگا' یعنی انسانی خواہشوں کی' آرزوؤں کی' تمناؤں کی' تصورات کی' انتہا ہے۔کہتا ہے کہ یہ سارا کچھ جو ہے یوں سمجھو کہ وہ ایک بہت اعلیٰ درجے کی کرسی پہ یا صوفے پہ بیٹھے ہوں گے جس کے یہ بازو بھی ہوں گے

---

❶ اس لیے خدا کا قانون علم وحکمت پر مبنی ہے (74:56;81:29)۔

❷ یہ بات ہم نے سوچ سمجھ کر کہی ہے۔اس کا یہ ترجمہ ہوگا۔

❸ بڑی سے بڑی خواہش بھی کرے گا تو کیا مانگ لے گا!

تو کہا کہ یہ سارا کچھ کس چیز کے لیے ہوگا؟ ''ارتفاق'' کہتے ہیں اس شے کو جیسے کرسی کے یہ بازو کہ جس کے سہارے سے انسان اوپر اٹھے۔ یہ تمام محنتیں اور خوشگواریاں وہ سہارے ہیں جن کے ذریعے انسان اس مقام سے اور اونچا اٹھے گا۔ اس لیے کہا کہ **وَ حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا** (18:31) یہ منتہا نہیں ہے یہ بھی اور بلند ہونے کا ذریعہ ہے۔ زندگی کے ارتقائی منازل میں جنت بھی آخری مقام نہیں ہے اور قرآن نے اسی لیے کہا ہے کہ وہاں مومنین کی ہیڈ لائٹ ان کے پیشانی کا نور ان کے اگلے راستے روشن کرتا چلا جائے گا۔ اسی لیے وہاں کی نعماء کو اس نے ''ارتفاقات'' کہا ہے۔ مرتفقًا کہا ہے جس کے سہارے سے انسان اوپر اٹھ جائے۔ **خٰلِدِین** (25:16)۔ اور وہاں سے نکالے گا کوئی نہیں اور اس کے بعد کہا کہ **کَانَ عَلٰی رَبِّکَ وَعۡدًا مَّسۡئُوۡلًا** (25:16) یہ یونہی کسی ایرے غیرے کا وعدہ نہیں ہے یہ تیرے رب کا حتمی وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔

انسان خدا کے کیے گئے وعدہ کے متعلق بھی پوچھ سکتا ہے

جہاں بھی قرآن نے خدا کا وعدہ کہا ہے اس کے معنی ''اس کا یہ غیر متبدل قانون ہوتا ہے'' اور خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اس کے معنی ہیں: **لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا** (48:23) خدا کے قانون میں جو کچھ اس نے کہا ہے یوں کہیے اس میں کبھی تبدیلی نہیں آتی اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا۔ پہلی چیز تو یہ کہی کہ **کَانَ عَلٰی رَبِّکَ وَعۡدًا** (25:16) یہ تیرے خدا کا وعدہ ہے یہ قانون ہے اور اگلا لفظ ہے عزیزانِ من! بڑا ہی اہم نکتہ میں تو جب اس پہ آیا ہوں تو پوچھیے نہیں میری کیفیت کیا رہی ہے **کَانَ عَلٰی رَبِّکَ وَعۡدًا مَّسۡئُوۡلًا** (25:16) یہ وہ وعدہ ہے سمجھانے کے لیے کہ اگر بفرض محال تم سمجھو یہ پورا نہ ہو تو مسئولًا تو تم پوچھ سکتے ہو کہ یہ وعدہ کیوں پورا نہیں ہوا۔

میں نے عرض کیا تھا عزیزانِ من! کہ ایک ہی چیز ہے کہ قرآن سے اگر خدا کا تصور متعین کر لیا جائے سب کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ وعدہ ہے قانون ہے غیر متبدل ایسا ہے کہ **کَانَ عَلٰی رَبِّکَ وَعۡدًا مَّسۡئُوۡلًا** (25:16) وہ وعدہ ہے یعنی یہ تو اس نے کہا ہے کہ اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ سمجھانے کے لیے کہا ہے کہ اگر بفرضِ محال کبھی ایسا ہو تو یہ وہ ہے کہ تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا سرکار! آپ نے تو یہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا یہ زندگی اچھی ہے یا وہ زندگی کہ جس کے اندر تم زنجیروں میں جکڑے جاؤ گے تنہائی کی کوٹھڑیوں میں بند کیے جاؤ گے کیفیت تمہاری چیخنے چلانے کی یہ ہوگی کہ داروغۂ جہنم کی منتیں کرو گے کہ ہمیں پھانسی کے تختے پہ لٹکا دو اس عذاب سے نجات دلا دو اور وہ کہے گا کہ یہاں تو موت نہیں ہے تمہیں ہر طرف سے موت آتی دکھائی دے گی

موت آئے گی نہیں۔ پوچھا کہ کیا یہ زندگی بہتر ہے یا یہ زندگی کہ جس میں کیفیت یہ ہوگی کہ **لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُوْنَ** (25:16) اتنی وسعتیں اختیارات کی ہوں گی کہ جو چاہو گے ہوگا یہاں تک کہ **وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ** (50:35) اس سے بہت کچھ اور آگے بھی ہوگا۔ **خٰلِدِيْنَ** (25:16) وہاں سے تمہیں کوئی بھی نکالے گا نہیں اور یہ اس خدا کا وعدہ ہے کہ جس کے وعدے کی کیفیت یہ ہے کہ اگر بفرضِ محال یہ کہا جائے کہ پورا نہ ہو تو اس سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ وعدہ کیوں نہیں پورا کیا۔ کہا کہ بتاؤ دونوں زندگیوں میں سے کون سی بہتر ہے؟

عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی آیت 16 تک ہم آ گئے 17 ویں آیت سے آئندہ درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

پانچواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 17 تا 18)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَیَوۡمَ یَحۡشُرُہُمۡ وَمَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَقُوۡلُ ءَاَنۡتُمۡ اَضۡلَلۡتُمۡ عِبَادِیۡ ہٰۤؤُلَآءِ اَمۡ
ہُمۡ ضَلُّوا السَّبِیۡلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ مَا کَانَ یَنۡۢبَغِیۡ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَّخِذَ مِنۡ دُوۡنِکَ مِنۡ اَوۡلِیَآءَ وَلٰکِنۡ
مَّتَّعۡتَہُمۡ وَاٰبَآءَہُمۡ حَتّٰی نَسُوا الذِّکۡرَ ۚ وَکَانُوۡا قَوۡمًۢا بُوۡرًا ﴿۱۸﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1978ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 17 سے ہوتا ہے: (25:17)۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو نظروں سے اوجھل کر دینے کا نتیجہ

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں عمودی موضوع جہنم کا بیان تھا اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مرنے کے بعد کی قیامت، حشر، جہنم، جنت، پر تو ہمارا ایمان ہے لیکن قرآنِ کریم نے صرف قیامت، حشر اور جہنم کا ہی ذکر نہیں کیا جو مرنے کے بعد آتا ہے، وہ اس دنیا میں بھی جہنم کے عذاب کا ذکر کرتا ہے جس میں خصوصیت سے غلام اور محکوم قومیں گرفتار ہوتی ہیں اور یہ محض تفسیر یا تاویل نہیں، قرآن نے خصوصیت سے ان چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی سازش تھی کہ قرآن میں جہاں جہاں محکومیت کے اس عذاب کا ذکر آیا، اس امت کے سامنے یہ نہ بتایا گیا کہ ہم خود اس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ اگر یہ بتایا جاتا تو اس سے نکلنے کی کوئی تدبیر سوچی جاتی، کم از کم دل میں آرزو ہی اُبھرتی لیکن جب مطمئن کر دیا جائے کہ نہیں، ان کا تعلق تو آخرت سے ہے، اور آخرت میں صرف کفار اور مشرکین اور ملحد اور

جہنم میں جائیں گے اور خدا کے محبوب کی امت کے لیے جنت لکھ دی گئی ہے' تو سیدھی بات ہے پھر جس حالت میں بھی ہم رہیں اس سے نکلنے کی کوئی خواہش و آرزو کا پیدا ہونا تو ناممکنات میں سے ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھے اور کہا کہ اس دنیا میں یہ مصیبتیں' تکلیفیں' نامساعد حالات' خدا کے مقرب بندوں کی علامات ہیں' تو جہنم میں زندگی بسر کیے جا رہے ہیں اور ذہنی طور پہ ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ تم خدا کی محبوب قوم ہو' خدا کے برگزیدہ بندے ہو۔ صدیوں سے اس قوم کو اس مغالطے میں مبتلا رکھا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دن بدن ان کی حالت ابتر سے ابتر ہوتی چلی گئی یہ **اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ** [1] (95:5) کے درجے تک پہنچ گئے لیکن بڑے مطمئن بلکہ بڑے خوش رہے۔ جتنی زیادہ تکلیفیں پہنچیں' اتنے ہی خوش ہو گئے کہ ہم خدا کے زیادہ محبوب بندے بنتے چلے جا رہے ہیں۔

سابقہ آیات کے ضمن میں ایک فقرہ یہ آیا تھا کہ ان کے مقابلے میں دوسری وہ جماعت ہے جو خدا کے قوانین کا اتباع کرتی ہے۔ اس کی زندگی کس قدر خوشحالی اور خوشگواریوں کی ہے' قرآنِ کریم یہ ذکر کر کے پھر اسی جہنم کی طرف آتا ہے کہ **وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُهُمۡ وَ مَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَیَقُوۡلُ ءَاَنۡتُمۡ اَضۡلَلۡتُمۡ عِبَادِیۡ هٰۤؤُلَآءِ اَمۡ هُمۡ ضَلُّوا السَّبِیۡلَ** [2] (25:17)۔

قرآنی آیات کے موجودہ تراجم اور تفاسیر کے عمل نے قرآن کو کیا سے کیا بنا دیا

اب یہاں **مَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ** (25:17) آ گیا۔ اس کا ہمارے ہاں عام ترجمہ اور تفسیر یہ چلی آ رہی ہے کہ جن چیزوں کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے تھے اُنہیں اور انہیں اکٹھا کیا جائے گا اور ان سے جن کی یہ پرستش کرتے تھے' پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ہمارے بندوں کو غلط راستے پہ ڈال دیا تھا؟ اب ہمارے ہاں تو یہ جہاں بھی آتا ہے کہ یہ خدا کو چھوڑ کے کسی اور کی پرستش کرتے تھے تو وہ تو بت ہوتے ہیں۔ بتوں کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ بت ہیں جن کی خدا کو چھوڑ کے پرستش کی جاتی ہے۔ تو اب یہاں بات یہ ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ان بتوں سے پوچھے گا کہ کیا تم نے ہمارے بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ جب اعتراض کیا کہ صاحب! بت تو ساری عمر ہمارے سامنے ہوتے ہیں' وہ تو بولتے ہی نہیں ہیں۔ ان چیزوں کا جواب تو بڑا آسان ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں ان کو یہ قوتِ گویائی عطا کر دے گا۔ خدا ان پتھر کی مورتیوں سے پوچھے گا کہ کیا تم نے ان جیتے جاگتے انسانوں کو گمراہ کیا تھا؟ وہاں عبادت کا مفہوم پرستش کیا' اور یہ جو پرستیدہ ہیں' یہ

---

[1] حیوانی زندگی کی پست ترین سطح

[2] جب (ظہورِ نتائج کے وقت) ان لوگوں کو' جو خدا کے اقتدار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں' اُن کے معبودوں کے ساتھ' اکٹھا کیا جائے گا۔ تو ان کے معبودوں سے پوچھا جائے گا کہ میرے ان بندوں کو صحیح راستے سے بہکایا تھا' یا یہ خود ہی بہک گئے تھے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 818)۔

مٹی اور پتھر کی مورتیاں اور بت بنائے۔اب ساری باتیں ان کی طرف منسوب کر دیں۔نہ ہم مشرک ٹھہرے نہ جن کی ہم معبودیت اختیار کیے ہوئے ہیں' محکومیت اختیار کیے ہوئے ہیں' غلامی اختیار کیے ہوئے ہیں' نہ وہ معبود بنے' نہ ان سے کسی قسم کی باز پرس ہوئی' نہ ہم سے کوئی سوال ہوا۔سوال ہوا تو وہ بت پرستوں سے اور ان کے بتوں سے۔معاملہ وہاں تک ٹھہر گیا۔یہاں یہ قصہ ہوا اور وہاں قیامت میں جو سوال جواب کا تعلق ہے' وہ ان سے ہو گیا۔ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن کیا بات بتاتا ہے' یہ کن کی معبودیت تھی' کون تھے جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ تم نے ہمارے بندوں کو گمراہ کیا تھا؟

جہنم میں متبعین اور لیڈروں کے مابین باہمی مکالموں کا ذکر

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں جہنم میں کچھ مکالمات کا ذکر آیا ہے۔ان کے درمیان واضح طور پہ وہ بتاتا ہے کہ لیڈروں اور عوام میں سے ان کے Followers (متبعین) کے مابین باہمی مکالمے ہیں۔بڑی تفصیل سے قرآن نے وہ مکالمات دیئے ہیں۔جہنم کے عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد یہ عوام سب سے پہلے ان پہ اعتراض کرتے ہیں کہ تم تو ہمیں یہ کہتے تھے کہ ہمارے پیچھے پیچھے چلو اور اس کے بعد دیکھو کہ کس قسم کی تمہیں خوشگواریوں کی زندگی عطا ہوتی ہے! ہمارے نظام میں کیا کیا چیزیں ملیں گی جب وہ قائم ہوگا' بس اس نظام کے قیام میں ہماری مدد کرو' پھر دیکھو راوی عیش لکھتا ہے اور وہ یہ کہیں گے کہ ہم تو جہنم کے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔تم نے کیا کہا تھا اور یہ ہوا کیا؟ اب ان اعتراضات کو' ان سوالات کو' دیکھیے۔بڑے دلچسپ مکالمے ہیں۔وہ تمام تفصیل تو بہرحال اس وقت آئے گی جب یہ مقام خود سامنے آئیں گے یعنی آیات سامنے آئیں گی' ضمناً سورۃ سبا میں آیا ہے کہ **وَ لَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ اِلْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ** (34:31)۔قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ان مجرد حقیقتوں کو' بسیط حقیقتوں کو' جو Abstract Truth ہوتی ہیں' جو غیر محسوس ہوتی ہیں' تمثیلی انداز میں' محسوس طریقے پر' سامنے لاتا ہے۔اس طرح سے بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور جلدی سمجھ میں آ جاتی ہے۔وہ نقشہ یوں کھینچتا ہے کہ جیسا خدا کی عدالت ہے اور اس کے سامنے یہ لوگ پیش ہیں اور وہاں ان سے پوچھا جاتا ہے' سوال کیا جاتا ہے اور وہاں کٹہرے میں کھڑے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے ایک طرف یہ Leaders (لیڈر) ہیں' دوسری طرف متبعین ہیں اور وہاں ان کے آپس میں سوال جواب ہوتے ہیں۔محسوس انداز میں وہ بات کرتا ہے کہ وہاں یہ خدا کے سامنے کھڑے ہیں اور **يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ**

اسۡتَکۡبَرُوۡا [1] (34:31)۔میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بات بتوں کی نہیں ہے۔قرآن خود **اسۡتَکۡبَرُوۡا** (34:31) بتا رہا ہے' یعنی وہ جوان میں سے بڑے بن بیٹھے تھے۔

میں پھر عرض کروں گا کہ آپ قرآن کے الفاظ پہ آیئے۔یہ باب استکبروا کا مادہ ''ک ب ر'' ہے جس میں اکبر اور کبریائی آئی ہے لیکن یہ جو استکبروا کا باب ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''درحقیقت تو وہ ایسے نہیں تھے' البتہ ایسے بن بیٹھے تھے۔'' یہ زبان عجیب وغریب ہے۔اس کے بنیادی معنی ایک ہوتے ہیں' وہ تو ہر لفظ کے اندر جھلکتے چلے جاتے ہیں' پھر ان میں مختلف باب [2] ہوتے ہیں مثلاً اِسۡتِفۡعَالٌ [3] باب ہے۔ان کے وزن پہ جو الفاظ آئیں گے' ان میں اس باب کی جو الگ خصوصیت ہوتی ہے' وہ بھی آئے گی۔اس کی مثال استکبروا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ ان لوگوں میں سے بڑے بن بیٹھتے تھے' بڑے بننے کی خواہش ہوتی تھی۔دوسری طرف ہے: **الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ** (34:31) جنہیں کمزور کر دیا گیا تھا یا جنہیں کمزور سمجھ لیا گیا تھا' بنا دیا گیا تھا۔یہ ہے اس باب کا خاصہ اس لیے کہ قرآنِ کریم کی رو سے تو تمام انسان یکساں ہوتے ہیں۔انہیں تو انسان کچھ کر دیتا ہے: **یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ** (28:4)۔ان میں ابنائے قوم کو ذبح کرتا چلا جاتا ہے' باقیوں کو کمزور کرتا چلا جاتا ہے اور خود بڑا بن کے بیٹھ جاتا ہے۔کہا کہ وہ لوگ جنہیں یہاں کمزور کر دیا گیا تھا' کمزور سمجھ لیا گیا تھا' وہ ان سے کہیں گے جو یہاں ان کے ہاں کے بڑے بن بیٹھے تھے۔اب' عزیزانِ من! خود سمجھ لیجیے کہ ان سے بات بتوں کی تو نہیں ہو رہی۔یہ کہیں گے کہ **لَوۡ لَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا مُؤۡمِنِیۡنَ** (34:31) اگر تم ہمارے ہاں نہ ہوتے تو ہم واقعی صحیح راستے پہ چلتے جو خدا نے ہمیں بتایا ہوا تھا۔یہ تمہاری وجہ سے ہے کہ ہم نے وہ راستہ چھوڑا اور غلط راستہ اختیار کیا: **قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡۤا اَنَحۡنُ صَدَدۡنٰکُمۡ عَنِ الۡهُدٰی بَعۡدَ اِذۡ جَآءَکُمۡ بَلۡ کُنۡتُمۡ مُّجۡرِمِیۡنَ** (34:32) وہ ان سے کہیں

---

[1] عوام' جو قوت میں کمزور تھے' اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ.....

[2] فعل کی ہر نئی شکل جو فعل ماضی اور اس کے فعل مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں (زبر، زیر، پیش) سے مل کر بنے' ایک باب کہلاتی ہے۔ماضی اور مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں کے اعتبار سے ثلاثی مجرد کے چھ ابواب مستعمل ہیں۔ثلاثی مجرد کے علاوہ ایسے افعال جن میں اصلی حروف تو تین ہی ہوں' لیکن ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں' ثلاثی مزید فیہ کہلاتے ہیں۔ان کے مختلف ابواب مختلف اوزان پر آتے ہیں' جن میں بیشتر استعمال ہونے والے ابواب قرآنِ مجید میں بارہ ہیں۔ان کی مزید تفہیم کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (1960)۔لغات القرآن جلد اوّل۔لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ص ص۔46 تا 70۔

[3] باب اِسۡتِفۡعَالٌ کے خواص: ثلاثی مجرد کو باب ''اِسۡتِفۡعَالٌ'' میں منتقل کرنے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب ہوتے ہیں: (1) کسی کام کو چاہنا' اسے طلب کرنا اور مانگنا۔ (2) مفعول میں فعل کی صفت کو پانا یا سمجھنا۔ (3) کسی کام کا اثر قبول کرنے اور اس کے ساتھ جیسا کیا جائے ویسا ہو جانے کے لیے بھی اس باب کو استعمال کیا جاتا ہے۔ (4) کبھی یہ باب ثلاثی مجرد کے ہم معنی ہوتا ہے (پرویزؒ: لغات القرآن' جلد اوّل' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ص۔64-65)۔

گے کہ خدا کی طرف سے صحیح ہدایت وراہنمائی تو تمہارے سامنے آ چکی تھی۔ کیا تم آج چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ ہم نے تمہیں اس سے گمراہ کیا تھا؟ اصل بات یہ ہے کہ تم ہی اس کے اوپر نہیں چلنا چاہتے تھے‘ تم خود مجرم تھے‘ ہم نے تو تم سے صرف فائدہ اٹھایا ہے۔ قرآن بڑی عظیم بات کہہ گیا ہے۔ یہ ایک غلامی اور محکومی کی نفسیات ہوتی ہے‘ ایک سائیکولوجی ہوتی ہے۔ یہ خود نہیں اس راستے پہ چلنا چاہتے اور اونگھتے کو سوجاتے کا بہانہ۔ یہ جو درمیان میں بڑا ابنا چاہتے ہیں‘ وہ ذرا سا ان کو اشارہ کرتے ہیں اور یہ لپک کر ان کے پیچھے چل دیتے ہیں۔ ازخود یہ کیوں نہیں کرتے؟

اصل بات اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کرنا ہے

قرآن بتاتا ہے کہ ان کے من کے اندر تو اپنا چور ہوتا ہے لیکن یہ اس کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتے کہ ہم خود گمراہ ہوئے تھے۔ جیسے ہر فرد اپنے ہر بدفعل کا ذمہ دار شیطان کو قرار دے دیتا ہے۔ یہ Self-deception (فریبِ نفس) ہے۔ یہ اپنے آپ کو خود ایک مغالطے میں رکھنا ہے۔ یہ جو ہم اپنے ہر برے کام کو ابلیس یا شیطان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں‘ یہ درحقیقت فریب نفس ہے کہ ہم اس کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے‘ قبول نہیں کرنا چاہتے‘ اعتراف نہیں کرنا چاہتے یا یہ جو کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ ابلیس کی طرح کرنے والے تو گناہ گار مجرم ہوئے اور ہماری طرح کے‘ یہ جو اللہ کے بظاہر مقدس بندے ہیں‘ میں مقدس Quoted کہہ رہا ہوں‘ وہ جو کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ تو اللہ کی مرضی سے یہاں سب کچھ ہوتا ہے‘ اس کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہلتا‘ بات یہ بھی وہی ہے کہ یہ جو ہم سے غلطیاں ہوتی ہیں‘ ہم سے گناہ سرزد ہوتے ہیں‘ تو انسان تو مجبور واقع ہوا ہے۔ خدا کے حکم کے بغیر تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بھی وہی چیز ہے۔ اسی لیے اس ❶ نے کہا تھا کہ:

یہ تیرے مومن و کافر‘ تمام زناری

شیطان کو ذمہ دار ٹھہرانے والے یا یہ کہنے والے کہ خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتہ نہیں ہلتا‘ اس لیے ہم کیسے اپنی مرضی سے یہ کر سکتے تھے‘ دونوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اِن اپنے جرائم اور غلط کاریوں کی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتے جیسے شیطان کو بدنام کر کے اس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ اللہ کے بندے خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور مقدس بن جاتے ہیں کہ رضائے خداوندی یہی ہے‘ مرضی مولیٰ بر ہمہ اولیٰ۔ ❷ قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ایمان سے کہو‘ تمہارے دلوں کے اندر کیا یہ بات نہیں تھی کہ یہ اس قسم

---

❶ یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

وجود انہی کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد　　یہ تیرے مومن و کافر‘ تمام زناری!　　(ضربِ کلیم)

❷ مالک کی رضا سب سے بہتر ہے۔ ہر امر میں خدا کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو　　لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

کے خدا کی پابندیاں گراں گزرتی تھیں‘ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے‘ جن کے اندر تو یہ بات تھی مگر جرأت اتنی نہیں تھی کہ اس کا یوں اعلان کرتے۔تم تو چاہتے تھے کہ کسی طرح سے ذرا سی کوئی سبز جھنڈی دکھائے اور گاڑی چل پڑے۔اوگاڑی تو چلنے کے لیے پہلے تیار کھڑی ہوتی ہے۔انجن چلنے کے لیے تیار نہ ہو‘ یہ گارڈ لاکھ جھنڈیاں دکھاتا رہے گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔انہوں نے کہا کہ تم خود مجرم تھے لیکن تمہارے اندر یہ جرأت نہیں تھی۔اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ **وَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا** (34:33) کہا کہ تم ہمیں یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ وہ جو دن رات تم پلان بناتے رہتے تھے‘ سازشیں کرتے رہتے تھے‘Political (سیاسی) چالیں چلتے رہتے تھے کہ اِس طرح سے انہیں الجھاؤ‘ اُس طرح سے اپنے پیچھے لگاؤ‘ یہ جو کچھ تم کرتے رہتے تھے‘ ہم تو اس کی وجہ سے پھنس گئے۔غور کیجیے جب کسی غلط نظام‘ غلط دورِ اقتدار کے نتائج سامنے آتے ہیں‘اس سے سارا معاشرہ چیخ اٹھتا ہے۔یہ اوپر والوں سے کہیے کہ تمہاری وجہ سے یہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہم کیا برے ہیں‘ جیسا دودھ ہوتا ہے اسی قسم کی بالائی آتی ہے‘ ہم اسی قوم کے پیدا کردہ ہیں‘ قوم ہی ایسی ہے۔وہ قوم کہتی ہے کہ ہم جو کچھ کرتے تھے‘ یہ اتنے چالاک تھے کہ ہمیں یہ اس غلط فہمی میں‘ مغالطے میں‘ رکھتے تھے‘ دھوکا دے جاتے تھے‘ فریب کر جاتے تھے‘ الجھا جاتے تھے‘ ہمیں سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں‘ بس الجھا کے لے جاتے تھے تو ہم تو اس طرح سے مارے جاتے تھے‘ ہم تو بالکل بدھو واقع ہوئے تھے۔ اس غلط نظام میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے یہ جو محکوم متبعین یا عوام یا جن کو آج کی اصطلاح میں پیچھے چلنے والے کہتے ہیں یہی محکوم ہیں‘ یہ آگے چلنے والے معبود ہیں‘ یہ ان کے عبادت گزار کہیے۔یہ ان کے مکالمے ہو رہے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے سائیکولوجی کو بڑی اہمیت دی ہے

ان عوام کی پیچھے چلنے کی جو نفسیات ہے‘ آج کی سائیکولوجی نے‘ جیسا میں اکثر کہا کرتا ہوں‘ قرآن کے سمجھنے کے لیے بہت سی چیزیں بہت اچھی کی ہیں۔یہ بات فلسفے سے بہت آگے چلی گئی ہے۔قرآن کا تعلق فلسفے سے نہیں ہے بلکہ زیادہ سائیکولوجی سے ہے کیونکہ وہ کہتا یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کی نفسیات میں تبدیلی نہیں واقع ہوتی اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔یہ ایک نیا علم‘ اس دور میں‘ ہمارے ہاں پروان چڑھا ہے‘ یا بڑھ رہا ہے گو کہ ابھی آگے تک وہ سائنس تو نہیں بن سکا لیکن اس کے باوجود نفسیات کے متعلق وہ

بڑی عجیب باتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ ایرک فرام [1] امریکہ میں سے ہے۔ آج کل وہ Psycho-Analysis (تحلیل نفسی) میں بڑے بلند مرتبے کا ریسرچ اسکالر (Scholar) مانا جاتا ہے۔ اس کی بڑی عمدہ کتابیں ہیں۔ وہ Latest (جدید ترین) ہیں' اس لیے میں اکثر اس کے حوالے دیتا رہتا ہوں۔ اس کی ایک کتاب Fear of Freedom (خوفِ آزادی) ہے۔ ساری دنیا یہ کہتی ہے کہ ہر شخص Freedom (آزادی) چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں' یہ جو عوام ہیں' یہ Freedom (آزادی) سے ڈرتے ہیں کیونکہ Freedom (آزادی) میں بڑی ذمہ داریاں لینی پڑتی ہیں' یہ ذمہ داریوں سے گھبراتے ہیں۔ یہ وہی بات جو بہت پہلے' وہ [2] کہہ گیا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے' نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ محکوم کی نفسیات ہے اور پھر یہ (مرزا اسداللہ خاں) غالب ہے۔ اس کی نگاہ بھی نفسیات پہ بڑی گہری جاتی تھی۔

اپنے لیے خود کوئی فیصلہ کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے

یہ بات ایرک فرام (1900-1980) لکھتا ہے کہ عوام یہ نہیں چاہتے ہیں کہ ذمہ داریاں لیں۔ یہ ذمہ داریوں سے گھبراتے ہیں۔ اس نے کہا کہ سب سے بڑا مشکل کام اپنے لیے خود فیصلے کرنا ہے۔ یہ اس سے گھبراتے ہیں۔ یہ کرائے ہوئے فیصلے چاہتے ہیں۔ سب سے پہلا مغالطہ تو یہ مذہب دیتا ہے یعنی یہ کیے کرائے ہوئے فیصلے لیتا ہے مثلاً اسلاف نے یہ فرمادیا' فلاں کتاب میں یہ آیا ہے' تفسیر میں یہ لکھا ہے' فلاں امام کا یہ قول ہے' یا یہ کہ ہم تو فقہ حنفی کے پابند ہیں صاحب! ہم امام بخاری کے پیچھے چلتے ہیں۔ یہ خود کوئی Decision (فیصلہ) نہ لینا ہے۔ اپنے لیے خود کوئی فیصلہ لینے میں بڑی محنت کرنا پڑتی ہے' سیروں خون خشک ہوجاتا ہے' فکر کے بعد کسی فیصلے پہ پہنچنا اور اس فیصلے کے بعد پھر اس کی ذمہ داری لینا' بڑی ہمت کا کام ہے۔ قرآن اس قسم کی قوم پیدا کرنا چاہتا ہے جو ذمہ داری لے۔ وہ شخص اس پوری کتاب میں لکھتا ہے کہ یہ Fear of Freedom (خوفِ آزادی) ہے جس سے اس قسم کے بنے بنائے عوام' ان لیڈروں کو ہاتھ

---

[1] اس کا سالِ وفات 1980ء ہے۔

Fromm, Erich (1900-1980). Geman born U.S psycho-analyst and philosopher. Challenging the theories of Sigmund Freud (1856-1939), he argued the importance of sociological and cultural influences in causing psychological disturbances. (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Lomited, P.614)

[2] یہ اشارہ مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797) کی طرف ہے۔

آ جاتے ہیں۔ یہ ان کے اندر کی چیز ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی اور ذمہ داری سنبھال لے۔ اور وہ اس کو Exploit (سلب) کر جاتے ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ دنیا میں غلط نظام قائم ہی اس طرح سے ہوتا ہے۔

لیڈر عوام کو اور عوام لیڈروں کو قصوروار ٹھہراتے ہیں

اب دیکھیے کہ قرآن جو جہنم میں مکالمات پیش کر رہا ہے' یہ انہی کے مکالمے ہیں' انہی کی نفسیاتی کیفیت ہے۔ وہ لیڈر' ان عوام کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں' یہ عوام' ان لیڈروں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اب ایک اور بات پیدا ہوگئی۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ذمہ دار تو یہ لیڈر رہوتے ہیں۔ عام طور پہ ہمارے ہاں یہی چیز ہے کہ جو ذمہ داری ہوتی ہے' وہ تو ان لیڈروں کی ہوتی ہے۔ عوام کیوں اس عذاب میں آتے ہیں؟ جیسے ہم آپ آج کل اپنے آپ کو یہ فریب دیتے ہیں کہ صاحب! ہم نے کیا کیا تھا؟ نہ کوئی لوٹ مچائی' نہ کوئی دھاندلی کی' نہ کچھ حاصل کیا اور خوامخواہ اس عذاب کے اندر ہم بھی گرفتار ہیں۔ تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں الگ ہونا چاہیے تھا' جہنم میں تو انہی کو ہونا چاہیے تھا جو یہ بڑے بڑے لیڈر تھے۔ **وَ اِذۡ یَتَحَآجُّوۡنَ فِی النَّارِ فَیَقُوۡلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِیۡبًا مِّنَ النَّارِ** [1] (40:47) یہ جو عوام ہوں گے' میں Followers (متبعین) کا یہی ترجمہ کروں گا ورنہ یہ جو Followers اور لیڈر ہیں ان کا ترجمہ وہی ہے۔ یہ ان بڑوں سے کہیں گے کہ تم ہمیں کشاں کشاں اس منزل میں لے آئے ہو۔ کیا الفاظ ہیں قرآن کے' عزیزانِ من! سورۃ ابراہیم میں ہے کہ جس کارواں کے سالار اس قوم کو اس منڈی میں لے آئیں جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ [2] وہ ان سے یہ کہتے ہیں کہ تم تو ہمیں بڑے بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے' یہ کہاں آ گئے؟ تو تم اتنی ذمہ داری لیا کرتے تھے کہ کوئی بات نہیں' کچھ ہوگا ہم ذمہ دار ہیں۔ کہا کہ تم ذمہ داری لیتے تھے تو آج ہمیں کچھ اس عذاب میں سے چھڑاؤ۔ کیا جواب ملے گا؟ **قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُلٌّ فِیۡہَاۤ** (40:48) وہ ان سے کہیں گے کہ اس جہنم میں تم ہی نہیں ہو' ہم سب اس جہنم کے اندر ہیں۔ کوئی بھی ایک دوسرے کا عذاب ٹال نہیں سکتا۔ یہ **کُلٌّ فِیۡہَاۤ** (40:48) آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں قرآن بھی ان Followers کو بری الذمہ قرار نہیں دے رہا۔ ابھی وہ انہیں بتاتا ہے کہ تمہارا جرم کیا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ **یَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡہُہُمۡ فِی النَّارِ یَقُوۡلُوۡنَ یٰلَیۡتَنَاۤ اَطَعۡنَا اللّٰہَ وَ اَطَعۡنَا الرَّسُوۡلَا o وَ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ**

---

[1] اُس جہنم میں لوگ ایک دوسرے سے جھگڑیں گے۔ وہ کمزور لوگ (عوام) جنہیں بڑے بڑے لیڈروں نے اپنے پیچھے لگا رکھا تھا' ان سے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع تھے۔ کیا تم اس عذاب کا کچھ حصہ ہم سے دور نہیں کر سکتے؟ (38:60; 37:27-29; 34:32; 33:67; 14:21) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص-1099)۔

[2] وَ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ (14:28)

اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا (33:66-67) [1]۔ وہاں یہ جو Followers (متبعین) ہیں' یہ کہیں گے کہ اے کاش! اس کے بجائے ہم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے' صحیح نظامِ خداوندی کی اطاعت کرتے۔ ہم نے اپنے سیاسی لیڈر اور مذہبی راہنما' دونوں کی اطاعت کی۔ **سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا** (33:67) میں یہ دونوں آ گئے۔ آج کی اصطلاح میں سیاسی لیڈر **سَادَتَنَا** [2] بھی اور مذہبی راہنما **کُبَرَآءَنَا** بھی دونوں آ گئے۔ کہا کہ ہم نے ان دونوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں خدا کی طرف جانے والے راستے سے گمراہ کر دیا۔

قرآنِ حکیم احبار و رہبان دونوں کو مجرم قرار دیتا ہے

علماء و مشائخ کے متعلق تو قرآن نے بالتصریح کہا ہے کہ یہ خدا کی طرف جانے والے راستے سے روکتے ہیں۔ سورۃ توبہ (9 ویں سورۃ) کی وہ 34 ویں آیت ہے جس میں یہ کہا ہے کہ یہ احبار و رہبان **یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ** (9:34) جو بظاہر تمہیں خدا کی طرف جانے والے راستے کی طرف لیے چلے جا رہے ہیں حالانکہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی لوگ ہیں۔ یہ کتابِ قرآن تو فریبِ نفس کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑتی' عزیزانِ من! بہرحال ان متبعین (Followers) نے کہا کہ ہم نے ان کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں بھی ڈبو دیا اور کہا کہ **رَبَّنَاۤ اٰتِہِمۡ ضِعۡفَیۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ** (33:68) اے ہمارے پروردگار! یہ ٹھیک ہے کہ ہم تو ہیں ہی جہنم کے اندر۔ کم از کم انہیں دوگنا عذاب دو۔ ایک تو اس لیے کہ یہ خود غلط راستے پہ چلے تھے اور دوسرے اس لیے کہ انہوں نے ہمیں بھی غلط راستے کے اوپر چلایا تھا۔ ہمارے جو جرائم ہیں ان کی ذمہ داری ان کے اوپر عائد ہوتی ہے۔ چونکہ ان پہ دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے' ان کے اپنے جرائم کی بھی' اور جو ہم نے جرائم کیے ان کی بھی' حقیقت میں موجب ابتدا یہی تھے اس لیے ان کو دہرا عذاب دو' تو گویا اکہرے عذاب تک تو یہ معترف ہو گئے۔ انہیں دہرا عذاب دو۔ آپ کو معلوم ہے کہ کیا جواب ملتا ہے؟

---

[1] اُس وقت' ان کی حالت یہ ہوگی کہ یہ اس تباہی کی آگ میں اوندھے منہ جھونک دیئے جائیں گے' اور یہ بصد حسرت و یاس کہیں گے کہ اے کاش! ہم بھی اللہ اور رسول (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرتے (تو ہماری آج یہ حالت نہ ہوتی)۔ اُس وقت ان کے عوام کہیں گے کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہم نے اپنے ان لیڈروں کی' جو ہم سے بڑے بنے ہوئے تھے' اطاعت کی' تو انہوں نے ہمیں زندگی کے صحیح راستے سے بہکا دیا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص-984)۔

[2] اس کا مادہ ''س و د'' ہے۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ ''اَلسَّائِدُ'' سردار یا سید سے نیچے کا سردار۔ السید رئیس صاحبِ سواد' جس کے ساتھ بہت سی جماعت ہو۔ ''اَلۡاَسۡوَدُ مِنَ الۡقَوۡمِ'' قوم کا سب سے بڑا اور جلیل المرتبہ آدمی ہو' بزرگِ قوم ہو۔ (پرویزؒ): لغات القرآن جلد دوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1960ء) (ص ص 916-915)۔

اعمال کی نتیجہ خیزی کے وقت لیڈروں اور متبعین کے مابین باہمی چپقلش کا منظر

قرآنِ کریم یہاں افراد کا ہی ذکر نہیں کرتا' بلکہ پارٹیز کا بھی ذکر کرتا ہے۔ سورۃ الاعراف (7ویں سورۃ) کی 38ویں آیت میں قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جہنم کی کیفیت یہ ہوگی کہ پہلے ایک قوم' ایک فریق' ایک پارٹی' جہنم کے اندر آ جائے گی۔ اب اس کے بعد ایک دوسری پارٹی ہوگی' وہ ان کے بعد آئے گی۔ یہ دوسری پارٹی کون ہے؟ یہ وہ ہے جس نے پہلی پارٹی کی تقلید کی تھی' اس کی روش پہ چلے تھے' اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس اعتبار سے ابتدا تو انہوں نے کی تھی جو پہلے آئے ہیں لیکن یہ ان سے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ **كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا** [1] (7:38)۔ کیفیت یہ ہوگی کہ اس دنیا میں تو یہ سب ایک ہی تھے' ان کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے' ان لوگوں نے باہمی اتحاد کیا ہوا تھا' ایک جماعت بنے بیٹھے تھے۔ وہاں جہنم میں کیفیت یہ ہوگی کہ یہ جو جہنم میں بعد میں آنے والے ہیں' وہ پہلے آنے والوں کے اوپر لعنت کریں گے کہ ستیاناس تمہارا' خود تو ڈوبے تھے صنم ہم کو بھی لے ڈوبے۔ تم نے تو جہنم میں آنا تھا' ہمیں بھی اس جہنم میں دھکیل دیا۔ **قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ** (7:38) یہ بعد میں آنے والے خدا سے کہیں گے کہ اے پروردگار! انہوں نے ہمیں تباہ اور گمراہ کیا تھا۔ اس لیے انہیں دہرا یعنی دوگنا عذاب دو۔ یہ وہی ہے جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انہیں دوگنا عذاب دو۔ آپ کو پتہ ہے کہ قرآن کی جانب سے اس کا کیا جواب مل رہا ہے: **قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ** (7:38)۔ انہوں نے کہا کہ دونوں کو دوگنا عذاب دو۔ انہیں اس لیے کہ خود گمراہ ہوئے اور تمہیں گمراہ کیا' اور تمہیں اس لیے کہ (لفظی تصرف سے)

''انہیں'' تو ''تو'' کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا
''حضور'' تم نے بنایا ''جناب'' تم نے کیا

لیڈروں کی قوت تو ہمیشہ عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے

تم اگر انہیں لیڈر نہ بنا دیتے تو انہیں کون پوچھتا تھا۔ ان کی قوت تو تمہارے زور کے اوپر تھی اور تم کہتے ہو کہ ان کو ان کے جرائم کا دوگنا عذاب دیا جائے۔ تمہیں دوگنا عذاب تو اس لیے ہے کہ تم نے ان کو لیڈر بنایا' اس لیے انہوں نے جو جرائم کیے ہیں' ان کی قوت کا موجب تو تم ہو۔ عزیزانِ من! غلط معاشرے میں کوئی بھی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا۔ ہمیں اس فریب نفس میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ یہ

---

[1] قوموں کی حالت بھی عجیب ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی تقلید کرتی ہے' لیکن جب' کچھ عرصہ بعد' یہ بھی اُسی گڑھے میں جا گرتی ہے جس میں پہلی قوم گری تھی تو یہ (بعد میں آنے والی قوم) پہلی قوم کو مطعون کرنے لگ جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا بھی ایسا حشر ہوا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 346)۔

کتنی عظیم بات ہے جو کہہ گیا ہے کہ ان کی اپنی قوت وطاقت تھی ہی کیا؟ یہ تو تمہارے بل بوتے کے اوپر یہ کچھ بنے ہوئے تھے۔ جس دور میں قرآن نازل ہوا ہے' اس دور میں تو شاید یہ بات سمجھ میں نہ آ سکتی کہ عوام کے بنائے ہوئے یہ صاحب اقتدار کس طرح کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں تو ملوکیت تھی' اس میں وہ ہر صاحب قوت' شمشیر کے زور پہ آ کر اقتدار حاصل کر لیتا تھا تو یہ جو محکوم تھے ان کا جرم یہی تھا کہ یہ محکومی پہ قناعت کر جاتے تھے' مطمئن ہو کے بیٹھ جاتے تھے۔ قرآن اس کو بھی بہت بڑا جرم قرار دیتا ہے۔ کسی غلط بات پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے لیکن وہاں پھر بھی یہ صورت تھی کہ وہ بزورِ شمشیر آ کر قوت اختیار کرتے تھے۔ یہ جو قرآن کہتا ہے کہ یہ تو تمہارا ہی دیا ہوا اقتدار ہے' جو ان کے ہاتھ میں آیا تھا۔ آج کے دور میں تو بات نکھر کر سامنے آ گئی ہے۔ ارے' تم انہیں اگر ووٹ نہ دیتے' تو یہ کس طرح سے مسند کے اوپر آ جاتے۔ یہ تو تمہارے ووٹوں کی تعداد پہ صاحب اقتدار بنے ہیں۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ صاحب! یہ جرائم ان کے کیے ہوئے ہیں' ہمارے کیے ہوئے نہیں ہیں۔ تم نے تو ان کو اس قابل بنایا کہ یہ جرائم کر سکیں' اس لیے اگر ان کے لیے دوگنی سزا کا مطالبہ کر رہے ہو تو دوگنی سزا تمہیں بھی ساتھ ملنی چاہیے اور ملتی ہے' عزیزانِ من! غلط نظام کے جو تباہ کن عواقب اور نتائج ہوتے ہیں' ان میں کبھی بھی یہ عوام بخشے نہیں جاتے' الگ نہیں کیے جاتے اور اس کی وجہ یہی ہوتی ہے جو چودہ سو سال پیشتر قرآن یہ کچھ بتاتا ہے۔

آج کا جمہوری نظام اور اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ''

میں کہہ رہا ہوں کہ آج کا جو یہ جمہوری نظام ہے' اس کو کس وضاحت سے بیان کیا ہے۔ یہ وہ جمہوری نظام ہے جسے آج ابلیس بڑے فخر سے پیش کرتا ہے۔ میں کئی دفعہ یہ کہا کرتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ (1938-1877) کی ارمغانِ حجاز میں' جو ان کی اردو کی نظم ہے' یہ آخری بڑی لمبی نظم ہے یہ ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' ہے جو 1936ء [1] میں کہی گئی تھی۔ یہ بڑے غور سے پڑھنے کی ہے۔ یہ میرے ذہن میں ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی یہ کیا تھا کہ ایک خاص نشست میں' خاص تقریب میں' غالباً میں نے یہ پوری نظم تمام سندوں حوالوں کے ساتھ' اور دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق پیش کی تھی' آج پوری نظم تو نہیں' آج کے اس درسِ قرآن کے عنوان کی نسبت سے' اس کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ وہ ہے بڑی دلچسپ چیز۔ علامہؒ [2] نے بھی یہ چیزیں محاکاتی انداز میں' ڈرامائی انداز میں' پیش کی ہیں۔ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ

---

[1] نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے 1996ء میں طبع ہونے والے ارمغانِ حجاز......اردو...... کے نسخہ میں ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کے نیچے 1936ء درج ہے۔

[2] یہ اشارہ مفکرِ قرآن ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔ انہیں بلا خوف وخطر علامہ محمد اقبالؒ بھی کہا جاتا ہے۔

کیبنٹ ہو رہی تھی' اس میں جو وزیر اعظم تھے یا صدرِ مملکت تھے وہ خود ابلیس تھے اور باقی ان کے وزراء یا مشیر تھے۔ وہ Review کرتے ہیں کہ انہوں نے جو نظامِ ابلیسی قائم کیا ہوا ہے' اس کے متعلق اس کے نتائج کیا ہوئے' کیا خامیاں رہ گئیں' کیا کیا چیزیں برآمد ہوئیں' آئندہ پروگرام کیا ہے' کیا کرنا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مشیر یا وزیر جو اس کا اپنا شعبہ ہوتا ہے' ڈیپارٹمنٹ ہوتا ہے' منسٹری ہوتی ہے' اس کی رپورٹ پیش کرتا ہے کہ میں نے اپنے ہاں انسانوں کو تباہ کرنے کے لیے یہ کیا ہے' دوسرا کہتا ہے کہ میں نے اپنے شعبے میں یہ کیا ہے۔ وہ سنتا رہتا ہے' چھوٹی چھوٹی تنقید بھی کرتا ہے اور پھر آخر میں بتاتا ہے کہ یہ جو سب چیزیں ہیں یہ نا کام ہیں' میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کرنا کیا چاہیے۔ یہ بڑی عجیب نظم ہے۔ ''کرنا کیا چاہیے'' میں ابھی بتا دوں۔ یہ کہتا ہے کہ ہمیں دنیا میں کسی نظام سے ڈر نہیں ہے' کسی قوم سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے' صرف ایک ہی ڈرنے کی بات ہے کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں ❶

بس یہ ہے کرنے کا کام' باقی سارے نظام اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ یہ جو قرآن کا نظام ہے' یہ ہے جس سے ابلیسی نظام کو خطرہ ہے اور اس کے لیے میں تمہیں پروگرام دیتا ہوں اور پروگرام یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں انہیں

او فیر سبّے خیراں' کہ ہو گیا ❷۔ اس نظم میں ''پہلا مشیر'' یہ پیش کر رہا ہے کہ یہ جو ابلیسی نظام ہے اس میں قوموں کو محکوم رکھا جاتا ہے:

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ اِبلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

سب سے بڑا جرم قوم میں خوئے غلامی کا پیدا کرنا ہے

خوئے غلامی میں مجبوراً' جبراً کسی کو غلام بنا لینا اور بات ہے' اس میں خوئے غلامی کا پیدا کر دینا' اور پھر اس میں ان کا پختہ ہو جانا' یہ ہے اصل چیز۔ یہ ہے ابلیسیت! پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام۔ اور سنیے! اس طرح پختہ تر ہونے کے بعد ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ:

---

❶ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف...... ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

❷ ارے! پھر تو سبھی ٹھیک ہے' بہتری ہی بہتری ہے' اپنا کام بن گیا۔

ہے اَزل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام

عزیزانِ من! غور کیجیے' میں نے کہا ہے کہ فرصت نہیں ہے ورنہ میں آپ کو سمجھاؤں۔اس میں ایک ایک لفظ سمجھنے کا ہے۔آپ کے ہاں کا سارا مذہب' ساری شریعت' بلکہ آگے چل کر کہتا ہے کہ سارا تصوف کیا ہے؟ جھکنا' جھکنا' جھکنا' جھکنا: ہر صاحب قوت کے سامنے جھکنا' انکساری' عجز' محکومیت۔''ہو جا ککھ مسیت دا۔''❶ وہ پہلا مشیر کہتا ہے کہ ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود ہی ہیں' ان کی جو نماز ہے اس میں قیام آتا ہی نہیں ہے' سجدہ ہی سجدہ ہے' کسی باطل کے سامنے کھڑے ہونا' ان کی نماز میں ہے ہی نہیں۔ان کی فطرت کا تقاضا نمازِ بے قیام ہے اور آگے ہے کہ

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

اور یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج یہ ابلیس فخر سے اپنا کارنامہ' اپنی منسٹری کا یہ کارنامہ' کیبنٹ میں' بحضورِ وزیر اعظم وصدر مملکت پیش کر رہا ہے کہ

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

افلاطون کے فلسفہ کے مقابلے میں ارسطو کا Logic (منطق) کامیاب ہے

اور آگے یہ ہے کہ ہم نے اس قوم کے لیے کیا کیا ہے۔تمہیداً میں عرض کر دوں کہ یونان میں ایک چیز ہے جسے فلسفہ یونان کہتے ہیں۔اس میں فلسفہ زیادہ نہیں ہے اصل میں وہ Logic ہے جسے منطق کہتے ہیں۔ہمارے ہاں اس کے لیے علم الکلام کی اصطلاح آئی ہوئی ہے۔مسلمانوں نے جب اپنے ہاں یونان والوں کے ترجمے کیے تو اس کا نام انہوں نے علم الکلام رکھا۔ارسطو (322-384 ق م) اس Logic (منطق) کا ابوالآباء ہے چونکہ پلیٹو یا افلاطون (347-428 ق م) وغیرہ کے ہاں فلسفہ ملتا ہے۔ارسطو (322-384 ق م) جو Logic (منطق) کا ابوالآباء ہے' اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے ہاں Logic کے متعین کیے ہوئے فارمولے آج تک اسی طرح چلے آ رہے ہیں۔

---

❶ مسجد کی صف کے تنکے کی طرح بے ضرر ہو جا یعنی بے قدر و وقعت ہو جا (یہی مقصودِ مذہب و شریعت وتصوف ہے)۔

Logic(منطق) کے الفاظ کی الجھنوں کے جال کی گرفت اوراس کا اثر

انسانی ذہن کی گمراہی کے لیے منطق یا Logic سے زیادہ کوئی اور حربہ مؤثر نہیں ہوتا۔ یہ ہوتا کیا ہے؟ صرف الفاظ کا گورکھ دھندہ' اس کے علاوہ اس کے اندر اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کسی چیز کو Reality (حقیقت) میں مانتے ہی نہیں ہیں کہ حقیقت میں بھی کچھ قدر یا اقدار ہیں۔ جس چیز کو جو چاہیں الفاظ کے ہیر پھیر سے ثابت کر دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کہو تو ہم پیتل کو سونا ثابت کر دیں' کہو تو سونے کو پیتل ثابت کر دیں۔ ان فارمولوں کی اس قدر گرفت ہوتی ہے کہ ان الفاظ کی گرفت سے انسان کا ذہن نکل ہی نہیں سکتا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ انسان کے ذہن کو ماؤف کرنے کا' الجھنوں میں ڈالنے کا' یہ سب سے زیادہ مؤثر حربہ ہے۔ یہ پوچھو نہیں' جس دور کے اندر یہ فقیر ❶ خود اس سے گزرا ہے! کیا کیفیت تھی؟ پتہ نہیں وہاں سے کیسے نکل گیا ہوں! اللہ تعالیٰ کا ہی فضل ہے' اور اس کے مقابلے میں یہ چیز تو کچھ نہیں ہے۔ یہ منطق اور فلسفہ تو ذہنی چیز ہوتی ہے۔

یونان کی سوغات: تصوف کی خواب آور دنیا

اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں تصوف کو اختیار کیا گیا۔ یہ ایجاد نہیں کیا گیا۔ یہ بھی مانگ کر لیا ہے۔ ہم نے یہ بھی یونان سے لیا ہے۔ تصوف ❷ کا تعلق انسان کے جذبات سے ہوتا ہے۔ اس میں دماغ' فکر' ذہن' خرد' کو آنے ہی نہیں دیا جاتا۔ یہ لٹھ لے کر اس کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تصوف کے اندر یہ ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دو' نہ رہے بانس نہ بجے بانسری' انسان کی اپنی Individuallity (انفرادیت)' اس کا تشخص' اس کی خودی' اس کی میں' اس کا I- am - ness سب ختم ہو جاتا ہے' یہ باقی ہی نہیں رہتا:

کافر ہوں جو ''میں'' سمجھوں کہ ''میں'' بھی کچھ ہوں
جو کچھ ہے سو ''تو'' ہے میرا ایمان یہی ہے

سنیئے' کیا کہتا ہے یہ ابلیس کا پہلا مشیر کہ ہم نے کیا کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ

طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ 'قوالی' سے کچھ کم تر نہیں 'علم کلام'!

جو ہم چاہتے تو علم کلام کو بھی عام کر سکتے تھے۔ 'قوالی' سے مراد یہاں تصوف ہے۔ وہ بھی تھا لیکن یہ جو مشرق کی طبع ہے' اس میں شروع سے

---

❶ یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔
❷ تصوف برائے شعر گفتن خوب است (شیخ علی حزیں)

ہی مذہب' زیادہ مشرق کے اندر آیا ہے۔ یہ جتنے بڑے بڑے پیغمبر ہیں' آپ دیکھیں گے کہ مشرق کی طرف آئے ہیں۔ مشرق کو عام طور پر جذبات پرست کہا جاتا ہے۔ یہ پہلا مشیر کہہ رہا ہے کہ میرے ذہن میں تھا کہ یہاں ان مسلمانوں کے اندر منطق کو عام کروں لیکن میں نے یہ سمجھا کہ نہیں' ان کے لیے زیادہ مؤثر حربہ تصوف کا ہے تو میں نے یہاں تصوف کو عام کر دیا۔ تصوف پر اقبالؒ (1938-1877) نے بہت کچھ لکھا ہے:

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

تصوف کی تعلیم کا ماحصل

اس تصوف میں ہوتا ہی یہ نمازِ بے قیام ہے: اس دنیا سے ترک' مادہ سے ترک' ہر میٹریل شے کو قابل نفرت سمجھنا' دنیاوی زندگی کو جیل خانہ قرار دے دینا' اسے مردار سمجھنا' ساری جونگاہ اور عشرت ہے وہ کس قسم کی ہے:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

تصوف کے اندر یہ منتہیٰ ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ خلوت گاہوں کے اندر **فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ** (16:36) کا وظیفہ کرنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ **فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ** (16:36) جاؤ' زمین میں چلو' پھرو' اور اقوامِ گزشتہ کے کھنڈرات سے عبرت حاصل کرو کہ ہم نے کیا کیا ہے: تاریخ سے پوچھو' ان کے اوراق سے پوچھو' جاؤ' پھرو: **فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ** (16:36)۔ آپ حیران ہوں گے کہ تصوف میں **فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ** (16:36) ایک چلہ ہے۔ انہوں سے آکر مرید نے پوچھا: کہ میں حضرت صاحب سے ملنا چاہتا ہوں' صاحب! میں ذرا ہاتھ چومنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' آج کل تو نہیں ہو سکتا۔ یہ کچھ کہنے لگے: کیوں؟ کہنے لگے کہ حضرت صاحب تو باہر نہیں آسکتے' چالیس دن تک خلوت میں ہیں۔ کہنے لگے: اوہ کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ حضرت صاحب آج کل **فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ** (16:36) کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں' خلوت میں بیٹھے ہیں۔ کمرے سے باہر برآمدے میں بھی نہیں آسکتے: **فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ** (16:36) کا وظیفہ ہو رہا ہے' یہاں بیٹھے ہوئے:

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت' کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے[1]

---

[1] غالب' مرزا اسداللہ خاں (2002)۔ دیوانِ غالب۔ لاہور: جہانگیر بک ڈپو۔ ص۔ 189۔

جانا آنا تو کوئی ہوتا نہیں' ان کے پاس تصورِ جاناں کیے ہوئے بیٹھے رہیں۔ اس لیے وہ ❶ یہ کہتا ہے کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے

بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

بات تو اس دنیا کے جو ہنگامے ہیں ان کو انسان کے لیے سہل کرنا تھا لیکن اقبالؒ کہتا ہے کہ اگر زمین کے یہ ہنگامے سہل نہ ہوں تو ''بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی''۔ اقبالؒ ہی کا ایک اور شعر ❷ ہے:

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا

زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے' فضائے گردوں ہے بے کرانہ

کوئی بات نہیں ہے' اگر زمین تنگ ہے تو کیا؟ وہ جو میں دو بھائیوں کی تقسیمِ جائیداد کا قصہ سنایا کرتا ہوں کہ باپ کا چھوڑا ہوا وہ ایک ہی کوٹھا تھا جو انہوں نے تقسیم کرنا تھا۔ بڑا بھائی چھوٹے سے کہنے لگا کہ برخوردار! دیکھو' تمہارا زیادہ حق ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں ہے' کچھ اور بھی کرلوں گا اور میں تمہارے لیے' تمہارے سر پہ باپ کی جگہ ہوں' میں نے ہی ہاتھ رکھنا ہے' تو یوں کرتے ہیں کہ ''از صحن خانہ تا بہ لب بام'' مجھے دے دو یعنی یہ زمین یہاں فرش سے لے کر صرف چھت تک جو دس بارہ فٹ کا ہے' مجھے دے دو اور ''از بامِ خانہ تا بہ ثریا'' یعنی چھت سے لے کر آسمان تک تم لے لو۔ میں تیرے پیودی تھاں ہیں نا۔ ❸ یہ ہے تصوف:

زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے' فضائے گردوں ہے بے کرانہ

اور یہاں تو پھر اس فضائے گردوں کو کہا جاتا ہے۔ آپ کے مذہب کی دنیا میں تو سارا قصہ ہی آخرت کی جنت پہ رکھ دیا جاتا ہے۔ ایسا سبز باغ دکھاتے ہیں کہ یہ دنیا و درِ دنیا کا سارا جو قصہ ہے' یہ کفار اور مشرکین کے لیے رکھا جاتا ہے اور وہ ''بامِ خانہ'' سے ''تا بہ ثریا'' اور اس سے آگے پھر ''تا بہ سدرۃ المنتہیٰ'' وہ اس قوم کے حصہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ کہتا ہے: ❹

طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی

---

❶ یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔ ان کا یہ شعر ضربِ کلیم کے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد' 1992ء کے ص 33 پر موجود ہے۔

❷ اقبالؒ (1996)۔ ارمغانِ حجاز اردو۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ ص۔ 69

❸ یہ اس لیے کہ میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔

❹ اقبالؒ کی ''ارمغانِ حجاز اردو'' میں ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کے عنوان سے پہلا مشیر یہ بیان دیتا ہے۔

یعنی منطق میں یا فلسفے میں بہرحال ذہن تو کام کرتا تھا یہ جو افیون ہے اس میں ذہن بالکل معطل ہو جاتا ہے کیف اور نشہ ہی رہتا ہے وہ کہتا ہے کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے
(غالب)

تا کہ میں کسی وقت بھی ہوش میں نہ آؤں۔ ذرا سی بھی آنکھ نیم وا بھی نہ ہونے لگے۔ کیا کہہ گیا ہے کم بخت! ہوش میں آ رہا ہوں میں، چشم ساقی تری دہائی ہے اور پلا' آ رہا ہوں میں' بڑا خطرہ ہے

طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ 'قوالی' سے کچھ کم تر نہیں 'علم کلام'!
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز)

نبوتِ قادیاں اور جہاد

آخر میں آ کے وہ کہتا ہے کہ اور تو اور' انتہا ہو گئی کہ تم کو وہ قادیان [1] ایک نبی مل گیا۔ اس نے کیا کہا؟ کہتا ہے:

کس کی نو امیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید؟
'ہے جہاد اس دَور میں مردِ مسلماں پر حرام'!

چل قصہ ہی ختم ہو گیا۔ اے آخری نبی' اے کہن واسطے آیا سی' ایس قوم نوں۔ [2]

عزیزانِ من! یہ ہیں وہ مکالمے' جو جہنم میں ہو رہے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس میں آپ' جو Followers (متبعین) یا عوام کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہیں' اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے۔ اب آ جایئے پھر اسی طرف جہاں سے یہ درس شروع کیا تھا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ **وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُهُمۡ وَ مَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَیَقُوۡلُ ءَاَنۡتُمۡ اَضۡلَلۡتُمۡ عِبَادِیۡ هٰۤؤُلَآءِ اَمۡ هُمۡ ضَلُّوا السَّبِیۡلَ** (25:17) جب (ظہورِ نتائج کے وقت) ان لوگوں کو جو خدا کے اقتدار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں' اُن کے معبودوں

---

[1] یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) کی طرف ہے۔
[2] یہ "آخری نبی" اس قوم کو یہ کہنے کے لیے آیا تھا۔

کے ساتھ اکٹھا کیا جائے گا تو اُن لیڈروں سے' بڑوں سے' علماء اور مشائخ سے' پوچھا جائے گا کہ تم نے انہیں گمراہ کیا تھا؟ وہ جو پہلی بات تھی کہ غلط راستے پر چلنے کی آرزو تو ان کے سینے میں خود مچلتی تھی مگر وہ کہیں گے کہ **قَالُوْا سُبْحٰنَکَ** (25:18)۔ کیا لفظ ہے! یہاں کہا جائے گا کہ یہ کون سا مقام ہے جو سُبْحٰنَکَ کہا ہے؟ کہا کہ تو تو اس سے بہت بلند ہے کہ تجھے کسی چیز کا علم نہ ہو اور تو ہم سے پوچھے کہ تم بتاؤ۔ یہ بات نہیں کہ ہم کوئی جواب دیں' لیکن تم نے چونکہ حجت کے لیے ہم سے پوچھ لیا ہے' اس لیے ہم جواب دینے کی جرأت کرتے ہیں ورنہ تو اس سے بلند ہے کہ تیرے ہوتے ہوئے ہم کہیں کہ تمہیں معلوم نہیں' ہم بتاتے ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ **سُبْحٰنَکَ مَا کَانَ یَنْۢبَغِیْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِکَ مِنْ اَوْلِیَآءَ** (25:18)۔ انہیں گمراہ کرنا تو ایک طرف رہا' ہمارے لیے یہ بھی جائز نہیں تھا کہ ہم بھی تیرے سوا کسی اور کو اپنا سرپرست مقرر کرتے۔ یہ ہے سرپرستی کی صورت جسے محکومیت کہا گیا ہے۔

اس روشِ زندگی کا نتیجہ بھوک اور خوف کا عذاب ہے

یہ ہوا اس قوم کے ساتھ۔ اور دیکھیے' عزیزانِ من! کہ اس قوم کے ساتھ کیا ہوا؟ ایک فقرے کے اندر اس عذابِ جہنم کی ساری لم آجاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے مفلسی اور غریبی کو جس کا نام بھوک ہے' خدا کا عذاب قرار دیا ہے: **لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ** (16:112) ہر وقت سر پہ خوف کا رہنا کہ کیا ہوگا' کیا بنے گا؟ اس سے مستقبل تو بڑا تاریک نظر آ رہا ہے: وہ نہ حملہ کر دے' وہ نہ اچک کے لے جائے۔ جہنم کے اندر بدترین چیز کسی محکوم قوم کی بھوک اور خوف (16:112) ہے۔ ملک میں بھوک ہو جائے' غلہ نہیں رہے تو یوں ہوگا کہ فلاں جگہ سے لینا پڑے گا' فلاں جگہ سے برآمد کرنا پڑے گا' اگر یہ نہ رہا تو کیا بنے گا؟ ڈر اور بھوک کو یہاں خدا کا عذاب کہا ہے۔

ایک تمثیلی بیان میں عذاب کی ایک دوسری شکل

یہاں میں وہ لفظ سامنے لے ہی آؤں' یوں آگے گزرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ کون سا جرم ہے جس کی بنا پہ یہ عذاب آتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ** (16:112) اللہ مثال کے طور پہ جو بات اس میں ہے بیان کرتا ہے' سمجھ لو کہ کوئی ایک بستی تھی' بڑی خوشحال' بڑی آسودہ حال۔ چاروں طرف سے خدا کی نعمتیں اس کے ہاں بھی موجود تھیں اور چاروں طرف سے چلی بھی آ رہی تھیں۔ اتنی خوشحالی تھی! پھر اس کے ساتھ کیا ہوا؟ بتایا کہ **فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ** (16:112) خدا کی ان نعماء سے' جو اس نے عطا کی تھیں' ان لوگوں نے کفر برتا۔ کفر کے معنی ہوتا ہے ''کسی چیز کو چھپا کے رکھ لینا''' انہوں نے کفر برتا' ان نعماء کی ناقدر شناسی کی۔ بڑے بڑے لوگوں نے اپنے لیے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ **فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ** (16:112) تو خدا نے انہیں خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ ان کا کیا جرم تھا؟ بتایا کہ **بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ** (16:112) انہوں نے جو اپنے ہاتھوں سے مصنوعی نظام بنا کے کھڑا کیا تھا اور بتاتے کچھ

تھے' حقیقت میں وہ کچھ اور تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ قوم ڈر اور بھوک دونوں کے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ یہاں لفظ **یَصۡنَعُوۡنَ** (16:112) ملاحظہ فرمائیے۔ یہ تو کوئی زیادتی ہو گی' اگر میں صنعت ترجمہ کر کے' انڈسٹری کہہ لوں لیکن وہ بات کچھ ایسی ہی کہتا ہے۔ انڈسٹری تو خیر بات نہیں ہے۔ جو Capitalistic (سرمایہ داری) نظام ہے' یہ ہے عزیزانِ من! سنیئے قرآن کے الفاظ! یہ ہے اس کی لم۔ کہا کہ نہیں' ہم نے انہیں گمراہ کیوں کرنا تھا' ہم تو خود بھی تیرے سوا کسی اور کو چارہ ساز نہ مانتے' لیکن ہوا کیا؟ **وَ لٰکِنۡ مَّتَّعۡتَہُمۡ وَ اٰبَآءَہُمۡ حَتّٰی نَسُوا الذِّکۡرَ ۚ وَ کَانُوۡا قَوۡمًۢا بُوۡرًا** (25:18) اصل میں یہ سب کچھ اتنی افراط سے ان کو بغیر محنت کیے ہوئے مل گیا کہ یہ اس نشے میں مدہوش ہو گئے اور اس کی وجہ سے یہ صحیح راستہ چھوڑ بیٹھے۔ اب وہاں (16:112) میں تو مفلسی' قلاشی' بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے اور یہاں (25:18) میں دولت کی افراط کو خدا کے عذاب کا موجب قرار دیا ہے اور یہ دونوں ہی باتیں ٹھیک ہیں۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں افراطِ زر کی تعریف اور اُس کی تباہ کاریاں

عزیزانِ من! دوسرے مقام پہ ہے کہ **وَ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍۭ بَطِرَتۡ مَعِیۡشَتَہَا** (28:58) کئی قومیں تم ایسی دیکھو گے کہ وہ بھوک کے عذاب سے نہیں مریں' افراطِ زر یا افراطِ معیشت کے عذاب سے غرق ہو گئیں۔ وہ ایسی تباہ ہوئیں کہ **فَتِلۡکَ مَسٰکِنُہُمۡ لَمۡ تُسۡکَنۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہِمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا** (28:58) یہ دیکھو معدودے چند کے علاوہ ان کے کھنڈرات' ان کی تباہیوں کے نوحہ خواں ہیں۔ ان کی ٹھیکریوں پہ ان کی داستان لکھی ہوئی ملیں گی۔

یہ معیشت کا افراط کیا چیز ہے؟ آج کی اصطلاح میں اسے Capitalistic System (نظامِ سرمایہ داری) کہتے ہیں- یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ دولت اکٹھی کرنے کو منتہائے زندگی قرار دے دیا جائے' مقصد حیات قرار دے دیا جائے۔ دولت کچھ مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے' یہ فی ذاتہ مقصد نہیں ہوتی۔ یہ اسی طرح ہے جیسے یہ تلوار خود ایک مقصد نہیں ہوتی' کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے' بندوق مقصد نہیں ہوتی کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے کہ خطرہ ہو تو اس کے ذریعے سے اس کو رفع کر دیا جائے۔ اگر یہی چیزیں مقصودِ حیات بن جائیں کہ صرف انہیں اکٹھا کیے جاؤ' اکٹھا کیے جاؤ تو کہا کہ یہ اکٹھا کرنے کی ہوس انسان کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہا کہ تباہی ہے اس کے لیے۔ کون ہے یہ؟ **الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ** (104:2) وہ جو دولت اکٹھی کرتا ہے اور پھر اس کا وہ اتنا ہی کام رہ جاتا ہے کہ روز بنک بیلنس دیکھتا چلا جائے کہ اب اتنا ہو گیا' ابھی کم ہے۔ ہمارے ہاں اسے ننانوے کا پھیر کہتے تھے کہ ابھی کم ہے اور اس میں جمع کیا جائے۔ یعنی اندازہ لگائیے' عزیزانِ من! قرآن کے انداز کا۔ اس دور کے اندر یہ بات کہنا کہ **جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ** (104:2) کتنا بڑا کام تھا! عزیزانِ من! صرف جمع مال جرم نہیں قرار دیا بلکہ جمع کرنے کے بعد صحیح مصارف پہ خرچ کیا جائے تو اس سے بڑے بڑے مقاصد حاصل ہوتے ہیں لیکن جمع کیا جائے تو مقصد حیات صرف یہ بن جائے کہ وہ اس

کو گنتا رہے۔ یہ ہے Capitalistic System (نظام سرمایہ داری)۔ وہ کہتا ہے کہ **اَلۡھٰکُمُ التَّکَاثُرُ o حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ** (102:1-2) اس کو دوسرے سے بڑھ جانے کی' آگے نکل جانے کی ہوس ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ میرے پاس آئے' وہ ایک موٹر ہے' ٹھیک ہے تیرے گزارے کے لیے ٹھیک ہے' نہیں صاحب! وہ جو ہمارے ہاں فلاں صاحب ہیں ان کے پاس تین ہیں' Latest (جدید ترین) آئی ہیں' میں پانچ منگاؤں گا۔ **اَلۡھٰکُمُ التَّکَاثُرُ** (102:1) یہ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی ہوس' انسان کو مقصد حیات سے غافل کرتی ہے' **حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ** (102:2) اور اس ہوس کا تو ٹھکانہ ہی کوئی نہیں ہوتا' قبر تک پہنچ کر بھی یہ جو ہوس ہے' اس کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ وہ **جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ** (104:2) مال جمع کرتا اور گنتا رہتا ہے اور اس طرح **یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ** (104:3) سمجھ یہ رہا ہے کہ بس اس دولت کے بل بوتے پہ حیاتِ جاوید مجھے مل جائے' میں مروں گا ہی نہیں۔

دولت اکٹھی کرنے والوں کے ذہن میں یہ کبھی آتا ہی نہیں ہے کہ میں نے مرجانا ہے۔ **اَخۡلَدَهٗ o کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَةِ** (104:3-4) ان کو کہو کہ کیا کر رہے ہو' ایک چکر اس نظام کا آئے گا' یک گردش ایک انقلاب آئے گا۔ **یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ** (83:6) جس دن عام انسانیت خدا کی ربوبیت عالمینی کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ تو کیا ہوگا؟ یہ تمہارا مال و دولت ٹکڑے ٹکڑے کر کے جہنم کے اندر' اسی جہنم کے اندر' ڈال دیا جائے گا۔ وہ کون سی جہنم ہے؟ اس کے لیے بتایا کہ **نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ o الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَةِ** (104:6-7) وہ باہر کہیں آگ نہیں جلی ہوئی ہوتی' وہ تمہارے دلوں کے اندر آگ جلی ہوئی ہوتی ہے۔ ان شعلوں میں تیری دولت کو ڈال دیا جائے گا۔ **اِنَّهَا عَلَیۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ o فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ** (104:8-9) تو سمجھتا ہے کہ یہ جو دولت کے بڑے بڑے ستون ہیں' میرے لیے ممد حیات ہیں۔ یہی تو تیری تباہی کا باعث ہیں کیونکہ تو **جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ** (104:2) دولت اکٹھی کرتا ہے اور پھر گنتا ہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہو گیا اور اب کتنا۔ وہ ننانوے کے پھیر میں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی تباہی کا موجب یہ تھا' باعث یہ تھا۔ **وَ لٰکِنۡ مَّتَّعۡتَهُمۡ وَ اٰبَآءَهُمۡ حَتّٰی نَسُوا الذِّکۡرَ ۚ وَ کَانُوۡا قَوۡمًۢا بُوۡرًا** (25:18) ہوا یہ کہ ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو زندگی کا ساز و سامان اس قدر فراوانی سے مل گیا اس لیے تیرے قوانین کو انہوں نے نشے میں بدمست ہو کر نظر انداز کر دیا اور تباہ ہونے والی قوم ہو گئی۔ یہ Capitalistic System (سرمایہ داری نظام) جب ان کے اندر آ گیا تو انہوں نے اپنی تباہی خرید لی۔ اس سرمایہ داری نظام میں بڑی تباہیاں ہوتی ہیں۔

افراطِ زر کا نتیجہ تباہ کن طبقاتی تفریق کی شکل میں نکلتا ہے

عزیزانِ من! Capitalistic System (سرمایہ داری نظام) میں دو طبقات ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بے شمار دولت اکٹھی کر لیتا ہے' دوسرے وہ ہوتے ہیں جو محتاج ہوتے ہیں۔ یہ جو بے شمار دولت اکٹھی کرتا ہے' بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ یہ بڑا آزاد بندہ ہے'

اسے کسی کی احتیاج نہیں مگر وہ اپنے اندر کی اس ہوس کا اس قدر غلام اور محکوم ہوتا ہے کہ اسے آپ آزاد کہہ ہی نہیں سکتے اور یہ جو باہر والے ہیں ان کو اگر اس میں سے ان کی ضروریاتِ زندگی کی جو چیزیں ہیں' دے بھی دی جاتی ہیں تو ان کو اس قیمت پہ دی جاتی ہیں کہ ان کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔ یہ دونوں محکوم ہوتے ہیں: وہ دولت کا غلام ہوتا ہے' یہ دولت مند کے غلام ہوتے ہیں۔ سائیکولوجی میں دو Terms (اصطلاحات) بڑی عمدہ وضع کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو Capitalistic System (سرمایہ داری نظام) ہے' اس میں دولت منداور غریب دونوں کو ''Freedom from'' (سے آزادی) حاصل ہوجاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نوجوان طالب علموں کا جو ''Freedom from'' (سے آزادی) کا تصور ہے' وہ واضح نہیں ہے۔ وہ ہے Freedom from Hunger (بھوک سے آزادی ہے) احتیاج سے آزادی ہے۔ اس سے تو نہیں ''Freedom'' (آزادی) حاصل ہوجاتی ہے مگر ''Freedom to'' (کی آزادی) ان کو نصیب نہیں ہوتی مثلاً

Freedom to think as will I, freedom to do as will I [1]

یہ ان کو نہیں ملتی۔ کیا بات ہے' عزیزانِ من! میں ترجمہ نہیں کرتا۔ کہا کہ اس قوم کی تباہی یوں آتی ہے کہ ان کے ہاں بطرت یعنی معیشت یا فراوانی دولت سے' جو غلط نظام کی وجہ سے ہے' اس پوری قوم کو ''Freedom from'' (سے آزادی) تو حاصل ہوجاتی ہے مگر ''Freedom to'' (کی آزادی) ان کو حاصل نہیں ہوتی۔ اور جس قوم کو Freedom to do some thing as will I [2] نہ حاصل ہو تو اس سے بدتر محکوم قوم کوئی نہیں ہوسکتی ہے۔ کہا کہ یہ اس لیے تباہ ہوئے ہیں۔

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ **حَتّٰی نَسُوا الذِّكْرَ** (25:18) اس وجہ سے' ان لوگوں نے' اے خدا! تیرے قوانین کو نظرانداز کردیا' پیچھے ڈال دیا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ **وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا** (20:124) جو ہمارے ''الذکر'' کو یعنی ہمارے ضابطہ قوانین کو ترک کردے گا' پسِ پشت ڈال دے گا' اس دنیا میں اس کی معیشت تنگ ہوجائے گی پھر **وَ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى** (20:124) اور قیامت کے دن بھی وہ اندھا اٹھایا جائے گا۔

عزیزانِ من! اب درس کا وقت پورا ہوا۔ 18-17 دو ہی آیات ہم نے لیں۔ بات بھی بڑے کام کی ہوگئی۔ 19 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

---

1. اپنی منشا کے مطابق سوچنے کی آزادی' اپنی منشا کے مطابق کچھ کرنے کی آزادی۔
2. اپنی منشا کے مطابق کچھ کرنے کی آزادی

چھٹا باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 19 تا 26)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ
نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿١٩﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ
وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۗ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ
بَصِيْرًا ﴿٢٠﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۗ لَقَدِ
اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ
لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٢٢﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً
مَّنْثُوْرًا ﴿٢٣﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿٢٤﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ
بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿٢٥﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۗ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿٢٦﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1978ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 19 سے ہو رہا ہے:(25:19)۔

معاشرتی نظام کی ذمہ داری ہر شخص پر عائد ہوتی ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ جہنم میں لیڈروں اور ان کے متبعین (Followers) کے مکالمات کا ذکر تھا اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ یہ آخرت کی جہنم میں جو ہوگا وہ تو وہاں کی بات ہے' اس دنیا کا جہنم وہ ہے کہ غلط معاشرہ کے انجام میں جو تباہی آتی ہے' قرآنِ کریم نے اسے یہاں کے جہنم سے تعبیر کیا ہے۔ اگر ان مکالمات کو یہاں کے اس جہنم کے Context (سیاق و سباق) میں دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس تباہی کے وقت یہ عوام یا Followers یا متبعین اپنے لیڈروں کو الزام دیتے ہیں کہ ان کی وجہ سے یہ کچھ ہوا اور وہ لیڈر انہیں الزام دیتے ہیں کہ یہ دودھ ہی اس قسم کا زہریلا تھا جس کی وجہ سے اوپر بالائی بھی ایسی ہی آئی غرضیکہ وہ ایک دوسرے کو مطعون کرتے رہتے ہیں اور قرآن یہ بات کہتا ہے کہ اس میں نہ تنہا وہ لیڈر اس کے ذمہ دار ہیں' نہ تنہا یہ متبعین ان کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ذمہ داری پورے کے پورے معاشرے کے اوپر عائد ہوتی ہے اس لیے یہ سب اس جہنم کے عذاب میں محصور ہیں اور انہیں تو یہ عذاب بھگتنا ہی پڑے گا۔ اگر یہ پیچھے چلنے والے اس وقت اپنے عقل و ہوش سے کام لیتے اور جذبات کے سیلاب میں نہ بہہ جاتے' تو ان لیڈروں کے پاس کون سی قوت تھی جس کی بنا پہ یہ آج اس قسم کا جہنم برپا کر سکتے تھے۔ بہرحال' آخری بات یہ تھی کہ وہ لیڈر یہ بات ان کے منہ پہ دے ماریں گے کہ الزام ہم پہ دے رہے ہو قصور تو تمہارا بھی اتنا ہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **فَقَدْ كَذَّبُوكُم بِمَا تَقُولُونَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا** (25:19) وہ ان عوام یا Followers (متبعین) سے یہ کہتا ہے کہ یہ دیکھ لو' تمہارے منہ پہ تمہیں جھٹلا رہے ہیں' تو اس کے بعد اب نہ اس عذاب کا رخ کسی اور طرف مڑ سکتا ہے' نہ اس میں کوئی تخفیف ہو سکتی ہے' نہ تفریق ہو سکتی ہے' وہ تو پھر سارا معاشرہ ہی اس کے اندر مبتلا ہوتا ہے اور آگے یہ اس کی وجہ بیان کی کہ **وَمَن يَظْلِم مِّنكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا** (25:19) تم میں سے جس نے بھی ہمارے قوانین سے سرکشی برتی تھی اسے سخت عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک ظلم کا مفہوم

اصل بات تو یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہے ظلم کا۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے متعدد بار عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے نزدیک تو ظلم' یہ جو بالا دست طبقہ ہوتا ہے اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ جو کمزور طبقہ ہوتا ہے' یہ جو عوام ہیں' انہیں مظلوم کہا جاتا ہے' اُنہیں ظالم نہیں کہا جاتا ہے لیکن عربی

زبان اور قرآنِ کریم کے استعمال کی رو سے ظلم کے تو بنیادی معنی ہیں کہ ''جس چیز کو جس مقام پہ ہونا چاہیے' اسے وہیں نہ رکھا جائے'' تو اگر بالادست طبقے نے ان عوام کو انسانیت کے مقام سے بھی نیچے رکھا اور انہیں اجناس (Comodity) قرار دیا کہ جہاں جی چاہے' جس بھاؤ جی چاہے' انہیں بیچ دیا جائے' یہاں بکیں یہاں بیچ دیا جائے' ایکسپورٹ کرنا ہو وہاں بھیج دیا جائے' تو ان کو بھی تو ان کے مقامِ انسانیت سے نیچے رکھا اور ان عوام نے انہیں اٹھا کر انسانوں کے مقام سے الوہیت کا درجہ دے دیا' خدائی مقام ان کو دے دیا' ان کے احکام کی اسی طرح اطاعت کرتے رہے جیسے خدا کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ اسی لیے خدا نے پہلے ان کو کہا ہے کہ تم نے ان کو اپنا معبود بنا رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں Worship (پرستش) کا تصور ہے' دینِ اسلام میں وہ تصور نہیں ہے۔ یہاں تو یہ صورت ہے کہ کسی کو کس مقام سے اٹھا کے اونچا رکھتے ہو' یہ بھی ظلم ہے' اس کے مقام سے نیچے رکھتے ہو یہ بھی ظلم ہے اور Unbalanced (غیر متوازن) معاشرہ کا بنیادی نقص یہ ہوتا ہے کہ اس میں کوئی چیز یا کوئی انسان اپنے اُس مقام پہ نہیں ہوتا جہاں اُسے ہونا چاہیے۔ یہ ہے جو ظلم کے معنی ہیں۔

اب دیکھیے یہاں کتنی دلچسپ چیز ہے کہ قرآن ان Followers (متبعین) کو' عوام کو جنہیں ہم اپنی اصطلاح میں مظلوم طبقہ کہتے ہیں' کہتا ہے کہ تم نے بھی تو یہ ظلم کیا تھا کہ انہیں جس مقام پہ ہونا چاہیے تھا' اُس مقام سے اٹھا کے خداوندی اختیارات کا مالک بنا دیا۔ جو کچھ یہ کہتے رہے' تم سر جھکا کر اس کی اطاعت کرتے چلے گئے' کبھی یہ پوچھا نہیں کہ یہ جو چیزیں کہہ رہے ہیں' ان کے صحیح ہونے کی سند کیا ہے۔ اس کے لیے کوئی معیار ہونا چاہیے' کوئی کسوٹی ہونی چاہیے تھی جس پہ تم پرکھ کر ان سے یہ کہتے کہ یہ غلط چیز ہے' اس کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ تم نے بھی تو ان کو یہ مقام دے رکھا تھا تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ اب جو بھی کسی کو غلط مقام دے گا' اس کی بنا پہ جو تباہ کن نتائج نکلیں گے' وہ تو اسے بھگتنے پڑیں گے۔

ہماری اصطلاح میں ظالم اور مظلوم کے یہ معنی نہیں ہیں۔ ظالم کے جو معنی ہیں' قرآن انہیں خوب واضح کر رہا ہے کہ ظلم کسے کہتے ہیں۔ اب انہوں نے اعتراض یہ کیا تھا اور جو پہلے آچکا ہے' ابھی چار ہی آیتیں پہلے وہ کہتے تھے کہ یہ کس قسم کا رسول ہے' ہماری طرح کھاتا پیتا ہے' بازاروں میں جاتا ہے' سودا سلف خریدتا ہے' عجیب قسم کا رسول ہے۔ جو رسالت کا دعویٰ کرے' جو خدا کا رسول ہو' اسے تو عام انسانوں سے الگ تھلگ کوئی مخلوق ہونا چاہیے۔ یہ اعتراض تھا اور یہ تصور ہر مذہب میں ہے کہ وہ اپنے مذہب کے بانی کو خواہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام میں سے ہوں یا ان لوگوں کے اپنے تجویز کردہ' انہیں مقامِ الوہیت دیتے ہیں۔ وہ ہوتے تو دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی تھے لیکن ان کے یہ مرید' مرنے کے بعد' ان میں سے ہر ایک کو خدائی اختیارات کا حامل اور مافوق الفطرت قسم کا ایک ہیولا بنا دیتے تھے۔

رسول کو مافوق الفطرت یا مافوق البشر سمجھنے یا بنانے کا نتیجہ

قرآن نے یہیں آ کر بہت بڑا انقلاب تھا جو برپا کیا۔ اس نے کہا کہ یہ پیغام لانے والا' تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ اس کی طرف خدا کی طرف سے یہ پیغام آتا ہے' یہ پیغام تم تک پہنچاتا ہے اور اس پر عمل کر کے دکھاتا ہے۔ یہ اس کی روش' اس کا اسوہ' تمہارے لیے نمونہ بن ہی اس صورت میں سکتا ہے کہ یہ تمہارے جیسا انسان ہو۔ اگر یہ فوق الفطرت یا فوق البشر ہو اور وہ کچھ کام کرے تو وہ تمہارے لیے نمونہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم تو ہر قدم پہ یہ کہہ دو گے کہ صاحب! اس کا کیا ہے یہ تو کوئی عام انسان نہیں ہے' یہ تو خدا کا رسول ٹھہرا اور ہم تو آدمی گنہگار ٹھہرے۔ صاحب! ہم ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ یعنی سنت رسول ﷺ کے اتباع کی اس قدر تاکید بھی اور رسول کو فوق الفطرت اور فوق البشر ماننا بھی!! ارے! فوق البشر جو ہے اس کی تقلید' اس کا اتباع' اس کی روش کے مطابق عام انسان' عام بشر کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ بقول ان کے اگر میدانِ جنگ میں مقابل کی فوج کو جب شکست دیتا ہے' یا جب شکست کا مقام آ جائے اور کوئی حربہ نہ ہو' تو وہ کنکریوں کی ایک مٹھی مارے اور وہ سارے کے سارے اندھے ہو جائیں' اور بھاگ جائیں' تو سوچیے کہ وہ' ہم' آپ اور دوسرے انسانوں کے لیے رسول ﷺ کی یہ روش اسوہ کیسے بن سکتی ہے' سنت کیسے بن سکتی ہے' قابلِ اطاعت' قابلِ اتباع روش کیسے ہو سکتی ہے؟

سب سے بڑا معجزہ تو رسولِ خدا کی اپنی زندگی ہے

یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ایک ایک قدم پہ یہ کہتا چلا جاتا ہے کہ معجزات تم طلب کرتے ہو' معجزہ رسول کی زندگی ہے' معجزہ اس کا یہ پیغام ہے' وہ فوق البشر نہیں ہو سکتا۔ اسی کو پھر دوبارہ کہا کہ **وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّاۤ اِنَّھُمۡ لَیَاۡکُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَ یَمۡشُوۡنَ فِی الۡاَسۡوَاقِ** (25:20) یہ بات اسی رسول ﷺ کے ساتھ نہیں ہے' جتنے رسول علیہم السلام اس سے پہلے آئے تھے' ان کی بھی یہی کیفیت تھی کہ وہ بھی عام انسانوں جیسے انسان تھے' وہ بھی بازاروں میں چلا پھرا کرتے تھے' وہ بھی اسی طرح سے کھایا پیا کرتے تھے لیکن یہ لوگ اس قسم کے اعتراضات' اپنے شکوک رفع کرنے کے لیے نہیں کرتے تھے' محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کرتے تھے۔ یہ اپنی مخالفت کو برابر جاری رکھیں گے تا آنکہ یہ کشمکش' تصادم کی شکل اختیار کر جائے گی۔ اب آگے وہ بات واضح کر دی کہ **وَ جَعَلۡنَا بَعۡضَکُمۡ لِبَعۡضٍ فِتۡنَۃً** (25:20) وہاں ایک دوسرے کی قوتوں کی آزمائش ہو جائے گی۔ کہا کہ اگر وہ فوق البشر قسم کے لوگ ہوتے اور قدم قدم پہ ان سے معجزات اور کرامات سرزد ہوتیں تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا کہ تم سوچ سمجھ کر اپنے اختیار و ارادے سے ان کی کوئی بات مانتے یا ان کا مسلک اختیار کرتے۔ یہ جو چیز تھی' اس سے تو عقل و ہوش ماؤف ہو جاتی ہے لیکن یہ بات کہ عام انسانوں جیسا ایک انسان ہو اور اس کے بعد کہا یہ جائے کہ تم اس کی بات کو پرکھ کر دیکھو کہ وہ غلط ہے یا صحیح ہے' ماننے کے قابل ہے یا ماننے کے قابل نہیں ہے' مافوق

البشر ہونے کی رو سے نہیں ہوسکتی۔

معجزہ انسانی عقل کے چراغ کو گل کر دیتا ہے

عزیزانِ من! اصل آزمائش تو انسان کے ایمان کی یہاں پہنچ کر ہوتی ہے کہ کہنے والا عام انسانوں جیسا انسان ہو اور وہ یہ کہے کہ تم یہ نہ مجھ سے کہو کہ میں تمہیں منہ سے آگ نکال کے دکھا دوں۔ تم یہ دیکھو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ بات کیسی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آزمائش کا باعث بن جاتی ہے ورنہ اگر کرامت دکھا کے منوانا ہو تو وہ کسی کے لیے آزمائش کی بات بنتی نہیں ہے۔ کہا کہ یہ ان کا عام انسانوں جیسا انسان ہونا ہی تو وہ چیز ہے جہاں تمہاری عقل وفکر اور ہوش وتدبر کی آزمائش ہوتی ہے کہ سمجھ سوچ کے بات مانتے ہو یا عقل کے چراغ گل کر کے کسی بات کو ماننا چاہتے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ Faith (عقیدہ) اس چیز کا نام نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے کسی کی بات کو یونہی تسلیم کرلیا جائے' Faith (اعتقاد) تو اس چیز کا نام ہے' اس یقین کا نام ہے' جو Conviction (ایمان) سے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کی رو سے عقل وہوش کی بنا پر کسی چیز کو قبول کرنے کا نام ایمان ہے اور اگر رسول فوق البشر ہو اور وہ اس قسم کے معجزے دکھا کر تم سے بات منوائے تو وہ پھر عقل وخرد کی رو سے مانی ہوئی بات تو نہیں ہوگی۔ کہا کہ یہ بات ہے کہ رسول عام انسانوں جیسا انسان ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بھیجتے تھے کیونکہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

استقامت کے میدان میں استہزا کے سخت پتھر کا مقابلہ کرنا ہوگا

رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ مخالفین اپنی مخالفت جاری رکھیں گے' تصادم ہوگا' اس لیے **اَتَصۡبِرُوۡنَ ۚ وَ کَانَ رَبُّکَ بَصِیۡرًا** (25:20) تم اس چیز پہ استقامت رکھو' اور نہایت استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو۔ ان کی مخالفت سے دلبرداشتہ مت ہوجانا' حوصلہ نہ ہارو' استقامت سے اپنی بات پہ جمے رہو' ان کو یہ باتیں کرنے دو۔ یہ ایسی باتیں کہیں گے' اس لیے کہ جس قسم کا معاشرہ تم قائم کرنا چاہتے ہو' اس میں ان کی مفاد پرستیوں پہ بڑی خاص زد پڑتی ہے' دولت مند طبقے کے اوپر بھی اور مذہب پرست طبقے کے اوپر بھی۔ اس لیے یہ تو مخالفت کریں گے۔ ان سے دلبرداشتہ نہ ہوجاؤ۔

جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ سخت ترین پتھر' جو مخالفت کا آتا ہے' وہ استہزا کا آتا ہے یعنی مذاق اڑانا' تمسخر اڑانا۔ دلیل کا جواب تو دیا جاسکتا ہے لیکن تمسخر اور استہزا تذلیلِ انسانیت کا بڑا ہی بازاری انداز ہوتا ہے۔ رسول اس سطح کے اوپر نہیں اتر سکتا۔ وہ تو اخلاقِ انسانیت کے بلند ترین معیار پر ہوتا ہے لیکن دلیل کا جواب جب مذاق اڑانے اور استہزا کے انداز میں دیا جائے' تو وہ بہت ہی حوصلہ مندی کی بات ہوتی ہے' اسی لیے کہا کہ **وَ کَانَ رَبُّکَ بَصِیۡرًا** (25:20)۔ کوئی بات نہیں' خدا کا قانون مکافاتِ عمل ہر کسی کو دیکھ رہا ہے' بس تم حوصلہ نہ

ہاروااور دوسری بات یہ ہے کہ رسولوں کے عام انسانوں جیسا ہونے سے' انسانی اختیار وارادہ کی آزمائش ہوتی ہے۔اس لیے کہا کہ **وَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَوۡ نَرٰی رَبَّنَا** (25:21) جولوگ دل میں خیال کیے بیٹھے ہیں کہ انہوں نے کبھی ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہی نہیں' وہ دین کو سنجیدگی سے لیتے ہی نہیں۔ان کی طرف سے یہ بھی ایک مطالبہ آتا ہے کہ رسول کہتا ہے کہ میری طرف فرشتہ وحی لاتا ہے تو ہمارے اوپر فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوتا؟ اور اگلی بات یہ **نَرٰی رَبَّنَا** (25:21) کی ہے کہ ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھ سکتے؟

انسان کی ایک نفسیاتی کیفیت کا نفسیاتی طریق پر جواب

آپ غور کیجیے کہ قرآن میں اس کا جواب خالص نفسیاتی طریق پہ دیا ہے۔یہ ہے ہی ایک Psychological (نفسیاتی) مرض جو اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔آپ خود اپنے دل میں محسوس کرلیں گے کہ وہ کیا بات کہتا ہے یعنی اگر یہ کہتا ہے کہ خدا ہمارے ساتھ کیوں نہیں بات کرتا' ہم پہ کیوں نہیں ملائکہ اترتے' یعنی اس کے اندر خود تکبر نفس ہے' یہ خود بڑا بن رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ یہ بات کیوں نہیں ہوتی اور قرآن جواب ہی اتنا دیتا ہے کہ **لَقَدِ اسۡتَکۡبَرُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ** (25:21) یہ لوگ اس قسم کی باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ یہ بہت بڑا بنتے ہیں یعنی یہ بات اس کی نہیں کرتے جو کچھ رسول کہتا ہے۔یہ سمجھتے ہیں کہ رسول کی بڑائی اس میں ہے کہ یہ کہتا ہے کہ مجھ پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور خدا مجھے پیغام بھیجتا ہے۔اس پر وہ کہتے ہیں کہ ہم پہ یہ کچھ کیوں نہیں ہوتا۔اور یہی بات ہے جس کی وجہ سے **وَ عَتَوۡ عُتُوًّا کَبِیۡرًا** (25:21) یہ اتنی سرکشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔اگر دل سے اس خیال کو نکال دیں' اسی سطح پہ آجائیں جس سطح پہ رسول کہتا ہے کہ میں عام بشری سطح پہ ہوں اور اس کے بعد پھر جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے' اس پہ غور وفکر کریں' تو یہ صحیح نتیجے پہ پہنچ سکتے ہیں لیکن جب دل میں یہ تکبر ہو کہ ہم میں سے ہی یہ کل کا ایک غریب کا لڑکا' ایک یتیم کا بچہ' ہمارے ساتھ یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا' آج یہ دعوے ہو رہے ہیں کہ صاحب! ہم پہ فرشتے نازل ہو رہے ہیں' خدا ہماری طرف پیغام بھیج رہا ہے تو ہماری طرف وہ پیغام کیوں نہیں بھیج رہا۔کہا کہ یہ ہے ان کی سرکشی کی وجہ' اور انہی کے انداز کے مطابق کہا کہ یہ کہتے ہیں ہم پہ فرشتے نازل کیوں نہیں ہوتے' بات ان کے ہی انداز کی ہے کہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ **یَوۡمَ یَرَوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشۡرٰی یَوۡمَئِذٍ لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ وَ یَقُوۡلُوۡنَ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا** (25:22) جس دن ان کے تصور کے مطابق کہیں فرشتے نظر آگئے وہ دن' ان مجرمین کے لیے کسی خوشخبری کا دن نہیں ہوگا۔اس دن چیخیں مار کے بھاگ جائیں گے اور کہیں گے کہ ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ ہم میں اور ان فرشتوں میں کوئی روک حائل ہوجائے جس سے یہ ہم تک نہ پہنچ سکیں۔

رسول بھی ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتا

یاد رکھیے' قرآنِ کریم نے واضح انداز میں یہ بتا دیا ہے کہ ملائکہ انسانوں کو نظر نہیں آیا کرتے اس لیے کہ یہ محسوس اور مرئی پیکر نہیں ہیں' Visible (قابل دکھائی) چیزیں نہیں ہیں' مادی یا جسمانی نہیں ہیں۔ عام انسان تو ایک طرف رہے' خود نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم بھی انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ بدر[1] کے میدان میں جماعت مومنین کے لیے ملائکہ بھی نازل ہوئے تھے۔ اس نے وہیں بتا دیا ہے کہ مقصد ان سے یہ تھا کہ وہ مجاہدین کے دلوں میں سکون اور اطمینان پیدا کریں۔ گویا یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی۔ میں اس وقت اس تشریح میں نہیں جانا چاہتا کہ پھر یہ ملائکہ کا نزول کیسے تھا اور وہ اس قسم کی کیفیت کیسے پیدا ہوتی تھی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ قرآنِ کریم نے یہیں واضح کر دیا ہے کہ **وَ اَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا** (9:26) خدا نے اس قسم کے لشکر نازل کیے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے' نیز (9:40) میں بھی یہی ہے۔ دیگر مقامات میں بھی یہ چیز ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم یہاں مخاطب ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ ملائکہ کو ہم نے نازل کیا تھا' ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے' تو گویا یہ تو الگ بات ہے کہ ان کی پھر کیفیت کیا ہوتی ہے۔ بات میں یہاں یہ کہہ رہا تھا کہ انہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ جب رسول ﷺ اور اس کے صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کے متعلق قرآن نے کہہ دیا' خدا نے کہہ دیا کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے' تو دوسرے انسان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم انہیں دیکھتے تھے۔

جیسا کہ میں بتایا کرتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں 1965ء کی پاک و ہند جنگ میں افسانے مشہور ہوئے تھے کہ سفید گھوڑیوں والے اور سبز عماموں والے آئے ہوئے تھے اور وہاں دریائے راوی کے پل پہ دیکھا گیا کہ ہندوستانی فوج کی طرف سے ہوائی جہاز سے بم گرتا تھا' وہ اٹھا کے اُن کی طرف پھینک دیتے تھے اور اس جنگ میں اتنے آئے ہوئے تھے اور ہم نے یہاں دیکھا اور فلاں حضرت صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں ہاں ہاں یہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے جا رہے ہیں' جنگ میں آسمان سے مدد کے لیے فرشتے اتر رہے ہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس زمانے میں بھی میں نے یہ لکھا تھا کہ خدا کی طرف سے کوئی تقویت کا سامان' اس کی نصرت' اس کی رفاقت' الگ چیز ہے' حق کی خاطر اٹھنے والے کے ساتھ حق کی تائید ہوتی ہے لیکن یہ چیز کہ آسمان سے جو فرشتے اترتے تھے' انہیں عام انسان دیکھتے تھے' یہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن تو رسول ﷺ اور اس کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہہ رہا ہے کہ وہ فرشتے نازل ہوئے تھے' تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی طرف نازل شدہ فرشتوں کو وہ تو نہیں دیکھ سکتے تھے اور ہم دریائے راوی کے کنارے ان فرشتوں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ افسانے تھے جو بنائے اور سنائے جا رہے تھے۔

---

[1] یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے۔

فرشتوں کے متعلق ارشادِ خداوندی

قرآن نے خود کہا ہے کہ تو ملائکہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ ان کی کیفیت یہ نہیں ہوتی' وہ مادی پیکر نہیں ہوتے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ تم کہتے ہو کہ ملائکہ ہم پہ کیوں نہیں نازل ہوتے' ہم کیوں نہیں ان کو دیکھتے۔ انہیں بتایا گیا کہ تمہارا تصور یہ ہے کہ موت کے وقت فرشتے آیا کرتے ہیں' تو موت کے وقت جو فرشتے تم کہتے ہو' آیا کرتے ہیں آج تم یہ خود کہہ رہے ہو کہ ہماری طرف کیوں نہیں آتے' جب تمہاری طرف تمہارے تصور کے مطابق آتے ہیں' تو اس وقت جان کیوں نکل رہی ہوتی ہے' اس وقت تمہاری کیفیت یہ ہے کہ وَ یَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (25:22) اس وقت تم بھی' تمہارے حوالی موالی بھی' یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! یہ حضرت جی' یہ موت کے فرشتے' کچھ وقت کے لیے تو دور ہو جائیں' ہٹ جائیں۔ اس وقت تمہاری کیفیت یہ ہے اور آج یہ کہہ رہے ہو کہ صاحب! فرشتے ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے' یعنی اندازہ لگائیے قرآن کس طرح سے اس قسم کے جہلا کی باتوں کو کاٹتا ہے۔

انسان کا نامۂ اعمال ساتھ ساتھ مکافاتِ عمل کے ترازو میں تولا جاتا ہے

بات فرشتوں کے آنے اور نہ آنے کی نہیں ہے بات تو یہ ہے کہ وَ قَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (25:23) تم نے کام کس قسم کے کیے ہیں۔ ہمارے سامنے تمہارے کام ہوتے ہیں اور ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ وہ نتائج ہوتے ہیں جو تمہارے سامنے آتے ہیں اور یہ اعمال جو تم جیسے لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں' ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ گرد و غبار کی طرح فضا کی پہنائیوں میں اڑا دیئے جائیں گے یعنی ان کا کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ تخریبی اعمال کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے کئی مقامات میں ان قوموں کے' ان افراد کے' اعمال کے متعلق کہا ہے' جنہیں وہ یکسر کافر یا مشرک کہہ کر پکارتا ہے' انہیں تو چھوڑ یئے۔ ایسے لوگ جو اپنی دانست میں سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے نیکی کے کام کر رہے ہیں اور وہ اپنی دانست میں' اپنے ہی تصور کے مطابق' اسے نیکی سمجھ رہے ہوتے ہیں' قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ خدا کی وحی کے معیار کے مطابق نیکی کے کام نہیں ہیں تو ان کا بھی کوئی نیک نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ سوال یہ نہیں کہ تم اپنی دانست میں کس کام کو اچھا کام سمجھ رہے ہو۔ اس طرح تو دنیا کے ہر اہل مذہب سے پوچھیے' نہایت دیانتداری سے وہ اپنے ان باطل اعتقادات' مسالک اور اعمال کو بالکل اچھا' نیک اور حق سمجھتے ہیں۔ اس میں یہ بات نہیں ہے کہ صاحب! وہ بڑا مخلصانہ طور پر اس کو صحیح سمجھتا ہے۔ اس کام کا خدا کی وحی کے مطابق ہونا از بس ضروری ہے۔

اعمال کے سلسلہ میں انسانی سوچ کا معیار

ٹھگوں کے ہاں یہ عقیدہ یقیناً تھا کہ وہ مسافروں کو گلا گھونٹ کے مارتے تھے' ان کا مال لوٹتے تھے اور اس کے بعد دیوی کے چرنوں

میں پانچواں حصہ پیش کرتے تھے اور کسی نوجوان کی شادی نہیں ہوتی تھی جب تک وہ ایسا نہ کرے۔ اور جو ایسا کرنے والا تھا' اس کو بہت بڑا مقام حاصل ہوتا تھا❶ ۔اس میں کسی منافقت کو دخل نہیں تھا۔ وہ نہایت خلوصِ دل سے ایسا مانتے تھے۔ ہندو جب گائے کی پوجا کرتا ہے تو وہ کسی کے دکھلاوے کی خاطر نہیں کرتا۔ ہمارے ہاں یہ جتنے قبروں پہ جا جا کر مرادیں مانگتے ہیں' چڑھاوے چڑھاتے ہیں' کسی کو دکھانے کی خاطر نہیں کرتے۔ وہ دکھانے والے ٹھیک ہیں' وہ بھی نظر آ جاتے ہیں لیکن عوام جو وہاں جاتے ہیں نہایت خلوصِ نیت سے جاتے ہیں۔ خلوصِ نیت تو کسی کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار نہیں ہوتا۔ غلط اور صحیح ہونے کا معیار تو خدا کی دی ہوئی کسوٹی ہے۔ نیک اور غلط کا معیار تو اسوہ رسول اللہ ﷺ ہی ہو سکتا ہے' اس کے اوپر پرکھ کے دیکھنا چاہیے کہ کوئی عمل کیسا ہے۔ اگر خدا کی دی ہوئی کسوٹی کے اوپر کوئی عمل عمل خیر یا نیک کام نہیں ثابت ہوتا تو اپنی دانست میں کتنا ہی کوئی کیوں نہ کہے کہ میں تو نہایت نیک نیتی سے ایسا کرتا ہوں' یہ نیک نیتی تو ہر جگہ کسی عمل کے نیک ہونے کا معیار یا ثبوت نہیں ہو سکتی۔ نیک نیتی کے متعلق تو آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ

Sincerity is always a proof of sanity. ❷

تو اس لیے قرآن اسے نہیں مانتا۔

غلط اعمال کے سلسلہ میں ایک خوبصورت مثال

تم اس بارے میں اپنی دانست میں کیا سمجھتے ہو؟ سنو! قرآنِ کریم نے تو وہاں کہا ہے کہ **لَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا** (18:105) ان کے ان کاموں کے لیے جن کو وہ اپنی دانست میں نیک سمجھتے تھے' لیکن درحقیقت وہ نیک نہیں تھے' ان کے تولنے کے لیے تو میزان کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی اور یہاں کہا ہے کہ وہ عمل **فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا** (25:23) بکھرے ہوئے ذرات کی طرح ہیں۔ ذرات بھی اگر کسی ایک جگہ جمع ہوں تو وہ بھی صحرا بن سکتے ہیں' اُن سے بھی کوئی محسوس شے سامنے آ سکتی ہے لیکن اگر یہی ذرات غبار کی شکل میں بکھرے ہوئے ہوں' تو ان کا کوئی وزن نہیں ہوتا' ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی۔ یہ کیسی عمدہ مثال ہے! یہ **هَبَآءً** تو غبار سمجھ لیجیے۔ منثور کے معنی بکھرے ہوئے بھی ہوتے ہیں لیکن اس میں ایک بڑی لطیف چیز بھی پوشیدہ ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان میں' یہ عرب اپنے ہاں' عجیب وغریب انداز سے ان چیزوں کو استعمال کرتے تھے۔ ٹھیک ہے یہ جو نثر ہے اس کا مادہ ''ن ث ر'' ہے۔ اس کے عام معنی نظم کے مقابلے میں بکھرنے کے ہی ہیں۔ نظم کے معنی ہیں ''پروئی ہوئی چیز'' اور نثر کے معنی ہیں ''بکھری ہوئی چیز'' لیکن وہ ایسے کچے پھل جو جھکڑ سے خود بخود گر کر اِدھر اُدھر بکھرتے تھے ان کو بھی منثور کہتے تھے۔ پکا ہوا پھل تو کام کا پھل ہوتا ہے'

---

❶ اِن نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے اسی سورۃ الفرقان کا پہلا باب

❷ نیک نیتی ہمیشہ دانشوری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کچا پھل جو گر کے بکھر جائے، کسی کام نہیں آ سکتا۔ ان اعمال کو جن کی شکلیں تو پھل جیسی ہیں لیکن ہیں وہ کچے ہی پھل اور اس طرح سے بکھر گئے ہوئے ہیں، وہ کسی کام نہیں آئے۔ یہ اس کی ایسی عمدہ مثال ہے کہ بکھرے ہوئے کچے پھل یونہی گر گئے ہوئے ہیں۔ اب آپ اس تمثیل میں، اس مثال میں دیکھیے کہ اس کی شکل اس پھل جیسی ہوتی ہے لیکن کام کسی نہیں آتا ہے۔ یہ ہے **هَبَآءً مَّنْثُوْرًا** (25:23)۔

دنیا میں خیر وشر کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے

یہ چیز، عزیزانِ من! بڑی ضروری ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی کام کو، جسے ہم اپنی دانست میں اچھا سمجھتے ہیں، وہ فی الواقعہ اچھا ہو۔ دنیا میں خیر اور شر کا، Good & Evil کا مسئلہ، بڑا اہم مسئلہ ہے۔ انسان یہیں دھوکا کھاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ دنیا کی کثیر آبادی غلط راستوں پہ چلتی ہے اور ان میں کثیر لوگ وہ ہوتے ہیں جو نہایت دیانتداری سے، خلوص نیتی سے، ایمانداری سے، سمجھتے ہیں کہ یہ اچھا کام ہے۔ یہ بات ہے کہ یونان کے حکما سے لے کر، اڑھائی ہزار سال پہلے سے آج تک، Good & Evil (خیر وشر) کے فلسفہ پر یہ فلاسفر کسی متعین نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ان کی اتنی اتنی موٹی کتابیں اسی Issue (مسئلہ) پر ہیں۔ یہ اپنی The theory of good & evil (خیر وشر کے نظریہ) میں متعین طور پر نہیں بتا سکتے کہ Good (خیر) کسے کہتے ہیں، Evil (شر) کیا ہوتا ہے؟ شر اور خیر میں تمیز کس طرح کی جائے؟ یہ مذاہب کے معاملے میں بڑا اہم مسئلہ ہے۔ میں نے جیسا ابھی عرض کیا ہے کہ عام مذاہب میں آپ دیکھیے کہ نہایت نیک نیتی سے، وہ اپنے مسلک کو، اپنے اعمال کو، بالکل صحیح برسرحق سمجھتے ہیں۔ قرآن ان کا ابطال کرتا ہے، یہ غلط ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن نے آ کر یہ کہا کہ یہ بات انسانوں کے ذہن کے فیصلہ کرنے کی نہیں ہے۔ اس کے لیے Objective Standard (خارجی معیار) ہونا چاہیے جو انسانوں کے ذہنوں کا اور ان کی فکر کا تراشیدہ نہ ہو اور ایسا معیار تو، جب انسانوں سے باہر، اسے آپ خارجی (Objective) کہیں گے، خدا کی طرف سے دیا ہوا ہی ہو سکتا ہے جو انسانوں سے ماوراء ہے اور یہی چیز ہے جسے وحی کہتے ہیں۔

خیر وشر کا معیار صرف وحی مقرر کرتی ہے

عزیزانِ من! ایک Objective Standard (خارجی معیار) جو کسی انسان کے ذہن کا تراشیدہ نہ ہو، کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔ خدا کے ماننے کے معنی صرف یہ ہیں کہ انسانی سوچ کے لیے، خیر اور شر کے لیے، نیک اور بد کے لیے یعنی Good & Evil کے لیے، ایک خارجی معیار (Objective Standard) ہونا چاہیے۔ یہ ان فلاسفرز کی بھی اور سائیکولوجسٹ کی بھی Term (اصطلاح) ہے۔ ان دونوں کے ہاں Subjective (اندرونی) وہ ہے جو خود انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہو اور Objective (خارجی) وہ ہے جو ماورائے عقل انسانی سے ملا ہو۔ یہ جتنی Discussion (بحث)، ان لوگوں نے خود Good & Evil (خیر وشر) کی کی ہے، اس میں

آخر میں وہ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی Objective Standard (خارجی معیار) ہونا چاہیے ورنہ انسانوں کے ذہن کے تراشیدہ یا وضع کردہ یا پیدا کردہ معیار میں' اختلاف ہوتا چلا جائے گا۔ فکرِ انسانی اس باب میں کبھی ایک نکتے پہ نہیں پہنچ سکے گی اور یہ ہے وہ مقام جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے' جہاں خدا کے ماننے کی ضرورت پڑتی ہے۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ اپنی اپنی دانست میں تم لوگ جو اچھا کام' ثواب کا کام' سمجھتے ہو' ان میں تو وہ کام ہیں جو خدا کے میزان میں جب آتے ہیں تو ان کے لیے میزان ہی کھڑی نہیں کی جاتی وہ **هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا** (25:23) ہوتے ہیں: بکھرے ہوئے ذرے' گرے ہوئے کچے پھل جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اپنے کاموں کو خدا کے معیار کے مطابق پرکھ کر دیکھو اور یہی چیز ہے' عزیزانِ من! کہ جب ہم مذہب کی دنیا میں آتے ہیں' وہاں یہ جسے آپ خلوصِ نیت کہتے ہیں' حسنِ نیت کہتے ہیں' بہت بڑے فریب اور دھوکے کا موجب بن جاتی ہے۔ وہاں تو بالعموم' جو ہوتا چلا آ رہا ہے' بس اسی کو ہی آپ معیار قرار دیتے ہیں' لیکن سوال ''ہوتے چلے آنے'' کا نہیں ہے۔ باقی مذاہب کے ہاں غلط بھی تو ہوتا چلا آ رہا ہوتا ہے اور ان کے ہاں تو آپ سے بھی زیادہ عرصے سے وہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ آپ کا یا ہمارا جو مذہب [1] اسلام ہے' یہ تو سب سے Latest (جدید ترین' جو سب کے بعد ملا) ہے۔ اگر یہی پیمانہ ہو' اگر یہی معیار ہو' کہ جو ہوتا چلا آ رہا ہے' جو زمانہ قدیم سے متواتر چلا آ رہا ہے تو ان کے ہاں تو یہ معیار آپ کے معیار سے زیادہ لمبے عرصے سے چلا آ رہا ہوتا ہے۔ اس دلیل کے مطابق ہم ان کو کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ باطل ہیں۔ یہ سن (سال) کوئی دلیل نہیں ہے' یہ معیار کوئی سند نہیں ہے۔ معیار صرف خدا کا دیا ہوا معیار ہے۔ اس کے برعکس وہ معیار خواہ متواتر اسلاف سے چلا آ رہا ہو یا آج کسی کے ذہن کا پیدا کردہ ہو' اس میں کوئی فرق نہیں۔ اسے خدا کی عطا کردہ کسوٹی پر پرکھ کے دیکھ لیجیے جسے وہ سونا کہہ دے' وہ سونا ہے' جسے وہ پیتل کہے وہ پیتل ہے۔ معاملہ ختم ہو گیا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ ان کے اعمال کیا نتیجہ پیدا کریں گے!! ان کا کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ تخریبی اعمال کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پھر قرآن دوسری طرف آیا اور کہا کہ **اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ يَوۡمَئِذٍ خَيۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا وَّ اَحۡسَنُ مَقِيۡلًا** [2] (25:24)۔ اس کے مقابلے میں اہلِ جنت ہیں۔

مستقر اور مستودع کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں

یہاں (25:24) میں دو الفاظ آئے ہیں: **خَيۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا** (25:24)۔ میں نے ابھی خیر اور شر کہا تھا۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اہل

---

[1] یہاں مراد دین اسلام ہے۔ اسلام دین ہے مذہب نہیں ہے۔ مذہب کا تو لفظ ہی قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آیا۔

[2] اُس دَور میں جنتی زندگی بسر کرنے والوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ اُن کی رہائش گاہوں میں جو آسانیاں اور فراوانیاں ہوں گی' وہ تو ایک طرف رہیں' جہاں اُنہیں محض استراحتاً (آرام کرنے کے لیے) ٹھہرنا ہوگا' وہ مقامات بھی حسن خوبی کے آئینہ دار ہوں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 820 تا 821)۔

جنت وہ ہیں جن کے اعمال، جن کے کام، خدا کی دی ہوئی کسوٹی پر سچے ثابت ہوئے، ان کا مستقر، خیر ہے۔ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں، عزیزانِ من! الفاظ تو قرآن نے عربی مبین کے استعمال کیے ہیں لیکن اس کے انتخاب میں بھی یہ اعجاز ہے کہ ایک ایک لفظ کے اندر وہ اتنے اتنے اہم مسائل حل کر دیتا ہے کہ عام فکر انسانی بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں بھی بیان نہیں کرتی۔ انہی میں ایک مستقر کا لفظ ہے۔ ہم اس کا عام ترجمہ ٹھکانہ کر دیتے ہیں۔ سمجھنے کے لیے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آخری منزل، آخری مقام، ہے۔ عام طور پہ مستقر کے یہی معنی ہمارے ہاں لیے جاتے ہیں۔ قرآن تو بہت بڑی حقیقت بیان کر جاتا ہے۔

عزیزانِ من! مستقر کہتے ہیں ''ایسی چیز جو حرکت میں چلی آ رہی ہو اور کسی مقام پہ آن کر رک جائے۔'' یعنی وہ شے جو شروع سے ہی ایک مقام پہ ٹھہری ہوئی ہو، پتھر کی طرح جمی ہوئی، پتھر کے اس مقام کو مستقر نہیں کہتے، بلکہ کوئی چیز، جو رواں دواں چلی آ رہی ہو، جیسے پانی چلا آ رہا ہے، کسی مقام پہ ٹھہر گیا تو وہاں وہ اس کو پانی کا مستقر کہیں گے۔ رواں دواں چلے آنے والی جو چیز ہے، وہ کہیں آ کے رک جائے، ٹھہر جائے تو وہ ہے مستقر۔ قرآن نے مستقر اور مستودع کے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کہا ہے کہ **وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ فَمُسۡتَقَرٌّ وَّ مُسۡتَوۡدَعٌ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّفۡقَہُوۡنَ** (6:99)۔ پہلی بات تو یہ کہ خدا وہ ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے آگے بڑھایا۔ یہاں کہا ہے کہ تمہیں پیدا نہیں کیا آگے بڑھایا۔ یہ "**انشاکم**" آیا ہے۔ پھر کہا کہ اس کے بعد تمہارے لیے ''مستقر'' ہے اور ''مستودع'' ہے۔ آگے کہا ہے کہ یہ جو بات ہے، یہ بڑی نکھار ابھار کے کی گئی ہے لیکن سمجھ میں ان کے ہی آئے گی، جو غور وفکر سے کام لیں گے۔

میں یہاں نفس واحدہ کی بات پر تو اس وقت تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں مستقر اور مستودع کے الفاظ لوں گا۔ یہ الفاظ تو دو ہی ہیں لیکن ہیں عربی زبان کے۔ ان کے مادے (Roots) بالترتیب ''ق ر ر'' اور ''و د ع'' ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ اس میں غور وتفکر کی کیا چیز ہے جس کے لیے بتایا ہے کہ یہ بڑے گہرے غور وفکر کی بات ہے۔ غور وفکر کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ انفس اور آفاق میں جوں جوں ہماری نشانیاں بے نقاب ہوتی چلی جائیں گی، قرآن کے برحق ہونے کے لیے وہ ثبوت اور دلیل بنتی چلی جائیں گی۔ غور وفکر یہ ہے کہ انفس اور آفاق میں جسے خدا نے اپنی نشانیاں کہا ہے، جو کائنات کے اندر نظام چل رہا ہے یا جس انداز سے یہ کائنات چل رہی ہے، اس میں خود انسانی نفسیات کی جو Psyche ہے، سائیکولوجی ہے، اس میں تغیرات ہو رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جوں جوں یہ تمہیں سمجھ میں آنا شروع ہوں گے قرآن کے حقائق بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ یہ ہے غور وفکر۔ وہ جو کہتا ہے تو ''مستقر'' اور ''مستودع'' کے اندر کون سی چیز ہے جس پہ غور وفکر سے یہ بات سمجھ میں آئے گی؟ پہلے تو شاید نہ آ سکتی اگرچہ ہمارے ہاں بہت پہلے اس قسم کے مفکر گزرے

ہیں جنہوں نے اس پہ غور کیا تھا لیکن ہمارے دور میں جو بات بڑی واضح ہوئی ہے' وہ ہے انسانی تخلیق یا کائنات میں مختلف چیزیں' جو جاندار بھی ہیں' ان کی تخلیق کا سلسلہ۔

یہ جسے آپ Theory of Evolution (نظریہ ارتقا) کہتے ہیں' اس کا عام اور سب مذاہب میں پایا جانے والا یہی تصور ہے کہ کس طرح سے خدا نے ایک مٹی کا پتلا آدم بنایا' اس میں سے پسلی چیری' حوا پیدا کی' آگے پھر اس میں سے انسان بنائے۔ وہ ایک جوڑے ہی کی ضرورت تھی۔ پہلے مشکل تو وہیں تھی۔ یہ مشکل حل کی۔ آگے یہ سلسلہ چل پڑا' باقی باہر کائنات کی یہ چیزیں بھی' یہ جتنے جانور مویشی ہیں وہ سارے اسی طرح کے' اسی طرح بنے ہوئے موجود ہیں۔ ذہن انسانی یہیں پہنچ سکتا تھا لیکن آج کی تحقیق یہ کہہ رہی ہے کہ یہ اس طرح سے نہیں تھا۔ زندگی کی ابتدا ایک جرثومہ حیات (Single life- cell) سے ہوئی تھی۔ وہ اس کو نفسِ واحدہ کہتے ہیں یعنی ایک جرثومہ واحد جس کے اندر الگ ہو کر نر اور مادہ بننے کی یہ دونوں خصوصیات تھیں۔ بہرحال میرے پاس ارتقا کی تھیوری یا نظریہ کی تفصیل میں جانے کا تو وقت نہیں ہے' ان کی ساری تھیوری یہ ہے کہ اس طرح سے یہ چیزیں' یہ جنہیں وہ زندگی کے مختلف پیکر کہتے ہیں' بنے۔ لائف یعنی زندگی کے متعلق سائنس اب تک نہیں بتا سکی کہ اس کی ابتدا کس طرح سے ہوئی۔ یہ بتا ہی نہیں سکے۔ یہی تو وہ چیز ہے جس میں خدائی اختیار آتا ہے۔ زندگی نے آگے بڑھ کر یہ مختلف پیکر کیسے اختیار کیے؟ یہ جرثومے (Single life-cells) جو خوردبین سے نظر آتے ہیں' بنے۔ اس کے بعد یہ کیڑے مکوڑے' رینگنے والے' دو پاؤں پہ چلنے والے' چار پاؤں پہ چلنے والے' اس قسم کے جانور' یہ گوریلا قسم کے چمپینزی وغیرہ ملتے جلتے ہوئے انسان سے شکل و شباہت میں اور پھر انسان بنا۔

مستقر کا قرآنی مفہوم

زندگی مختلف منازل سے گزرتی ہوئی' اس پیکر انسانی میں آئی اور اس کے لیے ان کی تھیوری میں یہ ہے کہ ہر جنس یا ہر Species (نوع) ایک مقام پہ آ کے رکتی ہے' وہاں اس کے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اس درجے سے' اس منزل سے' جس میں وہ ہے' اسے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل بنا دیتی ہے اور یہ صلاحیتیں اس کو اگلی منزل میں پہنچا دیتی ہیں' پھر وہ وہاں رکتی ہے' ٹھہرتی ہے اور اس کے بعد پھر وہ ان صلاحیتوں کو لے کر اگلی منزل میں جاتی ہے۔ یہ مستقر کے معنی ہوتے ہیں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ کوئی رواں دواں چیز کسی منزل میں آ کے ٹھہرے اور ''مستودع'' کے معنی ہوتے ہیں'' وہاں سے اسے کسی اور کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ مستودع کرنا آپ جانتے ہی ہیں۔ اس کے معنی ودیعت کے ہوتے ہیں' کسی امانت کو کسی کے سپرد کر جانا۔

عزیزانِ من! اب آپ سمجھے جو اس نے کہا تھا کہ غور و فکر سے بات سمجھ میں آئے گی جو ہم کہہ رہے ہیں۔ آج یورپ کا یہ سائنٹسٹ

وجد میں آجائے' جب وہ لفظ اس کے سامنے آئیں گے کہ قرآن چودہ سو سال پیشتر کیا کہہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ** (6:98)۔ وہ جو پہلا سیل ہے اس سیل سے انشاکم ہوا یعنی زندگی کی ابتدا ہوئی' زندگی کو آگے بڑھایا۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ اس سے آگے نشوونما دے کر اسے آگے بڑھایا۔ بڑھنے کی صورت یہ نہیں تھی کہ یکا یک اگلے پیکر میں یوں پہنچ گیا اور پھر یوں آ گیا' نہیں' یہ بڑھتا گیا' ایک منزل میں اس کو استقرار ہوا' وہ رکا ٹھہرا' وہ اس کا مستقر بنا' مستقل طور پہ ٹھہرنے کا مقام نہیں۔ یادر کھیے رکنے کا مقام' اور اس کے بعد اس مقام کے جو' یوں کہیے کہ اس مقام کے جو مستودع ذمہ دار تھے انہوں نے اس امانت کو آگے کسی کے سپرد کر دیا۔ یہ **فَمُسۡتَقَرٌّ وَّ مُسۡتَوۡدَعٌ** ❶ (6:98) ہے۔ مستقر کے یہ معنی تو قرآن نے خود واضح کیے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن سمجھنے کا طریقہ ہی یہ ہے' عزیزانِ من! کہ جو لفظ آئے' دیکھیے کہ وہ ان معنی کی کس طرح وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً وہ زمین کے متعلق یہ کہتا ہے کہ **وَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ** ❷ (7:24)۔ دیکھیے کہ اس آیت کے ایک لفظ ''مستقر'' میں کتنا بڑا اہم مسئلہ ہے جو حل کر گیا ہے۔

مادی نظریہ حیات قرآن کی تعلیم کے برعکس ہے

ہمارے ہاں کا ایک مادی نظریہ حیات' طبعی نظریہ حیات' سیکولر نظریہ حیات یہ کہتا ہے کہ یہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے زندگی انسانی شکل میں آئی اور یہ اس کا آخری مقام ہے۔ بس یہاں پھر ختم ہو جائے گا۔ یہ موت آئی اور موت کے بعد انسان ختم ہوا۔ بس یہ اس کی آخری منزل ہے' آگے کچھ نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ** (7:24)۔ اونہیں بابا! آخری منزل نہیں ہے یہ تو صرف مستقر ہے۔ یہ مستقر کب تک کے لیے ہے؟ کیا یہ ابدی طور پہ مستقر ہے؟ کہا کہ **اِلٰی حِیۡنٍ** (7:24) نہیں' ایک مدت تک کے لیے ہے۔ اس طرح وہ مستقر جائے قرار ہوئی جو ایک مدت تک کے لیے ہوتی ہے' فائنل اسٹیج نہیں ہوتا' مستقر آخری ٹھہرنے کا مقام نہیں ہوتا' اور اس سے یہ نظر آیا کہ قرآن کی رو سے نظریہ حیات یہ ہے کہ یہ ارضی زندگی آخری مقام نہیں ہے' یہ تو انسانی زندگی کا مستقر ہے۔ اس نے آگے چلنا ہے۔ لفظ مستقر یہ کچھ بتا رہا ہے۔ قرآن زور دیتا ہے کہ ہم نے اسے عربی مبین میں نازل کیا۔ لہٰذا عربی مبین کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ پھر یہ دیکھیے کہ یہ اپنے معنی کس طرح واضح کرتا ہے تو یہ **مُسۡتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ** (7:24) ہے یعنی یہ تسلسلِ حیات ہے' یہ

---

❶ **اَنۡشَاَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ** (6:98) تمہاری زندگی کی ابتدا ایک جرثومہ حیات (Single life-cell) سے ہوئی (4:1; 39:6)۔ اُس کے بعد **فَمُسۡتَقَرٌّ وَّ مُسۡتَوۡدَعٌ** (6:98) ہے یعنی تم نے ارتقائی منازل طے کرنا شروع کیں' اس طرح کہ تمہارا کاروانِ زندگی کچھ وقت کے لیے ایک منزل میں ٹھہرا۔ پھر اُس منزل نے اُسے دوسری منزل کے سپرد کر دیا (11:6)۔ اس طرح یہ قافلہ منزل بہ منزل آگے بڑھتا گیا تا آنکہ تم مقامِ آدمیت تک پہنچ گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 311 تا 312)۔

❷ اب تم نے یہاں ایک مدت تک رہنا ہے اور سامانِ زیست سے ہر ایک نے فائدہ اٹھانا ہے۔

زندگی کا آگے جانا ہے۔ اس ایک لفظ میں قرآن یہ بات کہہ گیا اور فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ (6:98) کے دو الفاظ استعمال کیے تو نظریہ ارتقا کی تمام کڑیاں گنا گیا۔

مستقر کی ایک دوسری شکل مقیل بھی ہے

ان عربوں کے ہاں پھر یہ چیز بھی آئی ہے کہ بعض نوع (Species) ایسی ہوتی ہیں جنہیں زیادہ عرصہ ٹھہرنا پڑتا ہے اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ وہ تھوڑے عرصے میں ہی وہ صلاحیت حاصل کر لیتی ہیں اور آگے بڑھ جاتی ہیں۔ یہ بھی ان کے ہاں کی چیز ہے۔ سنیے قرآن کہتا ہے کہ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا (25:24) ان کے لیے مستقر (یعنی ٹھہرنے کی جگہ) بھی بڑا ''خیر'' ہے، بہت اچھا ہے اور مستقر ہی نہیں یہ مقیل احسن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مقیل کیا ہے؟ یہ دوپہر کو، جو آدمی یونہی ذرا کمر سیدھی کرتا ہے، تھوڑا سا جھونکا لیتا ہے، جسے قیلولہ کہتے ہیں، ذرا سی راحت ہے، وہ مستقر سے بہت چھوٹا عرصہ ہوتا ہے۔ یہ استراحت کا بہت چھوٹا عرصہ ہے، جسے مقیل کہا جاتا ہے۔ کہا کہ ان کا مستقر خیر ہوگا اور بعض میں تو یہ صلاحیت ہوگی کہ بس اتنا ہی ٹھہرنا ہوگا جیسے دوپہر کو ''تھوڑی ٹیک لگا لیندا اے آدمی۔'' ❶

عزیزانِ من! اربابِ فکر و نظر ہی یہ بات سمجھ سکیں گے کہ قرآن کیا کہتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ارتقائی منازل گنا رہا ہے، منازل کے دو درجے گنا رہا ہے۔ مستقر کہہ کے اس کی فائنل اسٹیج نہیں کہتا، بلکہ جائے قرار کہتا ہے۔ جائے قرار میں یہ کہتا ہے کہ بعض کے لیے تو ذرا زیادہ لمبا عرصہ ہوگا اور بعض تو ایسا ہی ہوگا جیسے یونہی دوپہر کو کوئی آدمی ذرا سی آنکھ جھپکنے کے لیے ٹھہر جائے یا رک جائے یا استراحت کر لے اور اس کے بعد پھر اٹھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھے۔ اس وقت کیا ہوگا؟ اس دور میں کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ❷ (25:25)۔

قرآنِ حکیم کے یہ یوم تشقق السماء بالغمام کے الفاظ غور و فکر کے متقاضی ہیں

عزیزانِ من! یہاں ایک بات سوچنے کی ہے کہ اگر ہر جگہ یہی چیز ہو کہ قربِ قیامت میں جب یہ چیز کچھ نہیں رہے گی اس وقت آسمان دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے، زمین پھٹ جائے گی، آسمان گر جائے گا، ہم آپ آج جو ہیں، ہمیں اس سے کیا فائدہ پہنچا۔

---

❶ جیسے دوپہر کو انسان استراحاً (آرام کرنے کے لیے) ٹھہر جاتا ہے۔

❷ اُس دور میں خدا کے کائناتی قوانین، زندگی بخش اسباب وسائل کو ساتھ لیے بے نقاب سامنے آئیں گے، اور خدا کے پروگرام کو بروئے کار لانے والی کائناتی قوتوں (Cosmic Forces) کا پے در پے نزول ہوگا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 821)۔

اس بات سے وہ ہوجائے گا' اس وقت یہ ہوجائے گا' اور جو اس وقت موجود ہوں گے ان کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اور وہ تو بیک جنبشِ گردش زمین نہ رہے گی' نہ زمین پہ رہنے والے رہیں گے۔ یہ واقعات جو بھی ہیں اگر یہ اسی طرح سے ہی ہیں' بہرحال بیان کیے گئے ہیں' تو سمجھ لیجیے کہ کچھ آنے والے واقعات کا ذکر ہے۔

قرآن تو ہمارے لیے کتابِ ہدایت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس زمین کی زندگی میں ہمارے لیے مستقر ہے۔ زندگی آگے چلتی ہے' یہ ہے ہدایت ہماری۔ یہ زمین ہی ایک دن نہیں رہے گی۔ وہ ٹھیک ہے' نہیں رہے گی۔ زمین میں رہنے والوں کے متعلق تو خدا نے کہہ دیا ہے کہ زمین کے ختم ہونے کے ساتھ یہ تو ختم نہیں ہوجائیں گے' وہ تو اس وقت کے بعد بھی آگے چلیں گے' تو اس لیے ہر مقام پہ ان کے معنی یہی نہیں ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ **يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ** (25:25)۔ یہاں اس کے ترجمے میں کہا کہ جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ پڑے گا تو اس سے کیا چیز آپ کی سمجھ میں آئی؟ **وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا** (25:25) فرشتے اتارے جائیں گے۔ آہستہ آہستہ ان کی تنزیل ہوگی۔ ٹھیک ہے یہ بھی قربِ قیامت میں ہوگا تو جو اس دور میں لوگ ہوں گے وہ دیکھ لیں گے۔ اگر قرآن نے یہی بات کہی ہے تو ہمارا اس پہ بھی ایمان ہے۔ جب ایمان ہمارا یہ ہے کہ یہ کائنات ابدی نہیں ہے' اس نے ایک دن ختم ہونا ہے تو ٹھیک ہے' آج ہمارے لیے اس میں یہ کیا چیز ہے۔

یہ الفاظ آج ہمیں کیا سبق دیتے ہیں؟

قرآن بتا رہا ہے کہ باطل کے نظام کی جگہ جب حق کا نظام قائم ہوگا' جسے وہ الجنۃ کہتا ہے' اس وقت کیفیت کیا ہوگی؟ کہا ہے کہ انشقاق ہوگا۔ اس کے معنی پھٹ پڑنا ہے۔ عرب اَلشَّقُّ کو طلوعِ سحر [1] بھی کہا کرتے تھے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے! مگر انسان زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا۔ دورِ حاضر کے انسان کو اقبالؒ (1877-1938) یہ کہہ رہا ہے:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اور قرآن نے جہاں یہ ہے کہا کہ **اِنَّـآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ** (97:1)۔ اسی سورۃ کے آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ **هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ** (97:5)۔ ان میں وہ کیا چیز کہی ہے "فجر" اور "انشقاق" تو ایک ہی بات ہے: تاریکیوں کا پھٹ پڑنا اور اس میں سے نورانیت کا نمودار ہوجانا۔ یہ وہی ہے جسے قرآن نے **وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا** (39:69) کہا ہے یعنی اس دور میں یہ زمین اپنے پرورش

---

[1] تاج العروس میں اَلشَّقُّ کے معنی صبح آئے ہیں۔

دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ یہ اس ارض کی بات ہو رہی ہے کہ یہاں یہ کیفیت ہوجائے گی کہ جہاں تاریکیاں ہی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں، جب نظامِ خداوندی قائم ہوگا، تو یہاں نورانیت ہی نورانیت ہوگی۔ جو سماء ہے، یہ کائنات کے قوانین ہیں، اقدارِ خداوندی ہیں، جو خارج سے آتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ غمام بادلوں کو کہتے ہیں لیکن قرآنِ کریم نے ہر جگہ زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرنے کے لیے ہمیشہ آسمان کے بادلوں کو مینہ سے تشبیہ دی ہے۔ کہا ہے کہ اسے اقدارِ خداوندی کی رو سے حیاتِ تازہ اور حیاتِ نو عطا کرنے والے سامان واسباب ملیں گے۔ جب غلط نظام کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی، ایک طلوعِ سحر ہوگا، نئے نظام کی نورانیت پھیل جائے گی، دنیا میں یہ اقدارِ خداوندی، تمام آسائشوں اور راحت سامانیوں کے ساتھ، اس زمین پر نازل ہوں گی اور **نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا** (25:25) یہ فطرت کی قوتیں ہیں جو ان تمام اسباب ووسائل کو لے کر تنزیلاً، آہستہ آہستہ، بتدریج آئیں گی، یکلخت نہیں آئیں گی۔

اس دور کی خصوصیت کبریٰ

میں نے کہا تھا کہ عربی زبان کے اندر تَنْزِيلٌ "تفعیل" [1] کا باب ہے، یعنی آہستہ آہستہ کسی چیز کا اتارا جانا ہے۔ یہاں کہا کہ یہ دور وہ ہوگا۔ اس دور کی خصوصیت کبریٰ کیا ہوگی؟ عزیزانِ من! اب دیکھیے بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ عظیم چیز ہے، ایسی عظیم چیز ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے بیان کیسے کروں گا۔ میں تو وجد میں آجاتا ہوں۔ اس دور میں کیا ہوگا؟ کہا کہ **اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ** (25:26)۔ آپ کے سامنے بھی قرآن کے نسخے ہیں الفاظ تو بہرحال آسان ہی ہیں، سامنے آتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ کون سی چیز ہے جس میں کہتے ہو کہ میں تو وجد میں آجاتا ہوں۔ میں تو سمجھتا نہیں کہ میں یہ کیسے سمجھاؤں۔ کہا ہے کہ اس دور میں حق پر مبنی (ملک کے معنی اقتدار اور کنٹرول ہوتا ہے) پورا اقتدار اور کنٹرول **لِلرَّحْمٰنِ** کے لیے ہوگا۔ بات دو الفاظ میں تو یہ ہے کہ قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی ہوگی، انہیں اقتدار حاصل ہوگا، حق کو اقتدار حاصل ہوگا، ملک یعنی اقتدار اور کنٹرول انہی کا ہوگا۔

الرحمٰن یعنی صفتِ خداوندی کی عظمت پوری طرح کارفرما ہوگی

غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں **لِلرَّحْمٰنِ** (25:26) کہا ہے۔ کنٹرول اور اقتدار ہوگا، حق پر مبنی ہوگا۔ یہ کس کے ہاتھ میں ہوگا؟ بات تو خدا ہی کی ہے۔ یہاں قرآن خدا کی یہ صفت رحمٰن لایا ہے کہ کنٹرول اور اقتدار رحمٰن کے ہاتھ میں ہوگا۔ اب نظامِ خداوندی کی ساری بات سامنے آجاتی ہے۔ عزیزانِ من! رحمٰن تو آپ کو پتہ ہے کہ "رح م" اس کا مادہ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی اس انداز کی پرورش کرنا جیسے

---

[1] ثلاثی مزید فیہ کے مختلف ابواب ہیں۔ ان میں ایک باب تَفْعِيْلٌ ہے۔ ہر باب کے اپنے مخصوص خواص ہیں۔ اس باب سے مصدر تَفْعِيْلٌ کے وزن پر آئے گا۔ مثلاً تَكْرِيْمٌ، تَنْزِيْلٌ

رحم مادر میں بچے کی، جنین کی، پرورش ہوتی ہے۔ جو بھی صاحبِ کنٹرول یا صاحبِ اقتدار ہیں، جن کے ہاتھوں میں بھی کنٹرول ہوتا ہے، جن کے ہاتھوں میں بھی یہاں قوت ہوتی ہے، وہ تو زندگی کو ذبح کر دیتے ہیں، وہ تو گلا گھونٹ کے رکھ دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں اقتدار اور استبداد تو مرادف الفاظ ہیں۔ یہاں کہا کہ اس میں خصوصیت یہ ہوگی کہ کنٹرول اور اقتدار اس کے ہاتھ میں ہوگا، جس کا فریضہ نشوونما دینا ہے۔ معاشرے کو بلا اقتدار نہیں چھوڑا جائے گا کہ اس میں فوضیت اور (Anarchy) (بدنظمی) ہوتی ہے۔ اقتدار ہوگا تو ضروری ہے کہ وہ اقتدار حق پر مبنی ہو: **يَوۡمَئِذِ إِلۡحَقُّ** (25:26) لیکن جن کے ہاتھ میں اقتدار ہوگا، ان کی خصوصیت کیا ہوگی؟ کہا کہ ان کی خصوصیت رحمانیت کی ہوگی، عالمگیر انسانیت کی ربوبیت اور نشوونما ان کا فریضہ ہوگا۔

اس سے بھی ایک قدم آگے یعنی وہ رحیم بھی ہے اور رحمان بھی

قرآن رحمت کے مادے سے، یا رحم کے مادے سے، رحمت والا، رحمٰن کا لفظ لایا ہے۔ قرآن اس میں تو ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ربوبیت کے لیے، نشوونما کے لیے، رب کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور رحیم اور رحمٰن کے الفاظ بھی آئے ہیں، **رَحۡمَتَ رَبِّكَ** (43:32) بھی آیا ہے اور ربوبیت بھی آیا ہے۔ عام مقصد تو دونوں کا ہی نشوونما ہے یعنی نشوونما دینا، پرورش کرنا۔ اسی میں فرق کیا ہے؟ اس کے لیے آپ اس کے بنیادی معنی کی طرف آ جائیے، رحم کی طرف آ جائیے۔ رحم مادر میں بچے کی جو پرورش ہوتی ہے وہ بچے کے کسی کام کا صلہ یا معاوضہ نہیں ہوتا۔ ماں تو بچے سے معاوضہ نہیں مانگتی۔ میں تو ابھی رحم کی بات کر رہا ہوں۔ بچے کی پیدائش کے بعد بھی یہ جو ماں کی طرف سے پرورش آتی ہے، وہ ہے رحمت۔ حقیقت میں وہ اس کا ایک حصہ ہوتا ہے جو رحم کے اندر وہ جنین کی پرورش کرتی ہے۔

رحمِ مادر میں بچے کی پرورش کی نوعیت اور ماں کی قربانی

عزیزانِ من! بڑے غور سے سنتے چلے جائیے۔ اس میں بڑی عجیب عجیب چیزیں سامنے آئیں گی۔ ایک تو پرورش وہ ہے کہ آپ اس کی پرورش کریں لیکن اس کا جداگانہ تشخص، انفرادیت، Individuality باقی نہ رہے، آپ اسے ختم کر دیں۔ ایک یہ طریقہ ہوتا ہے۔ خدا کا مقرر کیا ہوا کائنات کا عجیب سلسلہ ہے۔ رحم مادر کے اندر بچہ اپنی الگ انفرادیت رکھ رہا ہے، ماں الگ ہے اور اس کے اندر بچہ الگ ہے، اور دونوں کے دونوں ایک لحاظ سے یکساں بھی ہیں، اور ایک لحاظ سے ان دونوں کو یکساں نہیں کہا جائے گا۔ دونوں کے دونوں ایک بھی ہیں: ماں کو بخار ہوتا ہے اس رحم کے اندر بچے کو بخار ہو جاتا ہے، ماں کمزور ہوتی ہے وہ کمزور ہو جاتا ہے، بچے کو اگر آپ نے کیلشیم دینا ہوتا ہے تو ماں کو کیلشیم کھلاتے ہیں، اس میں خون کی کمی ہوتی ہے تو ماں کو فولاد زیادہ دیتے ہیں، ماں میں کمی ہوتی ہے بچے میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ اس کو آپ Oneness (ایک پن) کہیں گے لیکن انفرادیت اور تشخص دونوں کا الگ الگ ہوتا ہے۔ بچے کی انفرادیت کو تکمیل تک

پہنچاتے چلے جانا' اپنے خونِ جگر سے ایک دوسری انفرادیت کو' اپنی محنت اور کوشش سے مکمل کرتے چلے جانا جس میں پرورش پانے والے کی اپنی محنت اور کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ ہے رحیمی' یہ ہے رحمانیت۔ صرف پرورش ہی تو کوئی چیز نہیں ہے' پرورش تو غلاموں کی بھی کرتے ہیں' پرورش تو ہم بیلوں کی بھی کرتے ہیں' اپنے گدھے کی بھی کرتے ہیں' قربانی کے لیے جو جانور رکھا ہوتا ہے اس کی بھی پرورش ہم کرتے ہیں' محکوموں کی پرورش کرتے ہیں' مظلوموں کی کرتے ہیں' فرعون بنی اسرائیل کی پرورش بھی کرتا تھا' لیکن اس پرورش میں وہ کرتا کیا تھا؟ یہ کہ **يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ** (28:4) [1] کسی کی انفرادیت اور تشخص کو پنپنے نہیں دیتا تھا۔ مستبد پرورش دینے والا' جداگانہ تشخص کو برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ پرورش کرتا ہے' چارہ ڈالتا ہے' جداگانہ تشخص کو برداشت نہیں کرتا۔ ذرا سی کسی نے سرفرازی کی' سر کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ یہ صرف ماں کی طرف سے پرورش ہے جس میں انفرادیت اور جداگانہ تشخص ہوتا ہے ورنہ ہر پرورش کرنے والا اس کا معاوضہ اس سے مانگتا ہے۔ جس دن وہ معاوضہ دینے کے قابل نہیں رہتا وہ اُسے ''ذبح'' کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ ہندو جو گائے کی پرستش کرتے ہیں جب وہ کم بخت بوڑھی ہو جاتی ہے' سوکھ جاتی ہے' ان کو ہانک کر پاکستان کی طرف بھیج دیتے ہیں' یعنی انسان کے Selfish (خودغرض) ہونے کی تو کیفیت یہ ہے کہ اپنی مائیں جن کی وہ پوجا بھی کرتے ہیں' جب وہ بھی دودھ دینے کے قابل نہیں رہتی ہیں ''تے اوہنوں قصائی دے حوالے کر دیندے نیں۔'' [2] دنیا میں ہر Selfish (خودغرض) انسان یہی کرتا ہے۔

عزیزانِ من! جب تک کوئی دوسرا انسان اس کے کام کرنے کے قابل رہتا ہے وہ اس کی پرورش کرتا ہے' جس دن وہ اس کے کام کرنے کے قابل نہیں رہتا' اسے ذبح کر کے رکھ دیتا ہے' یہ ماں کی پرورش ہے' عزیزانِ من! کہ بچہ اس کا کوئی کام نہیں کرتا اور رحم کے اندر پرورش کی کیفیت یہ ہے کہ اس کو پتہ نہیں ہوتا' احساس نہیں ہوتا۔ پیدا ہونے کے بعد تو بچے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ماں کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ بچہ ہے' میں اور ہوں۔ اب اس بچے کے لیے کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنا خون دودھ میں تبدیل کر کے' اس جذبے کے ماتحت اس کے جسم میں انڈیلتی چلی جاتی ہے کہ اگر وہ دودھ کم پیتا ہے تو ڈاکٹروں کو' حکیموں کو دکھاتی پھرتی ہے کہ یہ کم کیوں پی رہا ہے' میرے جسم کا کم خون کیوں لے رہا ہے۔ سردی کی راتوں میں اگر وہ کہیں بستر پہ پیشاب کرتا ہے تو گیلی اور ٹھنڈی جگہ خود سوتی ہے' اس کو گرم بستر میں لٹاتی ہے۔ یہ اس سے کوئی معاوضہ نہیں لے رہی۔ وہ معاوضہ دینے کے قابل ہی نہیں ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس کے تو بس میں نہیں ہوتا' چمٹائے جاتی ہے' اپنے سینے سے لگائے جاتی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ

---

[1] اس قوم کے ان افراد کو جن میں اُسے جوہرِ مردانگی نظر آتے تھے' ذلیل وخوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔883)۔

[2] تو اُسے قصاب کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

اگر بس میں ہوتو شاید وہ اپنا سینہ چیر کر اندر رکھ لے۔ یونہی میں نے ایک دفعہ یہ کہا تھا' آپ اسے لطیفے کے طور پہ بھی سمجھ لیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ مائیں ہمیشہ بچے کو بائیں ہاتھ کی طرف رکھتی ہیں تا کہ وہ دل کے ساتھ لگا رہے۔ بلا کسی معاوضے کے' بلا کسی معاوضے کے خیال کے' پرورش کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اس انداز سے بچے کی پرورش ہوتی ہے اور یہ ہے وہ پرورش کا انداز جسے قرآن نے بار بار خدا کی رحمت کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ہے اندازِ پرورش خدا کا۔ میں نے تو کہا ہے کہ ماں یہ کچھ پلاتی ہے۔ خدا کا دیا ہوا یہ نظام ہے کہ جو اس کے خون کو دودھ میں تبدیل کر دیتا ہے اور وہ اس طرح سے پلاتی ہے۔ اسی لیے خدا نے اس چیز کو اپنی رحمت کہا ہے۔ یہ سامانِ پرورش صفحہ ارض کے اوپر' زمین کے اوپر' ایسے بکھرا ہوا ہے۔ ہمارے لیے اس قدر وافر ہے۔ ہماری کون سی کاریگری ہے کہ جس کی بنا پہ ہمارے لیے یہ سارا کچھ پیدا کیا ہے۔ دو دن پانی نہ ملے انسان ختم ہو جاتا ہے' کوئی جان باقی نہیں رہتی۔ کس نے پیدا کیا ہے وہ پانی؟ کیا یہ ہماری کاریگری کا نتیجہ ہے؟ یہ ہے وہ جسے وہ رحمت کہتا ہے۔ یہ ہے اندازِ پرورش۔

ماں کی طرف سے دودھ کی نہروں کے ساتھ شہد کی نہروں کا بھی مہیا کرنا

عزیزانِ من! کہیے تو ایک اور بات بھی عرض کروں۔ پرورش کی بات میں نے کہی کہ ماں دودھ دیتی ہے۔ جنت میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ دودھ کی نہریں بھی ہیں اور شہد کی نہریں بھی۔ دودھ کی نہریں تو ہم نے دیکھ لیا کہ ماں کے چشمے سے بہتی چلی جاتی ہیں۔ یہ شہد کی نہریں کیا ہیں؟ ماں بھی وہی ماں ہے' جو دودھ دینے کے ساتھ ساتھ بچوں کے ساتھ ایک شیرینی بھی بکھیرتی چلی جائے۔ اگر ماں کی اس محبت میں شیرینی نہیں ہے' صرف دودھ ہی دودھ ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بچے کی وہ پرورش نہیں ہوگی۔ ماں کی مسکراہٹ' ماں کی بشاشت' ماں کے چہرے کی خوبصورتی' ماں کی محبت' اس کا اس طرح لپٹانا' یہ شہد کی نہریں ہیں جو دودھ کی نہروں کے ساتھ بہتی چلی جائیں گی۔ جس ماں میں یہ دونوں چیزیں ہوں گی' آپ دیکھیے گا اس کا بچہ جنتی زندگی کے مطابق پرورش پائے گا۔ یہ کچھ محض دودھ دینے سے نہیں ہو سکے گا۔ دودھ کے ساتھ ماں شہد کے یہ قطرے بھی ٹپکائے تو یہ کچھ ہوگا۔ آج تو مائیں اپنا دودھ بھی نہیں دیتی ہیں' ڈبے کا دیتی ہیں۔ ان کو کیا پتہ کہ شہد کے قطرے کیسے ٹپکائے جاتے ہیں۔ یہ ان بچوں سے پوچھیے جنہوں نے ماں سے دودھ بھی لیا ہے اور یہ شہد بھی لیا' پھر ان کی کیا نشو ونما ہوئی ہے اور کیا ان کی انفرادیت کس قسم کی بنی ہے! یہ ہے جنت کی پرورش۔

رحمت کے مفہوم کی بہترین مثال ماں کی آغوش اور باپ کا قاعدہ قانون سکھانا ہے

اب آپ نے دیکھا کہ قرآن ہر مقام کے اوپر رحمت' رحمت' رحمت کیوں کہے چلا جا رہا ہے۔ رحمت کی تو مثال ہی ماں کی آغوش میں ملتی ہے لیکن آج بچہ ذرا بڑا ہو جاتا ہے' وہاں پھر باپ آتا ہے: او بیٹا یہ نہ کرنا' تمہیں میں نے کہا تھا کہ اِدھر نہ جانا' یہ کرو' وہ کرو۔ اب یہاں

کنٹرول شروع ہوتا ہے' اقتدار شروع ہوتا ہے۔ وہ محبت دیئے جاتی ہے' یہ اس کو قاعدہ قانون سکھاتا ہے' یہ اس پہ ایک کنٹرول رکھتا ہے۔

بچے کی صحیح پرورش رحمت اور الملک کے امتزاج کی رہین منت ہوتی ہے

یہ ماں اور باپ دونوں کے توازن سے' تعامل سے' تعاون سے' گھر کے اندر جو پرورش ہوتی ہے' وہ رحمت اور الملک کا امتزاج ہوتا ہے۔ اگر بچے کو صرف وہ رحمت ہی رحمت ملتی جائے اور یہ بات ساتھ نہ ہو تو نشوونما نا تمام رہ جاتی ہے۔ وہ بچہ جسے انگریزی میں Mother Style (ماں کی طرز کا) کہتے ہیں وہ ''ماں دالا ڈلا'' [1] تو بن جاتا ہے۔ یہ ماں دالا ڈلا [1] (Mother child) کیا ہوتا ہے؟ اپنی Protection (حفاظت) کے لیے دوسروں کا محتاج۔ خود Protection (حفاظت) تو اس سے ہوتی ہے۔ یہ جو باپ ساتھ کر رہا ہوتا ہے' اس کو چلنے کے لیے چھوڑتا ہے' خطرہ آتا ہے تو وہاں روکتا ہے۔ یہ جو کنٹرول ہے اگر وہ رحمت ساتھ نہ ہو' خالص کنٹرول ہی کنٹرول ساتھ ہو' تو آپ کے ہاں فرعون کی ربوبیت تو آجائے گی' خدا کی نہیں آئے گی۔ ایک مغرب کے فلاسفر نے یہ کہا تھا کہ تم مجھے بتادو کہ فلاں قوم نے اس قسم کا خدا اپنے لیے تجویز کیا ہوا تھا' میں اس قوم کی پوری معاشرت' نفسیات' سیاست' یہ سب کچھ تمہیں بتا دوں گا۔ وہ بڑی عجیب بات کہہ گیا ہے۔ فرد کی بات نہیں' جو قوم صرف Mother child (ماں کا لاڈلا) بن کے رہ جاتی ہے وہ اپنی حفاظت (Protection) کے لیے' نشوونما کے لیے' دوسروں کی محتاج بن جاتی ہے یعنی خود کچھ کر کے نہ دینا' دوسروں کی محتاج ہونا۔ جو قوم اس طرح سے پروان چڑھتی ہے' وہ ہمیشہ محکوم رہتی ہے' وہ اپنی حفاظت کے لیے دوسروں کی دستِ نگر ہوتی ہے' وہ خدا کو بھی ماں کے قالب میں ڈھالتی ہے۔ ہندوؤں کو دیکھیے۔ ماتا ان کے ہاں دھرتی بھی ہے' گائے بھی ماتا ہے' اگنی بھی ماتا ہے۔ یہ ان کے ہاں ماتائیں ہیں۔ انہوں نے Mother land (دھرتی ماتا) کا تصور دیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی مادرِ وطن کہنے لگ گئے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ کیا بول رہے ہیں۔ ان کے ہاں صرف ماں کا تصور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزارہا سال سے وہ قوم محکوم چلی آرہی ہے۔ ''جیہڑا جونی والا او نے اپناں نوں اگے لگالیا۔'' [2] ان میں Self confidence (خود اعتمادی) اور Self relliance, (خود انحصاری) پیدا ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے سیکھا ہی یہ ہوتا ہے کہ گائے کا دودھ دوہتے چلے جائیں' سینگ دوسرے کے ہاتھ میں ہوں۔ وہ قوم ہمیشہ نفسیاتی طور پہ محکوم ہوتی ہے' اس کی نفسیات محتاجی کی ہوتی ہے' Self-confidence (خود اعتماد) کی نہیں ہوتی۔ جس قوم نے خالص باپ کی ہی آغوش میں پرورش پائی ہو' ماں کی محبت اور شیرینی نہ ملی ہو' اس قوم میں رحم کا جذبہ نہیں ہوتا۔ جس میں کنٹرول استبداد کا ڈنڈا ہو' وہ یہودیت

---

[1] ماں کا پیارا

[2] جو طاقتور تھا اس نے انہیں اپنا محکوم بنالیا۔

کی قوم ہوتی ہے۔ یہودیوں کے دل میں رحم کا جذبہ ہی نہیں ہے۔ یونہی ان کو شیکسپیئر (1564-1616 AD) نے نہیں کہہ دیا تھا کہ کم بخت اپنے ایک پونڈ گوشت کے لیے دوسرے کی جان لے لیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ یہودیوں کے ہاں خدا کا جو تصور ہے وہ باپ کا تصور ہے۔ یہ قرآن تھا جو آیا اور اس نے ماں اور باپ (Father) دونوں کو ملا کے یہ امتزاج کر دیا۔ **اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ** (25:26) وہ خدا جس کے اقتدار میں ماں کی سی محبت بھی سموئی ہوئی ہے' وہ جو کائنات کی ہر شے کو نشوونما دیتا ہوا' تکمیل کیے جا رہا ہے۔

انسانی دنیا میں صفاتِ خداوندی کے ظہور کی اہمیت اور اس کی لم

یہ خدا اپنی صفات ہی نہیں بتا تا بلکہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ جو خدا کے نام پر یہاں کوئی نظام قائم کرے گا' اس میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے۔ وہ نظام اس لحاظ سے ظل الله علی الارض ہوتا ہے' بادشاہ نہیں ہوتا۔ اس نظام کے اندر خدا کی صفات کا عکس ہونا چاہیے جو خدا کے نام پہ قائم کیا جائے۔ عزیزانِ من! نظامِ خداوندی تو خیر نہیں' نظام مصطفیٰ ﷺ تو آپ نے سنا ہے۔ کبھی سنا کہ وہ ہوتا کیا ہے؟ وہ یہ ہوتا ہے کہ جس میں خدا کی صفت ملکیت' خدا کی صفت رحمانیت ہو۔ اس نظام میں ان دونوں کا امتزاج ہوگا کہ وہ اقتدار جو ان کا ہوگا وہ خداوندی Values (اقدار) کو نافذ کرنے کے لیے ہوگا' جس سے ہر فرد کی ذاتی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی' اس انداز سے کہ ماں کی سی محبت کے ساتھ چیز آئے گی' بلا صلہ کے وہ وہ نظام یہ چیز دے گا لیکن قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہر فردِ مملکت کی ضروریات زندگی کا بلا محنت ومشقت پورا کرنا' ان کا فریضہ ہوگا۔ ان کا فریضہ ہوگا کہ جو کام ان کے ذمے لگایا گیا ہے' باپ کی طرف سے اس کام کو یہ سرانجام دیں' وہ پرورش اس کام کے معاوضے میں نہیں ہوگی وہ پرورش بجائے خویش اس نظام کی ذمہ داری ہوگی جیسی ماں کی محبت کی ہوتی ہے۔ یہ جو کام کریں گے' اس لیے نہیں کہ اس کے معاوضے میں ان کو روٹی ملے گی' بلکہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ وہ تو ملے گی ماں کی طرح سے' رحمانیت کی طرح سے' ہر ایک کو ملے گی' محبت کے ساتھ ملے گی' دودھ اور شہد کی ملاوٹ سے ملے گی اور یہ جو کچھ کرے گا وہ کسی کے ڈنڈے کی وجہ سے نہیں کرے گا۔

قرآنِ حکیم انسان کو ڈیوٹی کا نہیں لبیک کا تصور دیتا ہے

پھر وہ بات اور سامنے آ گئی۔ ایک چیز ڈیوٹی ہوتی ہے۔ وہ تو فریضہ ہوتا ہے' جو اوپر سے کسی پر Impose (عائد) کیا جاتا ہے۔ یہ کرنا ہوتا ہے۔ ایک چیز Responsibility [1] ہوتی ہے۔ یہ لفظ انگریزی جاننے والے جانتے ہوں گے کہ Response سے ہے۔ یہ Response کرنا' خود کسی کام کے متعلق لبیک کہنا ہے۔ یہ جو قرآن نے ہمیں لبیک سکھایا ہے' یہ Response کرنے کی بات ہے

---

[1] بقول اسٹیفن آر کووے (Stephen R.Covey) یہ Responsibility کا لفظ Response-ability سے ماخوذ ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کہ کوئی کرنے کا کام جو سامنے ہو آگے بڑھ کر خود اس کے لیے لبیک کہو کہ ہم اس کام کو ڈیوٹی کے طور پہ کریں گے۔ کسی کام کو کرنا اور لبیک کہہ کر کسی کام کو کرنا' ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ قرآن اپنے اس نظام میں کہہ یہ رہا ہے کہ افراد کی پرورش اور ان کی انسانیت کی نشوونما تو یوں ہوگی جیسے ماں بچے کی پرورش اور نشوونما' بغیر معاوضے کے تصور کے' محبت کے ساتھ' شیرینی کے ساتھ' کرتی ہے اور افراد جو کام کریں گے وہ اس کو بیگار ڈیوٹی سمجھ کے نہیں کریں گے بلکہ وہ ان کے قلب کا تقاضا ہوگا کہ یہ کام ہم نے کرنا ہے۔ یہ اس تقاضے کی طرح کر جائیں گے کہ یہ کچھ کرنا ہے اور جب یہ کچھ کریں گے تو اس کے لیے صلہ کیا ہوگا؟ وہ جو ماں کو بچے سے صلہ ملا کرتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ ماں کو ایک صلہ ملا کرتا ہے۔ وہ ہے بچے کا ہلکا سا تبسم اور مسکراہٹ۔ یہ ماں کی ساری قربانیوں کا صلہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! یقین مانیے' مجھے پتہ نہیں کہ کسی اور نگاہ میں یہ بات ہے یا نہیں' بچے کی مسکراہٹ سے حسین شے دنیا میں کوئی نہیں اور اگر سوتے میں بچہ مسکرائے' میری بہنیں اور بیٹیاں ہیں بتاؤ کہ اس سے بھی حسین تر چیز دنیا میں کوئی ہوتی ہے! ماں کی طرف سے شیرینی' بچے کی طرف سے مسکراہٹ' باپ کی طرف سے اس لیے کنٹرول کہ کہیں خطرے میں نہ پڑ جائے' یہ اس لیے اس کے اوپر لبیک کہہ رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ تھانیدار کا ڈنڈا ہے' بلکہ یہ اس حفاظت کو لینا' اس کے اندر کی آواز ہو جاتی ہے۔

یہ ہے' عزیزانِ من! اس نظام کی خصوصیت جس کے اندر قرآن نے کہا ہے کہ اس میں ملائکہ کا نزول ہوا کرتا ہے۔ یہ ہے **اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۣالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ** (25:26) جس طرح خارجی کائنات اس کے قوانین کے تابع چل رہی ہے' اسی طرح اس دنیا میں بھی اُسی کا قانون نافذ ہوگا۔ **وَ كَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا** (25:26) اور جنہوں نے اس قسم کے نظام کی مخالفت کی ہوگی' آپ سوچ لیجیے کہ ان کے اوپر وہ دور پھر کس قدر عسرت کا دور ہوگا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الفرقان کی آیت 26 پہ آ گئے' 27 سے ہم آئندہ لیں گے۔

اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

Look at the word "responsibility ...... "response-ability" ...... the ability to choose your response.Highly proactive people recognize that responsibility.They do not blame circumstances, conditions, or conditioning for their behavior. Their bahavior is a product of their own conscious choice, based on values, rather than a product of their conditions, based on feelings, (p.71). It is much easier to blame other people, the conditioning or conditions for our own stagnant situation. But we are responsible ...... "response-able" ...... to cotrol our lives and to powerfully influence our circumstances by working on be, on what we are, (p.89). Knowing that we are responsible ...... "response-able" ...... is fundamental to effectiveness and to every other habit of effectiveness (p.93) (Covey, Stephen R.(1994). The Seven Habits of Highly Effective People. London: Simon of Schuster.)

ساتواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 27 تا 31)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى
لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ
لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ
مَهْجُوْرًا ﴿٣٠﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا
وَّنَصِيْرًا ﴿٣١﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1978ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 27 سے ہو رہا ہے: (25:27)۔ آج سب سے پہلے تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس قسم کے نامساعد موسم کے باوجود آپ احباب تشریف لے آئے ہیں۔ ذوقِ قرآنی کی عقیدت کا یہ ایک مظاہرہ ہے جس سے واقعی مجھے خوشی ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظام کی بنیادی خصوصیت صرف دو لفظوں میں

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں وہ نظام' وہ معاشرہ' وہ الدین جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا' جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اور جسے عملاً نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ کے ساتھیوں یعنی والذین معہ رضی اللہ عنہم نے دنیا میں قائم کر کے دکھا دیا' زیر بحث رہا۔ اس کی خصوصیتِ کبریٰ وہ تھی جو قرآن میں دو لفظوں میں بیان کر دی گئی: اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۨ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ (25:26) اس دور میں' اس نظام میں اقتدار اور کنٹرول' ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو افرادِ معاشرہ کی پرورش ایسے کریں گے جیسے ماں اپنے بچوں کی کرتی ہے۔ یہاں وہ کنٹرول کا لفظ خاص طور پہ اس دور میں قابلِ فہم ہے خواہ یہ رزق کے سرچشموں کے اوپر ہو بلکہ اب تو انسانوں کے قلب و دماغ پہ بھی

یہاں ملک کے لفظ میں یہ سب چیزیں آ جاتی ہیں۔ کہا کہ یہ نظام وہ ہوگا جس میں اقتدار' کنٹرول اور وہاں کا نظم ونسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو افرادِ معاشرہ کی پرورش ایسے کریں گے جیسے ماں اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے۔ یہاں چار الفاظ ہیں' عزیزانِ من! غور کیجیے اس سے جامع مفہوم کچھ اور بھی ہوسکتا ہے! وہ نظام جو خدا کی طرف سے ملتا ہے' جو قرآنی اقدار اور حدود کے تابع متشکل ہوتا ہے' اس کے لیے یہ کہنا کہ اس میں حق پر مبنی کنٹرول ہو' Truth (صداقت) پر مبنی کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا کی صفتِ رحمانیت کو مشہود کرنے کے لیے اس نظام کو قائم کریں۔ اور صفتِ رحمانیت یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی پرورش اور نشوونما کی ذمہ داری لیں گے۔ اس میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ ہر ذی حیات اور ہر ذی نفس شامل ہے۔ انہوں نے تو انسانوں سے بھی آگے یہ اعلان فرمایا تھا' اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45) کا وہ اعلان آپ کو یاد ہوگا جس میں کہا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ آپؓ سے کہا گیا کہ آپؓ نے انسانوں سے آگے بڑھ کر حیوانات تک کو بھی اپنے احاطے کے اندر لے لیا تو آپؓ نے فرمایا کہ قرآن میں **دابة فی الارض** ہے' رزق کی ذمہ داری کے لیے تو دآبہ کا لفظ ہے۔ وہ صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے ہر ذی حیات کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے اس لیے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس حدودِ مملکت کے اندر ہر ذی حیات اور ہر ذی تنفس کہ جس کو اپنی پرورش اور نشوونما کے لیے ان ذرائع کی ضرورت ہے وہ ہماری ذمہ داری کے اندر آ جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ کہا ہے کہ انسان ہی نہیں بلکہ اگر کوئی کتا بھی' اور یہ کچھ آپؓ مدینے میں بیٹھے ہوئے دجلہ کے متعلق فرما رہے ہیں جو اس دور میں اپنی مملکت کی آخری حد تھی' بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

ہمارے ہاں نظامِ ربوبیت کے خدوخال کی نوعیت

یہ ہے وہ چیز جسے قرآنِ کریم نے **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ** (25:26) کہا ہے اور یہ ہیں اس کے معنیٰ' ورنہ ہمارے نزدیک جیسا میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا ان سب چیزوں کو تو قیامت پر اٹھا کے رکھ دیا جاتا ہے اور پھر وہاں کہا یہ جاتا ہے کہ بس اس دن یہ سب کچھ خدا کے کنٹرول میں ہوگا' گویا اب یہاں کائنات میں خدا کے کنٹرول میں کچھ نہیں ہے' وہ کائنات تو اس نے ابلیس کے کنٹرول میں چھوڑ رکھی ہے اور آپ انتظار کر رہا ہے کہ جب لوگ یہاں آئیں گے تو پھر وہاں انتظام ایسا ہوگا کہ وہاں یہ کنٹرول اور اقتدار اس کا ہوگا' یہاں کوئی رحمٰن وغیرہ کا اقتدار نہیں ہے۔ آپ پڑھتے رہیے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' وہ کہتا ہے ٹھیک ہے خدا کی یہ صفات برحق ہیں لیکن یہ وہاں جا کے ملے گا ''اوتھے جا کے ملے گا تہانوں''[1]۔ وہ مسجد کے محراب و منبر کے متولی ہوں یا خانقاہ والے' ان سب کے رزق کی

---

[1] وہاں جا کر آپ کو ملے گا۔

ذمہ داری آپ پر ہے اور آپ کے رزق کی ذمہ داری خدا پر اور خدا کا وعدہ پورا ہوگا قیامت میں جا کے۔ یہ یہاں کی بات ہو رہی ہے' یہ اس نظام کی بات ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے ہاتھوں یہاں متشکل ہوا ہے۔ اور جس کا متشکل کرنا اس امت کا فریضہ تھا' بلکہ یوں کہیے کہ امت کا فریضہ نہیں' وہ تو **یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ** (83:6) کہتا ہے۔

انسانوں کا اختیار کردہ نظام ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہے گا

قرآن کہتا ہے کہ وہ خصوصیت کسی خاص امت کی نہیں' جو امت بھی قرآن کو اپنا گائیڈ بنا لے گی' اپنا راہنما بنا لے گی' اس کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس قسم کا نظام قائم کرے کہ جس میں یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو کہ وہ خدا کی صفت رحمانیت کو پورا کرنے والے ہوں۔ اور جس دن یہ نظام قائم ہوا اس نے کہا ہے کہ **وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا** (39:69) یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی' عزیزانِ من! اور یہ ہو کر رہے گا کیونکہ **وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ** (10:55) یہ خدا کے وعدے ہیں' یہ اس کا قانون ہے' ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ پورا نہ ہو۔ یہ ہوگا نقشہ عزیزانِ من! آج کی اصطلاح جو انہوں نے استعمال کی' پوچھتے ہیں کہ نظام مصطفیٰ ﷺ میں صاحب! کیا ہوگا' کیسا ہوگا' کیا صورت ہوگی؟ ان کے نزدیک تو یہ ہے کہ بس وہ جو چار سزائیں دیدیجیے' نظام پورا ہو گیا۔ نظام کا نقشہ' نظام کا تصور' اس کی تفصیل' قرآن نے دو لفظوں میں بیان کر دی کہ **اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذِ ۨالۡحَقُّ لِلرَّحۡمٰنِ**(25:26) مگر یہ آیت ابھی آدھی ہے' پچھلے درس میں ہم یہیں تک آئے تھے۔

قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں کافر کا مفہوم کسی چیز کو چھپا کر رکھنا ہے

اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ **وَكَانَ يَوۡمًا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ عَسِيۡرًا** (25:26)۔ اور وہ دور' اب پہلے اس لفظ کا ترجمہ یہی لے لیجیے تو انہوں نے کہا کہ کافروں کے لیے وہ دور بڑا ہی سخت ہوگا صاحب! اور کافر کہا: بس مسلمانوں کے سوا یہ ہندو ہوئے' یہ مشرک ہوئے' یہ عیسائی ہوئے' یہ یہودی ہوئے' وہ سب کافر ہیں' بس ان کے اوپر وہ دور بڑا سخت ہوگا۔ کافر کا تو یہ ترجمہ نہیں ہے' یہ تو ہماری اصطلاحیں ہیں۔ قرآن کی اصطلاح تو یہ ہے کہ جو کوئی بھی قرآن کے اس نظام سے انکار کرے گا' سرکشی برتے گا' وہ کافر ہے۔ وہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہو یا ہندو کے گھر میں پیدا ہو' سوال تو یہ ہے ہی نہیں کہ تم شودروں کے ہاں پیدا ہوئے ہو یا برہمن کے پیدا ہوئے ہو۔ کسی کے ہاں پیدا ہونا' کسی قوم کے اندر پیدائش کی رو سے داخل ہو جانا' یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ جو بھی اس نظام سے انکار کرتے ہیں' جو بھی اس سے سرکشی برتتے ہیں' وہ کافر ہیں۔ اگر اس کے بنیادی معنی میں آ جایئے تو وہ تو بڑی عجیب چیز ہے۔ کفر کے معنی ہیں کسی چیز کو چھپا کے رکھنا' ڈھانپ کے رکھنا' ظاہر نہ ہونے دینا۔ غور فرمایا آپ نے کہ کتنی دور جاتا ہے قرآن۔ اب لیجیے کہ یہ Definition یا اصطلاح جو ہے اس

کا عملی مفہوم کتنا وسیع ہوجاتا ہے۔ جو بھی اس نظام کی مخالفت کرنے والے ہیں' سرکشی برتنے والے ہیں' اُنہوں نے اسے دبا کے رکھا' ڈھانپ کے رکھا کہ ہونہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں' یہ جو وہ اقبالؒ کہتا ہے کہ ابلیس کا پورا پروگرام یہ ہے وہ اپنے مشیروں سے اپنے کیبنٹ کے منسٹروں سے کہتا یہ ہے کہ ایک ہی کام کرنے کا ہے: 'ہونہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں' بس' باقی ستے ای خیراں ہیگی آں'[1] بس یہ نہ ہونے دینا۔ یہ ہے 'آشکارانہ ہوجائے' کفر۔ ان کے لیے یہ لفظ تو عسیر ہے۔

کسی گتھی کے نہ سلجھنے پر چڑ چڑا پن کا پیدا ہونا عسرت کہلاتا ہے

میں نے کہا ہے کہ قرآن کے الفاظ سے تو ایسے ہی آگے نہیں گزر جانا چاہیے۔ یہ واقعی ٹھیک ہے کہ یُسر کے مقابلے میں عُسر آتا ہے یعنی آسانی کے مقابلے میں تنگی۔ عسرت کو مشقت سختی کہتے ہیں لیکن اس کے بنیادی معنی تو بڑے گہرے ہیں اور بات سمجھ میں پھر آتی ہے۔ عسرت ہوتی ہے کہ ''ڈور کی گتھی میں اس قسم کی الجھنیں پیدا ہوجانا کہ وہ سلجھ نہ سکیں اور سلجھ نہ سکنے سے یا سلجھا نہ سکنے سے انسان کو جو پریشانی تفکر اور چڑ چڑا پن پیدا ہوتا ہے' وہ ہوتی عسرت ہے۔ Blind Situation میں آجانا کہ کوئی راستہ نظر نہ آئے' کوئی شکل' کوئی صورت سجھائی نہ دے' جسے ہم کہتے ہیں کہ اتنی الجھنیں پیدا ہوجائیں کہ پتہ نہ چلے کہ یہ سلجھیں گی کس طرح سے''۔ دیکھ رہے ہیں آپ اپنے معاشرہ کو کہ کیا ہو رہا ہے' یہی جہنم نہیں ہے جسے وہ کہہ رہا ہے۔ یعنی وہ گتھیاں اس قسم کی پیدا ہوجاتی ہیں کہ پھر وہ سلجھائی نہیں جاتیں' اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں: **بـایـدیهم** قرآن کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں تم نے ''پہلے تے گنجلاں پادتیاں نے ایس ڈورنوں''[2] تو آپ دیکھتے ہیں کہ یہ بسنت آرہی ہے۔ اس میں یہ بچے' کس مصیبت میں ہوتے ہیں' وہ جو ڈور میں ''گنجلاں ہوندیاں نیں'' وہ ان کو سلجھا نہیں سکتے۔ عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ آج ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ خود پیدا کردہ گتھیاں اس طرح سے ہم نے سخت کر رکھی ہیں کہ وہ سلجھانے کی لاکھ کوشش کیجیے سلجھ نہیں رہیں۔

آخر کار انسان کو وہ قرآنی نظام جو اس نے ڈھانپ رکھا ہے ظاہر کرنا ہوگا

یہ ہے **وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا** (25:36) سلجھیں گی تو اس صورت میں کہ اس نظام کو جو تم نے ڈھانپ کر' چھپا کر' رکھا ہوا ہے اس کو آشکارا کیجیے' ساری گتھیاں سلجھ جائیں گی صاحب! گتھیاں تو روشنی میں سلجھا کرتی ہیں' تاریکیوں میں تو نہیں سلجھا کرتیں۔ روشنی تو ایک ہی ہے وہ خدا کی کتاب کی روشنی کو تم لوگوں نے دبا رکھا ہے اور گتھیاں سلجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہی تو ظلم ہے جس کا نتیجہ یہ جہنم ہے۔ سنیے جہنم کی کیفیت۔ کہا کہ **وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا** (25:27)۔

---

[1] باقی ہر طرف بھلائی ہی بھلائی ہے۔ رحمت ہی رحمت ہے۔

[2] اس ڈور میں پہلے سے جھلکیں پیدا کر دیں۔

یہاں وہی ظالم کا لفظ آیا ہے' میں نے اس دن یہ کہا تھا کہ ظالم کے معنی یہی نہیں کہ جو ہم اپنے ذہن میں جس کو ظالم کہتے ہیں یا جنہوں نے ان کو یہ کچھ بنا دیا تھا وہ سارے ہی ظالم ہوتے ہیں۔ ظالم کے معنی وہ شخص ہیں کہ جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے' جس مقام پہ کسی کو ہونا چاہیے وہاں نہ اس کو رکھا جائے خواہ نیچے لے آیا جائے خواہ اوپر پہنچا دیا جائے۔ ظالم اس دن اپنی انگلیاں کاٹیں گے اور یہ کہیں گے کہ اے کاش! میں بھی اس کارواں میں شریک ہوتا کہ جس کارواں کے سالار یہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں' میں بھی انؐ کی معیت میں اگر ہوتا تو آج یہ کیفیت تو نہ ہوتی۔ **یٰوَیۡلَتٰی لَیۡتَنِیۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِیۡلًا** (26:28) اے کاش! میں فلاں پارٹی میں شریک نہ ہوا ہوتا' میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس دن یہ بات وہ کہے گا کہ میں اس کارواں میں شریک نہ ہوتا' فلاں کو میں نے اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اب دیکھیے آگئی یہ جو بات ہے کہ **لَقَدۡ اَضَلَّنِیۡ عَنِ الذِّکۡرِ بَعۡدَ اِذۡ جَآءَنِیۡ** (25:29)۔ یہ بات تو واضح طور پہ ہمارے سامنے آچکی ہوئی ہے' ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے لیکن اس کے آجانے کے باوجود یہ میری پارٹی کے لوگوں نے' میرے ان دوستوں نے جنہیں میں نے خود دوست بنایا تھا' انہوں نے مجھے غلط راستے کے اوپر ڈال دیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ صحیح راستہ واضح طور پہ ہمارے سامنے نہیں آچکا تھا۔

قرآنِ حکیم کے ہوتے ہوئے اس قندیلِ آسمانی کی روشنی سے کون انکار کرے گا؟

قرآن آنے کے بعد تو عزیزانِ من! کوئی بھی یہ کہہ نہیں سکتا کہ صحیح راستہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اور کم از کم یہ قوم جو مدعی ہے آج بھی گئے گزرے زمانے میں ہر گھر کے اندر تو قرآن کا نسخہ موجود ہوتا ہے اگرچہ تقدس کے اعتبار سے اسے ایسی اونچی جگہ رکھا جاتا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہو' اس کو اس طرح لپیٹا جاتا ہے کہ وہ کوشش کے بغیر کھلنے ہی نہ پائے۔ ہے تو ہر گھر کے اندر رکھا ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ پھر اس کے آجانے کے بعد وہ کونسی بات تھی جس نے انسان کو بہکایا اور دوسرے راستے پہ لے گیا؟

شیطان کے متعلق غلط تصور کا نتیجہ

ابھی بات آتی ہے اور میرے خیال میں وہ بات قرآن کا بنیادی عمود ہے' عظیم ترین چیز ہے بلکہ ایک اعلان ہے۔ وہ بات آگے آئے گی۔ یہاں ایک بڑا عمدہ نکتہ آیا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ اے کاش! میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا' فلاں کے ساتھ شریک نہ ہوا ہوتا۔ تو اپنے کسی دوست کی بات کر رہا ہے اور کہہ یہ رہا ہے کہ **وَکَانَ الشَّیۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا** (25:29) بات اصل میں یہ ہے کہ شیطان ہے جو یہ کچھ کرتا ہے۔ اور ہم نے تو سمجھ رکھا ہے کہ وہ شیطان کہیں یوں باہر ہے اور وہ سب کچھ کرتا رہتا ہے۔ تصور دیکھیے اپنے ذہن میں اس شیطان کا۔ کام تو اس کے ذمے یہی لگا رکھا ہے کہ وہ گمراہ کرتا رہتا ہے لیکن ذرا اس کا تصور' اس کی پاورز' اس کی صلاحیتیں' اس کی قوتیں' دیکھیے کہ وہ دنیا میں ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ یا اللہ۔ اب کبھی غور بھی کیا ہے' غور کیا ہوتا تو ہماری یہ حالت کیوں ہوتی'

یہ غور کرنے کے دیئے ہی تو بجھائے جاتے ہیں جس سے یہ سب کچھ منوایا جاتا ہے۔ شیطان کا یہ تصور ہی غیر قرآنی ہے۔

ہمارے ہاں شیطان کا موجودہ تصور مجوسی یا پارسی مذہب کا پیدا کردہ ہے

شیطان شیطان صبح سے شام تک ہوتا چلا آتا ہے۔ کبھی سوچا بھی ہے کہ اس کو ہم کن صفات سے متصف کرتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں دنیا میں ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ ہر انسان کو جو گمراہ کرتا ہے وہ ساری دنیا میں ہر انسان کے ساتھ ہے۔ یہ تو (معاذ اللہ) خدا کی صفت ہے: **هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** (57:4) جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ ارے یہ پوزیشن دے رہے ہیں ہم خدا کے خلاف جو علی الرغم اس کا دشمن ہے جسے ہم کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ تصور کہاں سے آیا؟ یہ جنہیں مجوس کہتے تھے اب ہمارے ہاں تو پارسی کہتے ہیں' یہ ایران کا مجوسی مذہب تھا' جس کا بانی زرتشت تھا' نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں بڑے عروج پہ تھا۔ ایران کی مجوسیت آپ نے سنی ہوگی' سنی کیا ہے اگر آنکھیں کھلی ہوں تو معلوم ہو کہ یہ سارا جتنا بھی ہم آج مذہب لیے پھرتے ہیں مجوسیت ہے ایران کی۔ اس مجوسیت میں Dualism (ثنویت) کا' یہ تصور دیا گیا تھا کہ دو خدا ہیں: ایک نیکی کا' ایک بدی کا' ایک روشنی کا ایک تاریکی کا' ایک اہرمن ایک یزداں' دونوں کو برابر کی مساوی قوتیں دی گئی تھیں' دونوں ایک اکھاڑے میں پہلوانوں کی طرح کھڑے کیے ہوئے تھے' دونوں میں برابر کی کشتی ہوتی تھی۔ اور یہ ان دونوں کی کشمکش تھی کہ ہر دور میں' ہر جگہ' ہر ثانیہ' ہر لحہ میں قیامت تک جاری رہے گی۔ تو خدا کے مقابلے میں ایک دوسرا خدا کھڑا کیا ہوا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ جو اہرمن تھا ہمارے ہاں وہ شیطان کے تصور میں ذہن میں آیا اور وہ ساری خصوصیات یا صفات جو انہوں نے اہرمن کو دے رکھی تھیں خدا کے مقابلے میں دوسرا خدا وہ ہم نے شیطان کو پہنا رکھی ہوئی ہیں۔ پہلی صفت یہ کہ ساری دنیا میں موجود ہر وقت ہر شخص کے ساتھ' یہ تو خدا کی صفت ہے۔ اتنی بڑی قوت کہ انسان اس کے سامنے بالکل عاجز' کچھ نہیں کرسکتا' قیامت تک کے لیے موجود' مر بھی نہیں سکتا۔ دیکھتے ہیں یہ وہی تصور ہے یا نہیں مجوسیت کا!

عزیزانِ من! پھر ایک بات اور بتا دوں کہ قرآن یا دین یا اسلام اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک پہلے یہ جو باقی غلط مذاہب اور ان کے تصورات ہیں' آپ ان کا مطالعہ نہیں کرتے۔ یہ وہی ہے جسے تقابلی مطالعہ کہتے ہیں۔ جب تک آپ کو یہ معلوم نہیں کہ پہلے کیا عقائد چلے آرہے تھے' قرآن کے عقائد نکھر کر آپ کے سامنے نہیں آتے۔ یہ تو ان میں سے ایک ایک چیز کی تردید کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک ثانیہ میں اسے Refuse (انکار) کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ اپنا مثبت محسوس (Concrete, Positive) عقیدہ رکھ دیتا ہے۔ اس سے پہلے یہ سمجھ میں آنا چاہیے کہ وہ بات کیا ہے جس کی وہ تردید کرتا ہے۔

شیطان کے متعلق ہمارے ہاں پائے جانے والے تصور کی حقیقت

میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں شیطان کا یہ تصور ہے کہ اسے ہر انسان کے ساتھ موجود کہا ہوا ہے مگر اصل یہ ہے کہ وہ کہیں باہر نہیں کھڑا ہوتا بلکہ وہ تو ہر انسان کے اندر ہوتا ہے اور ہر انسان کا اپنا اپنا شیطان ہوتا ہے' وہ تو خود ہی شیطان ہوتا ہے۔ جب بھی انسانی جذبات سرکش ہو کر ہدایتِ خداوندی پہ غالب آ جائیں' یہ شیطنت کہلاتی ہے۔ یہ انسان کا اپنا فعل ہے' یہ فعل خارج سے کوئی نہیں کرتا' خارج میں کوئی ایسا وجود نہیں ہے جس کو ہم نے اس صفت الوہیت سے نواز رکھا ہے کہ دنیا میں ہر شخص کے ساتھ اور ہر جگہ موجود ہے (معاذ اللہ)۔ یہ ہر شخص کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اصل یوں ہے کہ انسان کے اندر خدا نے قوتیں دی ہیں' کچھ صلاحیتیں دی ہیں۔ یہ ان صلاحیتوں کا استعمال ہے۔ یہ جو ہدایت ہے اسے آپ ملائکہ کی صفت کہتے ہیں اور جو گمراہی ہے' اُسے آپ شیطان کی صفت کہتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ کہہ لیجیے کہ ان صلاحیتوں کو انسان استعمال کس طرح سے کرتا ہے؟ اگر انسان انہیں مفاد پرستیوں کے راستے میں استعمال کرتا ہے' خواہ وہ مفاد پرستیاں اس کی اپنی ذات کی ہوں یا اپنی پارٹی کی ہوں' اپنی قوم کی ہوں' مگر ہوں انسانیت کے مقابلے میں' تو جب وہ انہیں اس طرح استعمال کرتا ہے تو یہ بھی شیطنت ہے۔ یعنی اس میں وہ اپنے جذبات کی تسکین اس طرح چاہتا ہے کہ وہ صلاحیتیں خدا کی حدود کو تجاوز کر کے' پھاند کے' استعمال کی جائیں۔ یہ جو انسان اپنی صلاحیت کو غلط انداز سے استعمال کرتا ہے یہ ہے شیطنت۔ کبھی تو یہ اپنے اندر کا تقاضا ہوتا ہے' کبھی کسی ساتھی کا تقاضا ہے جو ورغلا دیتا ہے' اور عام طور پر بڑے پیمانے کے اوپر جو دنیا میں اس قسم کی سرکشیاں' مفاد پرستیاں' گمراہیاں پھیلتی ہیں' وہ ہوتی ہیں۔ یہ ہمیشہ ایک پارٹی کے اندر ہوتا ہے' گروہ کے اندر ہوتا ہے۔ ڈاکو بھی ایک گروہ رکھتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں کے جو ٹھگ تھے' وہ ایک الگ کمیونٹی تھی۔ یہ اس دور میں بھی ہے جسے آپ پارٹی سسٹم کہتے ہیں۔ وہ پارٹی کے اندر ہوتا ہے۔ یہ ہے جنہیں کہا ہے کہ تم فلاں کو اپنا حلیف یا دوست نہ بناؤ۔ یہ ہے وہ شیطان' یعنی انسان کا اپنی صلاحیتوں کو غلط طریقے پر استعمال کرنا۔ یہ شیطنت ہے اور ان انسانی صلاحیتوں کو حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرنا' یہ اسلام ہے۔

ابلیس یا شیطان کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی ایک خوب صورت حدیث

نبی اکرم ﷺ کا وہ ارشادِ گرامی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ وہ ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی صحیح حدیث ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کا ایک ایک ابلیس ہوتا ہے۔ جب آپ ﷺ نے کہا کہ ہر شخص کا ابلیس ہوتا ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ آپ ﷺ کا بھی ابلیس ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں' میرا بھی ابلیس ہے۔ صحابہ کرام کہنے لگے: جی' پھر آپ ﷺ نے کیا کیا؟ کہنے لگے کہ میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان بنا لیا ہے۔ اس سے بہتر اس کی کوئی اور تفسیر ہو نہیں سکتی' عزیزانِ من! میں کہہ رہا تھا کہ سنیے قرآن کیا کہتا ہے۔ اس نے یہ کہا تھا

کہ اے کاش! میں فلاں کو اپنا دوست نہ بناتا اور میری یہ کیفیت نہ ہوتی۔ اس نے مجھے اس طرح سے گمراہ کر دیا۔ یہ اس کے متعلق ہے اور آگے ہے کہ **وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا**[1] (25:29)۔ قرآن کہتا ہے کہ دیکھا شیطان کس طرح سے انسان کو گمراہ کرتا ہے! یہ شیطان کون ہے؟ یہ وہی ہے جس میں پہلے اس نے کہا ہے کہ **لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا** (25:28) میں نے اس کو کیوں اپنا دوست بنالیا' کیوں میں اس پارٹی میں شریک ہوگیا۔ قرآن کہتا ہے کہ دیکھا' شیطان کیسے انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ یہ تو اس پارٹی کا ذکر ہے' یہ تو اس دوست کا نام ہے' وہ تو اُس کا کام ہے جس نے اِس کو یوں گمراہ کیا۔ اے کاش! میں ان میں نہ ہوتا۔ میں ان میں نہ ہوتا' شیطان کو یہ چیز کہی ہے۔

لفظ خذولا کا مفہوم

یہاں (25:29) میں لفظ خذول بھی عجیب لفظ ہے' وہ ساتھی تھا۔ آپ یوں ذہن میں رکھیے کہ وہاں بھیڑوں کا گلہ ہوتا ہے' صحرا ہوتا ہے' بیابان ہوتا ہے' جنگل ہوتا ہے' ہر طرف بھیڑیوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ بھیڑ گلے میں ساتھ رہتی ہے تو محفوظ رہتی ہے۔ بہترین گڈریا تو وہی ہوتا ہے جو بھیڑوں کو گلے کے اندر رکھے۔ اگر بیابان میں کسی مقام کے اوپر جہاں اِدھر اُدھر ہر جگہ بھیڑیوں کا خطرہ ہو' کوئی بھیڑ ہٹ کر گلے سے الگ ہو جائے تو یہ چیز ہے جسے خذولا کہتے ہیں۔ میں اس کی پارٹی میں شریک ہوا تھا۔ اب جب یہ تباہی آئی ہے تو وہ کم بخت مجھے یوں چھوڑ کے الگ ہوگیا ہے جیسے گلے سے بھیڑ کو الگ کر کے بیابان میں چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ جس کا جی چاہے اس کو جھپٹ کے لے جائے۔ کیا بات ہے شیطان کی' مفاد پرستوں کی! پارٹیوں کے اندر یہی ہوتا ہے' عزیزانِ من! ہر خطرے کے وقت وہ جن کے ساتھ آپ اتنے اچھے تعلق بنائے بیٹھے ہوتے ہیں وہ یوں چھوڑ کے الگ ہو جاتے ہیں جیسے گلے سے بھیڑ کو الگ کر دیا جاتا ہے کہ جس بھیڑیئے کا جی چاہے اس کو جھپٹ کے لے جائے۔ اے کاش! میں اسے دوست نہ پکڑتا۔ وہ تو میرے ساتھ یہ کر گیا ہے۔ اب وہ آیت آتی ہے جس کا تذکرہ میں ابھی کروں گا۔

امت کے خلاف خدا کی عدالت میں حضور ﷺ کی پکار

عزیزانِ من! یہ وہ آیت ہے جسے میں نے کہا ہے کہ **بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى** (2:256) ہے اور **لَا انْفِصَامَ لَهَا**[2] (2:256) ہے۔

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ شیطان (یعنی اپنے مفاد کی بنا پر دوست داری کے تعلقات رکھنے والے) کا کام ہی یہ ہے کہ وہ پہلے تو غمخوار اور رفیق بن کر ساتھ چلتا ہے' لیکن جب مصیبت آتی ہے' تو اپنے ساتھی کو یوں تنہا چھوڑ دیتا ہے جیسے کوئی بھیڑ گلے سے الگ رہ جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 821)۔

[2] آیت کا یہ ٹکڑا یوں ہے: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (2:256) سو جو قوم' غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر' اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اِسے زندگی کا نصب العین بنائے گی' تو سمجھ لو کہ اُس نے ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 100)۔

یہ بنیادی عمود ہے' ستون ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ سارے قرآن کا نقشہ یہی ہے اور اب یوں سمجھ لیجیے کہ خدا کی عدالت ہے۔ اس کے حضور یہ سب قومیں آ رہی ہیں۔ وہاں نظر آ رہا ہے کہ اس کارواں کے ساتھ کون تھا' کس نے اس کا ساتھ چھوڑا' کون شیطان اور ابلیس کی سرکردگی میں اپنی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ سارا کچھ وہاں یوں ہے جیسے مقدمہ پیش ہو رہا ہے اور وہاں نبی اکرم ﷺ سامنے آ گئے ہیں۔ نقشہ دیکھیے' عزیزانِ من! قرآن کا' اس امت کا نقشہ۔ یہ وہاں موجود ہے۔ ابھی ہم کہہ رہے تھے کہ یہ جو کافر کا لفظ آتا ہے' وہ ہندوؤں کے لیے' عیسائیوں کے لیے' یہودیوں کے لیے آتا ہے۔ سنیے' عزیزانِ من! کہ اس جگہ' بڑی توجہ سے سنیے' اپنی توجہ مرتکز کیجیے' اس کیفیت کے اندر کہ نبی اکرم ﷺ تشریف لاتے ہیں اور جیسے دور سے آواز دی جاتی ہے کہ **وَ قَالَ الرَّسُوْلُ** (25:30) رسول کہے گا **یٰرَبِّ** (25:30) اے میرے رب! اے میرے نشوونما دینے والے! میری ایک بات سن لے: یہ جو تیرے سامنے قوم کھڑی ہے' یہ جو اپنی نسبت میری طرف کرتی ہے' یہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتی ہے' یہ جو تیرے سامنے کھڑی ہے' پتہ ہے اس نے کیا کیا ہے؟ **اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** (25:30) اس قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

عزیزانِ من! آپ قرآن کا منظر دیکھیے جسے آپ قیامت کا دن کہتے ہیں' اس قیامت کے دن خدا کے حضور اس عدالت کے اندر یہ امت کھڑی ہے۔ یہ سوال ہو رہا ہے کہ تم نے یہ کیوں کیا اور کیسے کیا اور کیا ہوا اور کیا نہ ہوا؟ جیسے کہتے ہیں اعمال نامہ کھڑا ہے' وہ جسے قرآن نے ایک شاہد کہا ہے' سب سے بڑا گواہ' وہ سب سے بڑا گواہِ عظیم ہے جو عدالت کی طرف سے آیا کرتا ہے۔ وہ نہ مدعی کی طرف سے ہے نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ وہ ایک شاہدِ اعظم آتا ہے' دور سے پکارتا ہے کہ اے میرے رب! آپ ان کے جرائم ایک ایک کر کے کیا گناتے ہیں' میں بتاتا ہوں کہ اس قوم نے کیا کیا ہے؟ **اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا** (25:30)۔ عزیزانِ من! قومی کہا گیا ہے' یہاں میری قوم کہا ہے۔ باقیوں کی جو قومیں ہیں' ان کے بارے میں تو تم جانو اور وہ قومیں جانیں' ان کا میں بتاتا ہوں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا' انہوں نے وہاں کیا کیا؟ **وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ** (25:30) رسول کہے گا کہ اے میرے رب! **اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** (25:30) اس قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔ عزیزانِ من! سارے قرآن میں بڑی بنیادی چیز ہے رسول اللہ ﷺ کی طرف' وہ جسے آپ کہتے ہیں' قیامت میں' یہ ایک ہی اعلان ہے جو بتایا گیا ہے **قَوْمِی** (25:30) کہا ہے۔ اپنی قوم کے خلاف کہا ہے جسے آج اپنی امت کہتے ہیں یہ اس کے خلاف اعلان ہے' یہ الزام ہے' یہ دعویٰ ہے کسی اور چیز سے متعلق نہیں کہا۔ سارے قرآن میں آپ دیکھ جائیے یہی کہا ہے کہ **اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** (25:30) میری اس قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ میری اس قوم نے یہ کیا تھا' اس کا یہ جرم تھا۔

زوالِ امت کی وجہ جواز

اب آپ نے دیکھ لیا، ہم روز کمیشن بٹھاتے ہیں، کمیٹیاں بٹھاتے ہیں، تحقیقات کرتے ہیں، اسبابِ زوالِ امت کے لیے ریسرچز (تحقیقات) ہوتی ہیں کہ اس امت کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ سب کچھ ہم کرتے ہیں۔ قرآن زوالِ امت کی وجہ جواز تو ایک فقرے میں کہہ دیا گیا۔ کیا حضورِ نبی اکرم ﷺ کی اس شہادت کے بعد کسی اور کمیٹی بٹھانے کی ضرورت ہے؟ یہ کمیشن اور کمیٹیاں بٹھا کر گویا (معاذ اللہ) ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا کے حضور پوری امت کے سامنے جو کی جا رہی ہے یہ کچھ کافی شہادت نہیں تھی۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا آؤ ہم کچھ ریسرچ کریں، بات کچھ اور بھی ہوگی یعنی یہ کافی نہیں ہے جو وہاں اعلان کیا گیا ہے۔ عزیزانِ من! اس کے بعد کسی کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** (25:30) اور رسول کہے گا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو، اپنے خود ساختہ معتقدات کی رسیوں سے، اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا۔ یہ ہے وہ سبب اور یہ ایک ہی سبب، ایک ہی جرم ہے اور رسالت اور رسول اللہ ﷺ کی عدالت خداوندی میں اس شہادت کے بعد کسی اور تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں رہتی، کیا اس سے جرم ثابت نہیں ہو جاتا؟ کیا اس گواہی کے بعد کسی اور تحقیق کی ضرورت ہے؟ عدالت خداوندی میں یہ گواہی پیش ہو رہی ہے اور عدالت خداوندی نے مزید کوئی Question (سوال واعتراض) بھی نہیں کیا کہ ہاں بھئی! یہ بھی ایک بات ہوئی، ہم کچھ اور بھی پوچھ لیں لیکن قرآن میں اور کچھ نہیں ہے بلکہ یہی شہادت کافی ہے۔ تو جرم یہ ہے، ہماری ذلت کا سبب یہ ہے۔

لفظ مهجورا کا قرآنی مفہوم

اب یہاں ایک اور بات بھی ہے، عزیزانِ من! جو میں کہا کرتا ہوں۔ مہجوراً کا ترجمہ، میں بھی ابھی تک یہی کرتا گیا کہ قرآن کو چھوڑ دیا۔ آؤ عربوں سے پوچھیں کہ وہ مہجور کے معنی کیا لیتے ہیں، پھر سمجھ میں آئے گا کہ اس صاحب اعظم ﷺ نے خدا کی بارگاہ میں کہا کیا تھا۔ ہم پرانے لوگوں کو تو یہ معلوم ہے مگر نئی جنریشن (نسل) نے تو یہ گائے بھینس کے وہ گلے وغیرہ دیکھے تک نہیں۔ یہ اس قسم کی بھینسیں بیل یا اس قسم کی گائے وغیرہ دیکھیں گے جو عام طور پہ رسہ تڑا کے بھاگ جایا کرتی ہیں۔ ان کو بھی لے جانا ہوتا ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ کرتے یہ ہیں کہ ایک چھوٹا سا رسہ (Rope) لیتے ہیں، اس کا ایک سرا اس کے پاؤں کے ساتھ باندھتے ہیں اور دوسرا سرا اس کے سینگ کے ساتھ

باندھتے ہیں۔ وہ رسہ چھوٹا سا ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جس رفتار سے آزادانہ وہ جانور چلنا چاہتا ہے وہ اسے اتنی رفتار سے نہیں چلنے دیتا۔ اس رسی کی جو لمبائی ہوتی ہے اُس سے وہ اتنی رفتار سے ہی چل سکتی ہے۔ اپنی اس رسی کے ساتھ اس کی آزادی کو مقید کردیا جاتا ہے کہ وہ چلے تو ہمارے پیمانے کی جو رسی ہے اس کے مطابق چلے' اپنی آزادی کی رفتار سے نہ چلے۔ عرب اس قسم کے جانور کو مھجور کہا کرتے تھے۔

ہم نے قرآنِ حکیم کو کئی ایک رسیوں سے باندھ رکھا ہے

سوچیے رسول اللہ ﷺ نے کیا کہا ہے؟ کہا ہے کہ وہاں میری اس قوم نے تیری اس کتاب کو جس کے لیے تو نے آزاد چھوڑا تھا کہ یہ اپنی رفتار سے دنیا میں چلے' اس نے اس قرآن کے ساتھ قسم قسم کی رسیاں باندھ لیں' قرآن تو باقی رہا لیکن اس کو انہوں نے اپنے پیمانے کے مطابق' اپنے منشا کے مطابق چلایا' اس قوم نے اسے اپنی رفتار سے آزادانہ نہیں چلنے دیا۔ یہ ہے جرم' عزیزانِ من! میں کہا کرتا ہوں کہ اس قوم کو دیکھیے' اس کی اس زبان کو دیکھیے' قرآن کے انتخاب کو دیکھیے' کیا لفظ آتا ہے اور پھر سوچیے کہ ساری کہانی ایک لفظ میں کہہ جاتا ہے یا نہیں! کیا اس قوم نے قرآن کے ساتھ یہ نہیں کیا؟ میں نے جیسا کہا ہے کہ قرآن تو ہر گھر میں موجود ہے' ہر زبان میں اس کے تذکرے ہیں' اس کو کتنا دہرایا جاتا ہے! دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس کو اتنا دہرایا جاتا ہو' ایک ایک رات میں اس کو ختم کیا جاتا ہے لیکن اس کی رفتار کے ساتھ کیا گیا ہے؟ اتنی رسیاں اس پہ باندھی گئی ہیں کہ جس منشا کے مطابق ہم چاہیں بس اتنا ہی یہ چلے' اس سے آگے نہ چلے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ پرچہ ابھی پریس میں ہے' چھپ نہیں سکا' میں چاہتا تھا کہ طلوعِ اسلام کا اگلا پرچہ اس درس سے پہلے آجائے۔ یہ عجیب اتفاق ہے اس میں میرا ایک بڑا اہم مقالہ آرہا ہے: ''قرآنِ کریم کے خلاف گہری سازش'' وہ خطرناک سازش قرآنِ کریم کی اسی آیت ہی کی تفسیر ہے کہ وہ کون کون سی رسیاں ہیں جو ہم نے اس قرآن کے پاؤں میں باندھ رکھی ہیں کہ جسے ہم چاہتے ہیں یا اتنا ہی چلے جتنا ہم چلانا چاہتے ہیں' اپنی آزادی سے نہ چلے۔ قرآن بھی باقی رہا' یہ بھی نہیں ہوا کہ صاحب! ہم بالکل کافر ہوگئے' اس کو چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ اس میں یہ کیا۔ میں نے بتایا ہے کہ کس کس قسم کی رسیاں باندھی ہیں' تفصیل آپ کو اس میں ملے گی۔ چند فقروں میں میں عرض کروں: یہ رسیاں ہمارے عقائد کی ہیں' یہ رسیاں ہمارے مسالک کی ہیں' یہ رسیاں وہ ہیں جو ہمارے مذہب کی ہیں جسے ہم اسلام کہتے ہیں۔ اب یہ دین نہیں رہا' یہ تو مذہب ہو چکا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ساتھ سب سے بڑی اور پہلی گہری سازش: اس کے متن میں شکوک وشبہات

یہ عقائد' قرآنِ کریم میں کیا ہیں؟ سورۃ بقرۃ کی پہلی آیت کے بعد یہ ہے کہ **ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ** ❶ (2:2) یہ الکتب ہے۔اس میں کوئی چیز شک وشبہ کی نہیں ہے۔**ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ** ❷ (2:2) یہ اس صورت میں ہدایت دے سکتی ہے جب اس کے منجانب اللہ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ اس کی کسی ایک چیز کے اندر بھی ذرا شک پیدا ہوا تو پھر یہ ہدایت نہیں دے سکتی۔ شک اور یقین دو متضاد چیزیں ہیں۔عزیزانِ من! کہیں ذرا سا بھی شک آ جائے' پورے کے پورے یقین کے پہاڑ کو گرا کے رکھ دیتا ہے۔یعنی یہ دو چیزیں اکٹھی ہو ہی نہیں سکتیں' یہ نہیں کہ تھوڑا سا شک آ جائے تو چلیے 1% شک ہے' 99% یقین ہے۔اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' یقین باقی ہو ہی نہیں سکتا' رہ ہی نہیں سکتا اگر اس میں ذرا سا شک ہو۔پہلی چیز جو اس قرآن کے خلاف ثابت کی گئی' وہ یہ ہے کہ خود اس کے متن میں شکوک پیدا کیے گئے کہ رسول اللہ ﷺ تو قرآن کو اس طرح دے کے ہی نہیں گئے تھے۔ یہ کتاب کی شکل میں تھا ہی نہیں۔ یہ کتاب دینے والا' جہاں سے اسے الکتاب کہہ کر اس کی ابتدا کرتا ہے' اس میں جو پہلا ہی ورق ہے' اس کا پہلا لفظ یہ ہے کہ **ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ** (2:2)۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں نہیں' یہ کتاب تھی ہی نہیں۔ آپ حیران ہوں گے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ پکی روٹی والوں کی باتیں نہیں ہیں۔ آپ کے ہاں جن احادیث کی کتابوں کو صحیح تریں' مستند تریں کہا جاتا ہے' یہ ان کی روایات ہیں کہ یہ اس شکل میں تھا ہی نہیں' رسول اللہ ﷺ اس طرح مرتب کر کے دے ہی نہیں گئے تھے یا اللہ! یونہی کوئی پتوں پہ' کوئی ہڈیوں کے اوپر' کوئی کھجوروں کے پتوں کے اوپر' کوئی ادھر ادھر تھوڑا بہت لکھا ہوا تھا۔اور یہ جو کچھ بھی تھا' ایسا ہی لکھا ہوا' وہ رسول اللہ ﷺ ایک تھیلے میں ڈال رکھتے تھے' اس کے اندر ڈالتے چلے جاتے تھے اور وہ تھیلا تھا جو دے گئے تھے۔ یا اللہ! چلیے' بھئی! تھیلا ہی سہی۔ بعد میں ہی سہی' اس تھیلے کو یعنی قرآنِ کریم کی اگر یہ ترتیب نہ رہے جو اس ترتیب میں دیا ہوا ہے' تو کیا ہو؟ اس کی ایک الگ کہانی ہے۔

---

❶ تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو (1:5) وہ ہمارے اس ضابطہ قوانین کے اندر محفوظ ہے (15:9) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے' اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن (Psychological Complex) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔2)۔

❷ یہ ضابطہ قوانین' سفر زندگی میں' اُن لوگوں کو انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔2)۔

قرآنِ حکیم کومختلف ادوار میں ترتیب دیئے جانے کی کہانی

عزیزانِ من! کتاب کوترتیب کے ساتھ ایک بنیادی دخل ہوتا ہے۔ کتاب کے معنی ہی اس کی ترتیب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تو وہ جوایک جھولے (تھیلے) کے اندر' یہ سارا کچھ کرکے' مخلوط شکل میں رکھا جائے تو اس میں کسی ترتیب کا سوال ہی نہیں ہے جو وہاں دے گئے تھے۔ پھر کیا ہوا؟ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بھی یہ نہیں ہے کہ یہ جو پہلی چیز ہے جو ضابطہ ہے' اس مملکت کا آئین ہے بھئی! اس کو تو ہم نے مرتب شکل میں نہیں پایا۔ وہ تو بعد میں ایک جنگ ہوئی تھی' اس جنگ کے اندر قرآن کے بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45AD) کو خیال پیدا ہوا کہ اگر یہ لوگ اس طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن تو ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634AD) سے کہا کہ بھئی! قرآن کو کچھ مرتب کرا لینا چاہیے۔ انہوں نے کہا یا اللہ! توبہ توبہ' جس کام کو رسول اللہ ﷺ نہیں کر گئے' میں کیسے کروں!! یعنی ڈر گئے کہ یہ تو بدعت ہو گئی۔ جو حدیث کی صحیح ترین کتابیں ہیں' آج ان کی جو صحیح ترین حدیثیں ہیں ان کو مانا جاتا ہے۔ بہرحال بڑے مباحثے کے بعد وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے سخت گیر تھے' تو وہ Prevail (چھا) کر گئے اور انہوں نے کہا کہ ہاں کرنا چاہیے۔ وہ پھر یہ نہیں کہ حافظ اتنے ہیں' خود یہ بھی خلفا جو ہیں یہ خود حافظ قرآن ہیں' ان کو بتایا جاتا ہے اور اگر قرآن کا حافظ ہے تو قرآن تو کسی ترتیب کے ساتھ اس نے حفظ کر رکھا تھا۔ ان حافظوں نے یا انہوں نے بھی یونہی ٹکڑے ٹکڑے یاد کر رکھے تھے!! حافظ قرآن شروع سے آخر تک جس کو آپ کہتے ہیں کسی ترتیب کے ساتھ انہوں نے حفظ کیا ہوا تھا۔ وہ حفاظ کی جماعت کو بٹھاتے' وہ ترتیب کے ساتھ بولتے جاتے' یہ لکھتے جاتے۔ بات ختم ہوئی۔ کہا کہ نہیں' یہ نہیں کیا۔ ان کو نہیں بلایا ایک کمیٹی بٹھائی اور وہ بھی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ان کا چیئرمین بنایا' ان میں سے کسی خلیفہ کو نہیں بنایا' اُن کو بنایا اور انہوں نے ڈھنڈورا پیٹا کہ آؤ' جس جس کے پاس اس قرآن کا کوئی ٹکڑا ہے' لاؤ۔ جناب! وہ لاتے گئے اور وہ دیکھتے گئے۔ اپنی طرف سے کہتے ہیں کہ بڑی پکی شہادتیں بھی وہ لیتے تھے' سب کچھ بھی کرتے تھے۔ یعنی اس طرح سے جو ٹکڑے تھے' ہڈیوں کے' کھجور کے پتوں کے' یہ سارا کچھ' وہ لاتے گئے اور یہ جمع کرتے گئے۔ یوں کتاب بنی' جمع کرتے گئے تو اس میں یہ دیکھا۔ یہ ان کے نزدیک صحیح ترین حدیثیں ہیں جنہیں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ صاحب! اس کے اندر دو آیتیں نہیں مل رہیں۔ ایک تو وہ آیت ہے کہ جس میں یہ تھا کہ بچے کو ماں کتنے مہینے تک دودھ پلائے۔ یہ چھوڑ دیجیے۔ یہ اہم نہیں۔ دوسری زنا کی آیۂ رجم ہے۔

زنا کی سزا رجم کے متعلق آیت بکری کھا گئی

یہ کہتے ہیں کہ دوسری زنا کی آیت رجم تھی۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو بہت بڑا قانون ہے۔ وہ آیت ''اُس قرآن'' میں تھی ہی نہیں۔

حضرت عمر ؓ (581-644/45AD) نے کہا کہ ہم تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس آیت کو پڑھا کرتے تھے مگر یہ ''اس قرآن'' میں ہے ہی نہیں۔ ڈھونڈ یا پڑی (تلاش شروع ہوئی) پتہ لگایا کہ کیا ہوا؟ ڈھونڈتے ڈھونڈتے انہوں نے کہا کہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے پاس جانا چاہیے کہ وہ تو رسول اللہ ﷺ کے گھر میں تھیں انہیں پتہ ہوگا۔ ان کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں بیٹا! ٹھیک ہے قرآن میں یہ آیت تھی' یہ کھجور کے پتے پہ لکھی ہوئی تھی وہ پتہ اندر کمرے میں حضور ﷺ کے پلنگ کے پائنتی کی طرف رکھا ہوا تھا۔ جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی' تو ہم سب تو جو گھر والے تھے وفات کے زمانے میں پریشان ہو گئے' گھر کے اندر نفسا نفسی کی سی کیفیت ہوئی۔ باہر میری بکری بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اس پریشانی کے عالم میں رسی تڑائی' اندر بھاگ کے گئی' اور وہ پتہ کھا گئی۔ ختم ہو گیا یعنی وہ جو دو آیتیں ہیں ان کا وجود ہی دنیا سے ناپید ہو گیا۔ حضرت عمر ؓ سے لوگوں نے کہا کہ آپ ؓ شہادت دیتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پڑھا کرتے تھے' حضرت عائشہ ؓ کی شہادت ملی کہ یہ آیت تھی' بکری کھا گئی ہے تو کیا ہوا؟ آپ اسے قرآن میں کیوں نہیں رکھ دیتے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' جی! اگر میں نے قرآن میں رکھ دیا تو لوگ کہیں گے کہ عمر ؓ نے قرآن میں اضافہ کر دیا۔ توبہ' توبہ' توبہ!! میں ایسا کام کر سکتا ہوں!!! انہوں نے کہا کہ یہ تو حکم ہے کہ زنا کی سزا سنگسار ہے۔ موجودہ قرآن میں یہ نہیں ہے۔ یہ تو حکم کی بات ہے تو اس کو رکھو۔ آپ ؓ نے کہا کہ نہیں' اس کا وایا میڈیا درمیانی راستہ نکالتے ہیں: قرآن میں تو یہ نہ رکھی جائے لیکن حکم اس کے مطابق چلے۔ تو اب یہ جو کہتے ہیں کہ زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے' یہ اس قرآن میں نہیں ہے جو ہمارے آپ کے پاس' جوامت کے پاس متواتر چلا آتا ہے' یہ وہ آیت ہے جو بکری کھا گئی تھی اور قرآن ہے کہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ **ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ** (2:2) یہ وہ الکتب ہے جس میں کوئی چیز شک وشبہ نہیں ہے۔ یہ اتنی سی جو ایک روایت ہے کیا یہ کم شک وشبہ کی روایت ہے؟ یہ تو کسی ایک یا دو آیتوں کے متعلق بات ہوئی۔ پتہ نہیں کہ اور کتنی ایسی ہیں۔ پہلی چیز ترتیب قرآن کے سلسلے میں خلش کی ایک رسی یہ رکھ دی تو یہ رسی یوں باندھی۔ اب موجودہ قرآن کی رسی وہی ہے جو ان آیتوں کے بغیر ہے۔

قرآنِ حکیم کے حروف پر نقطے بھی نہ تھے

ہمارے دور کے مفسر مودودی صاحب [1] فرماتے ہیں کہ جو قرآن دیا گیا ہے وہ اس طرح سے ہے کہ اس کے حروف پر نقطے نہیں تھے۔ بات سمجھ میں یوں نہیں آئے گی۔ آپ ذہن میں ذرا تصور کیجیے: ب ت ث عربی زبان کے حروف (Letters) ہیں۔ ان پہ آپ نقطے نہ دیجیے' اسی طرح سے لائنیں ڈال دیجیے' اور انہیں پھر پڑھیے کہ یہ کیا ہے؟ اسی طرح ج ح خ' د ذ ر ز' س ش' ص ض' ط

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)

ظ' ع غ' بغیر نقطوں کے رکھ لیجیے اور پڑھیے۔ یہ کہتے ہیں کہ نقطے ہی نہیں تھے۔ دیکھا' پھر ایک نقطہ کہیں ادھر سے اُدھر ڈال دیجیے معنی میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے' عزیزانِ من! ب کی شکل یوں اور ت یوں لکھا ہوا ہو تو کوئی اسے باب پڑھے گا' کوئی اسے بات پڑھے گا۔ سیدھی سی بات ہے عربی زبان کی گرائمر میں ایک بڑی چیز ہے جس کو اعراب کہتے ہیں۔ یہ آخر میں جا کے وہ زبر زیر پیش ہوتی ہے' یہ معنی کی بنیاد ہے جو آخری چیز ہے۔ یہ اس قسم کی چیز کسی اور زبان میں نہیں ہوتی۔ یہ عربی کی خصوصیت ہے' یہ ایک زبر اور زیر کے فرق سے فاعل سے مفعول' مفعول سے فاعل' یہ کچھ بن جاتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ان کے اوپر اعراب بھی نہیں تھے۔ چل بھئی! تھیلے میں ڈالے ہوئے یہ ٹکڑے' اس طرح انہیں جمع کیا' ان کے اوپر نہ نقطے' نہ ان کے اوپر اعراب' بعد میں جا کے کہیں حجاج بن یوسف کے زمانے میں' بنی امیہ کے زمانے (661-750AD) میں' جا کر وہ کہتے ہیں کہ اس کے اوپر نقطے بھی لگے' اعراب بھی لگے۔ یعنی وہ لگانے بیٹھ گئے اور یہ کچھ کیا۔ یعنی جیسے علما کے ذہن میں آئی جتنی جتنی رسیاں جی چاہیں انہوں نے قرآن کو باندھ دیں۔ یہ جو قرآن' آپ کے نقطے والا ہے' اعراب والا ہے' یہ حجاج بن یوسف کے دور میں ہوا۔ اس کے درمیان ایک عقیدہ اور ہو گیا کہ یہ قرآن ایک ہی قرآن نہیں تھا' یہ اللہ تعالیٰ نے سات زبانوں (سبعۃُ احرفٍ) میں نازل کیا تھا۔

قرآنِ حکیم سات زبانوں میں نازل ہوا تھا' چھ کو جلا دیا گیا

یہ جو مودودی صاحب لکھتے ہیں یہ ان کا نہیں ہوتا۔ میں اس لیے نام لیتا ہوں کہ آپ لوگوں کو معلوم کرنے میں ذرا آسانی ہو جائے کہ یہ آج بھی آپ کے ہاں کے یہ عقائد چلے آ رہے ہیں اور یہ مفسر ہیں جو اپنی تفسیروں میں یہ لکھتے ہیں کہ یہ جو قرآن تھے' یہ ایک ہی قرآن نہیں تھا' اللہ تعالیٰ نے سات زبانوں میں نازل کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی سات زبانوں میں دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے (645-656AD) تک' سات زبانوں میں ہی تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھ زبانوں والے قرآن کو اپنی صوابدید کے مطابق جلا دیا اور ایک باقی رکھا۔ یہ جو آپ کے پاس قرآن ہے ان سات میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سات زبانوں والا نازل کیا تھا۔ لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بغیر اس کے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہو یا رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا ہو' یہ ان کے الفاظ ہیں خود ان چھ کو جلا دیا' ایک باقی رکھا۔ یہ ہے وہ ایک جو آپ کے ہاں ہے۔ اس مذکورہ مقالے میں' عزیزانِ من! دھیان سے پڑھیے۔ میں نے ان کا ایک ایک سطر کا حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک باقی رہ گیا۔ گھروں تین سیر کرن والے نکلے: دواندھے اک نوں دسدا ای نئیں۔ جنوں دسدا نئیں اونوں دتے پیسے دو کھوٹے: ایک چلدا ای نئیں' جیہڑے چلدے نئیں' اوناں نے خریدے دو کوکڑو: اک گلدا ای نئیں۔ جیہڑا گلدا نئیں اونوں

لگے تین جنے کھان: دو بھکے' اک رجدا ای نئیں۔ [1] معاذ اللہ معاذ اللہ۔خدا نے سات قرآن اتارے چھ تو جلا دیئے' جو باقی رہا اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس میں غلطیاں رہ گئی ہیں۔انہوں نے کہا: ٹھیک کر دیجیے۔کہنے لگے: یہ عرب آپ ٹھیک کر لیں گے۔پھر اس میں لکھا یہ ہے کہ گیارہ غلطیاں تو حجاج بن یوسف نے ٹھیک کی تھیں۔خدا کہہ رہا ہے: **ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ** (2:2)۔یہ کہہ رہے ہیں: یہ ہے وہ کتاب۔ اچھا جی' جیسا تیسا یہ ہے پیسہ۔چلیے ہے تو سہی۔کہا: نہیں آپ کو پتہ نہیں ہے وہ تو دو آیتیں ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں' حکم انہی کا ہے۔

قرآن کی پانچ سو آیات منسوخ ہو گئیں

عقیدہ یہ ہے کہ اس موجودہ قرآن کے اندر ایسی آیات ہیں جن کو پڑھا تو جاتا ہے لیکن ان کا حکم منسوخ ہو گیا ہوا ہے۔چل بھئی' معاملہ ہی ختم ہوا۔قرآن میں تو یہ کہیں بھی لکھا ہوا نہیں ہے۔سیدھی سی بات ہے' آپ روز قانون کے متعلق دیکھتے ہیں کہ ایک قانون بنتا ہے' حکومت اس قانون میں کچھ ترمیم کرتی ہے' تو اس کے لیے اپنے ہاں کسی قانون کو منسوخ کرتی ہے کہ فلاں حکم اس حکم کی رو سے منسوخ کیا جاتا ہے' اس کی جگہ یہ حکم نافذ ہوگا۔اس قسم کی کوئی چیز قرآن میں نہیں ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے اور فلاں آیت نے اس کو منسوخ کیا ہے۔یہ کہیں سارے قرآن میں نہیں ہے۔ارے' تم کہہ رہو کہ کتنے حکم منسوخ ہو گئے ہوئے ہیں' اپنے ذہن میں' عزیزانِ من! زیادہ سے زیادہ کا نقشہ لگا لیجیے اور پھر پوچھیے کہ کتنے حکم؟ جواب ہوگا پانچ سو حکم منسوخ ہو گئے ہوئے ہیں۔یہ ان علمائے کرام نے کیا ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ رسیاں ہیں جن میں قرآن باندھا جا رہا ہے' دیکھتے ہیں' یہ قرآن جو مجبور ہوا جا رہا ہے۔اس بھینس کو بھی تو ہم کچھ اجازت دیتے ہیں' ہم اسے اتنی بھی اجازت نہیں دیتے: پانچ سو آیتیں منسوخ ہیں' سات زبانوں والے قرآن میں سے ایک باقی رہا' جو باقی رہا اس میں غلطیاں تھیں' جو غلطیوں والا ہمارے پاس ہے اس میں سے کچھ آیتیں ہیں جو اس کے اندر نہیں آئی ہیں' باہر تھیں' جو ہیں ان میں سے پانچ سو منسوخ ہیں۔

کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے' عزیزانِ من! جب میں یہ باتیں بیان کرتا ہوں: قرآن سے یہ آیتیں منسوخ ہیں' انہوں نے بعد میں خود بتانا شروع کیا کہ یہ آیت ہم نے اس آیت کی رو سے منسوخ کرائی ہے۔وہ آگے چلتے چلتے آیتیں ختم ہو گئیں جن کی رو سے منسوخ کرائی

---

[1] گھر سے تین سیر کرنے نکلے: دو تھے اندھے اور تیسرے کو نظر ہی نہیں آتا تھا۔جسے نظر نہیں آتا تھا اسے دیئے دو سکے' وہ بھی تھے کھوٹے: ایک چلتا ہی نہیں تھا۔جو سکے چلتے نہیں تھے انہوں نے ان کے خریدے دو مرغ: ایک گلتا ہی نہیں تھا۔جو مرغ گلتا نہیں تھا' اسے تین جوان کھانے لگے: ان میں دو تھے بھوکے اور ایک تھا وہ جس کا پیٹ ہی بھرتا نہیں تھا۔

تھیں اور بعض پھر بھی منسوخ شدہ باقی رہ گئیں۔ اب کیا کیا جائے؟ اے گھوڑا مک گیا۔ آپ کو پتہ ہے گھوڑا مک گیا والی گل جیہڑی میں کہی سی۔ ❶ نہیں معلوم' تو سنو۔ اس نے کہا: سردار جی! ایک گھوڑا ہمیں بھی دے دیجیے۔ اس نے کہا: اوگھوڑا تو تم لے لو گے' گھوڑا جو ہے بڑا سرکش شریر ہے' سوار کو پہچانتا ہے اناڑی کو بیٹھنے نہیں دے گا۔ کہنے لگے: سردار جی! ہم کوئی اناڑی نہیں ہیں' باپ دادا سے سواری کرتے چلے آ رہے ہیں بے شک وہ کم رفتار ہی ہووے۔ اب یہ ہمارے بچے اگلے پنجابی کیا سمجھیں گے کہ گھوڑا کیا ہوتا ہے' تے سیر کی ہوندی اے۔ ❷ ٹھیک ہے اس نے دے دیا' گھوڑے پہ بیٹھ گیا' گھوڑا اچلا' اس نے ایک پیچھے سے قدم مارا۔ اس کے لیے تو وہ زین سے سرین پہ مارا دوسرا اس نے جو تھا وہ گردن سے کنوتیوں کے اوپر' تیسرا مارا کنوتیوں سے نیچے۔ اس نے کہا کہ دیکھا میں نے کہا تھا کہ نہیں چڑھنا۔ کہنے لگے: جی میں کیا کروں گھوڑا ای مک گیا اے۔ ❸ یعنی آگے گھوڑا ہی ختم ہو گیا ہے' اس میں میرا کیا قصور ہے' معاذ اللہ۔ پانچ سو آیتیں منسوخ کیں۔ جو آیتیں باقی رہ گئیں' جن کو منسوخ کرنا تھا' یعنی جو ناسخ آیتیں تھیں' وہ ختم ہو گئیں۔

قرآنِ حکیم کی آیات کو حدیث منسوخ کر سکتی ہے اور دو سو سال بعد جمع کی جانے والی احادیث کی ماہیت

اب کیا کیا جائے؟ کہنے لگے: جی' کوئی بات نہیں۔ عقیدہ یہ وضع کیا کہ قرآن کی آیت کو حدیث بھی منسوخ کر سکتی ہے بس مسئلہ حل ہو گیا اور احادیث کے مجموعے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہیں۔

میں آپ کو یہ بتا دوں کہ حدیث کسے کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے کوئی دو اڑھائی سو سال بعد' انفرادی طور پہ' کچھ لوگوں نے جنہیں امام بخاریؒ اور مسلمؒ کہتے ہیں' جو باتیں اس زمانے میں لوگوں میں تھیں کہ حضور ﷺ نے ایسا کہا تھا' بغیر کسی پہلے Written record (تحریری ریکارڈ) کے زبانی' اسی لیے ان کو روایت کہتے ہیں' انہوں نے لوگوں سے پوچھ پوچھ کے جمع کیں۔ وہ ❹ کہتے ہیں مجھے کوئی چھ لاکھ کے قریب اس قسم کی باتیں ملیں' ان میں سے پانچ لاکھ ستانوے ہزار کے متعلق تو میں نے خود محسوس کیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتیں اور باقی جو ہیں جن کے متعلق انہوں نے اپنے صوابدید کے مطابق سمجھا کہ یہ ہو سکتی ہیں' وہ اپنے ہاں جمع کیں یعنی جو ان کی

---

❶ گھوڑا ختم ہو گیا والی بات جو میں نے بتائی تھی۔

❷ اب یہ ہماری اگلی نسل کے بچے پنجابی کیا سمجھیں گے کہ گھوڑا کیا ہوتا ہے اور سیر کیا ہوتی ہے؟

❸ یہ گھوڑا ہی ختم ہوا۔

❹ یہ اشارہ امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (260-194ھ) کی طرف ہے جن کا وطن بخارا تھا۔ انہوں نے کل چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے 2762 (مکررات حذف کرنے کے بعد) اپنے مجموعے میں درج کیں۔ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' (2005)' ص ص 187 تا 242' ابواب 7 اور 8۔

صوابدید کے مطابق ہوسکتی ہیں وہ ہیں جو سب سے صحیح ترین حدیث کی کتاب ہے اس میں جو جمع ہیں۔ یہ ان جامع حدیث کا اپنا قول ہے۔ ان کی صوابدید کے مطابق ہے جو انہوں نے سمجھا کہ یہ ان میں سے ہوسکتی ہیں' اسی لیے حدیث کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث نہیں کہتے۔ قول منسوب الی الرسول کہتے ہیں یعنی وہ بات جس کو منسوب کیا جاتا ہے رسول اللہ ﷺ کی طرف' اسی لیے حدیث سے پہلے لکھا ہوتا ہے قال رسول اللہ (حضور ﷺ نے کہا) اور آخر میں لکھا ہوا ہوتا ہے: اوکما قال رسول اللہ یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو۔ حدیث کے متعلق یہ چیز ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ یہ جو حدیثیں ہیں' یہ بھی قرآن کی آیتوں کو منسوخ کرسکتی ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ پھر ایک اور رسی باندھی گئی۔

فقہ کی تاریخ اور اس کی حیثیت

اس کے بعد ہمارے ہاں کے فقہ والے حضرات آئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ قرآن اور احادیث کی روشنی میں جو اسلام کے احکام ہیں وہ ہمارے ائمہ کرام نے مرتب کردیئے ہیں۔ یہ جو ان کے مرتب کردہ احکام ہیں ان کو فقہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی سارے مسلمانوں کے ایک ہی نہیں ہیں' یہ مختلف فرقوں کی اپنی اپنی الگ الگ فقہیں [1] ہیں۔ یہ جو فقہ ہے' اس کے بعد یہ کہتے ہیں' کہ نہ ہمیں حدیث کی طرف جانے کی ضرورت ہے اور نہ قرآن کی طرف۔ قرآن اور حدیث میں سے جو کچھ احکام آنے والے تھے وہ اس فقہ کے اندر موجود ہیں۔ اب اس فقہ کے اندر کئی ایسے احکام ہیں جو قرآن کے خلاف جاتے ہیں۔ امام ابوالحسن کرخی فقہ حنفی کے بہت بڑے امام ہیں۔ ان کا یہ فیصلہ ہے کہ جب آپ دیکھتے ہیں کہ فقہ میں اور ان میں ٹکراؤ ہوتا ہے' یہ ہمارے خلاف جاتی ہے' فیصلہ یہ ہے کہ ہمارے کسی امام کا کوئی فیصلہ یا قول اگر حدیث یا قرآن سے ٹکرائے' تو پہلے تو کوشش کرو کہ قرآن کی ایسی یا حدیث کی ایسی تاویل کی جائے کہ وہ اس فقہ کے مطابق ہوجائے۔ اس کی تاویل کی جائے' کچھ جسے کھینچا تانی کہتے ہیں' کی جائے تا کہ وہ اس کے مطابق ہوجائے اور اگر ایسا نہ ہوسکے تو یہ سمجھیے کہ قرآن کی آیت منسوخ ہے' عمل امام کے قول یا فیصلہ کے مطابق ہوگا۔ آپ اس مقالہ میں دیکھیں گے ایک ایک چیز کا حوالہ موجود ہے۔ دیکھتے ہیں کہ ایک رسی اور پڑی۔

---

[1] ان نکات کی مزید تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ حج' 2005' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' ص ص 303' اور فٹ نوٹ 1۔

اپنی اپنی احادیث اور اپنی اپنی فقہ کی روشنی میں لکھی گئی قرآنی تفاسیر کی حالت

اس کے بعد ہمارے ہاں تفاسیر آئیں۔ تفاسیر میں تو پوچھو ہی نہیں' بس قرآن کی آیت اوپر لکھی ہوئی ہوتی ہے جیسے خط کے اوپر 786 کو بسم اللہ کے حروف سمجھ کر لکھتے ہیں اور نیچے جو جی میں آئے بکتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن کی آیت اوپر ہوتی ہے اور اس کے نیچے وہ قصے اور کہانیاں اور اسرائیلیات اور یہودیوں کے اور مجوسیوں کے اور اس کے اور اس کے اور ہر ایک کی سند میں کوئی نہ کوئی روایت' کوئی نہ کوئی کسی بزرگ کا قول اور اس کا یہ سارا کچھ' یہ سب کچھ تفسیری ہے۔ عقیدہ یہ کہ جو کچھ ان کتب تفاسیر میں آ گیا ہے اس سے الگ اگر کوئی شخص آج سمجھتا ہے تو وہ تفسیر بالرائے ہے' یہ اس کی اپنی رائے ہے۔ اس کو قطعاً نہ مانو۔ یہ ملحد ہے' بے دین ہے' بدعتی ہے' منکر ہے تو قرآن وہ ہو گیا کہ جو ان تفاسیر کے اندر آ گیا۔

فرمائیے' عزیزانِ من! کہ ایک بالشت کے برابر بھی وہ رسی باقی رہتی ہے جو اس طرح اس بھینس کے گلے میں باندھی گئی ہو تو وہ پھر بھی اتنی باندھتا ہے۔ میں اور تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اور تفصیل میں' میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جو مقالہ میرا ہے' اس کو آپ دیکھیے گا وہ پہلی تاریخ[1] کو آ جائے گا۔ یہ آپ دیکھیے گا کہ اس کے بعد آپ کے ہاں جو قرآن جس کی اتنی عظمت ہے وہ باقی کیا رہ جاتا ہے اور اس کے بعد پھر آپ کی سمجھ میں یہ اعلان آ جائے گا' اعلان نہیں بلکہ جو فریاد ہے وہ آئے گی کہ **وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** (25:30) یہ قرآنِ مہجور بھی تو وہاں موجود ہے' اتنی رسیاں بندھی ہوئی ہوں گی' اور اس کے بعد کتنا بڑا فریب یہ دیا جائے گا کہ صاحب! جتنا اس قرآن کا تذکرہ ہوتا ہے کسی کتاب کا نہیں ہوتا' چومتے ہیں سر آنکھوں پہ رکھتے ہیں' سر پہ رکھتے ہیں اونچا رکھتے ہیں' ایک ایک رات میں اس کا شبینہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس قرآن کا ہوتا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ جو شکایت پیش کر رہے ہیں' خدا کے حضور میں وہ ہے **قُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** (25:30)۔ وہ یہ ہے قرآن مہجور۔

قرآنِ حکیم کی بعثت کا مقصد اور ضرورت

آپ نے دیکھا کہ عدالت خداوندی میں جرم کیا عائد کیا جا رہا ہے؟ رسول اللہ ﷺ جیسا شاہد اعظم ہے جس کو قرآن نے خود شاہد کہا ہے' وہ خدا کے حضور شہادت دے رہے ہیں اور اس شہادت کو Accept (قبول) کیا۔ کیوں نہ Accept کیا جائے' شہادت دینے والا تو صادق امین ہے **وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** (25:30) اور یہ کہنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہ ماجرا کسی ایک نبی کے ساتھ مخصوص نہیں رہا: **كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ** (25:31)۔ اے

---

[1] فروری 1978ء کا ماہانہ طلوع اسلام

رسول! یہ ماجرا تمہارے ساتھ ہی نہیں گزرا۔ آپ سے پہلے بھی جتنے رسول اور نبی آئے' ان کی امتوں نے ان کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ اور یہ چیز ہے جو قرآن بتاتا ہے کہ اب قرآن اور حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد کیا تھا' اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ قرآن کہتا ہے کہ پہلے جتنے نبی یا رسول آئے تھے جو دین لائے تھے وہ ہماری طرف سے آئے تھے' انہوں نے جو کتاب پیش کی تھی' وہ ہماری دی ہوئی کتاب تھی' ہمارا ہی تجویز فرمودہ دین تھا' اپنی طرف سے کوئی رسول نہیں لایا تھا لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ اب اس آسمان کے نیچے ان میں سے کوئی کتاب اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں ہے' اس لیے ضرورت ہے کہ وہی دین جو چلا آ رہا تھا اپنی صاف منزہ شکل کے اندر مکمل کر کے' منزہ کر کے' ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خدا لے لے اور اس کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم کر دے۔ یہ تھا خدا کا پروگرام یعنی پہلے نبیوں کی کتابوں کے ساتھ ان کی امتوں نے جو کچھ کیا' اس کو مٹا کر' اس کی جگہ ایک کتابِ عظیم دی' جس میں صداقتیں' خدا کے فرمان' وحی خداوندی' مکمل شکل میں' محفوظ شکل میں' رکھ دی گئیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں' اے رسول! یہ کچھ پہلی امتوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ قرآن کے متن کی حفاظت کا ذمہ تو خدا نے لے لیا ہے۔ اس امت نے کہا کہ ہاں صاحب! لیتے پھریئے آپ متن کو (معاذ اللہ) ٹھیک ہے۔ سانبھی رکھوائے قرآن دا متن جیہڑا ہیگا اے۔ [1] متن کے متعلق بھی میں نے عرض کر دیا ہے کہ اس کے متعلق بھی اتنے شبہات پیدا کیے جا رہے ہیں کہ یہ متن بھی پتہ نہیں وہ ہے یا نہیں ہے' لیکن بہرحال جو کچھ بھی ہے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے' قرآن تو صرف ان الفاظ کا ہی نام نہیں ہے قرآن تو ان الفاظ کے مفہوم کا نام بھی ہے۔

مہجورِ قرآن کا یہ عمل آج بھی جاری و ساری ہے

آپ نے دیکھا ہے کہ کتنی رسیاں باندھی گئی ہیں! کہا کہ یہ چیز تمہارے ہی ساتھ نہیں ہوئی' ہر نبی کے ساتھ ہوئی **عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ** (25:31) یہ لوگ مجرم تھے خدا اور رسول کے' دین کے' دین کی کتاب کے۔ یہ کرتے کیا تھے؟ یہ مجرم وہی کچھ کرتے تھے جو پہلی قوموں کے ساتھ خدا نے کہا ہے۔ کیا کرتے تھے؟ (22:52)۔ قرآن کا بڑا اہم حوالہ ہے۔ یہاں بھی یہ ہے کہ **وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ** (25:31) ہر نبی کے ساتھ یہ ماجرا ہوا ہے۔ وہاں (22:52) میں ہے کہ **وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ** (22:52) تم سے بھی پہلے کوئی نبی' رسول ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو۔ کیا ماجرا ہے؟ **اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ** (22:52) اس کے بعد شیطان نے' یہی شیاطین نے اس کی وحی کے اندر خود کچھ ملا دیا۔ انہوں نے یہ کیا تو پھر کیا ہوتا رہا؟

---

[1] قرآنِ کریم کے اس متن کو سنبھالے رکھو۔

کہا کہ **فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ** (22:52) تو خدا یہ کرتا رہا کہ جب کسی نبی کی امت نے اس کی کتاب کے ساتھ یہ کیا، ہم نے اور رسول بھیج دیا۔ اس رسول نے آ کے جو کچھ انہوں نے اس کے اندر کیا تھا اس کو الگ کر دیا ہمارے حکم سے اور پھر وحی کو منزہ شکل میں دے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر یہ کیا، ہم نے پھر ایک رسول بھیج دیا اور اب یہ رسول بھیجا کہ جس کے بعد کوئی دوسرا رسول نہیں آنا ہے اس لیے اس کتاب کے متعلق خدا نے یہ کہہ دیا کہ اس کی حفاظت کا ہم ذمہ لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے جی، کتاب کا ذمہ لے لیا کہ یہی خدا کی طرف سے آئی تھی۔

قرآنِ حکیم کے علاوہ مثلہ معہ کا عقیدہ

لیکن سن رکھیے! عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن ہی خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوا: مثلہ معہ، اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی نازل ہوا تھا۔ ارے قرآن تو بار بار چیلنج دیتا ہے کہ تم اس کی مثل کہیں سے ایک آیت لے آؤ، کہیں سے دس آیتیں لے آؤ۔ تم کہتے ہو کہ اس کی مثل، اس کے ساتھ اور بھی نازل ہوا تھا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے، یہ کتاب محفوظ ہو گئی، اس میں بھی تو ہم نے ملاوٹ کرنے کی جرأت کی، اس کے ساتھ اور بھی کچھ اس کی مثل، اس قرآن جیسا اور بھی نازل ہوا تھا۔ بھئی، وہ کیا چیز ہے؟ کہنے لگے کہ یہ حدیثیں جو ہیں: وہی جو میں نے ابھی پیش کیں۔ مثلہ معہ تو وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ پہلے یہ مجرم کرتے رہے کہ اس کی وحی میں یہ ملاتے رہے، قرآن کے اندر تو یہ داخل کرنا جو ہے یہ ممکن نہیں تھا، اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا تھا، انہوں نے کہا تھا کہ رکھتے پھریئے یہ کتاب مکمل ہے ہی نہیں، اس کی مثل اس کے ساتھ اور نازل ہوا تھا اور وہ ہے یہ صاحب! تو یہ اگر اس کے ساتھ ملانا نہیں تو اور کیا ہے؟ ملانا ہی نہیں ہے بلکہ جو میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، عقیدہ یہ ہے کہ یہاں اس خارج از قرآن وحی جو ان کا عقیدہ ہے اس میں اور قرآن کے اندر کی وحی میں ٹکراؤ ہو، دونوں ایک دوسرے سے متضاد چلیں، تو حدیث کو سمجھو محکم ہے اور قرآن سمجھو منسوخ ہے۔

پوچھا گیا کہ صاحب! اس کی مصلحت کیا تھی کہ قرآن ایک دیا اور پھر قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ جو اور ہونا چاہیے تھا وہ قرآن سے باہر رکھ دیا، وہ الگ کیوں دیا؟ کہا کہ بھئی! اسی قرآن کے اندر وہ کچھ بھی داخل کر دیا جاتا، امت کے پاس ایک محفوظ کتاب تھی، جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا، وہ تو آ جاتی اس کے اندر کیوں نہیں رکھ دیا گیا؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ اس کی مصلحت اور حکمت آپ اپنے ذہن سے سوچیے اور وہ آپ کا ذہن ہی کیا جو اتنی بڑی چیز کو سوچ سکے۔ ہمارے تو چھوٹے چھوٹے سے ناریل ہیں، ان کے اندر وہ چیز آ کیسے سکتی

ہے۔حکمت اس کی یہ بتائی مولانا مودودیؒ صاحب [1] نے کہ اگر اسے بھی قرآن کے اندر رکھ دیا جاتا تو قرآن انسائیکلوپیڈیا آف بریٹنیکا جتنا ہو جاتا۔چکیا ای ناجاند اتہاڈے کول۔ [2] دیکھا حکمت کی بات، مصلحت کی بات! اتنا بڑا ہو جاتا، شکر کرو بچ گئے ہو۔ **وَ كَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ** (25:31)۔یہ قرآن ہے، عزیزانِ من! دشمن دین کے، خدا کے، رسول کے مجرم، وہ یہ کیا کرتے تھے اور خدا نے رسول سے کہا کہ کوئی بات نہیں، اے رسول! تمہیں اس سے کبیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔**وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيۡرًا** (25:31) یہ یاد رکھو! ہدایت صرف خدا کی ہدایت ہے، نصرت صرف اس کی ہے، **وکفی**، یہ کافی ہے، کسی اور چیز کی اس کے ساتھ **هَادِيًا** ہدایت کے لیے ضرورت نہیں، اور اس کے بعد آگے پھر کفار کا اعتراض ہے کہ اس رسول پر سارے کا سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہ ہوا تا کہ ہمیں معلوم ہو جاتا کہ ہم سے کیا کیا باتیں منوائی جائیں گی۔اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

عزیزانِ من! ہم الفرقان کی آیت 31 تک آ گئے 32ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ

❀......❀......❀

---

1. مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)
2. (اتنا بھاری ہو جاتا کہ) آپ سے اٹھایا ہی نہ جاتا۔

آٹھواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 32 تا 34)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1978ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 32 سے ہو رہا ہے:

(25:32)

نبی اکرم ﷺ پر مختلف اعتراضات کا ذکر اور آپ کی عملی زندگی

سابقہ آیات میں ان لوگوں کے اعتراضات کا ذکر کیا جا رہا تھا جو نبی اکرم ﷺ کے انقلاب آفریں پیغام کی مخالفت کرتے تھے۔ عجیب عجیب قسم کے وہ اعتراضات تھے۔ کبھی یہ اعتراض تھا کہ یہ رسول کس قسم کا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، ہماری طرح کھاتا پیتا ہے؛ قرآن نے یہ کہا کہ یہ جو تمہارے ذہن میں توہم پرستیاں ہیں کہ رسول کوئی مافوق الفطرت، کوئی فوق البشر قسم کی چیز ہونا چاہیے، اسے نکال دیجیے۔ یہ تو رسول ہے، یہ تو قاصد ہے، یہ تو پیغامبر ہے، خدا کا پیغام تم تک پہنچاتا ہے۔ دیکھو یہ کہ وہ پیغام کیا ہے اور پھر سب سے بڑی چیز یہ کہ اس نے اس پیغام پر عمل کر کے دکھانا ہے۔ وہ عمل تمہارے لیے نمونہ بنتا ہے تو یہ اسی صورت میں بن سکتا ہے کہ یہ تمہارے ذہن میں ہو کہ جب ایک ہمارے جیسا انسان یہ کچھ کر کے دکھا سکتا ہے تو وہ ناممکن العمل پروگرام نہیں ہے۔ انسان اسے ممکن بنا سکتا ہے، اسے متشکل کر سکتا ہے۔ اگر رسول یا اس کے ساتھی جو وہ جماعت ہے، وہ فوق البشر ہوں، فوق الفطرت قوتوں کی رو سے، وہ اس قسم کا نظام قائم کر کے بتا دیں تو دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ کیسے بن سکتا ہے؟

خلافت راشدہ کے دور کے متعلق ہمارا عملی تصور اور خدا کا فرمان

قرآن نے تو بار بار یہ کہا ہے کہ نبی کی زندگی تمہارے لیے بطور نمونہ ہے۔ اب ایک طرف آج ہمیں جب اس دور کے سارے واقعات اور داستانیں سنائی جاتی ہیں کہ انہوں نے چند سالوں کے عرصے میں وہ کچھ کر کے دکھا دیا' تو اکثر آپ نے سنا ہوگا کہ یہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ان کا کیا پوچھتے ہیں جی' وہ تو خدا کے رسول تھے' ان کا کیا پوچھتے ہیں جی' وہ تو صحابہ کبارؓ تھے۔ کیا ہم ان جیسے ہو سکتے ہیں؟ ''جی اسی تے بندے بشر ہوئے جی''[1]۔ یعنی یہ انہی کے لیے تھا وہ یہ کچھ کر کرا گئے اور باقی ہمارے لیے تو یہ ہے کہ اس کا ختم پڑھا کریں مردوں کو بخشوایا کریں۔ تو وہ تو ہم نہیں ہو سکتے صاحب! دیکھیے صاحب! اب تو نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد تو جب کبھی کسی دور میں خلافت راشدہ کے انداز کا ایک نظام قائم کیا جائے گا' تو پھر اس کی مخالفت میں کہا جاتا ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ''ایاز قدر خود را'' نشناسد' آپ اور خلافت راشدہ کی قسم کا نظام کر لیں گے' معاذ اللہ توبہ توبہ جیسے کہا جاتا ہے۔ تحت الشعور کے اندر وہ چیز اب بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ اور وہ اس لیے ہی ہے کہ قرآن قدم قدم پہ کہہ رہا ہے' وہ رسول اللہ ﷺ سے معجزوں کا مطالبہ کر رہے ہیں' حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن یا خدا یہ کہلوا رہا ہے کہ ان سے کہو کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں بابا' میں جو کہتا ہوں اس پہ غور کرو' میں جو کرتا ہوں اسے دیکھو۔ معجزوں کے ذریعے سے اگر یہ کچھ ہوا تو بس وہ تو میری ذات تک رہے گا' اس سے آگے تو بات نہیں چلے گی اور یہ تو قیامت تک کے لیے چلنے والا ایک نظام ہے' ایک پیغام ہے۔ وہ اس پہ زور دیتا چلا آ رہا ہے۔ سارا قرآن یہی چیز کہتا چلا آ رہا ہے کہ یہ انسانوں کے لیے ہے' رسول ایک انسان تھا' رسول کے ساتھی انسان تھے' انہوں نے یہ کر کے دکھا دیا لہٰذا قیامت تک کے انسان اس کو کر کے دکھا سکتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو ان کا یہ تھا اور قرآن میں یہ بات کہی۔ ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اچھا' اگر اس کی طرف فرشتے آتے ہیں' اس کو خدا کی طرف سے وحی آتی ہے' یہ باتیں کرتا ہے' ہمارے سامنے خدا کیوں نہیں آتا' ہم پہ فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے؟ اس قسم کے اعتراضات تھے جو وہ کرتے چلے آ رہے تھے اور پچھلی آیات میں ان کا ذکر آ رہا تھا۔

قرآنِ حکیم کے نزول کے متعلق کفار کے اعتراضات اور خدا کی طرف سے ان کا جواب

اسی قسم کا اعتراض ایک اور بھی ہے جو اب سامنے آ رہا ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (25:32) یہ قرآن کی بات جو تم ہمیں روز کہتے ہو کہ اب یہ حکم آیا ہے' اب یہ تقاضا ہے' اب یہ یہ چاہتا ہے' تو ہمیں ایک ہی دفعہ سارے کا سارا بتا دو اور پھر یہ کہ پورے کا پورا قرآن ایک ہی بار تمہارے پاس کیوں نہیں آ جاتا۔ ایک ہی بار تم کیوں نہیں بتا دیتے کہ ہم

---

[1] جی' ہم تو بندہ بشر ہیں۔

نے کیا کرنا ہے‘ کیا نہیں کرنا تا کہ ہم ایک دفعہ فیصلے کریں:

یہ سسک سسک کے مرنا غم ہجر میں بلا ہے

ایک دفعہ سارا کچھ بتاؤ ہمیں۔ قرآن نے اس کا جواب نبی اکرم ﷺ کو دیا۔ کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے‘ یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن ایک ہی دفعہ سارا نازل نہیں ہو رہا‘ تیئیس سال کے عرصہ میں یہ قرآن نازل ہوا‘ اس کی تکمیل ہوئی۔ **کَذٰلِکَ** جواب ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ اسی طرح سے ہے جیسا یہ کہتے ہیں‘ یہ بتدریج نازل ہو رہا ہے۔ یہ بتدریج نازل کیا جا رہا ہے‘ ہمارے پروگرام کے مطابق ایسا ہو رہا ہے‘ یہ بائی چانس کچھ ایسی بات نہیں‘ اتفاقی بات نہیں ہے کہ یہ یونہی اس طرح بتدریج نازل ہو رہا ہے‘ **کَذٰلِکَ** ایسا ہم کر رہے ہیں‘ یہ ہماری مشیت کے مطابق ہے‘ ہمارے پروگرام کے مطابق ہے۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ اور اس کا پروگرام موتیوں کی ایک مالا کی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں

قرآن حکیم کہتا ہے کہ **لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا** (25:33)۔ یہ پروگرام جو قرآن دے رہا ہے‘ اسے بتدریج قائم ہونا ہے۔ یہ فساد نہیں جو یونہی برپا کیا جا سکتا ہو‘ یہ انقلاب ہے جس سے قلب و نظر کی تبدیلیاں ہونی ہیں۔ ایک ایک اسٹیج پر‘ ایک ایک قدم پر‘ پروگرام کا ایک حصہ آئے گا‘ اُسے سمجھایا جائے گا‘ اس کے لیے انہیں آمادہ کیا جائے گا‘ پھر اس کے اوپر عمل کیا جائے گا۔ اس میں ایک ایک کڑی پہ عمل کیا جائے گا۔ اب آگے وہ چیز ہے جسے **وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا** (25:33) کہا گیا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ یہ یونہی نہیں ہے کہ اسے یونہی بکھیر دیا گیا ہے‘ اس میں سے کبھی یہ آیت آ گئی‘ کبھی وہ آیت آ گئی۔ یہ صورت نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ قرآن کا یہ اس قسم کا پروگرام ہے جس کی ایک کڑی میں سے دوسری کڑی خود بخود آگے نکلتی چلی جاتی ہے۔ یہ جو ہے یہ ترتیل یا رتل ہے‘ یہ ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی جس طرح سے باہمی مربوط ہوتے ہیں اس کے لیے عرب یہ لفظ بولتے تھے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ موتی ہوتے تو الگ الگ ہیں لیکن جب وہ لڑی میں پروئے جاتے ہیں تو وہ تو ایک مربوط ہار بن جاتا ہے‘ ایک لڑی بن جاتی ہے۔ کہا کہ یہ اس طرح سے ہے کہ ایک کڑی میں سے دوسری کڑی نکلتی چلی جائے۔ پورا پروگرام ہمارے سامنے ہے لیکن وہ پروگرام اس طرح سے تکمیل تک پہنچنا ہے کہ جب اس کے ایک حصے پہ عمل ہو جائے گا اسی میں سے پھر وہ بات آگے چلے گی اور اگلی کڑی سامنے آ جائے گی۔ پہلی چیز یہ ہے‘ پھر اس کے اوپر انہیں سمجھایا جائے گا‘ اس کے بعد اس پر عمل کیا جائے گا‘ اتنی کڑی کے اوپر یہ ہوگا۔ پھر اس کے بعد اس میں سے اگلی بات نکلے گی۔ تو یہ چیزیں اتفاقی یا بائی چانس نہیں ہونگی۔ ایک کڑی میں جو کچھ کیا جائے گا‘ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس میں سے پروگرام کی اگلی کڑی سامنے آئے گی۔ یہ بڑا سائنٹفک طریقہ ہے۔

صحیح پروگرام کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بتدریج دیا جائے اور اس تدریج کی کیفیت یہ ہو جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ یہ کسی سائنسدان

سے پوچھیے جو کسی لیبارٹری میں کام کر رہا ہو۔اس کے سامنے ایک بہت بڑا فارمولا ہوتا ہے اور اس نے اس پر عمل کر کے آہستہ آہستہ آخر تک پہنچنا ہوتا ہے۔ پہلے درجے پر وہ ایک چھوٹی سی چیز ہے کہ وہ دو چیزوں کو ملاتا ہے۔اس میں سے پھر ایک اور چیز پیدا ہوتی ہے' اسے پھر آگے کسی اور چیز کے ساتھ ملاتا ہے' اس میں کچھ اور تبدیلیاں پیدا کرتا ہے' پھر آگے بڑھتا ہے تو اس میں سے آگے کچھ اور پیدا ہوتا ہے۔ یہ جو طریق ہوتا ہے جس میں سے کسی ایک درجے یا کسی ایک Step (قدم) سے اگلا قدم خود بخود نکلتا ہے' یہ جو اس طرح سے ایک تدریج ہوتی ہے' اسے قرآن کی رو سے ترتیل کہتے ہیں۔ زراعت کی مثال قرآن عام طور پہ دیتا ہے۔اس میں ترتیل کی کیفیت عجیب ہوتی ہے۔ اس پودے کو آپ دیکھیے کہ اس پودے کی جو نشوونما ہوتی ہے اس نشوونما میں خود بخود ایک اگلی اسٹیج اس پودے میں آتی چلی جاتی ہے۔ ذرا سی کونپل ہوتی ہے پھر آگے بڑھتی ہے' ذرا ذرا سی پتیاں نکلتی ہیں' کونپل بڑھتی ہے' شاخیں اِدھر اُدھر نکلتی ہیں' پھر ان میں سے شگوفے آتے ہیں' پھر پھول بنتے ہیں پھر پھل بنتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ چیز یکبارگی نہیں ہو جاتی' وہ بتدریج ہوتی ہے اور اس تدریج کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ پچھلی کڑی جب تکمیل تک پہنچتی ہے تو اسی میں سے اگلی کڑی نکل آتی ہے۔ یوں یہ چیزیں ایک نظام کے تحت' ایک پروگرام کے ماتحت' ترتیلاً' شروع سے آخر تک پہنچتی ہیں۔ اسے ترتیل کہا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں ترتیل کے معنی قرآنِ حکیم کو مختلف آوازوں کے ساتھ پڑھنے کا نام ہے

ہمارے ہاں تو بہرحال اس کے معنی لیے جاتے ہیں ''آرہانال پڑھنا قرآن شریف''[1] اور پھر وہ قاریوں کے طائفے آتے ہیں' وہ کانوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے ہوتے ہیں' گا گا کے قرآن پڑھتے ہیں۔ تو وہ اسکو کہتے ہیں: ترتیل سے قرآن کا پڑھنا۔ اب تو سوال قرآن کے پڑھنے کا رہ گیا۔ ٹھیک ہے جی' کوئی اسے تحت اللفظ پڑھتا ہے' کوئی اسے گا کر پڑھتا ہے۔ قرأت ہی کی آپ کے ہاں علم کی ایک الگ شاخ ہو گئی ہے۔ اس کے بھی چھ سات طریقے ہیں۔ وہ مختلف تجوید کے طریقے ہیں' اس کے لیے الگ مکتب کھلے ہوئے ہیں۔ وہاں پہ یہی' اتنا ہی' پڑھایا جاتا ہے کہ قرآن کو ترتیل کے ساتھ' قرأت کے ساتھ' کس طرح پڑھنا چاہیے۔ یہ حجازی لے ہے' یہ مصری لے ہے' بہرحال چھوڑیئے اس قصے کو' ورنہ میں بتاؤں کہ یہ لے ہیں کیا حقیقت میں؟ یہ رہ گئی بات ترتیل کی۔ جسے اس نے کہا یہ تھا کہ اس کے اندر ربطِ باہمی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک کڑی جب تکمیل تک پہنچے گی تو اسی کے اندر سے اس کی اگلی کڑی نکلے گی اور یہ جو مسلسل کڑیوں کا یوں نکلتے چلے جانا ہے اسے ترتیل کہا جاتا ہے۔

---

[1] قرآن شریف کا سر کے ساتھ تلاوت کرنا' گا کر تلاوت کرنا۔

جس پروگرام نے انقلاب نمودار کرنا ہو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بتدریج ایک ایک کڑی سے اگلی کڑی تک لے جاتا ہے۔

آپ یہ دیکھیے کہ ایک تو یہاں آیا ہے **رَتَّلۡنٰهُ تَرۡتِيۡلًا** (25:33)۔ دوسرے مقام پہ بھی آیا ہے بات وہاں واضح ہوتی ہے۔ **یٰٓاَیُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۔ قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۔ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ۔ اَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ۔ اِنَّا سَنُلۡقِىۡ عَلَيۡكَ قَوۡلًا ثَقِيۡلًا ۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِىَ اَشَدُّ وَطۡـاً وَّاَقۡوَمُ قِيۡلًا ۔ اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا** (73:1-7)۔ کیا کیا چیز اب عرض کروں! بات سامنے آ گئی مزمل کی۔ آپ کوئی قرآن شریف اٹھا کے دیکھ لیجیے اس میں یہ ترجمہ دیا گیا ہے کہ اے کملی والے! اٹھ۔ اور پھر وہ کملی والا تو آپ کو معلوم ہے کہ جس طرح سے پھر عام ہوا ہے۔ یہ اب ہمارے ہاں کی نعتوں میں، وعظوں میں، نبی اکرم ﷺ کے متعلق سب سے زیادہ جو چیز پیار محبت سے عظمت واحترام سے کہی جائے وہ ہے 'کملی والا'۔ کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے۔ یعنی آپ کے ہاں یہ بعض چیزیں ایسی مسلمات بن گئی ہیں کہ اس کے متعلق کبھی کھڑے ہو کر سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔اور وہ خدا رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے **یٰٓاَیُّهَا الۡمُزَّمِّلُ** (73:1) اے کملی والے! اٹھ' بھئی' خدا کیا کہہ رہا ہے؟ کہہ رہا ہے کہ اے کملی والے! تو وہ اوپر کملی لیے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے: جی دیکھیں خدا پیار اور محبت سے کہہ رہا ہے کہ اے کملی والے! آ جا۔ اور پھر آپ کے ہاں کے یہ سارے جو صوفی اولیا بنتے ہیں یہ سارے کملی اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر اس سے ایک داستان بنی کہ جب رسول اللہ ﷺ پہ پہلی وحی آئی تو رسول اللہ ﷺ آئے' وہ ایک قصہ گھڑا کہ آپ ﷺ غار حرا میں چلے جایا کرتے تھے۔ ہفتوں مہینوں وہاں جا کر رہا کرتے تھے۔

اب میں کیا کیا عرض کروں کہ کیا کیا چیزیں ہمارے ہاں بنی ہوئی ہیں صاحب! یہ ان کے سادھوؤں' سنیاسیوں' جوگیوں' کی جو چیزیں تھیں وہ در آئیں' عیسائیوں کے جو راہب تھے ان کے ہاں کی چیزیں آئیں' یہودیوں کے ہاں کے یہ جتنے بھی طریقے تھے' وہ آ گئے مثلاً وہ غاروں میں چلے جاتے تھے' باہر جنگلوں میں چلے جاتے تھے' تپسیہ گیان دھیان کرتے تھے' ان کے مکاشفہ کرتے تھے' اور اس طرح سے ایک چیز وہ خود پیدا ہو جاتی تھی' ہمارے ہاں بھی بعد میں جب تصوف آیا ہے تو تصوف میں بھی یہی ریاضتیں اور چلے شروع ہوئے۔ اور یہ غاریں ہیں' یہ سارے وہاں سے آئے ہوئے ہیں۔ اب انہیں اس کی سند چاہیے تھی کہ بھئی! قرآن نے تو یہ چیز کہیں نہیں کہی۔ قرآن میں تو خدا ان کی رہبانیت کے متعلق کہتا ہے کہ ہم نے ان پر یہ رہبانیت فرض نہیں کی تھی۔ انہوں نے خود ہی اس کو اختراع کر لیا۔ یہ انسانی اختراع ہے۔ قرآن یہ چیز کہتا ہے لیکن یہ تو جو یہاں اب آپ کے ہاں تصوف تھا وہ تو شریعت والوں سے بھی بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ اب یہ سند کہاں سے لائیں؟

وہ سند یہ ہے جناب! کہ دیکھیے نبی اکرم ﷺ نبوت ملنے سے پہلے غار حرا کے اندر بیٹھتے تھے۔ وہاں جا کے وہ تپسیہ کرتے تھے' گیان دھیان کرتے تھے' تفکر ہوتا تھا' غاروں میں جا کر Meditation (مراقبہ' استغراق) ہوتی تھی یعنی وہ اپنے ہاں کی جو خانقاہیت ہے' اُسے سند اور دلیل بہم پہنچانے کے لیے' یہ ایک غار کا جو قصہ تھا' اپنے ہاں گھڑا اور اس کے بعد سند یہ ہوئی کہ یہ الگ تھلگ تنہائیوں میں' خلوتوں کے اندر' خواہ وہ غاروں میں ہو' خواہ وہ حجروں میں ہو' اس کے اندر تپسیہ گیان دھیان تزکیہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیے کہ نبوت مل

جاتی ہے۔یعنی حضور ﷺ کا وہ جو خلوتوں میں' بقول ان کے' جا کے گیان دھیان ریاضت چلہ کرنا تھا' اس کے نتیجے میں نبوت ملی۔

وحی کے مقابل کشف والہام کا عقیدہ

اس کے بعد یہ کہ بھئی! ٹھیک ہے' ہم نبوت تو نہیں کہتے' ہمیں اس کے نتیجے میں خدا کی طرف سے کشف ہوتا ہے' الہام ہوتا ہے۔ نام دوسرا رکھ لیا۔وہ پروسیس (طریقہ) وہی بتا دیا کہ اس طرح سے خلوتوں کے اندر ریاضتیں چلّے کیے جائیں تو اس کے بعد' دیکھ لیا کہ رسول اللہ ﷺ ذرا اونچے مقام کے چلے کیا کرتے تھے' اونچے مقام کی بات ان کو مل گئی جسے یہ نبوت کہتے ہیں۔یعنی یہ بھی لوگوں سے ڈرتے ہوئے وہ لفظ نہیں لے کے آتے' ورنہ مقصد تو وہی ہوتا ہے کہ ہم اسی طرح سے یہ سب کچھ کرتے ہیں اور یہ عین وہی طریقہ ہے۔ یہ سنت رسول اللہ ﷺ کی پیروی ہے جو ہم غاروں میں جاکے' حجروں میں بیٹھ کے' ریاضتیں کرتے ہیں' چلّے کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ان کو وہ نبوت کی وحی ملی' ہمیں یہ الہام ملتا ہے' یہ تصوف کا الہام ہے' یہ ولایت کا مقام ہے۔

عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں' جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے اس کے پیچھے ایک عجیب سازش آتی ہے۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔انہوں نے اپنے ہاں نبوت کو یہ جو ولایت یا کشف یا الہام یا تصوف ہے' اسی کی ایک کڑی بتایا ہے۔فرق جو آگے جاکے کیا ہے وہ Quantitative ہے یعنی وہ کمیت کے لحاظ سے ہے کہ یہ چھوٹے پیمانے کا کشف ہے' چھوٹی سی سطح کا ہے' وہ (نبوت) ذرا بڑی سطح کا ہے' یہ دونوں Qualitatively (صفاتی لحاظ سے) ایک ہی چیز ہے' یہ خدا کی طرف سے علم ملنا ہے۔بات ساری یہ ہے کہ نبی کو' رسول کو' وہ علم ملا تو اس نے اس کو وحی کہا' ہمیں وہ علم ملتا ہے' ہم اسے الہام یا کشف کہتے ہیں اور یہ بھی ذرا احتراماً ہے کہ ہم وہ بات ہی نہ کہہ دیں ورنہ بات تو وہی ہے۔

بھئی! یہ کیسے ملا؟ کہنے لگے: جیسے رسول ﷺ کو ملا۔انہیں کیسے ملا تھا؟ غاروں میں جایا کرتے تھے' وہاں جاکے' آپ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ عبادت کیا کرتے تھے یعنی اسلام تو ابھی آیا نہیں تھا' تو یہ عبادت کیا تھی؟ کہ جی وہ غاروں میں جاتے تھے یعنی وہ غارِ حرا ایسا مسلمہ آپ کے ہاں آ گیا ہوا ہے کہ کوئی شخص اس کے اوپر Question (سوال واعتراض) کرنے کو تیار نہیں' کوئی سوچنے کو تیار نہیں' اور تو چھوڑ دیجیے' عزیزانِ من! عربوں کی تاریخ میں یہ بات نہیں ملتی کہ اس قوم میں اس کا تصور بھی تھا۔وہ تو صحرا نشین قوم تھی' باہر پھرنے والی قوم تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق نبوت سے پہلے قرآن نے یہ کہا ہے کہ **وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی** (93:7) تم تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھرا کرتے تھے' ہم نے تمہیں صحیح راستہ دکھا دیا۔ یہ تلاشِ حقیقت کیا چیز تھی؟ غور تھا' فکر تھا' تفکر تھا۔آپ ﷺ ہر چیز کے اوپر کھڑے ہو کر غور کیا کرتے تھے کہ کائنات کیسے وجود میں آ گئی ہے' شمس وقمر کس طرح' لیل ونہار کا اختلاف کیسے ہو رہا ہے؟ یہ سارا سلسلہ' یہ نظامِ کائنات کس طرح چل رہا ہے؟ یہ چیزیں تھیں' یہ غور وفکر تھا۔ یہ تو عربوں کے مزاج کے خلاف تھا کہ وہ غاروں کے

اندر چلے جائیں۔صحرانشین قومیں غاروں کے اندر نہیں جایا کرتیں۔عربوں کی تاریخ میں کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ ان میں سے کسی نے بھی یوں کیا ہو۔ان کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے لے کر اُس وقت تک' کسی نے بھی اس طرح غاروں میں جاکے تپسیہ کی ہو' لیکن ان کو تو خدا دے۔یہ لوگ تنکے رکھ کر پل سے ہاتھی گزارتے ہیں کہ جی وہ آپ غاروں میں جایا کرتے تھے' اب وہ سب مانتے ہیں کہ جایا کرتے تھے' تو ٹھیک ہے ہمارا غاروں میں جانا سنت رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے۔غاروں میں جاکے کچھ ملا کرتا تھا؟ کہ جی ہاں' ملا کرتا تھا۔ٹھیک ہے جی' ہمیں وحی نہیں ملی' خاتم النبیین ﷺ جو حضور ﷺ ہوئے ہیں' ہمیں کشف والہام ملتا ہے' پروسیس (عمل) وہی ہے' پھر اس کے بعد ہم بھی کملی اوڑھ کے آتے ہیں۔

غارِحرا میں وحی کے نزول کی روایت

آپ کو پتہ ہے کہ داستان کا وہ اتنا ٹکڑا ہی نہیں ہے کہ وہاں آپ ﷺ غارِحرا میں اسی طرح سے یہ کیا کرتے تھے۔آگے یہ ہے کہ ایک دن جبریل آگئے۔اس نے آن کے یہ کہا کہ پڑھ۔گویا کاغذ کے اوپر لکھا ہوا کچھ تھا' جو سامنے رکھا کہ پڑھ۔اندازہ لگایئے۔کہا کہ جی' میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔اس لانے والے کو یا بھیجنے والے کو اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔لکھا ہوا بھیج دیا' بڑی مشکل ہوگئی۔اب یہ اس کاغذ کو لے کے واپس کیسے جائیں۔انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں' یہیں کچھ کام کر لیتے ہیں۔انہوں نے سینے سے لگایا' زور سے بھینچا تو آپ ﷺ کو پڑھنا آ گیا۔انہوں نے پڑھ لیا۔چلیے' پڑھا دیا' پڑھ لیا۔اس کے بعد آپ کے ہاں یہ پہلی وحی کی داستان' بخاری جیسی کتاب کے بھی شروع میں ہی تفصیل سے ملے گی۔وہاں سے آپ ﷺ کانپتے ہانپتے بھاگے ہوئے گھر آئے۔ملاحظہ فرمایئے وہ عظیم القدر ہستی کہ جس کے لیے پہلے نبی سے لے کر آخری نبی تک رشد و ہدایت کا ایک سلسلہ چلا آ رہا تھا اور آخر میں آ کر قیامت تک کے لیے نبی بنانا جس سینۂ مطہر کا مقصود تھا' ان کی کیفیت یہ ہے کہ پہلی وحی آتی ہے تو بھاگے ہوئے چلے آ رہے ہیں' ڈر رہے ہیں' کانپ رہے ہیں' آ کے بیوی سے کہہ رہے ہیں کہ جلدی سے میرے اوپر کچھ وہ کمبل اوڑھاؤ۔

اب یہاں آئی وہ بات: اوڑھاؤ' مجھے سردی لگ رہی ہے۔جاڑا لگ رہا ہے' میں ڈر رہا ہوں۔بننے والا نبی ہے۔اس کی یہ کیفیت اس وحی کی رو سے ہے کہ ڈر رہا ہے' بیوی کہہ رہی ہے کہ آپ ﷺ کے لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے' آپ ﷺ تو بڑے خداترس ہیں' آپ ﷺ تو اللہ والے ہیں' غریبوں کا بھلا کیا کرتے ہیں' تو آپ ﷺ کے ساتھ خدا ایسا نہیں کرے گا۔یعنی نبی کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ میرا تو خدا کے ساتھ ایسا تعلق ہے' میں تو بھلے کرتا ہوں' وہ میرے ساتھ یہ کچھ نہیں کرے گا۔بیوی بتا رہی ہے کہ ڈرو نہیں۔پھر یہ بات کیسے ہوئی کہ یہ ہوا کیا ہے؟ وہ کہنے لگی: چلو' میرا ایک چچا کا بھائی ہے' اُسے ورقہ بن نوفل کہتے ہیں۔وہ مکے میں تورات کا' عبرانی کا' ایک بہت بڑا عالم تھا۔وہ کہنے لگی کہ چلو' ان کے پاس چلیں۔آپ ﷺ کو وہاں لے گئے۔

آپ ﷺ کی ورقہ بن نوفل کی طرف سے نبوت ملنے کے سلسلے میں روایات

عزیزانِ من! آپ سنتے جارہے ہیں۔کلیجہ شق ہورہا ہے یانہیں؟ نظر آرہا ہے کہ کس طرح سازش سے انہوں نے یہ بات بنائی۔ یہ بات خودعیسائیوں کی بنائی ہوئی نظر آرہی ہے۔وہ کس کے پاس لے کے جارہی ہے؟ عیسائی عالم کے پاس، جو وحی لینے کے پیمانے پہ خدا کے معیار کے مطابق اترا ہے، تو وحی شروع ہوئی ہے۔اسے کچھ علم نہیں ہورہا کہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہورہا ہے۔عیسائی عالم کے پاس آپ ﷺ کو بیوی لے جارہی ہے۔ان کے پاس لے گئی، اس نے ساری بات سنی۔ سننے کے بعد اس نے کہا کہ آپ ﷺ کو مبارک ہو، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ وہی ناموسِ اکبر جبریل علیہ السلام ہے جو اس سے بیشتر انبیا کے پاس آیا کرتا تھا۔آپ ﷺ تو خدا کے نبی ہیں، نبوت آپ ﷺ کو مل رہی ہے۔ مجھے تو یہ نظر آرہا ہے، آپ ﷺ کو نبوت مل رہی ہے۔ورقہ کے اس سرٹیفکیٹ دینے پہ آپ ﷺ نے تسلیم کیا (معاذ اللہ، معاذ اللہ) کہ مجھے نبوت مل رہی ہے۔اس ورقہ بن نوفل کو اتنا یقین تھا کہ یہ وہی ناموس، جبریل آپ کی طرف آیا اور آپ ﷺ وہ نبی ہونے والے ہیں۔سب سے پہلے تو اس کو ایمان لانا چاہیے تھا۔ وہ ورقہ آخر تک، مرتے دم تک، ایمان نہیں لایا۔جس کی شہادت پہ رسول اللہ ﷺ نے (معاذ اللہ) اپنے آپ کو نبی ﷺ سمجھ لیا، وہ مرتے دم تک عیسائی رہا۔ کہنے لگا کہ مجھے پتہ ہے کہ یہ قوم تمہارے ساتھ ظلم وستم کرے گی اور تمہیں یہاں سے نکال بھی دے گی تو آپ ﷺ نے کہا کہ یہ آپ کو کیسے معلوم ہے۔اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، پہلے نبیوں کے ساتھ بھی یہ ہوتا رہا، تمہارے ساتھ بھی ہوگا، مجھے معلوم ہے تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ میں اس وقت اگر زندہ رہا تو میں پھر تمہاری اس وقت مدد کروں گا۔ جب یہ قوم تمہارے ساتھ یہ کرے گی۔ آج وہ اسلام نہیں لا رہا، آج وہ ایمان نہیں لا رہا اور کہہ رہا ہے کہ میں اس وقت تمہاری مدد کروں گا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک کتنا گہرا نشتر ہے کہ ایک عیسائی عالم ان کو کہتا ہے کہ تو نبی ہونے والا ہے تو آپ ﷺ مان گئے، میں نبی ہوں (معاذ اللہ، معاذ اللہ)۔اس کے اوپر ان لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ کو فریب ہی دے دیا ہو، جسے جُل دے دینا، بہکا دینا کہتے ہیں اور آپ ﷺ سمجھ بیٹھے کہ میں نبی ہوں (توبہ توبہ استغفر اللہ) لیکن یہ جو کہانی ہے اس سے تو یہ نتیجہ نکلنا بالکل Natural (فطری) ہے۔ارے وہ اگر سچ مچ نبی سمجھتا تو پہلی چیز یہ ہے کہ وہ ایمان کیوں نہ لے آتا۔وہ تصدیق کررہا ہے کہ آپ ﷺ خدا کے نبی ہیں۔خود یہ کہہ رہا ہے مگر ایمان نہیں لا رہا۔ان لوگوں نے یہی تو اعتراض کیا ہے۔

مستشرقین کی طرف سے من گھڑت قصے ہمارے ہاں کے لٹریچر کی زینت بن گئے

آپ کے ہاں کے یہ جو مستشرقین ہیں ان کو تو آپ گالیاں دے کر، کتابیں چھپوا کر، اعلان کرا دیتے ہیں مگر یہ بخاری شریف کی پہلی ہی حدیث ہے جس میں تحریر ہے کہ گھر آئے تو وہ جو کملی تھی وہ اوڑھا دی۔ میں نے کہا کہ ایک تو کملی وہاں غارِ حرا میں ہوتی تھی اور یہ پہلی

وحی کے بعد جو ''اوکا مبا چڑھیا جنوں کیندے ہیگے نیں''[1] وہ جو اس طرح حضور ﷺ کو اس داستان کی رو سے کپکپی آئی' اس وقت جو کمبل اوڑھا ہے تو پھر اس کے بعد ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ یہ جو کمبل اوڑھنے کی ادا تھی وہ خدا کو بہت پسند آ گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اللہ میاں بھی (معاذ اللہ' معاذ اللہ) مزا لے لے کے دیکھ رہے ہوں گے' مگر قرآن ہے کہ یوں مخاطب کرتا ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ**[2] (73:1)۔ خدا کی طرف سے نبوت ملی' ایک پروگرام ملا۔ یہ رہبانیت نہیں تھی' جہاں ایک فرد خلوتوں میں جا کر' تنہائیوں میں جا کر' اپنے لیے تزکیہ نفس کرتا ہے۔ مذہب تو یہ سکھاتا ہے' اسلام تو دین تھا' یہ تو ایک نظام تھا' یہ جماعت چاہتا تھا' اس میں پہلا مرحلہ جماعت سازی کا ہوتا ہے' اپنے ساتھ اس قسم کے لوگ ملائیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے یہ اعلان کیا تھا کہ **اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ** (6:163)۔ اب یہ جو اسلام لانے والی جماعت ہے' اسے لے لیجیے۔ سب سے پہلے تو میں اس پر شہادت دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے پیغام عام کرنا شروع کیا' اس پیغام و پروگرام کو پہنچانا شروع کیا' جس پر قرآن نے بتایا کہ **یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ** (2:129)۔ وہ ان کو کتابِ خداوندی کی تعلیم دیتا ہے' ان کو Rationally سمجھاتا تھا' اس کی حکمت سمجھاتا تھا The why of it سمجھاتا تھا' Reason دیتا تھا' دلائل دیتا تھا' براہین پیش کرتا تھا۔ اس طرح اس کی تعلیم عام کرتا چلا جاتا تھا۔ اس طرح اُس کے ساتھ ایک ایک دو دو کر کے جو لوگ اس پیغام کی صداقت پر یقین رکھتے تھے جسے ایمان کہتے ہیں' وہ ساتھ ملتے تھے اور اس طرح سے **وَ یُزَکِّیْهِمْ** (2:129) وہ ان کا تزکیہ نفس کرتا تھا۔

تزکیہ نفس کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! تزکیہ نفس میں نے کہا اور دھیان غاروں کے اندر گیا۔ ہمارے ہاں تو اب پیری مریدی میں ان کے ہاں تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ تزکیہ کے معنی ہیں: Growth and Development یعنی انسان' ذات کے ساتھ نشوونما کرتا چلا جاتا تھا اور یہ ہے مقصود۔ اگر یہ ہو تو پھر اسلام لانے والی بات ہے اور اس کے لیے وہ چیز ضروری ہے جو قرآن نے کہی ہے یعنی تغیرِ نفس' قلب و نگاہ کے اندر ایک تبدیلی۔ مفکرِ قرآن علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938ء) تو یہاں تک بھی کہہ گیا ہے کہ

---

[1] جسے کپکپی لگنا کہتے ہیں۔

[2] اے رسولؐ! فریضہ رسالت کی عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد' تیرے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ تُو ایسے رفقائے سفر تیار کرے جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو (تاکہ یہ کارواں' شاداں و فرحاں' منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھاتا چلا جائے۔ اس قسم کا عملِ تزمیل سالارِ کارواں کا اولیں فریضہ ہوتا ہے۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1374)۔

خرد نے کہہ بھی دیا ' لا الٰہ ' تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(ضربِ کلیم)

یہ دل ونگاہ کومسلمان بنانے والے تھے۔انہوں نے خرد کو درمیان سے الگ نہیں کر دیا تھا' یہ تصوف نہیں تھا **یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ** (2:129) وہ انہیں کتابِ خداوندی کی تعلیم دیتا تھا اور اس کی غرض وغایت بھی بتاتا تھا۔اور اس کے بعد ہے کہ **وَ يُزَكِّيْهِمْ** (2:129) ان کی ذات کی نشوونما کرتا تھا۔ یوں کہیے کہ وہ کتاب کی تعلیم دیتا تھا' وہ عقل و برہان کی رو سے سمجھاتا تھا اور اس طرح سے ان کی ذات کی نشوونما کرتا تھا۔ یہ تھا پروسیس' یہ تھا پروگرام۔اس طرح ایک ایک دو دو کر کے جماعت بناتا تھا۔

قرآن حکیم کی روشنی میں مزمل کی حقیقت

اب آیئے کہ یہ مزمل کیا چیز ہے؟ عزیزانِ من! آپ پھر کہیں گے کہ یہ کچھ نئی بات کر دیتا ہے۔نہیں' یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ عربی لغت آپ کے ہاں موجود ہے۔انھیں نہیں دیکھنا' تو میرے لغت کے اندر آپ دیکھیے' عربوں کی زبان کے حوالے موجود ہیں کہ ان عربوں کے ہاں اس کے معنی کیا تھے؟ کیا بات تھی یہ جسے مزمل کہا ہے! وہ قافلوں میں سفر کرتے تھے اور تو کوئی ان کے ہاں سفر کا طریقہ ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ قافلوں میں سفر کرتے تھے۔اس قافلے میں جو کارواں سالار تھا' وہ شخص بہت بڑی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے۔ کارواں سالاری بہت بڑی چیز تھی۔آج کا وہ ڈرائیور یا گارڈ ہی کچھ کم نہیں ہوتا' وہ تو کارواں سالاری ہوتی تھی۔ اونٹ کا جو کجاوہ ہے اس میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کجاوے کے دائیں بائیں دو سواریاں بیٹھتی ہیں: ایک اِدھر اور ایک اُدھر۔ان سواریوں کے انتخاب میں پہلی ضروری چیز تو یہ ہے کہ ان کا وزن یکساں ہونا چاہیے' قریب قریب برابر ہونا چاہیے' ورنہ اگر ان کے وزن میں فرق ہوگا تو وہ کجاوہ سیدھا نہیں رہے گا' خود اونٹ کو بھی تکلیف ہوگی۔آرام دہ سفر وہی ہے کہ دونوں سواریاں فزیکلی (جسمانی طور پر) بھی یکساں ہوں۔یہ پہلی چیز تھی۔اب جو سفر ہے وہ دو تین گھنٹے کا تو ہوتا نہیں تھا' وہ سفر تو مہینوں کا ہوتا تھا۔اب ایک اونٹ کے اوپر یہ صرف دو شخص بیٹھے ہوئے ہیں' انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے پورا پورا دن' ہفتوں مہینوں۔تو سیدھی بات ہے کہ ان میں خیالات اور مزاج کا بھی امتزاج ہونا چاہیے' موافقت ہونی چاہیے' مطابقت ہونی چاہیے۔اگر یہ صورت نہ ہو تو وہ آپ کو میر تقی میر (1721-1810AD) کا واقعہ یاد ہے۔اس زمانے میں اکے ❶ چلا کرتے تھے۔دلی سے آگرہ کے لیے وہ بیٹھ گئے۔اکے میں دو تین سواریاں ہوتی تھیں۔ایک سواری یہ تھی۔امیر آدمی تو پورا اکا کر لیتے تھے۔یہ غریب آدمی تھے' سواریاں مل کے کرتے تھے۔میر صاحب بھی بیٹھ گئے' دو سواریاں اور بیٹھ گئیں۔

---

❶ یکے' ٹانگے

اب اکے نے چلنا شروع کیا۔ اب وہ جو سواریاں تھیں انہوں نے میر صاحب سے باتیں شروع کیں۔ تھوڑا وقت تو میر صاحب نے برداشت کیا۔ وہ ذرا آگے نظام الدین اولیاء تک ہی ابھی پہنچے ہوں گے' تو اکے والے سے کہا کہ بھئی! ٹھہرالینا میاں۔ یہ اپنے پیسے لے لو تم' مجھے یہاں اتار دو۔ اس نے کہا کہ میر صاحب! کیا ہوا؟ کہا کہ نہیں' کچھ نہیں ہوا' اتار دیجیے۔ کہنے لگے: پھر بھی بتائیے کہ کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ بھائی! میں نے آگرے تک پہنچنے کے لیے اکّا لیا تھا' زبان خراب کرنے کے لیے نہیں لیا تھا۔

میر صاحب کو تو ان کی باتیں سننے سے' زبان کی خرابی کی احتیاط برتنا پڑی۔ یہ جو سفر کا ساتھی ہوتا ہے اور ساتھی بھی وہ' جس نے سارا دن اکٹھے رہنا ہے اور مہینوں بھر تک چلنا ہے' اس کے لیے یہ کتنا ضروری ہے کہ وہ جو اس کے ساتھی ہوں ان میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ موافقت اور مطابقت رکھنے والے ہوں۔ بہترین کارواں سالار وہ سمجھا جاتا تھا جو پہلے ان دو ایسی ہی سواریوں کا صحیح صحیح انتخاب کرے اور پھر جو اربابِ کارواں بنتے ہیں' وہ جو قافلے کی پوری سواریاں ہیں ان کے متعلق بھی صحیح انتخاب کرے کہ کوئی اس قسم کا آدمی درمیان میں نہ آ جائے جو خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے فساد ہی پیدا کرتا رہے' سازشیں کرتا رہے۔ یہ سارا کچھ اس کو کرنا پڑتا تھا۔ یہ جو قافلے کے اندر سواریوں کا انتخاب تھا' اسے عرب اپنے ہاں تزمیل کہا کرتے تھے اور ایسا کرنے والا مزمل کہلاتا تھا۔

وحی کے پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عمل تزمیل کی ضرورت ہوتی ہے

وحی کا پروگرام آیا تو اس کے بعد عمل تزمیل شروع ہوا اور یہ ہے جو خدا نے کہا کہ **یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ** (73:1) او کارواں سالار' او سواریوں کا صحیح انتخاب کرنے والے! اب تمہاری اجتماعی زندگی شروع ہو رہی ہے' اس جماعت کے اندر جو تمہارے ہاں ارکان آ رہے ہیں' ان کا صحیح انتخاب کرنے والے! تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ نفس کے ساتھ اس طرح سے ہم فکر ہم خیال قلب ونگاہ کی صحیح تبدیلی والے! یوں جو قافلے کے اندر تم انتخاب سے اپنے ہاں کارواں بنا رہے ہو' عین اس دنیا کے سفر میں نئے کارواں بنانے والے' کارواں سالار! ہمیں پتہ ہے کہ تمہارے سامنے بہت بڑا پروگرام ہے۔ اب قرآن کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب برپا کر کے' نظامِ خداوندی کی عملی تشکیل کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ یہ بڑا ہمت طلب اور صبر آزما مرحلہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ **اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً** (73:5) ایک کمر توڑ دینے والا پروگرام تمہارے سپرد کیا گیا ہے' بہت بڑا پروگرام ہے اور اس پروگرام کے لیے پہلا درجہ یہ ہے کہ جو قرآن تمہیں دیا جاتا ہے اس کی روشنی میں ایک ایسی جماعت بناؤ کہ جن کے اندر قلب اور نگاہ کی ہم آہنگی ہو۔ یہ اس قسم کی جماعت بنانے والے کو مزمل کہا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ پروگرام اتنا بڑا یعنی **قَوْلاً ثَقِیْلاً** ہے' تمہارے سامنے بہت بڑا وزنی' بہت بڑا بھاری پروگرام ہے۔

یہ پروگرام کیا تھا؟ اب آپ کہیں گے کہ آگے چلا گیا ہے۔ اگلی ہی سورۃ میں ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ** [1] (74:1)۔ کیا بات

---

[1] اے وہ کہ جس کے ذمے عالم انسانیت کو سنوار کر' ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے' اور اس طرح حق کے نظام کو ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1379)۔

ہے! وہاں بھی یہی ترجمہ کیا جاتا ہے: وہی کملی اوڑھنے والا' وہی لحاف اوڑھنے والا۔ ہمارے ہاں اس کا بھی یہی ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ چیز تھی جو کہی گئی۔

انسانیت کو زندگی کے حقیقی مفہوم سے آشنا کرنے والی عظیم ہستی مدثرؐ اور خداوندی پروگرام

عربوں کے ہاں جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں بھی خزاں کا موسم ہے' پورے خزاں کے موسم کے بعد جب ایک پتی بھی کہیں درخت پہ نہ رہے' تو اس میں سے پھر نئی زندگی کا پیغام لانے والے بہار کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ یہ خزاں کے بعد نئے شگوفے پھوٹنے کی نئی بہار لانا' عربوں کے ہاں تدثیر کا عمل کہلاتا تھا۔ یہاں مدثر کہا کہ اے وہ کہ جو کائنات کے خزاں دیدہ باغ کے اوپر بہارِ نو لانے کا پیغام لے کے آئے ہو! **قُمْ** اٹھ۔ وہاں ہے کہ **قُمْ** (74:1)۔ یہ مدثر تھا اور یہاں ہے **قُمْ** (74:1) اٹھ۔ **اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا** (73:5) بہت بڑا پروگرام ہے۔ **اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا**[1] (73:7)۔ یہاں **سَبْحًا طَوِیْلًا** آیا ہے۔ اب سبح سے ہوئی تسبیح۔ تو ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ **سَبْحًا طَوِیْلًا** معنی لمبی لمبی تسبیحاں۔ تو پروگرام بتایا کہ راتوں کو اٹھ کر یہ لمبی لمبی تسبیحاں کیا کرو: **قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا** (73:2)۔ آپ تفسیریں اور ترجمے دیکھ لیجیے گا اور پھر وہ حدیثیں بھی کہ حضور ﷺ ساری ساری رات کھڑے رہا کرتے تھے' عبادت میں پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔ رات کو تو یہ کرتے تھے۔ دن کو کیا کرتے تھے؟ کہا کہ **اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا** (73:7) لمبی لمبی تسبیحیں پھیرا کرتے تھے' قصہ ختم ہوا۔ کہا کہ دن کا یہ پروگرام ہے۔

عزیزانِ من! سبح کے معنی ہوتا ہے ''کسی مقصد کے حصول میں پوری پوری توانائیوں سے کوشش کرنا۔ وہ گھوڑا جو دوڑتے وقت تیرنے والے کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں آگے بڑھاتا ہے اور پوری قوت کی چال چلا کرتا ہے'' عربوں کے ہاں اسے سبح کہتے تھے۔ ''یہ جو تیراک پورا ہاتھ یوں کر کے تیرتا ہے'' اسے سبح کہا کرتے تھے۔ یہاں کہا کہ دن میں تیرا پروگرام اتنا ہے کہ پوری توانائیوں کے ساتھ تجھے مصروفِ عمل رہنا پڑتا ہے' سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ پروگرام کی اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ دن میں تو اس کو Execute (نافذ) کرنے کے لیے' اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لیے' یہ سب کچھ کیا جائے۔ جو بڑا پروگرام ہے اس میں پھر رات کی تنہائیوں میں اگلے دن کے پروگرام کے لیے سوچا جاتا ہے۔ یہ تھا جو رات کو ہوا کرتا تھا۔ کہا کہ تھوڑا حصہ رات کا سو بھی لیا کرو' دن میں بڑے لمبے لمبے کام اور پروگرام تمہارے ذمے ہیں اور وہاں یہ کہا کہ تیری بے تابی تمنا کا تقاضا تو یہ ہے کہ کسی طرح سے شباشب پورا ہو جائے لیکن یہ شباشب پورا ہونے والی بات نہیں:

---

[1] پھر یہ بھی کہ دن میں تجھے مخالفتوں کے ہجوم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں تیرے سامنے اتنے کام ہوتے ہیں کہ تجھے سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے (لہٰذا جن امور کے لیے قدرے سکون کی ضرورت ہو' ان کے لیے دن میں وقت ہی نہیں مل سکتا) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1375)۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

یہ تھی رسول ﷺ کی بے تابی تمنا کہ سارا دن کام' ساری رات اس کے اوپر غور وفکر' نہ کھانے کی سوجھتی ہے نہ پینے کی' نہ صحت کا خیال۔ وہ جو صبر طلبی عشق کو جانتا تھا وہ کہہ رہا ہے کہ تھوڑا بہت سو بھی لیا کرو' بڑا لمبا سفر ہے' بڑا لمبا پروگرام ہے' اس میں دن رات لگے گا' فوری شباشب نہیں ہو جائے گا۔

یہاں ہے' عزیزانِ من! **وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا** (73:4) قرآن پر یہ عمل تدریجی طور پر ہوگا۔ یہ ہے وہ ترتیل' مربوط کڑیاں' ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی آئے گی۔ یہ اس لیے ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہم اس کو نازل بھی اسی طرح آہستہ آہستہ بتدریج کر رہے ہیں کیونکہ اس کے اوپر عمل بھی ترتیلاً کرو یعنی ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی' دوسری کے بعد تیسری کڑی۔ جو پروگرام بھی ایک سوچے سمجھے نقشے کے مطابق عمل میں لایا جائے گا' اس کا طریقہ ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کرو اور پھر کہا کہ یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں' اس میں یہ بات نہیں ہے کہ یونہی ہم نے جب ایک آیت نازل کر دی' اس کے بعد پھر دوسرا قصہ لے آئے' اس کے بعد ایک اور چیز لے آئے۔ وہ یوں نہیں ہے کہ وہ ریسلنگ (کشتی) کی طرح' ایک بڑے بکس کے اندر' بہت سی کنڈلیاں ڈال کے' ان کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں' تو پھر کوئی ایک نکالتے ہیں۔ یہ اس طرح سے قرآن کی آیتیں نہیں آئی ہیں۔ یہ ایک پروگرام کے ماتحت مربوط ہے۔ پورے کا پورا قرآن' عزیزانِ من! الحمد سے والناس تک یہ مربوط کتاب ہے لیکن:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا (اقبالؒ)

یہ تو گہرے غور و تدبر کی بات ہے کہ قرآن کے اندر ایک آیت کا دوسری آیت کے ساتھ نظم ہے' ایک سورۃ کا دوسری سورۃ کے ساتھ ربط ہے۔ تو دین کا یہ پروگرام آپ کے سامنے ہو تو پھر پتہ چلتا ہے' ورنہ اگر یہ چیز نہ ہو تو واقعی یہ بڑا بے ربط سا نظر آتا ہے۔

قندیل آسمانی کا باہمی ربط مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی نظر میں

آپ کو تو شاید یاد نہ ہو' مجھے تو یاد رکھنا پڑتا ہے' دیر کی بات ہے کہ کراچی کے ریڈیو اسٹیشن سے جو درسِ قرآن ہوتا تھا' صبح وہاں بہت بڑے علامہ صاحب مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب تھے۔ انکا درس ہوتا تھا۔ قرآن کی یہی بات آ گئی کہ کسی نے پوچھا ہوگا کہ جی' یہ کیا قصہ ہے آدم کا؟ قصہ آ رہا ہے' اس کے بعد دیکھیے' قریش کا ایک واقعہ آ رہا ہے' درمیان میں لوط علیہ السلام کا بیان آ رہا ہے' پھر نوح علیہ السلام کا سفر آ رہا ہے' پھر آسمان کے ستاروں کا ذکر آ رہا ہے' کہ یہ اس طرح کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں' اصل میں بات یہ ہے کہ یہ تم سمجھتے نہیں ہو کہ یہ قرآن جو ہے اس کے نزول کا طریقہ کیسے تھا' یوں سمجھو جیسے دستر خوان پہ باپ بھی بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور ساتھ بچہ کھانا کھا رہا ہوتا ہے اور باپ وہ کھانا بھی کھا رہا ہوتا ہے اور ان کو بتاتا ہے کہ بیٹا! دیکھو' سچ بولنا چاہیے اور فریب نہیں دینا چاہیے' تو بچے کے ہاتھ سے شوربے کا وہ ایک چھینٹا دستر خوان پہ پڑتا ہے' انگلیاں بھی اس کی دانتوں سے کٹ جاتی ہیں تو باپ کہتا ہے دیکھو' بیٹا! طریقے سے کھاؤ' ذرا احتیاط سے

کھاؤ' تم نے سارا دسترخوان خراب کر دیا اور اس طرح سے اب اس کو ذرا اچھی طرح سے پونچھو' اور پھر وہی کہ دیکھو' بیٹا میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ کہنے لگے قرآن شریف کچھ اس طرح نازل ہوا ہے۔ یہ کہ اللہ میاں نے دسترخوان تے نال بٹھایا اے نبی نوں۔ ❶ (معاذ اللہ' معاذ اللہ)۔ میں اس سے زیادہ کیا کہوں وہ جو کہہ گیا ہے کہ

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب ❷

پیدائشی اندھا ہے اور سورج کی روشنی ہے' کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جو قرآنِ کریم کے نزول کی حکمت بالغہ یہ بیان فرمائیں کہ وہ یوں تھا۔ وہ بچے کو ساتھ بٹھایا ہوا درمیان میں یہ باتیں بھی ہوتی تھیں تو اس کے متعلق بھی تو کچھ کہنا ہوتا تھا۔ وہ یہ کہتے تھے اور پھر اس کے بعد اپنی بات کہ اتنے میں بچہ کچھ اور انگلی کاٹ لیتا تھا' پھر اس کے بعد اس کے متعلق کہتے' دیکھا زبان کاٹ لی تم نے۔ میں نے کہا تھا آہستہ آہستہ نوالہ چبایا کرو اور پھر یہ چیز میں کہہ رہا تھا کہ وہ قومِ عاد کے ساتھ کیا ہوا' وہ میں پھر قصہ باقی' اب سناتا ہوں تمہیں (معاذ اللہ' معاذ اللہ)۔

قرآن حکیم کے تعلیمی ربط کے سلسلہ میں قندیل آسمانی کی اپنی شہادت

اب بات آگئی وَ رَتَّلۡنٰهُ تَرۡتِيۡلًا (25:32) ہم نے اس کو نازل بھی کیا ہے ایک خاص ربط قائم رکھتے ہوئے' کڑی در کڑی اور تمہیں بھی اس کے اوپر جو پروگرام تمہارے سامنے ہے' اس پہ عمل کرنا ہے: وَ رَتَّلۡنٰهُ تَرۡتِيۡلًا (25:32) قرآن کی تمام تعلیم' باہمدگر مربوط ہے اور ایک خاص نظم وضبط کے ساتھ سلسلہ درسلسلہ' آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک مسلسل پروگرام کو اسی ترتیب کے ساتھ سامنے آنا چاہیے تھا۔ اسی لیے تم بھی وَ رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا (73:4) اس قرآن کے اوپر کڑی بہ کڑی' درجہ بہ درجہ' منزل بہ منزل' اس طرح سے عمل کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ تو کہا کہ اس لیے یہ سارا قرآن ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہو گیا۔ ان کو بتائیے کہ یہ ایک انقلابی پروگرام ہے' فساد انگیزی نہیں ہے' تمہارے جذبات کو بھڑکا کے یہاں میں نے خونریزیاں نہیں کرانیں' میں نے تو قلب ونظر کے اندر ایک انقلاب پیدا کرنا ہے' میں نے تو عالمگیر انسانیت کے اندر ایک انقلاب پیدا کرنا ہے' اور وہ سب سے پہلی چیز ہے کہ انقلاب برپا کرنے والوں کے اندر میں نے ایک انقلاب پہلے پیدا کرنا ہے۔ یہ ہے میرے نزدیک عملِ تزمیل جو میں نے بتایا ہے: ایک ایسا کارواں تیار کرنا ہے جس نے نوعِ انسانی کے لیے امامت کا کام دینا ہے' اس لیے یہ کام بتدریج ہوگا' ٹھیک ہے:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک ❸

لیکن وہ بات غلط ہے یہ تو غالب ❸ تھا۔ وہ جو بے تابی تمنا تھی کہ

---

❶ اللہ تعالیٰ نے دسترخوان پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بٹھا لیا ہے۔

❷ اس کا اگلا ہی شعر ہے: دین کافر' فکر وتدبیرِ جہاد دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد (جاوید نامہ: اقبالؒ)

❸ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869AD)

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

انہیں پتہ تھا کہ ہم جئیں گے تیری زلف کے سر ہونے تک۔ یہ تھا اعتراض' یہ تھا اس کا جواب۔

عملِ پیہم کے استحکام کی خاطر قلبی سکون کی اہمیت اور تیز رفتاری کا دُور

اس کیفیت کے درمیان میں یہ ہے کہ **لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ** (25:32) اس طرح سے خود تیرے دل کو بھی تثبیت حاصل ہوتی رہے' تقویت حاصل ہوتی رہے' استحکام حاصل ہوتا رہے۔ یہ بڑی چیز تھی۔ یہ کس طرح سے حاصل ہوتا ہے؟ کہا کہ کسان سے پوچھیے کہ بیج بونے کے بعد' پانی دینے کے بعد' دھوپ کا انتظام کرنے کے بعد' اس کی حفاظت کرنے کے بعد' پھر وہ ہر روز جب آتا ہے تو تر تیلاً ہے' جس طرح سے یہ پودا بڑھ رہا ہوتا ہے یعنی سارا دن ساری عمر اس پودے کے اوپر آپ بیٹھے رہیں کبھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ بڑھتا کیسے ہے اور بڑھ رہا ہوتا ہے غیر محسوس غیر مرئی طور پر لیکن کسان کی آنکھ جب آ کے دیکھتی ہے' کہ اب اس میں یہ چیز ہوئی' پوچھیے کہ اس سے اس کے دل کو کتنی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس کی کوششوں کا نتیجہ سامنے آ رہا ہوتا ہے۔ اگرچہ آ رہا ہوتا ہے ابھی اس شکل میں کہ باقی دنیا کو نہیں معلوم ہو رہا ہوتا' اسے پتہ ہوتا ہے اور اگر کبھی وہ یہ دیکھے کہ صاحب! پندرہ دن یا مہینے کے بعد تو یہ پودے میں ہونا چاہیے تھا اگر وہ یہ چیز نہ ہو تو اسی دن وہ مایوس ہو جاتا ہے یا تو اس کو سنوارنے کی کچھ کوشش کرتا ہے۔ نہیں ہوتا تو مایوس ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ نتیجہ اس کے پروگرام کے مطابق نکلتا چلا جا رہا ہے' تو اس سے حقیقت میں تقویتِ قلب حاصل ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ پروسیس ایسا ہے کہ ہوگا تو تدریجاً لیکن ہر منزل' ہر قدم' ہر درجہ' یہ بتا دے گا کہ تمہارا قدم واقعی منزل کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اس سے تمہارے قلب کو تقویت حاصل ہوگی۔ اس لیے قرآن کو ہم بھی بتدریج نازل کر رہے ہیں' تم بھی اس پروگرام کو بتدریج منزل تک پہنچاؤ۔

ایک دن میں نے وہ بات چھیڑی تھی کہ یہ جو ہمارا نوجوان طبقہ ہے' ان میں ایک تو عمر کا تقاضا ہوتا ہے' ایک یہ ہمارے ہاں Age of speed [1] ہے' یہ دور ہی رفتار کا ہے۔ ہم ان ہوائی جہازوں کو دیکھ دیکھ کے یہ کہہ رہے تھے مگر اب تیز رفتاری کی تو کیفیت یہ ہے کہ کوئی تصور میں بھی نہیں لا سکتا تھا کہ Sound (آواز) سے بھی زیادہ رفتار سے ہوائی جہاز تیار ہوا ہے۔ یہ جو چاند اور مریخ کی طرف جانے والے ہیں ان کی رفتار کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان چیزوں کا اثر انسان کے ذہن پہ بھی ہوتا ہے۔ ہماری جو نوجوان نسل ہے وہ اس دور میں ہی آئی ہوئی ہے۔ ان کا ذہن بھی اتنی تیزی سے کام کر رہا ہے۔ وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ صاحب! یہ جو قرآن کا پروگرام ہے' آپ درس دیتے ہیں' قرآن کی تعلیم کو بھی عام کرتے ہیں' یہ سب کچھ ہے لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا بھئی! یہ دیکھیے بیزاری کتنی تیزی سے پیدا ہو رہی ہے۔ اب آپ یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے تو تغیرِ نفس ضروری ہے' اس کے لیے نفسیاتی تبدیلی ضروری ہے' کتاب و حکمت کی تعلیم ضروری ہے' اس کے بعد ایسے افراد آئیں گے کہ جو وہ نظام قائم کریں گے۔ وہ کہتے ہیں: خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک:

---

[1] رفتار کا زمانہ

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
(غالب)

جب تک تم یہ اس قسم کے آدمی تیار کرتے رہو گے اس وقت تک تو صاحب! وہ خاک ہوجائیں گے' یہ سب کچھ غائب ہوجائے گا۔ وہاں تو کسی طرح سے بس وہی اسپیڈ کی سی بات ہے۔

عزیزانِ من! جو تغیرِ نفس ہے اس کا علمائے نفسیات سے پوچھیے۔ یہ بڑا لمبا وقت لیتا ہے۔ آپ کسی سائیکاٹرسٹ (نفسیاتی امراض کے ماہر) کے پاس ایک چھوٹی سی شکایت لے جاکے دیکھیے۔ وہ مریض کہتا ہے کہ راتوں کو نیند نہیں آتی' دماغ چکر کھاتا رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کتنی جسے وہ Sittings کہتے ہیں' وہ دیتے ہیں۔ ایک ایک Sitting دو دو گھنٹے کی بھی ہوسکتی ہے' برسوں لگ جاتے ہیں ایک مریض کے اوپر اور وہ تو پھر بھی انہوں نے یہ جو طبعی اعصاب ہیں یا Nerves ہیں ان کی اصلاح کرنی ہوتی ہے۔ جس طبیب نے نفسیاتی اصلاح کرنی ہو قلب ونگاہ میں تبدیلی لانی ہو' سوچیے کتنا وقت اس کے اوپر لگتا ہے۔ آپ تیزی کرکے دیکھ لیجیے' جھکڑ تو چل جائیں گے' بادِ نسیم نہیں چلے گی۔ تو قرآن کا پروگرام ہے قلب ونگاہ کی تبدیلی پیدا کرنا۔ اس کے لیے ہے کہ **وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا** [1] (73:4)۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ یہ جو اعتراضات کرتے ہیں' ہم دیکھ رہے ہیں' تم بھی دیکھ رہے ہو' یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم بالکل مطمئن رہو اور ان کی باتوں سے نہ گھبراؤ۔

قرآن کی مخالفت کا جواب خود قرآن حکیم دیتا ہے

اب دیکھیے کہ اعتراض کا جواب کون دے رہا ہے؟ کہا کہ **وَ لَا یَاْتُوْنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰکَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا** (25:33) یہ جو اعتراض بھی کرتے ہیں' ہم اس کا جواب دیتے ہیں اور نہایت عمدہ توازن برقرار رکھتے ہوئے حق وصداقت کے ساتھ حسین ترین طریقے سے جواب دیتے ہیں۔ وہ ایسا واضح اور مدلل ہے کہ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہاں تفسیر کا لفظ آیا ہے' ہم قرآن کی تفسیر کرتے ہیں' ہم اس کا جواب دیتے ہیں۔

خدا کیوں جواب دیتا ہے' وہ خود کیوں تفسیر کررہا ہے' غور طلب بات ہے۔ قرآن میں یہ ہے کہ اے رسول ﷺ! تم دلبرداشتہ نہ ہو۔ جو تمہارے خلاف یہ کہتے ہیں' یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے' یہ ہماری کتاب پہ اعتراض کرتے ہیں۔ جب ہماری کتاب پہ اعتراض ہے تو ہمارا

---

[1] راتوں کو ان مجالس میں' تو انہیں قرآن کو اس طرح سمجھا کہ اس کا حسنِ ترتیب اور نظم وربط' ابھر کر اُن کے سامنے آجائے۔ پھر اسی ترتیب اور نظم وضبط کے ساتھ اسے عمل میں لاتے چلے جاؤ۔ (ہم نے قرآن کو جس حسن ترتیب وتناسب کے ساتھ مربوط کیا ہے (25:22)' اسی حسن نظم وترتیب کے ساتھ تم اس پر عمل کرتے چلے جاؤ۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1374)۔

فریضہ ہے کہ ہم جواب دیں۔ کیا بات ہے صاحب! ہم اس کا جواب دیں گے' اور یہ ہے وہ چیز کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ یہ تفسیر کرنی ہی مصنف کو چاہیے۔ کہتا ہے کہ ہم اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو نازل کیا ہے۔ دوسری جگہ (75:19) میں کہا۔

نبی اکرم ﷺ نے قرآن حکیم کتابی شکل میں نوع انسانی کو دیا تھا

بات پیچھے سے چلی آ رہی ہے کہ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ وَ قُرۡاٰنَهٗ ❶ (75:17)۔ یہ جو کہتے ہیں کہ قرآن کو جمع نہیں کیا گیا' اکٹھا نہیں کیا گیا تھا' صحیح نہیں ہے۔ میں نے پچھلے درس ❷ میں بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کے متعلق یہ بات آپ کے ہاں چلی آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس کو ایک مرتب شکل میں جمع کر کے' ایک جگہ کتاب کی صورت میں نہیں دے کر گئے تھے' یہ کتاب یونہی بکھری ہوئی سی تھی' کچھ ہڈیاں تھیں' کچھ پتے تھے جن پہ یہ لکھی گئی تھی:

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

آپ ﷺ وہ ایسے ہی چھوڑ گئے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ اس کے متعلق میرا ایک مضمون آ رہا ہے۔ یہ اسی پرچے ❸ میں میرا ایک خصوصی مقالہ آیا ہے: ''قرآن کے خلاف گہری سازش''۔ اس میں یہ ساری چیزیں آئی ہوئی ہیں' اسے دیکھ لیجیے گا۔ میں یہاں یہ کہہ رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ تو خود ایک طرف' جس نے اس کو کتاب کہہ کر پکارا ہے' وہ یہ الفاظ ہیں: ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ (2:2) یہ ایک کتاب ہے۔ پہلی چیز پھر عربوں کی آ جائیے کہ یہ عرب منتشر اوراق میں' لوہے کا کڑا ڈال کے' ایک طرح سے ان کی شیرازہ بندی کر کے اکٹھا کرتے تھے۔ اب بھی آپ نے دیکھا ہو گا وہ اس قسم کے کوئی پیڈ سے بنے ہوئے آتے ہیں جس میں وہ لوہے کے چھلے ہوتے ہیں تو وہ منتشر اوراق میں عام پور پر لوہے کا چھلا ڈالتے تھے' ہرن کی پتلی سی کھال تھی وہ اس کے اوپر لکھتے تھے اور اس کے بعد منتشر اوراق میں لوہے کا ایک چھلا ڈالتے تھے۔ جب منتشر اوراق میں لوہے کا چھلا ڈال دیتے تھے تو پھر ان اوراق کو کتاب کہتے تھے۔ یہ تو عربی زبان کے خلاف ہے کہ آپ کتاب کہیں اور کہیں کہ منتشر اوراق تھے اور وہ بھی کوئی ہڈیوں پہ' کوئی پتوں کے اوپر' کوئی کاغذوں کے اوپر تھے۔

کتاب مبین کا جمع کروانا اس کی وضاحت کرنا اور اسے محفوظ رکھنا خود خدا کے ذمہ ہے

کتاب کو دینے والا جو خود مصنف ہے' وہ کہتا ہے کہ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ (75:17)۔ او بھئی! اس کا یہ جمع کر دینا بھی ہمارا ہی ذمہ ہے' ہم نے اس کو مرتب کتاب کی شکل میں دینا ہے عزیزانِ من! آپ کے مضامین کے جو ابواب ہوتے ہیں' جو کتاب کے Chapters

---

❶ قرآن کا جمع کرنا اور بحفاظت رکھنا ہمارے ذمے ہے۔

❷ دیکھیے اسی کتاب کا ساتواں باب

❸ ماہانہ مجلہ طلوع اسلام فروری 1978ء

(ابواب) ہوتے ہیں آپ ان کی ترتیب بگاڑ دیجیے۔ آپ دیکھیے کہ کتاب کا سارا مفہوم گڈ مڈ ہو جاتا ہے۔ یہ خدا نے اپنے ذمہ لیا تھا اور اس کے بعد ہے کہ **ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ** (75:19) اس کی توضیح' اس کی وضاحت' ہمارے ذمے ہے۔ بیانہ کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو ابھار کر نکھار کر واضح طور پر بیان کرنا۔ یہ لفظ بیان جو ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں: مبین بینات کتاب مبین' یہ سب اسی سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ** (75:19)۔ نازل بھی ہم نے کیا اور اس کو جمع بھی ہم نے کرایا اور اس کے بعد اس کی وضاحت ہمارے ذمے ہے۔ یہی ہے قرآن کی وضاحت جو میں نے کہا ہے' یہ اس نے خود کہا ہے کہ تصریف آیات کے ذریعے ہم قرآن کے ایک مقام کی دوسرے مقام سے وضاحت کرتے ہیں۔ قرآن یوں سمجھ میں آتا ہے۔

قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے والوں کے لیے بتویب القرآن نہایت مفید ثابت ہوگی

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ میں نے تو قرآن کے ساتھ شغف رکھنے والے' غور و فکر کرنے والے' احباب کی محنت کو بچانے کے لیے' یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ میری ''تبویب القرآن'' ہے کہ ایک مقام پہ اس میں جو کچھ قرآن نے کہا ہے اسے اکٹھا کر دیا ہے۔ اس میں یہ کیا گیا ہے کہ سارے قرآن میں اس کے متعلق کہاں کہاں کیا کہا گیا ہے۔ یہ ہے قرآن کا انداز۔ **وَ اَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا** (25:33) نہایت صحیح توازن رکھے ہوئے مدلل اور واضح تفسیر' نہ اس میں کمی ہے نہ زیادتی ہے' اس میں توازن ہے۔ حسن کارانہ انداز سے ہم نے خود اس قرآن کی تشریح کر دی ہے اور کہا کہ اسی لیے جو اعتراض تم پہ کیا جاتا ہے اس کا جواب ہم دیتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اعتراض ہماری کتاب پہ کیا جاتا ہے' جواب ہمارے ذمے ہے۔ کہا کہ ان لوگوں کی کیا کیفیت ہے؟ اس کے لیے یہ بڑی اہم آیت آ رہی ہے۔

جہنم کی اصل حقیقت اور اہل جہنم کی پہچان

جہنم کے متعلق میں متعدد درسوں میں بار بار اس کی حقیقت کو واضح کرتا چلا آ رہا ہوں۔ قیامت کا جہنم ہے' اخروی جہنم ہے' مرنے کے بعد کا جہنم ہے۔ یہ برحق ہے' جنت جہنم پر ہمارا ایمان ہے۔ قرآن اس زندگی کے اندر بھی آپ کو جہنم کی زندگی بتاتا ہے۔ قرآنِ کریم پہ غور کیجیے گا' ان لوگوں کی علامت بتاتا ہے جن کو وہ اہل جہنم کہتا ہے' جو یہاں بھی جہنم کی زندگی بسر کر رہے ہیں: **وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی** (17:72) جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں کا بھی اندھا ہوگا۔ یہاں کا جہنمی وہاں کا بھی جہنمی ہوگا۔ یہ آیت جہنمی کی علامت بتا رہی ہے کہ **وَ لَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَہَنَّمَ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ** (7:179) یہ شہری ہوں یا یہ خانہ بدوش صحرائی بدو ہوں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی زندگی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ یہ اہل جہنم ہیں۔ وہ بتا دیتے ہیں کہ جہنم میں رہ رہے ہیں' ان کی یہ جہنم کی زندگی' اتنی بڑی اہم علامت یہ پہچان لینے کی ہے کہ یہ جہنم کی زندگی بسر کرنے والے کون ہیں؟ کہا کہ **لَہُمۡ قُلُوۡبٌ**

لَا یَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) ہم نے ان کو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت دی تھی' یہ اس سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سے کام نہیں لیتے تھے۔ **وَ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا** (7:179) ہم نے انہیں آنکھیں دی تھیں کہ راستے میں دیکھ کے چلو۔ یہ اندھا بن کے راستے کے اوپر چلتے ہیں **وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا** (7:179) ہم نے انہیں کان دیئے تھے کہ بات کو سنو پھر اسے پرکھو۔ یہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ ہیں اہل جہنم۔ قرآن کہتا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ** (7:179) یہ انسان' شکلیں تمہیں انسانوں کی نظر آتی ہوں گی۔ یہ انسان نہیں' حیوان ہیں اور تاکید کے لیے کہا ہے کہ **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) حیوان بھی اپنی جبلت (Instinct) کے مطابق تو چلا جاتا ہے' یہ کمبخت ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ کن کو اہل جہنم کہہ رہا ہے؟ انہیں جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سے کام نہ لیں' اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں' اپنے کانوں سے نہ سنیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ جہنم کے داروغے ان سے پوچھیں گے کہ بھئی! تم جو اس طرح سے جہنم کے اندر دھکیلے جا رہے ہو' تم نے کون سا اتنا بڑا جرم کیا تھا' ذرا ہمیں بتاتے تو جاؤ۔ وہ سپرنٹنڈنٹ جیل پہلے دیکھ لیتا ہے کہ بھئی! کس جرم میں ملوث تھے' جو تم یہاں قید میں آئے ہو' جہنم کا داروغہ پوچھے گا کہ کیا جرم تھا جو یہاں آئے ہو؟ سنیے ان کا جرم' انہوں نے کہا کہ **لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ** (67:10) اگر ہم بات کو گوشِ طلب سے سنتے اور اس پر غور و فکر کرتے تو کبھی جہنم میں نہ آتے۔ ❶ قرآن یہ کہنے کے لیے آیا ہے۔ وہ تو مومن کی نشانی ہی یہ بتاتا ہے۔

ایمان کا انگریزی ترجمہ Faith غلط ہے

یہ سورۃ الفرقان کی 72 ویں آیت کے اندر ہے۔ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ مومن کون ہوتے ہیں۔ آپ مومن کی Definition سننا چاہتے ہیں' اہل جہنم کا بھی ذکر ہم نے سن لیا۔ ہمارے ہاں ایمان کا ترجمہ Faith کیا جاتا ہے۔ Faith تو بالغیب ہے جو آنکھیں بند کر کے کسی چیز کو مان لینا ہے۔ یہ ایمان مسلمہ ہے جو چلا آ رہا ہے۔ ہمارے ہاں ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ یہ وہ ہے جس میں آدمی کی فکر غور عقل شعور کا کوئی دخل نہ ہو' بس وہ آنکھیں بند کر کے مان لینا ہے' بس اس کا نام ایمان ہے' آؤ قرآن سے پوچھیں کہ وہ ایمان والے کسے کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **وَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ** (25:73) مومن وہ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو **لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا** (25:73) وہ انہیں بھی آنکھیں بند کر کے' کان بند کر کے' اندھے بہروں کی طرح' نہیں مانتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایمان کس کو کہتے ہیں۔ اس کا Faith ترجمہ ہی غلط ہے' اس کا وہ ترجمہ عیسائیت کا

---

❶ اس کی مکمل تفصیل وتشریح کے لیے ملاحظہ کیجیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' سورۃ الملک' ص ص۔ 29 تا 96

تصور ہے۔ اس کا ترجمہ Conviction ہے اور Reason (حکمت) پر مبنی ہے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ آپ میں سے اہل علم اس کو Appreciate (پسند) کریں گے۔ Reason (حکمت) کسے کہتے ہیں؟ Reason (حکمت) کی دو لفظوں کے اندر Definition (تعریف) یہ ہے: To think objectively یعنی کسی بات کے سوچنے میں بھی اپنے داخلی جذبات کو دخل نہ دینا۔

اہل جہنم کی آنکھیں سامنے کی بجائے پیچھے کی طرف ہوں گی

یہ قرآن ہے، اب اہل جہنم کی بات تو ہم نے دیکھ لی کہ وہ **اَلَّذِیۡنَ یُحۡشَرُوۡنَ عَلٰی وُجُوۡهِهِمۡ اِلٰی جَهَنَّمَ** (25:34) جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ کس طرح لے جائیں گے؟ کہا کہ سیدھے منہ آدمی جاتا ہے تو پھر آنکھیں سامنے ہوتی ہیں، راستہ دیکھتا چلا جاتا ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں، اوندھے منہ والے لوگ، آنکھیں رکھنے کے باوجود نہ دیکھ سکنے والے ہوں گے۔ دوسری جگہ (33:66) میں ایک اور لطیف پیرائے میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ کہا کہ انسان کے دیکھنے والی آنکھیں تو سامنے کی طرف ہوتی ہیں مگر **یَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡهُهُمۡ فِی النَّارِ** (33:66) جہنم میں اہل جہنم وہ ہیں کہ جن کے چہرے الٹا دیئے جاتے ہیں، ان کی آنکھیں ان کے سامنے کی بجائے گدی میں لگی ہوئی ہوتی ہیں، پیچھے کی طرف لگی ہوئی ہوتی ہیں؟

قدامت پرست یا ماضی پرست اقوام کی حالتِ زار

یہ پیچھے کی طرف آنکھیں کیا ہیں؟ یہیں اس نے واضح کر دیا ہے کہ سامنے آنکھیں ہوتی ہیں تو آپ کا حال بھی روشن ہوتا ہے، پاؤں کے نیچے آپ دیکھتے ہیں، مستقبل بھی روشن ہوتا ہے، سامنے کا راستہ بھی روشن ہوتا ہے۔ اگر آنکھیں پیچھے لگی ہوئی ہوں تو ماضی تو آپ کا روشن ہوتا ہے، حال اور مستقبل دونوں تاریک ہوتے ہیں۔ ماضی پرست، قدامت پرست، اسلام پرست، اقوام مذہب پرست ہوتی ہیں۔ ان اقوام کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کا ماضی تو بڑا روشن ہوتا ہے: فلاں حضرت صاحب نے یہ فرمایا جی، فلاں نے یہ کچھ کہا، او جی وہ دور سبحان اللہ نور علی نور تھا، وہ دور جی ایمان والوں کا تھا۔ ان کا سارا قصہ ماضی کا قصہ ہوتا ہے، ماضی سارا روشن ہوتا ہے، ہمیشہ ماضی کی طرف دیکھیں گے اور اپنے زمانے کو بھی گالیاں دیں گے۔ تو آنے والوں کا اس سے پھر بدتر ہوگا کہ ہر آنے والا دور پہلے دور کے مقابلے میں بدتر ہے، ماضی روشن ہے، ہر اہل مذہب کے ہاں آپ پچھلوں کی کہانیاں سنائیں گے۔

کوئی بھی مذہب ہو، آپ دیکھیے کہ اس کے پیروکار ہمیشہ پچھلوں کے دور کو بتائیں گے کہ وہ صحیح انقلاب برپا کرنے والا دور تھا۔ میں کیا عرض کروں، اس آیت کے ساتھ ہی قرآن اگلا ٹکڑا املا کر لے آیا، ورنہ جس [1] نے اتنا انقلاب آفریں دعویٰ کیا تھا، اُس نے یہ نہیں کہا تھا

---

[1] یہ اشارہ نبی پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

کہ یہ پچھلا دور وہ تھا اور وہ تھا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ میرا زمانہ سب سے بہتر ہے۔ کیا بات ہے اس دور کی! یہ حضور ﷺ نے فرمایا مگر انہوں نے اس کے ساتھ اور بھی لگا دیا کہ میرا زمانہ سب سے بہتر ہے، پھر اس کے بعد جو زمانہ آئے گا، وہ اس سے بدتر، پھر اس کے بعد جو آئے گا، وہ اس سے بدتر پھر اس کے بعد جو آئے گا وہ اس سے بھی بدتر ہوگا۔ چل بھئی! اپنا کم کڈ لیا اینا ں نے۔ [1] سنیئے قرآن کیا کہتا ہے: **تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمۡ فِي النَّارِ** (33:66) جہنم میں الٹایا ہوا چہرہ ہوگا، پیچھے کی طرف آنکھیں ہوں گی یعنی اُس وقت، ان کی حالت یہ ہوگی کہ اُس تباہی کی آگ میں اوندھے منہ جھونک دیئے جائیں گے۔ **وَ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِيۡلَا** (33:67) یہ پیچھے کی طرف دیکھنے والے اس وقت کہیں گے کہ ہم اپنے بڑے بڑے اسلاف، جن کو ہم اپنے بڑے بڑے بزرگ اور پیشوا کہا کرتے تھے، کا اتباع کرتے رہے اور تباہ ہو گئے، پیچھے کی طرف آنکھیں تھیں، سلف صالحین کے طریقے پہ چلتے تھے۔ بجا ہے وہ واقعی صالحین ہیں لیکن قرآن کے معیار پہ ان کی زندگی پوری اترنی چاہیے۔ سیدھی سی بات ہے کہ تمہارے پاس ایک میزان ہے، اس میں سلف اور خلف کا کیا سوال؟ ہر ایک زندگی کو اس معیار (میزان، کسوٹی) کے اوپر لائیے۔ کہا کہ جی! وہ سلف بھی تو قرآن کو سمجھا کرتے تھے اور وہ قرآنِ کریم کو ہم سے زیادہ بہتر سمجھتے تھے یعنی یا اتنا ہی نہیں کہ چلیے صاحب! ان کا اخلاق، ان کی زندگی، ہم سے زیادہ پاکیزہ تھی۔ چلو جی! مان لیتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں جی، ان کی عقل وفکر بھی ہم سے زیادہ تھی۔ اب آگے آگے وہ بھی گھٹتی چلی جا رہی ہے، حالاں کہ علمِ انسانی بڑھتا جا رہا ہے جو بتا رہا ہے کہ انسان اور حیوان میں یہ فرق ہے۔

پہلے دور کے انسان اور آج کے انسان میں فرق

عزیزانِ من! بکری جس قسم کی پہلے دن بکری تھی، آج کی بکری بھی ویسی ہی بکری ہوگی۔ پہلے دور کا انسان غاروں میں رہتا تھا درختوں کی ٹہنیوں پہ، شاخوں پہ رہتا تھا، پتوں سے جسم ڈھانپتا تھا، یہی گھاس پھوس یا کچا گوشت کھاتا تھا۔ وہاں سے انسان چلا ہے، آج چاند [2] پہ پہنچ رہا ہے۔ کیا کاریگری ہے؟ کیا دونوں کا فرق ہے؟ حیوان اپنی زندگی کا تجربہ یا علم آگے منتقل نہیں کر سکتا، انسان اپنی زندگی کے تجربے کو آگے منتقل کر سکتا ہے، ہر دور کا ہر فرد اپنی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا جو تجربہ یا علم ہوتا ہے وہ آگے منتقل کرتا ہے۔ یہ جو علم یا تجربہ منتقل ہوا ہے، Snowball (تودۂ برف) کی طرح یہ علم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس علم کی دیوار پہ ہر آنے والا دور ایک ردہ رکھتا ہے، دیوار اوپر اٹھتی ہے۔ یہ انسانوں کے نسل ہا نسل کا Accumulative knowledge (مجموعی علم) ہے جو آگے منتقل کیا ہوا ہے۔ آج کا انسان

---

[1] انہوں نے اپنا کام تو نکال ہی لیا۔

[2] یاد رہے کہ 2 دسمبر 1942ء کو ایٹم (Atom) توڑا گیا۔ اس کے 15 سال بعد روس نے 4/اکتوبر 1957ء میں اسپٹنک نامی مصنوعی سیارہ پہلی بار خلا میں بھجوا کر ایک عالم کو ورطہ حیرت میں غرق کر دیا۔ 2 ہی سال بعد 28 فروری 1959ء میں امریکا نے پہلا مخبر سیارہ خلا میں بھیجا۔ (حوالۂ خورشید عالم: خلا کا عالمی کردار، طلوع اسلام فروری 1968، ص ص۔ 40 تا 47)

غاروں میں بسنے والے کے مقابلے میں چاند میں جا کر بس رہا ہے۔ یہ کسی ایک فرد یا ایک دور کی کاریگری نہیں ہے' یہ Accumulative knowledge (مجموعی علم) ہے۔ جب Knowlede (علم) کی Accumulation ہوگی تو علم و عقل کے اعتبار سے ہر زمانہ پچھلے زمانے سے آگے ہوگا۔ قرآن نے اسی لیے کہا ہے کہ قرآن سمجھنا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ **سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ** (41:53) ہم ان کی اپنی دنیا میں' انسانوں کے نفوس کے اندر' اور باہر کی خارجی کائنات میں' اپنی نشانیاں بے نقاب کرتے چلے جائیں گے اور ہر بے نقاب ہونے والی نشانی اس بات کی شہادت بنے گی کہ قرآن نے جو کہا تھا واقعی حقیقت ہے۔ خدا خود کہتا ہے کہ اس کے حقائق کا طریقہ یہ ہے۔ اس سے اس طرح وہ ثبوت تک پہنچیں گے کہ یہ جتنی بھی کائنات میں چھپی ہوئی ہماری مضمر نشانیاں ہیں' یہ بے نقاب ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ کیسے بے نقاب ہوتی ہیں؟ انسانی علم کے ذریعے سے بے نقاب ہوتی ہیں' فکر کے ذریعے سے بے نقاب ہوتی ہیں۔ اس علم و فکر کے اعتبار سے ہر آنے والا دور آگے ہوتا ہے۔

انسانی عقل اور فکری علم کو صرف قرآنی سوچ ہی جلا بخشتی ہے

اگلی بات یہ ہے کہ وہ جو علم و فکر ہے قرآن کی روشنی میں اس سے کام لے کر جب آگے چلا جائے گا تو پھر انسانیت کی زندگی بھی منور ہوتی چلی جائے گی لیکن آنکھیں بند کر کے زندگی میں رہنا' اوندھے منہ چلنا' گدی کے پیچھے آنکھوں کا ہونا' اس سے آپ کے ہاں کا ماضی ہی ماضی روشن ہوتا چلا جائے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ ان حضرات کے ماضی کا روشن ہونا ٹھیک ہے۔ ان کی زندگیاں اپنی تھیں کیونکہ **تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ** (2:141) یہ لوگ تھے' اپنے اپنے دور میں' اپنے اپنے کام کر کے چلے گئے۔ ان کے کاموں کا ان سے مواخذہ ہوگا' ان کا ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں۔ **وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (2:141) ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ کہا کہ جہنم یہ ہے کہ پیچھے کی طرف کا دور روشن مگر یہ دور بھی تاریک' مستقبل بھی تاریک اور وہ تو قرآن کہتا ہے کہ جو اپنے دور میں زمانہ حال (Present) میں اندھا ہوگا تو **وَ مَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ** (17:72) یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا ہوگا۔

امروز و فردا کے حالات انسانی سوچ کے لیے تازیانہ ہوتے ہیں

یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم صحیح راستے پہ جا رہے ہیں یا نہیں پہلا ٹیسٹ یہ ہے کہ آیا آپ کے ہاں کا امروز روشن ہے یا نہیں۔ جس کا امروز روشن نہیں ہے' اس کا فردا بھی روشن نہیں ہے:

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

(اقبالؒ:ضربِ کلیم)

وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ (17:72)۔یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ جہنم یہ ہے کہ جس میں اوندھے منہ چلیں گے، گدی کے اوپر آنکھیں ہو لگی ہوئی ہوں گی۔یعنی وہ اوندھے منہ، کشاں کشاں، جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔**اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیۡلًا** (25:34) یہ وہ لوگ ہیں جو صحیح راستے سے بہت دور جا پڑے ہیں اور جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ انہیں اس مقام پر لے جائے گا۔رہنے کی اس قدر بدترین جگہ ہے، اس قدر گمراہی کی طرف لے جانے والا راستہ ہے۔اس کا فائدہ تو انہی کو ہوگا جو عقل و بصیرت سے کام لیں۔اس کے برعکس اگر عقل وفکر سے کام نہ لیا جائے اور اندھی تقلید کے اندر آگے چلا جائے تو وہ انہیں بدترین مقام پر لے جائے گا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الفرقان کی آیت 34 تک آ گئے اور اس کے بعد اگلی آیات میں پھر قرآن یہ بتاتا ہے کہ یہ کشمکش جو پیچھے سے ہوتی چلی آئی تھی، کیا تھی؟ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

نواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 35 تا 40)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۚ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ
وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ښ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ
وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا
عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ
نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1978ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 35 سے ہو رہا ہے: (25:35)۔

قرآنِ حکیم کے تدریجی نزول کی حکمت

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں مخالفین کے اس اعتراض کے جواب میں کہ سارے کا سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ بالآخر ہمارا مقصد، منتہیٰ، مطلوب و مقصود ہے کیا، نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے جواب دیا گیا تھا کہ یہ قرآن ایک پروگرام کے لیے نازل ہو رہا ہے، تمھیں بتدریج دیا جا رہا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس کی پہلی کڑی پر پہلے عمل کیا جائے گا تو اگلی کڑی

پھر سامنے آئے گی۔ جس منزل تک بتدریج پہنچنا ہو اس کا طریق کار ہی یہی ہوتا ہے اور کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کے سامنے تو ایک عظیم الشان انقلاب ہوتا ہے' فساد برپا کرنا ہو تو اس کے لیے نہ کسی تدریج کی ضرورت ہے' نہ ترتیب کی ضرورت' وہ تو ایک جھکڑ چلتا ہے اور جبھی تو وہ کہتے ہیں کہ یہ شبا شب ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے' گرد کی طرح اٹھتا ہے' آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتا ہے لیکن انقلاب نے تو ایک قلبی تبدیلی پیدا کرنا ہوتی ہے' ایک عظیم انقلاب پیدا کرنا ہوتا ہے اور وہ بتدریج ہی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ جو پروگرام ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تدریجاً دیا جاتا ہے۔

ان تدریجی مراحل میں یہ انقلاب لانے والا پیغامبر کرتا کیا ہے؟ یہ نہیں کہ وہ اس نظام کی کڑیاں سنوارتا ہے۔ نظام تو مشیت کے سامنے پہلے ہی ہوتا ہے' اس کے ذہن میں بھی ہوتا ہے۔ خارجی دنیا میں انقلاب لانے کے لیے' فساد برپا کرنے کے لیے نہیں' فساد برپا کرنے کے لیے تو یونہی ہلا ہلا اور ڈگا ڈگا کیا جائے' فساد برپا ہوتا ہے۔ انقلاب لانے کے لیے ایک جماعت تیار کرنا ہوتی ہے اور تیار کرنے کے معنی یہ نہیں کہ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں دی جاتی ہیں اور ان کو نشانہ بازی سکھائی جاتی ہے' نہیں بلکہ خود ان کے قلب و ذہن میں ایک انقلاب پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ سارا جو ابتدائی مرحلہ ہے وہ اس پیغمبر کے لیے ہوتا ہے کہ **وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ یُزَکِّیْھِمْ** (2:129) وہ پہلے انہیں قانون کی تعلیم دیتا ہے' ان کو پروگرام کی غایت سمجھاتا ہے' اور اس کے بعد ان کی انسانی صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے' ان کے اندر تغیر نفس کرتا ہے' ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ جب یہ جماعت تیار ہو جاتی ہے تو اس کے بعد پھر وہ جو ٹکراؤ کی صورت ہے وہ نہیں پیدا کرتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ ٹکراؤ کے بغیر ہی یہ انقلاب برپا ہو جائے لیکن مفاد پرست جماعتیں تو اس طرح سے انقلاب نہیں پیدا ہونے دینا چاہتیں۔ ان کی تو ساری مفاد پرستیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ ٹکراؤ کے لیے آتی ہیں خواہ وہ ہجرت کر کے مکے سے مدینے ہی کیوں نہ چلا جائے وہ اس کے پیچھے آتی ہیں' یورش کر کے آتی ہیں' لشکر کشی کرتی ہیں' میدان جنگ میں آتی ہیں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے اس نے صرف سپاہ تیار نہیں کرنا ہوتیں' اس نے انسان تیار کرنے ہوتے ہیں۔ اس کا پروگرام انسانیت سازی کا ہوتا ہے۔ اس دوران میں وہ ہم گل' ہم رنگ' افراد تیار کرتا ہے۔

آپ کو یاد ہے میں نے پچھلی دفعہ وہ کچھ بتایا تھا جو سورۃ مزمل کے اندر کہا گیا تھا کہ راتوں کو تھوڑا جاگا کرو۔ **اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا** (73:5) وہ ایک بہت بڑا بارگراں یعنی ایک انقلاب برپا کرنے کا کام تمہارے ذمہ کیا جا رہا ہے۔ **اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا** (73:7) تمہارے ذمے دن میں اتنا بڑا پروگرام ہوتا ہے کہ راتوں کو کچھ تھوڑا سا آرام بھی کر لیا کرو۔ اسی سورۃ میں ہے کہ تمہارے ساتھ **وَ طَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ** (73:20) دوسرے ساتھی بھی ہیں تو اکیلا نہیں ہے کہ راتوں کی تنہائیوں میں' حجرے میں بیٹھا ہوا' مصلے کے اوپر تسبیح پھیر رہا ہے۔ آپ کے ہاں سبحا طویلا کے معنی یہی کیے جاتے ہیں: **سبح** بھی اور **سبحاً طویلًا** بھی' ہزار

ہزار دانے کی لمبی تسبیحاں پھیرا کرتا ہے' وہ یہ ہوتا ہے۔ مگر یہاں کہا کہ اس کے ساتھ اس کے جو ساتھی ہوتے ہیں ان کے متعلق ہے کہ **عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی ۙ وَ اٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ** (73:20) او بھئی! یہ تمہاری جماعت ایسی ہے کہ ان میں کمزور بھی ہوتے ہیں' کچھ بیمار بھی ہو جاتے ہیں' کچھ وہ بھی ہوتے ہیں جنہوں نے اپنا کچھ کاروبار بھی' کام کاج بھی کرنا ہوتا ہے' پھر یہ بھی ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی ان کو نکلنا ہوتا ہے' تو اگر صورت یہ ہو کہ وہ سارا دن اس پروگرام کی عملی تشکیل کے لیے لگے رہے' اور ساری رات پھر اس پروگرام کی ترتیب' تدریج' کڑیوں' سیکھنے سمجھانے میں' سلجھانے میں' لگے رہے تو اس طرح سے کتنے دن یہ بات چلے گی؟ یعنی خدا کو یہ کہنا پڑا کہ راتوں کو سو بھی لیا کرو۔ یہ ہے پروگرام جس کے لیے کہا کہ **قَوْلًا ثَقِیْلًا** (73:5) یہ اتنا بڑا پروگرام تھا۔ جس وقت اس پروگرام کی تکمیل کے بعد یہ سبکدوشی ہوئی ہے تو خدا نے کہا ہے کہ **وَ وَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَکَ** (94:2-3) ذمہ داریوں کے بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ خدا نے تمہارے رفقا کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح تمہارا وہ بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ یعنی خدا نے تیرے اوپر سے وہ بوجھ اٹھا لیا جس نے تیری کمر کو توڑ رکھا تھا۔

وَ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ کا مقامِ بلند کس طرح حاصل ہوا؟

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں تو انبیائے کرام علیہم السلام اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جو نعتیں پڑھی جاتی ہیں' جو قصیدے پڑھے جاتے ہیں' ان کے مقام کی عظمت کو ہمارے سامنے لایا جاتا ہے' اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ قرآنِ کریم ان کے متعلق کہتا ہے کہ **وَ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ** (94:4) اس سے بڑی نعت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم نے تمہارے ذکر کو بلندیوں تک پہنچا دیا۔ یہ ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح بلندیوں تک پہنچا تھا؟ اس نے کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا؟ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا' ادھر سے آیا' پیغام پہنچایا' پھر اگر کوئی معرکہ ہوا' تو اس کے فرشتے آئے' انہوں نے سر کر دیا' اس کے ذمے بھی ہوا تو کوئی معجزہ دکھا دیا۔ بس یہ دکھایا جاتا ہے۔ یہ چیزیں جس کے ہاتھوں سے رونما ہونی ہوں' اس بارِگراں سے اس کی کمر ٹوٹے گی مگر ہمارے ہاں اس پہ تو بوجھ ہی کوئی نہیں ہوگا۔ ادھر سے ایک حکم آیا' ساتھ ہی اس کے اس حکم کی تعمیل کرنے والے وہ فرشتے آ گئے' معجزے آ گئے' تو اس کے اوپر بارِگراں کیا ہے؟ وہ بارِگراں جس کے متعلق خود خدا کہتا ہے کہ اس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔ **قَوْلًا ثَقِیْلًا** (73:5) یہ اتنا بڑا وزنی پروگرام ہے جو تمہارے سامنے ہے۔ یہ انبیائے کرام علیہم السلام انقلاب آور ہستیاں ہوتی تھیں۔ یہ وعظ کہنے والے نہیں ہوتے تھے' تسبیحاں پھیرنے والے نہیں ہوتے تھے۔ یہ بہت بڑا انقلاب ہوتا تھا جسے لانے کے لیے یہ آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اے رسول! تیرا نام عزت و تکریم سے لیا جانے لگا' تیرا چرچا دور دور

تک پھیل گیا۔ تو شرف ومجدِ انسانیہ کی معراج کبریٰ تک پہنچ گیا اور قرآن کا پیغام بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔

قرآنِ حکیم میں تاریخی حقائق بیان کرنے کا مقصد

عزیزانِ من! یہ کچھ کہنے کے بعد اب آیئے زیرِنظر آیت کی طرف۔ اس میں یہ کہا کہ حق وباطل کی کشمکش کا یہ سلسلہ کچھ نیا نہیں۔ یہ شروع سے ہی چلا آ رہا ہے مثلاً وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ جَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا [1] (25:35)۔ ویسے تو قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ جہاں وہ ایک دعویٰ کرتا ہے اس کی صداقت کی شہادت میں تاریخ کی داستانیں یا واقعات انبیائے کرام اور سابقہ اقوام کی داستانیں پیش کرتا ہے اس لیے کہ اصل کے اعتبار سے تو یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ یہ حق وصداقت کی بنیادوں پر ایک انقلاب برپا کرنے کے لیے آتے تھے مفاد پرست قوتیں اس کی مخالفت کرتی تھیں بالآخر حق وصداقت کو کامیابی ہوتی تھی۔ یہ تھا جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ زمان ومکان کے Context (سیاق) کے اندر یہ چیز جگہ بدلے گی حالات بدلیں گے انسان بدلیں گے لیکن اصل حقیقت یہی ہے جو حضرتِ نوح علیہ السلام سے نبی اکرم ﷺ تک چلی آئی۔ قرآنِ کریم تاریخ کے ان واقعات کو اس لیے بتاتا ہے۔ مخالفین سے یہ کہتا ہے کہ تم ان تاریخی واقعات کو جانتے ہو۔ ابھی ابھی بات آئے گی کہ تم تو ان کی اجڑی ہوئی بستیوں میں سے صبح وشام گزرتے ہو ان کے کھنڈرات کے اوپر لکھی ہوئی ان کی داستانیں پڑھتے ہو تو اس کے بعد بھی تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو وہی کچھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ اس کے لیے وہ سابقہ داستانیں دہراتا ہے اور ادھر جو اس پیغمبر کے ساتھی ہوتے ہیں قرآن نے ان کا تثبیت قلب کہا ہے۔ خود رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (25:32) اس کے خوشگوار نتائج سے تمہیں بھی تثبیت قلب حاصل ہو جمعی حاصل ہو کہ واقعی حق کی علمبردار جو جماعتیں ہیں مشکلات کا سامنا تو انہیں کرنا پڑتا ہے لیکن آخر الامر کامیابی اور کامرانی انہی کے حصے میں آتی ہے۔ اِدھر تو یہ یقین ہوتا ہے اور اُدھر مخالفین کو یہ تنذیر اور تنبیہ ہوتی ہے کہ اگر تم نے اس روش کو نہ بدلا تو تمہارا انجام بھی یہی ہوگا جو اقوامِ سابقہ کا انجام ہوا ہے۔ یہ ہے جو قرآن اس کے ساتھ واقعات بیان کرتا ہے۔ انبیائے سابقہ میں سے ہر ایک نبی اپنے اپنے مقام کے اوپر اسی قسم کا انقلاب برپا کرنے کے لیے آیا تھا۔

قرآنِ حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان کو کیوں نمایاں حیثیت حاصل ہے؟

ان داستانوں میں صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش کو بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ

---

[1] ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ایک ضابطہ حیات دیا تھا اور (چونکہ اس کے پیش نظر مہم بڑی سخت تھی اس لیے) ہم نے اس کے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی اُس کے ساتھ کر دیا تھا تاکہ وہ اس کا بوجھ بٹائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 823)۔

ہے کہ انسانیت کے سینے کا کابوس بن کر جو تین لعنتیں سوار ہوئیں وہ بڑی ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ یوں کہیے کہ اگر ان کو Categories (اقسام) میں تقسیم کرنا ہو، حصوں میں بانٹنا ہو تو وہ تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں: پہلی چیز ملوکیت کی لعنت۔ اس کا ترجمہ بادشاہت نہیں ہے۔ ملوکیت انسانوں کی انسانوں پر حکومت ہے، خواہ اس کی شکل اور نام کچھ بھی ہو۔ دوسری چیز مذہبی پیشوائیت۔ ملوکیت کی حکمرانی انسانوں کے اجسام پر ہوتی ہے، وہ ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالتا ہے، وہ انسان کے ایک پیکرِ جسم کو حوالات میں بھیجتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت ان کے قلب و دماغ کو اپنی زنجیروں میں جکڑتی ہے، یہ بڑی سخت قسم کی غلامی اور محکومی ہوتی ہے۔ یہ دوسری قسم کی لعنت ہوتی ہے اور تیسری قسم نظامِ سرمایہ داری کی لعنت ہے، جو ان کو بھوکوں مارتی ہے یعنی وہ نظام درحقیقت ان کو اس قسم کی غلامی کے لیے تیار کرتا رہتا ہے، انہیں سرکس کے شیر کی طرح بھوکوں مارتا ہے پھر وہ اشارے کے اوپر جو جی میں آئے ان سے کراتا رہتا ہے۔ یہ حقیقت میں تینوں کی ملی بھگت ہوتی ہے، ان میں سے ایک ایک لعنت بھی انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لیے کچھ کم زور آور نہیں ہوتی لیکن جہاں یہ تینوں اکٹھی ہوئی ہوں تو آپ سوچیے کہ ان کے نیچے تڑپتی پھڑکتی انسانیت کا کیا حشر ہوگا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ تینوں لعنتیں بیک وقت، بیک زماں، اکٹھی ہوگئی تھیں: فرعون کی ملوکیت، ہامان کی مذہبی پیشوائیت، قارون کا سرمایہ داری کا نظام، اور ان کے تابع بنی اسرائیل کی قوم۔ اور یہ تھا وہ انقلاب جس کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تیار کر کے بھیجا جا رہا تھا۔ [1] آپ سوچتے ہیں، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک محکوم قوم کا فرد ہے، وہاں سے ''بھاگا'' ہوا ہے، اور اس کے ذمے یہ اہم پروگرام عائد کیا جاتا ہے کہ جاؤ، فرعون کی طرف کیونکہ اِنَّــــهُ طَغٰى (20:24,43) وہ تو ساحل ناآشنا ہو چکا ہے، سیلاب بن چکا ہوا ہے، جاؤ اس کی طرف۔ یہ مقامِ نبوت ایسے ہی نہیں ملا کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے اور پھر اس کے بعد ساری دنیا ان کے حضور سجدہ ریز ہو اور قیامت تک ان کی مدح و ستائش کرتی رہے۔

نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی داستانِ موسیٰ علیہ السلام کے جہادِ زندگی کی ہی مثل تھی

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ انبیائے کرام کیا کرنے کے لیے آتے تھے۔ اب سمجھ میں آیا جو کہا تھا کہ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (73:5) تم پہ ایک بہت بارِگراں، بھاری بوجھ والا پروگرام عائد کیا جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم میں اکثر و بیشتر مقام پر نبی اکرم ﷺ یا جماعت مومنین کو جب اس پروگرام کی یاددہانی کرائی گئی تو ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بطور شہادت، بطور صداقت، پیش کیا گیا۔ ہم یہاں بھی پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے یہ کہا تھا کہ یہ قرآن اس لیے تدریجاً نازل ہو رہا ہے کہ تیرے ذمہ ایک بہت بڑا پروگرام ہے، جس کی کڑیاں طے کرنا ہیں اور اس کے بعد آگے ہے کہ وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ جَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا o فَقُلْنَا

---

[1] اس مکمل داستان کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ طٰہٰ، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء۔

اِذۡهَبَاۤ اِلَی الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا [1] (25:35-36) اور یہاں بھی جو سورۃ مزمل میں پچھلی دفعہ آپ نے دیکھا تھا کہا کہ **اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا** (73:5)۔اس کے بھی آخر میں جا کے کہا گیا ہے کہ **اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا** [2] (73:15)۔ یہاں بھی وہی بات کہی گئی ہے کہ جس طرح فرعون کی طرف ہم نے اپنا ایک رسول بھیجا تھا' اے اہل عرب' اہل دنیا! تمہاری طرف اسی قسم کا ایک رسول بھیجا جا رہا ہے۔تو گویا یہاں بھی یہی چیز کہی گئی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مختلف مقامات پر' جہاں پوری اہمیت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا پروگرام سامنے لایا گیا ہے' اس کے بعد صاحب ضربِ کلیم علیہ السلام اور فرعون کی اس آویزش کو بطورِ شہادت پیش کیا گیا ہے۔ابھی میرے ذہن میں بات آئی کہ سورۃ ابراہیم' 14 ویں سورۃ' کی ابتدا ہی اس سے کی گئی ہے کہ **الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ اِلَیۡکَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ** (14:1) یہ کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ تو نوعِ انسانی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔یہ تاریکیاں کیا ہیں؟ یہ روشنی کیا ہے جس کی طرف پھر یہ رسول انسانیت کو لاتا ہے؟ وہ بتایا کہ **وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ** [3] (14:5)۔ یہ وہی الفاظ ہیں: موسیٰ علیہ السلام کو بھی ہم نے اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا تاکہ وہ انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے اور ظاہر ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی یہ جو کشمکش کی داستان ہے وہ تو بڑی تفصیل سے قرآن کے اندر آئی ہے اور وہ یہی داستان ہے: ملوکیت' مذہبی پیشوائیت' اور نظامِ سرمایہ داری میں جکڑی ہوئی انسانیت۔یہ تاریکیوں کے اندر تھی۔اس میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت ہو تو اس کے بعد ''ایناں بیچاریاں نوں فیر کوئی سمجھدا ای نئیں' کچھ دکھائی نئیں دیندا' کچھ نظر ای نئیں اوندا'' [4] تاریکی یہ ہے۔روشنی کی طرف لے آؤ' بڑی چیز ہے۔

---

1. ہم نے موسیٰ کو ایک ضابطہ حیات دیا تھا اور (چونکہ اُس کے پیش نظر مہم بڑی سخت تھی' اس لیے) ہم نے اس کے بھائی ہارون کو بھی اس کے ساتھ کر دیا تھا' تاکہ وہ اس کا بوجھ بٹائے۔ہم نے ان دونوں بھائیوں سے کہا تھا کہ وہ اس قوم کی طرف جائیں جو ہمارے قوانین کی (کھلے بندوں' پوری سرکشی کے ساتھ) تکذیب کرتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔823)۔
2. اے رسولؐ! تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ نہ یہ مقصد' جس کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے' کوئی نیا مقصد ہے' اور نہ ہی مخالفین کا ایسا انجام' کوئی نرالا انجام ہے۔اس قسم کی انقلاب آفرینی کے لیے سابقہ انبیائے کرام آتے رہے' اور اسی قسم کا انجام ان کے مخالفین کا ہوا۔ان میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں کا لایا ہوا انقلاب اور فرعون کا انجام بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ہم نے اس مقصد کے لیے تمہیں ان لوگوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ تو ان کے اعمال کی نگرانی کرے' اور دیکھے کہ یہ کون سی روش اختیار کرتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1376)۔
3. اسی نہج (14:1) کے مطابق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ضابطہ قوانین کے ساتھ بھیجا۔وہ بنی اسرائیل کو موت کی تاریکیوں سے نکال کر زندگی کی روشنی کی طرف لے آئے۔
4. ان بیچاروں کو کوئی کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے۔انہیں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا' کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

قوموں کی موت وحیات کا راز' فساد اور انقلاب کے قرآنی مفہوم سمجھنے میں مضمر ہے

میں یہ عرض کر دوں' بار بار میں اس چیز کو کہتا ہوں کہ یہ انقلاب فساد نہیں ہوتا۔ فساد کی تو قرآن نے سخت مذمت کی ہے' لہٰذا جب تک فساد اور انقلاب میں فرق نہیں سمجھا جائے گا' کسی قوم کی حالت نہیں بدلی جاسکتی۔ فساد تو بنی بنائی عمارتوں کو کھنڈرات میں تبدیل کرتا ہے' انقلاب ان کھنڈرات سے نئی عمارت کی تعمیر کرتا ہے۔ یہ بڑا لمبا پروسیس ہوتا ہے۔ اس کا ایک پہلا حصہ وہ ہے جو غیر محسوس ہوتا ہے اور لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ کچھ ہو رہا ہے۔ قلب اور دماغ کی تبدیلی غیر محسوس ہوتی ہے' اندر ہی اندر یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ پروگرام کا یہ حصہ' یہ پیریڈ' یہ عرصہ' حقیقت میں دوسرے حصے کے مقابلے میں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اس حصے میں صلاحیتیں برومند ہو جاتی ہیں' ان کی نشوونما ہو جاتی ہے' اندر تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ پھر ان کو عملاً بروئے کار لانے کا وقت آتا ہے۔ وہ محسوس ہوتا ہے' وہ ٹکراؤ ہوتا ہے' مسالہ تیار ہوتا ہے' یوں سمجھیے کہ کسی کے پاس یہ ہتھیار' اوزار' اسلحہ اور ساری چیزیں تیار ہوں' فوج ٹرینڈ ہو' یہ انتظامات مکمل ہوں' پھر میدانِ جنگ میں جانا ہو' تو اس وقت یہ میدانِ جنگ کا مرحلہ پہلے مرحلے کے مقابلے میں آسان ہوتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات مثال کے طور پہ سامنے آئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسی کی وضاحت سے یہ پروگرام جو حضور ﷺ کے سامنے تھا' سمجھ میں آئے گا۔

سورۃ طٰہٰ میں (20:15) سے بات ہو رہی ہے۔ طور کی چوٹیوں کے اوپر' جہاں انہیں کہا جا رہا ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ' وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے' بڑے لطیف پیرائے میں ایک بات یہاں قرآن نے کہی ہے۔ وہ ہے الساعۃ کی بات۔

الساعۃ قرآنِ حکیم کی ایک بنیادی اصطلاح ہے

قرآن کی ایک اصطلاح الساعۃ ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے بتایا تھا کہ جب کوئی بات تیزی سے نمودار ہو کر سامنے آجائے' تو وہ الساعۃ ہوتی ہے۔ یہ جو انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاتھوں پروگرام نمودار ہوتا ہے' اس کا پہلا حصہ جب ختم ہوتا ہے' اور اس کے بعد اس نے مرئی یعنی محسوس طور پہ جب سامنے آنا ہوتا ہے' وہ ہے مرحلہ جہاں الساعۃ کہا جاتا ہے۔ وہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ جو تینوں انسانیت کی ہڈیاں توڑنے والی قوتیں تھیں' ملوکیت' مذہبی پیشوائیت یعنی ہامانیت اور قارونیت' یہ جو کچھ اندر ہی اندر ایک لمبے عرصے سے کر رہی تھیں' ان کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ **اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا** (20:15)۔ الساعۃ کی اندر ہی اندر یہ تیاریاں بہت عرصے سے ہو رہی تھیں۔ محکوم قوموں میں بھی اگر تھوڑا سا احساس بیدار ہو جائے تو ایک وقت آجاتا ہے جب انہیں محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ ہمیں کس حالت تک پہنچایا جاتا ہے۔ کہا کہ **اِنَّ السَّاعَةَ** (20:15) وہ الساعۃ آنے والی ہے۔ **اَكَادُ اُخْفِيْهَا** (20:15) اس سے پیشتر وہ نگاہوں سے پوشیدہ تھی' اب ہمارا پروگرام یا ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ وہ نمودار ہو کر سامنے آجائے۔ کیا بات کہی ہے خدا نے! کہ اس الساعۃ

کی تیاریاں تو ایک عرصے سے ہو رہی تھیں۔ محکوم قوم پہ آہستہ آہستہ اتنے مظالم ہو رہے تھے کہ وہ اب اس اسٹیج پر پہنچی ہے' یہ مظالم ایک عرصے سے ہو رہے تھے' ادھر ایک عرصے سے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی اسی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے بھی تربیت ہو رہی تھی۔ یہ نہیں ہے کہ یہ سارا عرصہ جتنا ہے وہ جنگلوں میں بکریاں ہی چراتے پھرتے تھے۔ اگر اتنے عظیم پروگرام کے لیے کسی کو تیار کرنا ہے تو اس کام کے لیے ان کو اس لیے نہیں رکھا جائے گا کہ جاؤ' بارہ بجے تک بکریاں چراؤ۔ اصل یہ ہے کہ مصر میں فرعون کی نگاہوں کے نیچے رہتے ہوئے' وہ اس قسم کی تیاریاں کر ہی نہیں سکتے تھے' وہ کرنے ہی نہیں دیتا تھا۔ کون کرنے دیتا ہے اس قسم کی تیاریاں! ان کی سی آئی ڈی کی نگاہیں تو گھروں کے اندر تک ہوتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہاں سے نکل جائے۔ کہا کہ **اَکَادُ اُخۡفِیۡهَا** (20:15) اب وہ وقت آ گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مرئی طور پہ سامنے آ جائے۔ اتنا پہلا عرصہ جو ہوتا ہے وہ اس کی تیاریوں کا عرصہ ہوتا ہے۔ بڑے خوبصورت انداز میں کہہ گیا ہے۔ اس [1] کو تو انداز ہی خوبصورت نصیب ہوا تھا کہ

با نشۂ درویشی در ساز و دَما دَم زن

یہ جو تیاری کی اسٹیج ہے' وہ اسے نشہ درویشی کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ یہ اندر کی نشو ونما اور صلاحیت اور تغیر ہے۔

با نشۂ درویشی در ساز و دما دم زن
چو پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن [2]

اس پروگرام کے لیے جو پختہ شدن ہے' دوران میں بانشہ درویشی ساز' قسم کا فقر اور استغنیٰ لازم ہے۔ اور یہ جو اندر کے تغیرات کی تمام تیاریاں ہیں' ان کے ساتھ یہاں چوں پختہ شوی کہا ہے۔ جب اس کے اندر پوری Maturity (پختگی) حاصل ہو جائے تو اس کے بعد بر سلطنتِ جم زن ہے' جو متصادم قوتوں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دے۔

قرآنی انقلاب کا مقصد و منتہیٰ

یہ ہے وہ **اَلسَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡهَا** (20:15)۔ اور ساتھ ہی میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ قرآن ہے۔ اس نے اتنا ہی نہیں کہا

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

[2] جب تک انسان میں اپنی ذات (سیرت) کی پختگی پیدا نہ ہو جائے' اسے مصافِ زندگی میں متصادم قوتوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ زندگی نام ہے:
زیرِ خاکستر شرار اندوختن   شعلہ گردیدن نظر ہا سوختن   (مثنوی اسرارِ خودی)
زندگی نام ہے: اپنی ذات کی مضمر حرارتوں کو' جو جسم کی خاکستر کے نیچے چھپی اور دبی رہتی ہیں' یکجا کرتے چلے جانا اور اس طرح چنگاریوں کے مجموعہ سے شعلہ بن کر' دوسروں کی نظروں کو جلا دینا۔

کہ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ الساعۃ یعنی وہ جو انقلاب ہے‘ اب نمودار ہو جائے‘ دو الفاظ کا آگے اضافہ کر دیا۔ فساد اور انقلاب کا جو مقصد ومنتہیٰ وما حصل ہے‘ اس کو بھی بیان کر دیا۔ کہا کہ یہ کاہے کے لیے کیا؟ اس لیے کہ **لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی** (20:15) تا کہ ہر فرد کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے۔ یہ مقصد ہے اس انقلاب کا۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر دو اور بھی بڑے واضح الفاظ آئے ہیں۔ (20:112) میں کہا تھا کہ اس انقلاب کے بعد کیا چیز حاصل ہوگی؟ اس سے بھی پہلے (2:62) میں‘ اس نظام کے تابع رہنے والے مومنین کی جماعتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ **لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ** (2:62) نہ بیرونی خطرہ ہوگا‘ نہ ان کو کسی قسم کی دلی افسردگی ہوگی‘ حزن بھی نہیں ہوگا‘ ملال بھی نہیں ہوگا‘ خوف بھی نہیں ہوگا۔ وہ اس بات سے مامون ہوں گے۔ یہ کس چیز کی سیکیورٹی (ضمانت) ہوگی؟ سنیئے‘ عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ **وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ** (20:112)[1]۔ اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **فَلَا یَخٰفُ** (20:112) ان کو کسی قسم کا خوف نہیں رہے گا۔ کس بات سے خوف نہیں رہے گا؟ اس کے لیے کہا کہ **ظُلۡمًا وَّ لَا ہَضۡمًا** (20:112) نہ دھاندلی اور بے انصافی کا‘ نہ Fxploitation (سلب ونہب) کا۔

یہاں ہضماً کا لفظ آیا ہے۔ آپ دیکھیں کہ ہم بھی کہتے ہیں کہ ہضم کر گیا۔ یہاں ظلم اور ہضم آیا ہے۔ ظلم تو عدل کے خلاف دھاندلی اور ناانصافی ہے جو قانون کے خلاف ہوتی ہے اور ہضماً Economic یعنی معیشت کی چیز ہے۔ یہ وہی ہے جو وہاں (20:15) میں کہا تھا کہ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ ملے۔ یہاں کہا ہے کہ کسی کو بھی نہ دھاندلی کا‘ بے انصافی کا‘ لاقانونیت کا‘ ڈر ہوگا اور نہ ہی یہ ڈر ہوگا کہ اس کی محنت کو کوئی دوسرا ہضم کر جائے گا۔ یہ ہے اس انقلاب کا وہ مقصد‘ لیکن یہ پہلا مرحلہ ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اس انقلاب کی تیاری کا مرحلہ ہوتا ہے اور یہی اس تیاری کے مرحلے میں سورۃ مزمل میں کہا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کتنی زیادہ مشقتیں اٹھانا پڑتی ہیں‘ صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں‘ یہ بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں نبی اکرم ﷺ کی یہ جو نبوت کی تیئس سال کی زندگی ہے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے: 13 سالہ مکی زندگی اور اس کے بعد 10 سالہ مدنی زندگی۔

ہماری تاریخی کتب نبی اکرم ﷺ کی شان میں مغربی مفکرین کی گستاخیوں کے لیے اسلحہ خانہ ہے

مغربی مفکرین‘ مورخین‘ مستشرقین کے لیے نادانستہ یا دانستہ طور پر ہماری تاریخی کتب نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخیوں کے لیے اسلحہ خانہ ہیں اس لیے کہ ہم نے ان کو تاریخ اس قسم کی دی ہے کہ وہ بھی اگر اس نتیجے پہ پہنچ جائیں تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ ہم نے خود ان کو یہ میٹریل (مواد) دیا ہوا ہے۔ یاد رکھیے‘ یہ لوگ جو کچھ ہمارے خلاف یا نبی اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخیاں لکھتے ہیں یہ اپنی طرف سے کچھ وضع نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کی وہ کتابیں ہیں جنہیں ہم بڑا ہی قابل استناد‘ معتمد علیہ‘ مقدس گنتے ہیں‘ یہ سارا

---

[1] اور جو شخص‘ خدا کے ضابطہ قوانین کی صداقت کو تسلیم کر کے‘ صلاحیت بخش کام کرے گا۔

میٹریل (مواد) ان میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو پہلی مکی زندگی تھی' یہ تو واقعی ایک اللہ والی زندگی تھی' ایک مذہب پرست انسان کی زندگی تھی' عبادتیں کرتے رہتے تھے' نفل پڑھتے رہتے تھے' تسبیحاں پھیرتے رہتے تھے' لوگوں کو وعظ کرتے رہتے تھے' نصیحتیں کرتے رہتے تھے کہ بھئی! بھلے ہو جاؤ' برائیاں نہ کرو۔ یہ سب کچھ تو بڑی ٹھیک ٹھاک زندگی تھی۔ یہ کچھ کرتے کرتے' انہوں نے پلٹا کھایا۔ یہ جتنے بھی مغرب کے مورخین آپ دیکھیں گے' انہوں نے جو حضور ﷺ کی لائف پر کتب لکھی ہیں' ان میں اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جب مدینے پہنچے تو وہاں جا کر ان کو بہت سے حالات سازگار نظر آئے' کچھ اپنے ساتھی ساتھ لے گئے' کچھ وہاں کے لوگ ساتھ ملے۔ حالات وہاں سازگار تھے' ان کے مقابلے میں عیسائی اور یہودی تھے جو سپاہ گری اور فوج کے فن سے واقف نہیں تھے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ قریش کے مقابلے میں ان کو سر کر لینا کچھ مشکل نہیں۔ ان کے دماغ میں مملکت بنانے کا خیال ابھرا اور اس سے انہوں نے فائدہ اٹھایا۔ یہ ہے تاریخ جو ان کو پیش کی جاتی ہے۔ ہم کہہ دیتے ہیں کہ متعصب عیسائی ہیں۔ آپ کے ہاں بھی اگر آپ دیکھیں گے' تو مکی اور مدنی زندگی اسی طرح تقسیم کی ہوئی ہے۔ معاف کیجیے اگر میں اسے بتائے بغیر آگے چلوں تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔

مودودیؒ کے نزدیک حضور ﷺ کی زندگی کا عکس

عزیزانِ من! وہ مورخین' مفکرین اور مستشرقین تو پھر غیر ہیں' دشمن ہیں' انہوں نے تو یہ کہنا ہے اور یہ جو میں اب آپ کو اپنوں میں سے بتا رہا ہوں کہ یہ کیا کہتے ہیں یہ غیر بھی نہیں کہہ سکے۔ مجھے پھر مجبوراً نام لینا پڑتا ہے۔ مودودی صاحب [1] نے بھی حضور ﷺ کی زندگی پیش کی ہے۔ انہوں نے 1941ء میں اپنی جماعت بنائی۔ اس میں اچھے اچھے لوگ جمع ہوئے۔ 1956ء میں انہی کے ہاں کے بڑے بڑے اکابرین میں سے ایک گروہ ان سے الگ ہوا اور الگ ہونے سے پہلے انہوں نے ان پہ اعتراضات کیے۔ سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے جماعت بنائی ہے تو آپ بڑے بلند آہنگ اصول دیتے تھے: مساوات کے' احترامِ انسانیت کے' دیانت کے' تقویٰ کے۔ ہم ان اصولوں کو دیکھ کر آپ کے ساتھ ہوئے تھے۔ اب جو یہاں آ پہنچے ہیں اور آپ کے سامنے حصولِ اقتدار کا مقصد آ گیا' تو آپ نے ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور جو کچھ دوسری سیاست میں ہوتا ہے وہی کچھ آپ کرنے لگ گئے ہیں۔ وہ سارے اصول ہی ختم کر دیئے' بالائے طاق رکھ دیئے۔ آپ کو پتہ ہے کہ انہوں نے اس کا جواب کیا دیا۔ یہی ہے وہ مقام جہاں میں نے کہا ہے کہ کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ کہنا پڑتا ہے' جواب یہ ہے' لکھا ہوا موجود ہے۔ کہا کہ میں نے اگر یہ کیا ہے تو کوئی انوکھی بات نہیں کی' میں نے تو اتباعِ سنتِ رسول اللہ ﷺ کیا ہے۔ اچھا جی! کہا کہ آپ نے دیکھا نہیں کہ رسول اللہ ﷺ مکی زندگی میں مساواتِ انسانیہ احترامِ آدمیت کے نہایت بلند و بالا اصول دیتے رہے اور آپ ﷺ نے کوشش بھی کی کہ کچھ مساوات کے نمونے بھی دکھا دیئے جائیں۔ وہاں مکی

---

[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)

زندگی میں آپ ﷺ یہ سارے اصول پیش کرتے رہے۔ مدینے کی زندگی میں آ کر جب مملکت ہاتھ میں آئی تو ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر آپ ﷺ نے کہا کہ مملکت میرے خاندان قریش کے اندر رہے گی۔ مساواتِ انسانیہ کے سارے اصول بالائے طاق رکھ دیئے۔ میں نے اگر یہ کیا ہے تو کیا جرم کیا ہے۔ (یا اللہ) سنیے عزیزانِ من! یہ مکی اور مدنی زندگی کو یوں تقسیم کیا جا رہا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ اس قسم کی گستاخی کی حد تک تو کوئی مغربی مستشرق بھی نہیں پہنچا تھا۔ یہ اس شخص ﷺ معاف رکھیے میں شخص کہہ رہا ہوں اس ذاتِ اقدسؐ کے متعلق کہہ رہا ہے جو ان تمام مخالفین کے بھرے مجمع میں ان کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ ﷺ کے دعوے کی سچائی اور صداقت کا ثبوت کیا ہے کہہ رہی ہے کہ **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (10:16) میں نے تو اس دعویٰ کرنے سے پہلے بھی تمہارے اندر اپنی ایک عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس عمر سے اندازہ نہیں لگا سکتے ہو کہ وہ زندگی ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے۔ **اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (10:16) عقل و فکر سے کام لے کے دیکھو۔ وہ شخص جو اپنی زمانہ قبل از اسلام کی زندگی یوں پیش کر رہا ہے۔ اسے تو یوں کہیے کہ **اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ** (6:163) تو وحی آنے کے بعد حضور ﷺ نے کہا ہے تو اس سے بھی پہلی زندگی بحیثیت صرف ایک انسان کے دشمنوں کے سامنے اپنے دعویٰ نبوت کی صداقت میں پیش کر رہے ہیں اور کوئی اس کے خلاف ایک انگلی نہیں اٹھا رہا ان کے متعلق (معاذ اللہ، معاذ اللہ) یہ کہنا کہ مکی زندگی کے اندر تو وہ اس قسم کے بلند و بالا اصول پیش کرتے رہے تا کہ لوگ اس طرح سے ساتھ آ جائیں اور جب مملکت ہاتھ میں آئی تو کہا کہ یہ تو میرے خاندان قریش میں رہے گی باہر نہیں جائے گی۔ عزیزانِ من! رسول ﷺ تو ایک طرف رہا ایک شریف انسان کی زندگی بھی اس طرح حصوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ جو کیریکٹر ہے وہ تو ایک Indivisible Unit (ناقابلِ تقسیم وحدت) ہوتا ہے۔ شہد کا ہر قطرہ میٹھا ہوتا ہے اس کے الگ الگ حصے نہیں کیے جا سکتے۔

نبوت کی زندگی کا پہلا دور اندرونی تبدیلیوں کا دور ہوتا ہے

یہ جو نبوت کی زندگی ہے اس میں بھی حصے نہیں ہوتے۔ یہ جو انقلاب لانے کے لیے پہلا دور ہوتا ہے وہ اندرونی تبدیلیوں کا دور ہوتا ہے جماعت سازی کا دور ہوتا ہے انسانیت سازی کا دور ہوتا ہے۔ مزمل تو کہا ہی اس لیے تھا۔ میں نے پچھلی دفعہ ❶ کہا تھا کہ مزمل تو بہترین قافلہ سالار ہے جو چن چن کے افرادِ کارواں کو اپنے ساتھ ملاتا ہے ان کی ایک ایک چیز کی نگہ پرداخت کرتا ہے۔ یہ قافلہ بنانے کی تیاری انسانیت کی تیاری اپنے ساتھیوں کے قلب و نگاہ کے اندر ایک تغیر پیدا کرنا تھا۔ یہ **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ** (2:129) کا دور تھا۔ یہ اکیلے رسول علیہ السلام کا کام نہیں تھا یہ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ رضی اللہ عنہم کا کام تھا۔ یہ جو والذین معہ رضی اللہ عنہم تھے یہ ان کی تیاری کا

---

❶ اسی کتاب کے آٹھویں باب میں۔

دور تھا اور یہ بھی نہیں کہ مکے مدینے میں جا کر پھر یہ دور ختم ہو گیا۔ یہ دور تو آخر تک آگے چلتا رہا ہے لیکن بہر حال اس دور میں جسے ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر نظر کچھ نہیں آتی' یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ ساعت تو آ رہی تھی' لیکن وہ نگاہوں سے پوشیدہ تھی وہ یہ تیاریاں تھیں' یہ کیریکٹر بنایا جا رہا تھا' اس قسم کے انسان تیار کیے جا رہے تھے۔

مخالف قوتوں کی طرف سے مخالفت کی وجہ جواز

اس تیاری کے اندر توپ وتفنگ کی تو باری ہی نہیں آتی' اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کچھ کرنے کے بعد' پھر وہ اگلا مرحلہ آتا ہے جب مخالف قوتیں یہ بھانپ لیتی ہیں کہ یہ تو ایک نیا نظام قائم کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو وہ پھر میدان میں آ جاتی ہیں بلکہ قرآنِ کریم نے تو دوسری جگہ خود ان کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ جو کچھ یہ انسانیت کش مظالم و جرائم کرتے ہیں وہ اپنا نتیجہ اندر اندر پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ (21:11) میں ہے۔ یہ بڑی اہم آیات ہیں۔ اپنی قوت کے نشے میں بدمست ہو کر یہ نہیں محسوس کرتے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' اس کا نتیجہ ایک دن تباہی ہوگا۔ اندر ہی اندر یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ جب وہ اگلا مرحلہ آتا ہے' جب یہ تیار ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ ہو گیا۔ یہ وہی ہے جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ حکیم صاحب یا ڈاکٹر صاحب' کے پاس جا کر مریض کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ صاحب! رات کو تو اچھا بھلا سویا تھا اور صبح اٹھا ہے تو اتنا شدید درد اٹھا ہے صاحب! کہ ہوش نہیں آ رہا' پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ وہ جب ایکسرے کے نیچے اس کو رکھ کے دیکھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ راتوں رات' شباشب نہیں ہوا' یہ تو برسوں سے گردے کے اندر پتھری پیدا ہو رہی تھی۔ اگر ساتھ کے ساتھ اس قسم کا چیک اپ کراتے رہتے' تو پہلے ہی پتہ چل جاتا لیکن وہ جو آخر میں اس چیز کے ناقابلِ برداشت ہونے کا ایک وقت آتا ہے' اسے Pain (درد) کہتے ہیں۔ یہ یونہی نہیں آ جاتا۔

مکافاتِ عمل انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے

قرآن یہ کہتا ہے کہ ان کے گردوں کے اندر پتھریاں تو برسوں سے بنتی چلی آ رہی ہیں' ریت جمع ہوتی چلی آ رہی ہے مگر ان کو محسوس نہیں ہوتا اس لیے کہا کہ وَ کَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ کَانَتۡ ظَالِمَۃً وَّ اَنۡشَاۡنَا بَعۡدَہَا قَوۡمًا اٰخَرِیۡنَ (21:11)۔ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ کتنی ہی قومیں ایسی گزریں جنہوں نے ظلم اور دھاندلی کی اور اس کے بعد دو لفظوں میں کہا کہ ان کا نام و نشان مٹ گیا اور ان کی وارث دوسری قومیں ہو گئیں۔ پہلے تو وہ بات جو آخر میں ہوئی ہے' یہ بیان کی۔ قرآن کا بڑا عمدہ انداز ہے۔ اسے Graphic (گرافیانہ) انداز کہتے ہیں اور اس کے بعد کہا کہ ایک عرصہ سے یہ جو قومیں تھیں انہوں نے ظلم و ستم اور ہضم وفریب پر کمر باندھ رکھی تھی' Exploitation (لوٹ کھسوٹ) ہو رہی تھی' دھاندلی ہو رہی تھی' جو کچھ اس کا نتیجہ اندر اندر ہو رہا تھا' اسے یہ

محسوس نہیں کر رہے تھے۔ کہا کہ **فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ** (21:12) جب محسوس طور پہ ان کے سامنے وہ چیز آئی تو **اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ** (21:12) پھر اس سے بھاگے۔ کیا انداز ہے!

بھاگے وہاں سے، اور سنیے قرآن کیا کہتا ہے؟ کہا کہ یہ بھاگ کر جا رہے تھے اور پیچھے سے ہمارا قانونِ مکافات آواز دے رہا تھا کہ **لَا تَرْكُضُوْا** (21:13) بھاگو نہیں، بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتے، چاروں طرف ہمارے قانونِ مکافات کی زنجیروں کی باڑیں لگی ہوئی ہیں، بھاگ کے نہیں جا سکتے: **لَا تَرْكُضُوْا** (21:13)۔ مت اس قسم کی بیکار کوشش کرو، بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ پھر کیا کرو؟ اس کے لیے کہا کہ **وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ** (21:13) واپس آؤ، کہاں واپس آؤ؟ وہاں واپس آؤ، جہاں تم دوسروں کی محنتوں کے اوپر اپنی عیش سامانیاں تیار کیا کرتے تھے، آؤ وہاں۔ **وَ مَسٰكِنِكُمْ** (21:13) آؤ ان محلات میں کہ جن کی رنگینیاں مزدوروں اور محنت کشوں اور کمزوروں اور محتاجوں کے خون کی رہینِ منت تھیں، آؤ ان محلات کے اندر۔ کاہے کے لیے آؤ؟ **لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ** (21:13) تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ جو کچھ ایسا تم نے بنا کے رکھا ہوا تھا کہاں سے لیا تھا، آؤ ادھر۔ کیا انداز ہے قرآن کا! **قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ** (21:14)۔ وہاں پہنچ کے پھر وہ کہیں گے کہ ہاں واقعی ہم نے ظلم کیا، ستم کیا۔ لیکن اس وقت، اس تاسف سے کیا ہو سکتا تھا؟ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے۔ **فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ** (21:15) اور وہ وہاں چیخ و پکار کرتے رہیں گے، کہتے رہیں لیکن یہ تو وقت گزر گیا۔ وہ کچھ کہتے رہیں گے۔ **حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ** (21:15)۔ کیا بات ہے! ایک لفظ کہنے سے، جیسے کہتے ہیں، تیری تسلی نہیں ہوئی۔ وہ یہ کچھ چیخ و پکار کرتے رہیں گے تا آنکہ تم دیکھو، تاریخ سے پوچھو، کہ وہ ایسے ہو گئے جیسے ایک کٹی ہوئی فصل ہوتی ہے: **حَصِيْدًا** (21:15) جیسے کٹا ہوا کھیت، جس میں نشوونما کی صلاحیت باقی نہ رہے۔ میں نے کہا ہے کہ جیسے تسلی نہیں ہوئی۔ **خٰمِدِيْنَ** (21:15) بجھا ہوا شعلہ ہوتا ہے جس میں زندگی کی حرارت ختم ہو جائے۔ یہ ہوتا ہے، عزیزانِ من! یہ ہے انقلاب جو یہ پیغمبر لاتے تھے۔ نہ تو ان کے اس دین کا نام نفلیں پڑھنا اور تسبیحاں پھیرنا تھا، نہ ان کے اس انقلاب کا نام یہ فساد انگیزیاں تھیں جن میں تخریب ہی تخریب ہوتی ہے لہٰذا وہ تو ان کے سامنے تھا، پروگرام یہ تھا، ان کا پروسیس یہ تھا: پہلے انسانوں کی تیاریاں ہوتی تھیں:

چو پختہ شوی خودرا بر سلطنتِ جم زن

پختہ ایک فرد نہیں ہوتا والذین معہٗ ساتھ ہوتے ہیں جو پختہ ہوتے ہیں۔

اس جیسے پروگرام کی تکمیل کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام بھی تھے

یہ ہے وہ پروگرام جس کے لیے پہلی آیت میں کہا گیا کہ بہت بڑا کمر شکن بارِ گراں اتنا عظیم پروگرام تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اس واسطے آہستہ بڑھو، بتدریج اس کے اوپر چلو۔ ہم تمہاری بے تابیٔ تمنا کو جانتے ہیں لیکن صبر طلبیٔ عشق کا تقاضا کچھ اور ہے۔ اس میں بڑا وقت

لگے گا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد' میں نے عرض کیا' کہ یہاں پھر دہرایا کہ **وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ جَعَلۡنَا مَعَہٗۤ اَخَاہُ ھٰرُوۡنَ وَزِیۡرًا** ❶ (25:35)۔ یہاں تھا کہ **وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ** (94:2-3) اے رسول! ہم نے تمہاری کمر سے وہ بوجھ اٹھالیا جو تمہاری کمر کو توڑ رہا تھا۔ یہاں حضرت ہارون علیہ السلام کو ساتھ وزیر کہا ہے۔ اب اس سے آپ اس مرحلہ یا اس پروگرام کی دقت طلبی کا اندازہ لگائیے کہ ایک نبی' وہ بھی حضرت موسیٰ ﷺ جیسا' اکیلا کافی نہیں ہے' ایک اور نبی اس کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ کاہے کے لیے دیا جاتا ہے؟ اس کے لیے یہی لفظ وزیر ہے۔ وزیر کے معنی ہیں ''بوجھ اٹھانے والا''۔ دوویں رل کے بوجھ نوں چک لوتسی' جنوں اسی کہواں گے۔ ❷ یہ بوجھ بٹانے والا وزرا ہے۔ یہ وہی ہے جو بھی میں نے لفظ پڑھا ہے کہ **وِزۡرَکَ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ** (94:2-3) بوجھ بٹانے والا' وزیر۔ ایک یہ ہوتے ہیں دوسروں کا بوجھ بٹانے والے' اک ساڈے وی وزیر ہوندے نیں' اپناوی بوجھ دوسریاں تے پادین والے۔ ❸

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

(اقبالؒ)

تکذیب دین کا مفہوم

ایک حضرت ہارون علیہ السلام وزیر تھا' ایک ہمارے ہاں وزیر ہوتے ہیں۔ کہا کہ جاؤ' اس قوم کی طرف۔ وہ ہمارے قانونِ مکافات کو جھٹلا رہے ہیں۔ یہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ یہ تکذیب کا لفظ بڑا عجیب ہے۔ عربی زبان کے اندر اس کے معنی ہوتے ہیں: اپنے عمل سے' اپنی روش سے' یہ ثابت کرنا کہ یہ دعویٰ جھوٹا ہے جو کیا جارہا ہے۔ یہ دعویٰ قانونِ مکافات کیا ہے؟ کہ ظلم کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے' ظالم پنپ نہیں سکتا۔ **اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ** (6:21) یہ قانون ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ یہ ہے خدا کی آیت۔ ظالم ظلم کیے چلا جاتا ہے' پنپتا چلا جاتا

---

❶ ہم نے موسیٰ کو ایک ضابطہ حیات دیا تھا اور (چونکہ اس کے پیش نظر مہم بڑی سخت تھی' اس لیے) ہم نے' اس کے بھائی ہارون کو بھی اس کے ساتھ کر دیا تھا تا کہ وہ اس کا بوجھ بٹا سکے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 823)۔

❷ جسے ہم کہیں گے کہ دونوں مل کر بوجھ اٹھالیں۔

❸ ایک ہمارے ہاں بھی وزیر ہوتے ہیں جو اپنا بوجھ بھی دوسروں پہ لاد دیتے ہیں۔

ہے‘ پھلتا پھولتا چلا جاتا ہے‘ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے بعد جب اسے کہا جائے کہ بھئی! ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے‘ کہنے لگا کہ جا اوئے جا‘ دیکھتے نہیں ہو‘ وہ بھی اس طرح سے پنپتا جاتا ہے‘ پھر دیکھنے والے بھی جو اس کے ساتھی ہیں‘ وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ یونہی باتیں ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں‘ اگر کچھ اچھا انتظام کر لیا جائے‘ سیاست کی مہرہ بازیوں کی خامی نہ رہ جائے‘ تو کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ جو چیز ہے کہ اپنے اس طرزِ عمل سے یہ بتا دینا کہ وہ جو دعویٰ ہے قرآن کا یا خدا کے قانون کا کہ یہ نہیں ہو سکتا‘ یہ اس کی تکذیب ہوتی ہے کہ نہیں‘ وہ جھوٹا ہے۔ یہ ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے‘ تکذیب کر رہے تھے‘ جھٹلا رہے تھے اور ایک لفظ میں پھر یہ کہا کہ **فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا** ❶ (25:36)۔

سابقہ قوموں کے تذکرہ کا مقصد ان کے انجام کو ظاہر کرنا ہوتا ہے

عزیزانِ من! چونکہ ان کی تفاصیل دوسرے مقام پہ دی گئی ہیں‘ جب وہ ان چیزوں کو ضمناً لاتا ہے‘ تو یہ آخر میں جو نتیجہ تھا‘ وہ دو لفظوں میں بیان کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ہر مقام پہ تفصیل دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کہا کہ **فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا** ❶ (25:36)۔ اور اس کے بعد باقی قوموں کے متعلق بھی جو کچھ کیا‘ وہ سامنے آیا۔ **وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً** ❷ (25:37)۔ قومِ نوح کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔ ضمناً یہاں **كَذَّبُوا الرُّسُلَ** (25:37) آیا ہے۔ ویسے تو قرآنِ کریم نے جہاں سلسلہ انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر کیا ہے حضرتِ نوح علیہ السلام سے اس کی ابتدا کی ہے لیکن یہ بتایا ہے کہ اس سے پہلے بھی اس قوم کے اندر رسول آ گئے تھے کیونکہ یہ **كَذَّبُوا الرُّسُلَ** (25:37) ہے کہ اس قوم نے رسولوں کو جھٹلایا تھا اور حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانے میں تو پھر وہ غرق ہو گئی تھی‘ تباہ ہو گئی تھی۔ یہ بعد کی تو بات نہیں ہے۔ **اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً** ❸ (25:37) وہ قوم غرق ہو گئی‘ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے‘ متعدد مقامات پہ یہ باتیں آ چکی ہیں۔ ہم نے اس داستان کو بھی‘ ان کی تاریخ کو‘ ان کے انجام کو‘ انسانوں کے لیے اس بات کی علامت بنا دیا کہ اس قسم کی غلط روش کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے۔

آیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی محسوس شے سے اصل حقیقت کو پا لینا‘ جیسے دور سے کہیں بیابان میں‘ جنگل میں دھواں نظر آئے تو ذہن میں ہوتا ہے کہ نیچے آگ ہے اور آگ ہے تو کوئی انسان بھی ہے۔ یہ اس چیز کی آیت ہو جاتی ہے جس پہ انسان نتیجے پہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ان کے غرق ہونے کو ہم نے بھی دوسرے لوگوں کے لیے آیت بنا دیا تاکہ اس سے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ **وَ اَعْتَدْنَا**

---

❶ ہم نے ان مخالفین کو بھی اُسی طرح تباہ کر دیا جس طرح ہم‘ اس قسم کی مجرم اقوام کو تباہ کیا کرتے ہیں۔

❷ اور اسی طرح (اُن سے پہلے) قومِ نوح کا بھی ماجرا ہے۔ اُنہوں نے بھی اُن رسولوں کی تکذیب کی جو اُن کی طرف ہمارا پیغام لے کر گئے تھے۔ چنانچہ (اسی قسم کی کشمکش کے بعد) ہم نے انہیں غرق کر دیا (اور اس طرح‘ اُن کے انجام کو‘ دوسرے لوگوں کے لیے‘ اپنے قانونِ مکافات کی) نشانی بنا دیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔ 823)۔

❸ ہم نے انہیں غرق کر دیا اور اس طرح‘ ان کے انجام کو‘ دوسرے لوگوں کے لیے‘ اپنے قانونِ مکافات کی نشانی بنا دیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔ 823)۔

لِلظّٰلِمِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا [1] (25:37)۔اب یہاں یہ بات آ گئی کہ جو ظالم ہیں' ان کے لیے یہ ایک الم انگیز سزا ہوتی ہے' یہ اس کا انجام ہوتا ہے۔تاریخ کی یہ داستان اس بات کی آیت بن جاتی ہے۔

ابھی میں عرض کروں گا کہ قرآن کا اور تاریخ کا فلسفہ کیا ہے؟ یہاں کہا کہ **عَادًا وَّ ثَمُوْدَا وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ** (25:38) اسی طرح اور قومیں بھی جیسے قوم عاد' قوم ثمود' اصحٰب الرس ہیں' ان کا بھی یہی انجام ہوا۔یہ جو اصحٰب الرس ہیں ان کا ذکر بھی قرآن میں دو مقام پہ آیا ہے۔ایک یہاں ہے اور دوسرا سورۃ ق (50:12) میں ہے۔اس قوم کی تفصیل قرآن نے نہیں دی۔انہیں عام طور پر کنوؤں والے' گڑھوں والے کہا جاتا ہے لیکن اس کے مادے (Root) کے اعتبار سے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''غلط باتیں وضع کر کے پھر ان کو پھیلاتے چلے جانا'' اس میں تو بہت سی قومیں آ جائیں گی۔ڈرن والی گل نئیں۔اسی تے کسے قوم اچ وی نئیں اوندے ہیگے۔ [2] میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں تو اس نوشتہ تقدیر میں ایسا مرفوع القلم کر دیا ہے کہ ہم مٹ گئے ہیں۔اب اسی کتھے رڑ کدے وی نئیں ہیگے' کہ چلو ہور نئیں تے ظالماں وچ ای ساڈا شمار ہو جائے' مٹ مٹا ای چکے ہوئے ہیگے۔ [3] یہاں آیا ہے **اصحٰب الرس** یعنی غلط باتیں وضع کرنا اور پھر ان کو بیچ کر کے پھیلاتے چلے جانا۔عجیب چیز ہے مادے کے اعتبار سے اور میں سمجھتا ہوں کہ قرآن نے اسی لیے کسی متعین قوم کے متعلق یہ بات نہیں کہی' ذہنیت ہی کے متعلق بات کہی ہے' روش کے ہی متعلق بات کہی ہے اور آگے کہا کہ **وَ قُرُوْنًا بَیْنَ ذٰلِکَ کَثِیْرًا** (25:38) اور ان کے درمیان کئی اور قومیں آئیں جن کا انجام بھی یہی ہوا۔

یہاں کہا ہے کہ **وَ کُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَ کُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا** (25:39) ان سب کے یہ تاریخی واقعات' ہم نے تمہارے لیے بیان کیے ہیں۔یہ قرآنِ کریم کی بڑی اہم چیز ہے کہ تاریخ کی اہمیت کتنی بڑی ہے! خدا کی طرف سے تو وحی ہے' قوانین آئے' ہدایت آئی' اس نے پروگرام دیئے لیکن وہ کہتا ہے کہ **وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ** (24:34) ہم نے تمہاری طرف یہ کھلے کھلے احکام بھیجے' ضوابط بھیجے' قانون بھیجا' وحی بھیجی' ہدایت بھیجی' **وَ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ** (24:34) اور اس کے ساتھ ہی اقوامِ سابقہ کی تاریخ بھی نازل کی۔تاریخ منزل من اللہ ہے۔یہ **ولقد انزلنا** آیا ہے۔یعنی پہلے دو چیزیں نازل کی ہیں: **اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ** (24:34)۔ایت مبینہ اور اقوامِ سابقہ کی تاریخ۔تو یہ برابر کی اہمیت رکھنے والی بات آ گئی۔یہ بڑی چیز ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ ہے ہی انسان کی خصوصیت۔حیوان کی تاریخ تو کیا ہو سکتی ہے!

---

1. جو لوگ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں' آخر الامر وہ خود ہی الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔
2. ڈرنے والی بات نہیں ہے۔ہمارا شمار تو کسی قوم میں بھی نہیں ہوتا۔
3. ہم تو کہیں رڑ کتے بھی نہیں ہیں کہ چلو کہیں اور نہیں تو ہم ظالموں میں ہی شمار ہونے لگیں۔ہم تو نسیا منسیاً ہو چکے ہیں۔

جیسی بکری پہلے دن تھی، ویسی بکری آج کے دن ہے لیکن جیسا انسان غاروں میں بسنے والا تھا، چاند پہ جانے والا انسان ویسا نہیں ہے۔ قرن ہا قرن اور صدیوں کے ارتقائی مراحل طے کر کے انسانیت آگے آ رہی ہے۔ پھر اس کے اندر مختلف قسم کی قومیں آ رہی ہیں، روشیں آ رہی ہیں، نظام آ رہے ہیں، ٹکراؤ ہو رہا ہے، کوئی الٹتا ہے تو کوئی چڑھتا ہے۔ یہ ساری، جتنی بھی انسانیت کی مسلسل داستان ہے، بڑی عجیب چیز ہے۔ اس میں ایک ہی چیز ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں پیش کرتا کہ یہ اکبر [1] نے فلاں سال میں تخت نشینی کی اور بابر [2] فلاں سال مر گیا۔ ہماری اس طرح کی مرتب تاریخ کو اقوام افراد کی روش سے، نظام سے، عروج و زوال کے ٹکراؤ سے واسطہ نہیں ہے۔ اسی لیے جتنی اقوام کا قرآنِ کریم نے ذکر کیا ہے، اس نے ان کے تاریخی سن یا مقام زیادہ نہیں دیئے۔ دیا اس نے یہ ہے کہ اس قوم نے اس قسم کی روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا، دوسری قوم نے اس کے خلاف اچھی روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ یوں خوشگوار نکلا اور اس کے بعد کہا ہے کہ یہ سنت اللہ ہے: وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) یہ خدا کی روش ہے، اس کے مطابق یہ ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہمارے ساتھ اس کا تعلق محض خبر کا نہیں ہے، تاریخ کا تعلق ہے۔ یہ صرف معلومات (Information) ہی نہیں ہے، کچھ اور ہی بنیادی اہم چیز ہے۔

قرآن تاریخی واقعات سے اقدارِ خداوندی کی اہمیت کو واضح کرتا ہے

ہمارے ہاں جو History (تاریخ) پڑھائی جاتی ہے، وہ صرف Informatory (معلوماتی) ہوتی ہے مثلاً اکبر [1] کس سال تخت نشین ہوا اور بابر [2] نے کس سال فلاں کو شکست دی۔ قرآن کہتا ہے کہ تاریخ یہ ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام قائم کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ جب بھی کوئی قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ یہ ہے Philosphy of History (فلسفہ تاریخ)۔

قرآن کے نزدیک تاریخ انسانوں کے تابع ہوتی ہے

قرآن کی رو سے، بات دوسری طرف چلی جائے گی، ہمارے دور میں فلاسفی آف ہسٹری ایک خاص Subject (مضمون) بن کے سامنے

---

[1] اکبر، شہنشاہ ہمایوں کا بیٹا (1542-1605AD)، ہندوستان میں تیسرا شہنشاہ (1556-1605ء) جو عمر کوٹ صوبہ سندھ، پاکستان میں پیدا ہوا اور 13 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

[2] بابر، حقیقی نام ظہیر الدین (1483-1530AD)، باپ کی طرف سے منگول، ماں کی طرف سے چنگیز خان سے متعلق، ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی، پہلا شہنشاہ (1526-1530ء) جس نے سلطان ابراہیم لودھی (1517-1526AD) کو شکست دی۔

آیا ہے۔فلاسفی آف ہسٹری یعنی ہسٹری آف فلاسفی نہیں' فلسفے کی تاریخ نہیں' تاریخ کا فلسفہ۔ ویسے تو ہیگل [1] (1770-1813ء) کو اس کا امام کہا جاتا ہے' یہ اس نے پیش کیا ہے اور واقعی اس کی کتاب اس قابل ہے کہ اس کو یہ کہا جائے کہ فلاسفی آف ہسٹری میں اس کا بہت بڑا درجہ ہے' اور اسی کے فلسفے پر کارل مارکس نے بھی اپنا معیشت کا نظام دیا ہے۔ یہ ہے فلاسفی آف ہسٹری۔ کارل مارکس (1818-83) کے ہاں دلیل جو ملتی ہے وہ Historical Necessity (تاریخ وجوب) کی ہے۔ Necessity (وجوب) فلسفے میں اس دَور کو کہتے ہیں جسے انسان ٹال ہی نہ سکے' جو ہو کر رہے۔ اب میں اسے دو لفظوں میں' عرض کر ہی دوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ احباب اتنے حصے کو توجہ سے سن رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ کسی دور میں جس قسم کا معاشی نظام قائم ہوگا' اسی قسم کی وہ قوم بن جائے گی۔ انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو تبدیل کیے بغیر خود کچھ اور ہو جائے۔ اسکے لیے وہ اس قسم کا معاشی نظام پیش کرتے ہیں۔ جس قسم کے انسان تھے' اس قسم کا معاشی نظام تھا' سو وہ اس قسم کے انسان تھے۔ گویا وہ انسانوں کو اس قسم کے معاشی نظام کے تابع رکھتے ہیں' جس کے بنانے اور بدلنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔

ہیگل کا فلسفہءتاریخ انسانی اختیار وارادے کو سلب کر لیتا ہے

جب ان سے پوچھا گیا کہ صاحب! اس قسم کا یہ نظام کون بنا دیتا ہے جس کے سامنے انسان بھی مجبور ہوتا ہے' تو اس کے لیے ان کے پاس کوئی Explanation (وضاحت) نہیں تھی' صرف Historical Necessity (تاریخ کا تقاضا یا وجوب) کی' ایک اصطلاح تھی: صرف یہ کہ تاریخ ایسا چاہتی تھی اس نے ایسا کر دیا۔ پہلی چیز تو اس میں یہ رہی کہ انسان اس تاریخ کے ہاتھوں مجبور ہو گیا جس کے بنانے' بگاڑنے' تبدیل کرنے میں اس کا کوئی ہاتھ ہی نہیں ہے۔ انسانیت تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ان کے ہاں کا فلسفہ تاریخ [2] ہے۔

---

[1] Hegel, Georg Wilhelm Friedrich (1770-1831AD) German Philosopher. His main works, including Encyclopaedia of Philosophical Sciences (1817) and the Philosophy of Right (1821), proposed that truth is reached by a continuing dialectic: an initial thesis, when found unsatisfactory, generates an antithesis: these interact to form a Synthesis, which may itself constitute a new thesis. Marx and Engels adapted the theory. (Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London:The Reader`s Digest Association Limited, p . 715)

[2] ہیگل کا فلسفہ: اس کے فلسفے کے خطوط یہ ہیں: (۱) تمام کائنات ایک مسلسل تغیر کا نام ہے۔ یہاں کوئی شے جامد (Static) نہیں۔ ہر شے میں ہر آن تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ (۲) اشیاء درحقیقت تصورات (Ideas) کا مظہر ہیں لہٰذا یہ کائنات دنیائے تصورات (World of Ideas) ہے۔ (۳) جو کچھ اشیاء کے متعلق اوپر کہا گیا ہے وہ درحقیقت تصورات کے متعلق ہے یعنی یہاں کوئی تصور اپنی مکمل حالت میں نہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

قرآنِ حکیم انسان کو مجبورِ محض قرار نہیں دیتا

ایک قرآن کا فلسفہ تاریخ بھی ہے۔ ہمارے ہاں ابنِ خلدون ❶ نے اپنے مقدمے میں اس کی وضاحت کی ہے لیکن یہ فلسفہ تو قرآن نے دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ انسان Determined (مجبور و مقہور) ہے یعنی انسان مجبورِ محض ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بات انسانیت کے خلاف ہے۔ انسان کسی خارجی قوت کے تابع مجبور نہیں ہوتا' اس میں اتنی بڑی قوتیں اور صلاحیتیں ہیں

(**پچھلے صفحہ کا حاشیہ**) ہر تصور نا تمام ہے۔ اس لیے اس میں ہر آن تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ (۴) زمانۂ سلف میں اشیاء اور تصورات کو جامد تسلیم کیا جاتا تھا' اس لیے ان کے متعلق منطق (Formal Logic) کی رو سے گفتگو کی جاتی تھی۔ اس اندازِ منطق میں صغریٰ اور کبریٰ دونوں مستقل ہوتے تھے اور اس سے مستقل نتیجہ مرتب کر لیا جاتا تھا لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہاں کی کوئی شے مستقل اور جامد ہے ہی نہیں' یہ اسلوب منطق بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ اس کی جگہ اب ایک نیا منطق آنا چاہیے۔ اس منطق کا نام ہیگل کی اصطلاح میں جدلیت (Dialecic) ہے۔ اس میں صغریٰ کی جگہ (Thesis)' کبریٰ کی جگہ (Antithesis) اور نتیجہ مستخرجہ کی جگہ Synthesis کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں (۵) ایک تصور (Idea) اپنی نا تمام حالت میں سامنے آتا ہے' اسے Thesis کہتے ہیں لیکن اس کی ''نا تمامیت'' کو پورا کرنے کے لیے اسی میں سے ایک دوسرا تصور وجود کوش ہوتا ہے جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے' اسے Antithesis کہا جاتا ہے۔ ان دونوں تصورات کی باہمی کشمکش (جنگ و جدل) سے ایک تیسرا تصور ا پیدا ہوتا ہے جسے Synthesis کہتے ہیں۔ یہ جدید تصور' پہلے دونوں تصورات سے متمیز ہوتا ہے۔ اس میں ان دونوں تصورات کے محاسن موجود ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کا مقام ان سے بلند ہوتا ہے لیکن یہ تصور پھر نا تمام ہوتا ہے۔

اب یہ نا تمام تصور پھر ایک نیا Thesis بن جاتا ہے' اس میں سے ایک Antithesis پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دونوں باہمی جدلیت سے ایک نئے Synthesis کی تخلیق کا موجب بن جاتے ہیں۔ کائنات میں ارتقا اسی عمل سے جاری و ساری ہے: انسداد کی کشمکش سے ارتقا۔ (۶) یہ ارتقائی سلسلہ بلندیوں کی طرف جا رہا ہے تا آنکہ ایک دن اس کشمکش مسلسل اور پیکار غیر منقطع سے' ایک مکمل تصور کی نمود ہوگی اسے عالمگیر تصور (Universal Idea) یا مطلق تصور (Absolute Idea) کہا جائے گا۔ درحقیقت یہ تمام جنگ و پیکار محض اس لیے ہے کہ یہ عالمگیر یا مطلق تصور اس طریق سے تکمیل خویش (Self-realization) چاہتا ہے۔ اس جدلی ارتقا سے اس کی مضمر ممکنات بتدریج مشہور ہوتی جاتی ہیں اور ان کی مکمل مشہودیت کا نام اس کی نمودِ ذات ہے۔ اسی کو ہیگل روحِ کائنات (World- spirit) بھی کہتا ہے۔ (۷) کوئی تصور' مجرد شکل (Abstract Form) میں سامنے نہیں آ سکتا۔ تصورات ہمیشہ انسانی جدوجہد کے پیکر میں مشہود ہوتے ہیں۔ اس جدوجہد کو انسانی تہذیب کہا جاتا ہے لہٰذا سطور بالا میں جس چیز کو جدلی ارتقا کہا گیا ہے وہ اپنے لباسِ مجاز میں انسانی تہذیب کی کشمکش پیہم ہے۔ ایک نا تمام تہذیب سے ایک نئی تہذیب ابھرتی ہے جو اس کی ضد ہوتی ہے۔ ان دونوں کی کشمکش سے ایک تیسری تہذیب منصۂ شہود پر آتی ہے جو پہلی دونوں تہذیبوں کے محاسن کو اپنے دامن میں لیے ہوتی ہے اور ان کی مذمومات کو الگ کر دیتی ہے پھر یہ نئی اور نا تمام تہذیب اسی پیکار کی اگلی کڑی بن جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلا آتا ہے اور اسی طرح جاری رہے گا تا آنکہ دنیا پر وہ آخری تہذیب چھا جائے گی جو روحِ کائنات کی مکمل نمود کا پیکر ہوگی۔ یہ ہے ہیگل کے نظریہ کے مطابق شاہراہِ زمانہ پر روحِ کائنات کی داستانِ سفر! (پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ طلوعِ اسلام ٹرسٹ' لاہور' 2002' ص ص 277 تا 278)

❶ عبدالرحمٰن بن محمد ابن خلدون (1332-1406AD)

کہ یہ خارج کی ان تمام چیزوں کو اپنی منشا کے مطابق تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں' انسان ہی ان کو تبدیل کر سکتا ہے اور ان کی جگہ دوسرا نظام لا سکتا ہے۔ مجبور یہ یہاں ہوتا ہے کہ جب جس قسم کا یہ نظام لاتا ہے' اس کے نتائج نہیں بدل سکتا۔ یہ تو اسکے اپنے بس میں ہے کہ جی چاہے سنکھیا کھالے' جی چاہے اس کو اٹھا کے پھینک دے' لیکن جب یہ سنکھیا کھالے تو پھر یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے کہ اس کا نتیجہ ہلاکت نہ ہو' حیات آور ہو جائے۔ یہاں انسان مجبور ہوتا ہے' وہاں مجبور نہیں ہوتا۔ تاریخ یہ ہے کہ انسان خود ایک نظام قائم کرتا ہے۔ یہ اس کے بس کی بات ہے' خود کرتا ہے لیکن اس نظام کے جو نتائج ہوتے ہیں ان کو الٹ نہیں سکتا۔ سنت اللہ ان نظاموں کے نتائج کا نام ہے۔ انہیں یہ بدل نہیں سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے فلسفے میں ان دونوں میں کتنا فرق آ گیا: وہ کمیونزم کا فلسفہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ یہ قرآن کا فلسفہ ہے کہ انسان ہی نظام بناتا ہے اور انسان چاہے تو ان نظام کو تبدیل کر دیتا ہے۔

تاریخِ انسانی' تاریخ کے نتائج کی امین ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہ ہیں وہ داستانیں جو قرآن نے اقوامِ سابقہ کی بیان کی ہیں کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام بنایا' اس کے ہاتھوں تباہی ہوئی' انقلاب لانے والوں نے اس قسم کا نظام قائم کیا' اس کا نتیجہ خوشگواریاں ہوا۔ یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ ہم نے قوانین نازل کیے اور ان قوانین کی صداقت کے شہادت کی طور پر تمہارے لیے تاریخ نازل کی کہ تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ ظالم پنپ نہیں سکتا اس کی شہادت کیا ہے۔ راتوں رات تو ظالم تباہ ہوتا نہیں' وہ تو پنپ رہا ہوتا ہے اور اسی سے انسان دھوکے میں آ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس انسان یا اس قوم یا اس نظام کی اس وقت کی حالت کو نہ دیکھو' اس قسم کے نظام پہلے گزر چکے ہیں' ان کے نتائج پہ نگاہ رکھو اور تاریخ کا فلسفہ یہ ہے کہ جس نظام نے جو نتیجہ اس وقت پیدا کیا تھا وہ نظام ہر زمانے میں وہی نتیجہ پیدا کرے گا' یہ ہے' عزیزانِ من! قرآن کا تاریخ کا فلسفہ اور اس کے لیے اس نے تاریخ کو اتنی اہمیت دی ہے۔

نتائج کو قرآنی تاریخ کے معیار پر پرکھنا ہوگا

دنیائے مذاہب میں آپ کہیں یہ بات نہیں دیکھیں گے کہ خدا کہے کہ ہم نے قوانین نازل کیے اور اسکے ساتھ تاریخ نازل کی۔ تاریخ بھی جو خدا کی نازل کردہ ہوگی' وہی سچی تاریخ ہوگی۔ جب انسان تاریخ بناتے ہیں تو وہ تو پوچھو نہیں کہ پھر تاریخ کیا بنتی ہے۔ وہ تو افسانے ہوتے ہیں اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ وَ كُلًّا ضَرَبۡنَا لَهُ الۡاَمۡثَالَ ۫ وَ كُلًّا تَبَّرۡنَا تَتۡبِيۡرًا (25:39) ہر قوم آئی اور ہم نے اس کے سامنے اس کی پہلی قوموں کی تاریخ پیش کی۔ انہوں نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ وہ اپنی روش پر اڑے رہے اور آخر الامر تَبَّرۡنَا تَتۡبِيۡرًا (25:39) ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ہلاک ہو گئے۔ ہر غلط نظام کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اب یہ ساری چیزیں ہیں اور آگے ایک اور قوم کا بھی ذکر ہے۔ کہا کہ **وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِیْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا** (25:40) یہ تو بہر حال داستانیں ہیں جو تم انہیں سنا رہے ہو۔ عاد اور ثمود تو ذرا دور کی بات ہے۔ ایک اور قوم بھی ہے جسے قوم لوط کہا جاتا ہے۔ اس کی بستیوں کے کھنڈرات تو اس شاہراہ پر واقع ہیں جہاں سے یہ عرب دن رات گزرتے ہیں۔ ان کی داستانیں، ان کا انجام، تو ان کا آنکھوں دیکھا ہوا ہے۔ **اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا** (25:40) ان سے پوچھو کہ کیا تم ان کھنڈرات کو دیکھتے نہیں ہو؟ عقل کے اندھو! کیا تم ان کو دیکھتے نہیں ہو؟ کہا کہ یہ ان کھنڈرات کو تو دیکھتے ہیں اور جواب دیا کہ **بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا** (25:40) یہ قانونِ مکافاتِ عمل کو نہیں دیکھ سکتے کیونکہ ان کا اس پہ ایمان نہیں ہے کہ خدا مردہ قوم کو بھی زندہ کر سکتا ہے اور زندہ اقوام کی یہ کیفیت بھی کر سکتا ہے۔ اصل میں ان کا اس قانونِ مکافاتِ عمل (Law of Requital) پر ایمان نہیں ہے، دیکھتے تو ہیں۔

مومن کے دیکھنے اور ایک آرکیالوجسٹ کے دیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے

اب دیکھنے اور دیکھنے میں آپ دیکھیے کتنا فرق ہو گیا! ایک تو آرکیالوجسٹ (ماہر حضریات [1]) دیکھتا ہے۔ یہ جو کھدائیاں کر کے نشانات نکالتے ہیں، پھر پرانے شہروں کی اینٹوں سے، ٹھیکریوں سے، وہ اتنا ہی متعین کرتے ہیں کہ یہ اس زمانے کی بات ہے، دو ہزار سال قبل مسیح، چھ سو سال قبل مسیح، فلاں دور کے اندر کی بات ہے۔ یہ اتنا کچھ یہاں بھی ہم نے دیکھا ہے۔ رشیا میں ایک کھدائی ہوئی تھی۔ وہاں بھی دیکھا ہے۔ وہ صرف اتنا ہی دیکھتے ہیں لیکن قرآن ان سے آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے، اتنا ہی نہ دیکھو۔ اگر ان کھدائیوں کے بعد بھی دیکھنا ہے، اگر تمہارے پاس کوئی ذریعہ علم ہے، تو اس سے یہ دیکھو کہ اس قوم نے کس قسم کا نظام بنایا تھا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا، لیکن قانونِ مکافات پہ تو ہمارے اس دور کا بھی ایمان نہیں ہے۔ ہمارا یہ دور تو ہے ہی میکیا وَلی سیاست کا دور: جو جتنا زیادہ شاطر ہو، جتنا زیادہ ہوشیار ہو، جتنا زیادہ چابک دست ہو، وہ سمجھتا ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوتا ہے اور اسکے بعد یہ نظام یا اُس قوم کی روش یا اس کے نتائج جب سامنے آتے ہیں تو توجہ اس پہ جاتی ہے کہ کسی جگہ کوئی کمی رہ گئی تھی، کوئی رخنہ رہ گیا تھا۔ یعنی اپنے اس غلط پروگرام میں رخنہ دیکھتے کہ کہاں رہ گیا تھا۔ یہ نہیں دیکھا یا جانا جاتا کہ اس روش اور اس نظام کا حتمی نتیجہ یہ نکلنا تھا جو نکلا ہے۔ وہ دیکھتے یہ ہیں کہ رخنہ کہاں رہ گیا تھا۔ اس کے بعد جب دوسرے آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی تدبیروں میں یہ رخنہ رہ گیا تھا۔ آؤ، پہلے ان رخنوں کو بند

---

[1] حضریات: علم الآثار

کریں۔قرآن کہتا ہے کہ ان کو بند کر لینے دیجیے' وہ تباہی جب ہمارے قانونِ مکافات کے عمل کی رو سے آتی ہے تو **مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ** (39:25) وہ وہاں سے آتی ہے جو ان کے عقل و شعور میں بھی نہیں ہوتا۔عقل و شعور کی رو سے تو وہ مکافاتِ عمل کا ہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔وہ قانون سامنے ہو تو یہ کچھ کریں ہی کیوں! یہ تو ہوتا ہی اس لیے ہے کہ وہ قانونِ مکافاتِ عمل سامنے نہیں ہوتا۔یہ ہے قرآن کی رو سے امم سابقہ کی بات۔یہاں تک قرآن نے یہ دہرایا ہے۔

یہ کچھ بیان کرنے کے بعد قرآن پھر نبی اکرم ﷺ کی طرف آ گیا ہے۔کہا کہ **وَ اِذَا رَاَوْکَ اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا هُزُوًا**[1] (25:41)۔ بات بھی آگے پھر حضور ﷺ کی طرف پلٹ گئی ہے' اسے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی آیت 40 تک ہم آ گئے' 41ویں آیت سے ہم آئندہ جمعہ کو لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

---

[1] یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ تجھے دیکھتے ہیں تو مذاق کرتے ہیں۔

دسواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 41 تا 49)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿41﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ
اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿42﴾
اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿43﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ
اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿44﴾ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ
وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿45﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿46﴾
وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿47﴾ وَهُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ
الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿48﴾ لِّنُحْیِ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ
مِمَّا خَلَقْنَاۤ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِيْرًا ﴿49﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1978ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 41 سے ہو رہا ہے: (25:41)۔ اس قدر نامساعد موسم میں بھی آپ احباب کا درس کے لیے جمع ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ فکر قرآنِ کریم آپ کے دل کی گہرائیوں میں موجود ہے اور یہ چیز میرے لیے بڑی وجہ مسرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ذوق میں مزید برکت عطا فرمائے۔

مذہب کی دنیا میں سیرتِ رسول ﷺ کی کیفیت

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ ربیع الاول کا مبارک مہینہ ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے تذکارِ جلیلہ عام ہوتے ہیں اور قرآنِ کریم میں بھی آج کل ہمارے سامنے وہ آیات ہیں جن میں اس کشمکش کا ذکر ہے جو اس پیغام کے عام کرنے سے نبی اکرمؐ اور مخالفین کے اندر برپا ہوئی۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ یہ دین اسلام، مذہب میں بدل گیا اس لیے حضور ﷺ کی سیرت کا بھی جو نقشہ سامنے لایا

جاتا ہے' وہ ایک مذہبی راہنما کا ہوتا ہے۔ یہ تو سب بتائیں گے کہ بڑی سخت مخالفت ہوئی مگر سوال یہ ہے کہ یہ اتنی شدید مخالفت کیوں ہوئی؟ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ جو بتایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ قوم بت پرست تھی' آپ ﷺ بت پرستی کو برا کہتے تھے' آپ ﷺ اپنے طریقے پر نماز پڑھنا چاہتے تھے' وہ اس طریقے پہ نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ آپ ذرا سوچیے کہ اسی معاشرے میں' انہی قریش کے ساتھ' یہودی رہتے تھے' عیسائی رہتے تھے' مجوسی رہتے تھے۔ وہ اپنے اپنے طریقے پہ عبادت کرتے تھے' پرستش کرتے تھے۔ انہی کے اندر کچھ لوگ تھے' جو حنیف کہلاتے تھے۔ وہ اپنے زعم کے مطابق اللہ کی پرستش کرتے تھے' بتوں کی مخالفت کرتے تھے' وہ سب کچھ کرتے تھے۔ قریش ان سب کو برداشت کرتے تھے۔ ان کے خلاف وہ کبھی انگلی تک نہیں اٹھاتے تھے۔ ان کی مخالفت میں کبھی بھی کچھ نہیں سننے میں آیا۔ اگر یہی چیزیں تھیں جو رسول اللہ ﷺ پیش کرتے تھے اور یہی باتیں تھیں جو آپ ﷺ ان سے کہتے تھے تو یہ کیا بات ہوئی کہ وہ انہیں تو اس طرح برداشت کرتے چلے آئے' کچھ بھی نہ کہا اور یہاں یہ کیفیت ہے کہ تیرہ سال مکے کی زندگی کے اندر پہلے اس قدر کشمکش' اس قدر مخالفت رہی اور پھر وہاں سے حضور ﷺ مدینے تشریف لے گئے تو قصہ ختم ہوا۔ اب تو نہ بتوں کو برا کہنے کی بات ہے' نہ ان کا نماز پڑھنا ان کو دکھے گا' تین سو میل کے فاصلے پہ رہائش ہے۔ اس زمانے کے تین سو میل بڑا فاصلہ تھا مگر وہ وہاں سے اٹھ کے ایک یورش کر کے' اس زمانے کی نسبت سے اتنی بڑی فوج لے کر مدینے پہ چڑھ دوڑے۔ ایک دن نہیں' دو دن نہیں' ایک لڑائی نہیں' دو لڑائی نہیں' سات سال تک یہ سلسلہ جاری رکھا جب تک کہ مکہ فتح نہیں ہوا۔ یہ کشمکش' یہ یورشیں' یہ حملے' یہ لڑائیاں' یہ جنگ جاری رہے۔ کیا یہ محض نماز پڑھنے کی بات تھی؟ جہاں تک بتوں کا تعلق ہے انہیں تو برا کہنے کے متعلق قرآن میں یہ آیا ہے کہ ان کے معبودوں کو برا نہ کہو' ان کو گالی نہ دو اور حضور ﷺ کی تو سیرت میں ہی یہ بات نہیں تھی۔ جہاں تک بت پرستی کا تعلق ہے قرآن میں تو یہ ہے کہ جب اس جماعتِ مومنین کو' ان لوگوں کو' ملک میں تمکن حاصل ہو جائے گا' قوت حاصل ہو جائے گی' ان کی حکومت ہو گی' تو یہ عیسائیوں کے گرجوں' یہودیوں کے صومعوں' مجوسیوں کے معبدوں' ان بت پرستوں کے مندروں' کی حفاظت کریں گے۔ ان کے متعلق تو یہ کچھ قرآن میں تھا۔ تو کیا اس مخالفت ومخاصمت کی یہ وجہ تھی؟

احبار ورہبان کی طرف سے حضور ﷺ کی مخالفت کی اصل وجہ

عزیزانِ من! وہ جو مخالفت ومخاصمت کی اصل وجہ ہے' وہ کبھی زبان پہ نہیں آئی' یہ لا ہی نہیں سکتے۔ ہمارا یہ سارا دور' جتنا بھی ہے جیسے میں نے کہا ہے کہ اس میں دین مذہب کی حیثیت میں بدل گیا ہے تو مذہب میں اتنی سی باتیں ہی رہتی ہیں' جبکہ ملوکیت کے سارے دور میں پہلی جو مخالفت کی وجہ تھی' وہ یہ تھی کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پہ حکومت نہیں کرسکتا۔ کیا دورِ ملوکیت کے اندر یہ بات ان سے کہی جاسکتی

تھی؟ حضور ﷺ کا تو پیغام ہی یہی تھا' وہ یہ کرنے کے لیے آئے تھے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ رہے' اس سے ملوکیت کا خاتمہ ہو جاتا۔ حضور ﷺ یہ کہنے کے لیے آئے تھے کہ یہ مذہبی پیشوائیت' یہ احبار و رہبان' جو کہتے ہیں کہ ہم تمہیں خدا کی طرف لے جاتے ہیں' درحقیقت خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے زیادہ سنگِ گراں یہ بن کے حائل ہوتے ہیں۔ کیا یہ مذہب پرست' احبار و رہبان' آپ کو یہ بتاتے ہیں کہ یہ بات تھی جو یہ لوگ حضور ﷺ کے خلاف اٹھے تھے۔ یہ تو اپنی سرمایہ پرستی کی بنا پر' سرمایہ داری کی بنا پر' غریبوں اور محنت کشوں کے خون کا' آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں۔ کیا اس دور کے اندر جہاں سرمایہ پرستی اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی' یہ کہا جا سکتا تھا کہ حضور ﷺ کا مشن یہ تھا' حضور ﷺ کا پیغام یہ تھا؟ نہ کہا گیا ہے' نہ کہا جائے گا' جب تک یہ اسلام دین میں نہیں بدل جاتا۔ یہ تھی وجہ مخاصمت۔ اسی لیے قرآن یہاں سے بات نہیں شروع کرتا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کا انقلابی پروگرام ہی ان کی سیرت تھی

پچھلے درسوں میں بتایا جا چکا ہے کہ قرآن بات حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے شروع کرتا ہے۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک کے کوائف اور داستانیں ان قوموں کی بیان کرتا ہے اور یہی چیزیں ہیں جن کو وہ وجہ مخاصمت کہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ انسانیت کے سینے پہ یہ کابوس سوار تھا۔ یہ انبیائے کرام علیہم السلام بڑی انقلابی ہستیاں تھیں' وہ یہ انقلاب لانا چاہتے تھے اور یہ وجہ تھی کہ ہر مفاد پرست طبقہ ان کی مخالفت کرتا تھا۔ آج یہ کچھ نہیں کہا جائے گا۔ میلاد کی محفلیں ہوں گی' اِن میں نعتیں پڑھی جائیں گی' حضور ﷺ کے زلف' خدوخال' اور گیسو و ابرو کی تعریفیں ہو جائیں گی' پھر اس کے بعد خدا کے ساتھ وہ ایسے مکالمے ہوں گے جیسے (معاذ اللہ) ہمجولی کھیلتے رہے ہوں۔ آپس میں یہ چیزیں ہوں گی۔ معجزات گنائے جائیں گے: ان سب بتوں کو توڑا گیا اور مجوسیوں کے وہ آتش کدوں کو ٹھنڈا کیا گیا۔ بس یہ سارے قصے' جتنے بھی ہیں' آپ ہر سال دیکھتے چلے آ رہے ہیں یہی دہراتے چلے جائیں گے۔ یہ چیز کبھی نہیں کہیں گے۔

یہ جو پچھلی آیات کے اندر قرآن نے یہ کہا ہے کہ اے رسول ﷺ! تمہارے ہی ساتھ یہ نہیں ہو رہا۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہر دور کے مجرمین یہی کیا کرتے تھے۔ قرآن صرف غیر مسلم ہونے کی وجہ سے تو کسی کو مجرم نہیں کہہ سکتا۔ ٹھیک ہے کہیے کہ غیر مسلم یہ کیا کرتے تھے۔ اس نے کہا کہ مجرمین یہ کیا کرتے تھے اور عربوں کے ہاں تو جرم تھا ہی یہ پہلی چیز کہ دوسرے کے درخت کے پھل دار ٹہنے کو کاٹ کے اپنے گھر میں لے آنا۔ وہ اسے جرم کہا کرتے تھے۔ اس کے اندر ساری بات یہ کشمکش' جو ہم دہراتے چلے آ رہے ہیں آ گئی۔ یہ کشمکش کتنی شدید تھی؟ میں کہتا ہوں نبی اکرم ﷺ کی سیرت اس تاریخ کی رو سے نہیں مرتب کرنی چاہیے جو ہمارے دورِ ملوکیت کے اندر مرتب ہوئی ہے اور جو آج تک ہمارے نصابوں میں داخل ہے۔ یہ سیرت قرآن کی رو سے مرتب کی جائے گی جس میں خدا نے یہ کہا تھا کہ تمہارے لیے

رسول ﷺ کی زندگی میں اسوہ حسنہ ہے' نمونہ ہے' ماڈل ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو قرآنِ حکیم میں محفوظ کرنے کی اہمیت

خدا کی ذمہ داری تھی کہ وہ ماڈل ہمارے سامنے رکھے' ورنہ کسی کلاس کے اسٹوڈنٹس (طالب علموں) کو یہ کہہ دیا جائے کہ صاحب! تم اس ماڈل کے مطابق اپنی کاپیوں کے اندر ایک اسکیچ (Sketch) کھینچو' ایک پینٹ بناؤ' تصور بناؤ' پینٹ کرو' اور ماڈل سامنے نہ رکھا جائے تو آپ سوچیے کہ اول تو وہ بنائیں گے کیا اور اپنے اپنے تصور کے مطابق جو کچھ وہ بنائیں گے' وہ ہوگا کیسا؟ وہ ماڈل سامنے رکھنا چاہیے۔ جس خدا نے یہ کہا تھا کہ رسول ﷺ کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے اس خدا نے وہ ماڈل اپنی کتاب کے اندر محفوظ کر کے رکھ دیا ہوا ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں نے قرآن کی رو سے اس ماڈل کو اپنی کتاب ''معراجِ انسانیت'' میں بتایا۔ وہاں دیکھیے کہ یہ کشمکش کیا ہے اور میں نے تو پھر اپنی ساری کتابوں میں ''جوئے نور' برقِ طور' شعلہ مستور'' اور پھر ''حضور ﷺ کی معراجِ انسانیت'' میں بتایا ہے کہ اصل مسئلہ کیا تھا' مخاصمت کیا تھی' کشمکش کے اسباب کیا تھے' یہ کیا چیزیں تھیں؟ یوں یہ تاریخ سامنے آئے گی تو ان کی عظمت سامنے آئے گی۔ سوچیے کہ یہ کشمکش کتنی زیادہ سنگین کشمکش تھی' کتنی سخت کشمکش تھی کہ جب یہ مراحل طے ہوئے ہیں تو اس وقت خود خدا نے رسول اللہ ﷺ سے یہ یاد دہانی کرائی کہ **اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ** (94:1)۔ یہ عجیب چیز ہے' عزیزانِ من! کہا کہ اے رسول ﷺ! سوچو تو سہی' یہ سارا کچھ جو اس تئیس سال کی زندگی میں' تم برداشت کر گئے ہو' یہ اس لیے تھا کہ ہم نے تمہارے سینے میں کشاد پیدا کر دی تھی۔ بڑی ضروری ہوتی ہے سینے کی کشادگی۔

میں ابھی عرض کرونگا کہ اس کشاد کے لیے میدانِ جنگ کے اندر تیر و تفنگ کا مقابلہ ہی مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کے علاوہ بھی کتنی ہی قسم کی چیزیں مخالفین کی طرف سے آتی تھیں اور اس کے لیے کتنے ہی بڑے کشادِ سینہ کی اور کتنے بڑے ظرف کی ضرورت تھی اور پھر کشاد کی یہ کیفیت ہے کہ یہ قریش اس قدر تئیس سال تک یا کم از کم بیس سال تک اتنی سنگین مخالفت کرتے رہے کہ وہ تاریخ کے مطابق کم از کم بیاسی چھوٹی اور بڑی لڑائیاں ہیں جو انہوں نے لڑیں اور جب مکہ فتح ہونے کے بعد سارے کے سارے پا بجولاں' زنجیروں میں بندھے سامنے آ گئے اور آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ کہو تمہارے ساتھ آج کیا سلوک کیا جائے تو وہ بھی قریش تھے' انہوں نے کہا کہ جو شریف دشمن' دشمن کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بس ٹھیک ہے' شریف دشمن کہہ رہے ہو' آج تم اعتراف کرتے ہو کہ تم غلطی پر تھے اور تم نے زیادتیاں کیں؟ انہوں نے کہا کہ ہم اعتراف کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) تو پھر اب کوئی گرفت تمہارے اوپر نہیں۔

عزیزانِ من! قوت اور اقتدار کا ہاتھ میں ہونا، یا بجولاں دشمنوں کا سامنے ہونا اور اس وقت یہ چیز کہنا کہ ہاں جب تم اپنے ان جرائم کا اعتراف کرتے ہو اور آئندہ اصلاح کے لیے تم وعدہ دیتے ہو تو اب انتقام کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ہے **اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ** (94:1) کہ اے رسول ﷺ! اس نظام کے قیام میں جن مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے اور اس کی آخری کامیابی میں جو تاخیر ہو رہی ہے، اس سے اثر پذیر اور ملولِ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تم ذرا سوچو کہ نبوت ملنے سے پہلے اور اس کے بعد ابتدائی مراحل میں، تمہاری پریشانیوں اور تفکرات کا کیا عالم تھا۔ پہلے تم تلاشِ حقیقت میں سرگرداں و پریشاں پھرتے تھے، تمہیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی اور کشادگی کی کوئی راہ تمہارے سامنے نہیں کھلتی تھی۔ اس مقام پر ہم نے تمہیں وحی عطا کی جس سے زندگی کی تمام راہیں روشن ہو گئیں۔ تمہارے سینے میں اس قدر کشادگی پیدا ہو گئی کہ جو مہم پہلے ناقابلِ تسخیر نظر آتی تھی اس کا سر کرنا ممکن دکھائی دینے لگا۔ تمہاری ہمت اور حوصلے وسیع ہو گئے۔

نبوت کی کشادہ ظرفی کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد

عزیزانِ من! پروگرام کے ابتدائی مراحل میں سختیٔ منزل اور تنہائیٔ سفر کے احساس اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے کمر ٹوٹ رہی تھی اور اس پر برداشت کی یہ قوت کہ تئیس سال تک اس قدر مایوس کن مراحل آئے ہیں، کسی مرحلہ میں مایوسی نہیں آئی۔ اس کے لیے بہت بڑا جگر چاہیے اور جب قوت ہاتھ میں آئی ہے تو انتقام کا ذرا شائبہ تک نہیں آیا۔ یہ ہے **اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ** (94:1) نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ **وَ وَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ o الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَکَ** (94:2-3) وہ بوجھ کہ جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی، آہستہ آہستہ خدا نے تمہارے رفقا کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح وہ بوجھ اٹھا لیا گیا۔ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ اس بوجھ نے تیری کمر توڑ رکھی تھی۔ کیا وہ یہی بوجھ تھا کہ آپ ﷺ بتوں کو برا کہتے تھے، وہ آپ ﷺ کو نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے؟

عزیزانِ من! وہ بوجھ کہ جس نے رسول اللہ ﷺ جیسی ہستی کی کمر توڑ رکھی تھی، وہ اس پروگرام کے ابتدائی مراحل میں سختیٔ منزل اور تنہائیٔ سفر اور کمر شکن ذمہ داریوں کا بوجھ تھا۔ شروع شروع میں کیفیت یہ تھی کہ کوئی شخص سنجیدگی سے تمہاری بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تھا اور ہر طرف سے طعن و تشنیع کی دل خراش آوازیں سوہانِ روح ہوتی تھیں۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ خدا نے یہ کہا کہ **وَ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ** (94:4) تیرے شرف و مجد بامِ ثریا تک پہنچ گئے۔ رہتی دنیا تک، دنیا کو یہ چیز یاد رہے گی۔ اتنی بلندیوں تک تیرا ذکر جا پہنچا! یہاں ذکر کے معنی شرف کے ہیں۔ تیرا شرف اتنی بلندیوں تک پہنچ گیا ہے۔ کس طرح سے پہنچا؟ یہ ایک بڑا

ہی اہم سوال ہے۔

آسانیوں کا حصول ہمیشہ خونِ جگر کا متقاضی ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے بات کرتا ہے تو دلیل دیتا ہے وجہ جواز بیان کرتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا o اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا** (94:5-6) سہولت اور آسانی کی زندگی یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں میسر آئی ہے آ ہی نہیں سکتی یہ تو بڑی بڑی مشقتوں کے بعد آسانیاں آتی ہیں۔ بڑی بڑی مشقتوں کے بعد آسانیاں آتی ہیں یہ دو دفعہ دہرایا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ پہلی زندگی جو تیرہ سال مکے کی ہے اس کے اندر آپ کی جو عسرت تھی جو مشقتیں مصیبتیں اٹھانا پڑی تھیں اس کے بعد ہجرت کر کے حضور ﷺ مدینے تشریف لے آئے تو وہ اِدھر کا دور جو مکے کے اندر رہ کر یہ چیز برداشت کرنے کا تھا وہ ختم ہوا۔ مدینے میں حالات تو مساعد ہو گئے۔ پہلا تو یہ یسر تھا جو اس عسر کے مقابلے میں آیا۔ اب مدنی زندگی کے اندر ان مخالفین نے پھر ان چیزوں کو جاری رکھا اب پہلے سے بھی زیادہ سخت میدانِ جنگ میں آنا پڑا اور یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد فتح مکہ کے بعد پھر یسر آیا۔ یہ پھر دوسرا **اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا** (94:6) ہے۔

ایک نہ ختم ہونے والا پروگرام

اس مقام پہ ہر تذکرہ نویس ہر مورخ بلکہ ہر سیاستدان ہر وہ شخص جو اپنے سامنے پروگرام رکھتا ہے وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ لیجیے صاحب! معاملہ ختم پروگرام طے ہو گیا فتح ہو گئی کامیابی ہو گئی لیکن یہ پروگرام محض دشمنوں کی مخالفت کو سر کرنے ہی کا تو نہیں تھا پروگرام تو کچھ اور تھا۔ یہ پروگرام تو اس نظامِ خداوندی کو اس نظامِ ربوبیت کو کہ جس میں دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے نہیں مرنے دینا اس نظام کو عالمگیر بنانے کا پروگرام سامنے تھا۔ یہ جو مشکلات کا مقابلہ تھا وہ سر ہو گئیں وہ ختم ہو گئیں تو اسکے بعد جیسا کہ میں نے کہا ہے قرآن کو اس انداز سے دیکھیے دنیا کا ہر شخص جو اس طرح سے پروگرام کو طے کرتا ہوا آئے گا کہے گا کہ الحمدللہ صاحب! مشکلات حل ہو گئیں اب چار دن آرام سے گزریں گے وہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد جب یہ ادھر کی مشکلات مخالفتیں سر ہو گئیں ختم ہو گئیں یعنی **فَاِذَا فَرَغۡتَ** (94:7) اب جو تُو ادھر سے فارغ ہوا تو ہمارے ذہن میں یہ ہے کہ آگے ہونا یہ چاہیے تھا کہ اب چار دن آرام سے سوچا مگر قرآن کہتا ہے کہ **فَاِذَا فَرَغۡتَ** (94:7) جب تُو ادھر سے فارغ ہو گیا ہے تو **فَانۡصَبۡ** (94:7) اب جم کر کھڑا ہو۔ یا اللہ! اب جم کے کھڑا ہو۔ بھئی! یہ کاہے کے لیے؟ کہ **وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ** (94:8) خدا کے نظامِ ربوبیت کے لیے اب زیادہ رغبت سے کام کر جن مشکلات کا سامنا تھا راستے کے اندر رکاوٹیں تھیں وہ دور ہو گئیں۔ یہ رکاوٹیں دور کرنا ہی تمہارے لیے مقصود بالذات نہیں

تھا۔ یہ جو ایک منزل تک پہنچنے کے لیے راستہ ہموار کیے جا رہا تھا' لو بھئی راستہ ہموار ہوا' اور چلو اب۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ پروگرام' یہ نظام' یہ مشکلات' یہ سیرت حضور ﷺ کی! یعنی **فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ** (94:7) لہٰذا' جب تم پچھلی مہم سے فارغ ہو جاؤ تو پھر' خدا کے نظام ربوبیت کو مزید وسعت دینے کے لیے' ایک تازہ مہم کے لیے تیار ہو جاؤ لیکن اس سارے پروگرام میں ایک بلند حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔ اور وہ یہ کہ ایسا نہ ہو کہ کامیابیوں کے بعد' تمہاری توجہ کسی اور طرف منعطف ہو جائے۔ [1] یا اللہ! یہ وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

پہلے سے بھی زیادہ مشکل پروگرام کی تعلیم و تربیت کا مرحلہ تھا

عزیزانِ من! اب تو اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلہ ہے۔ کہا کہ **اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ o وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا** (110:1-2) جب خدا کی نصرت بھی آ گئی' معاملہ فتح بھی ہو گیا' دروازے کھل گئے اور تو دیکھتا ہے کہ لوگ جوق در جوق' فوج در فوج' اب دین کے اندر داخل ہو رہے ہیں تو یہ جشن منانے کا وقت تھا۔ فتح کے معنی یہ ہوتا ہے۔ پھر آرام سے سو جاؤ کہ شکر ہے الحمدللہ۔ کہا کہ نہیں اب تو **فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا** (110:3) خدا کی ربوبیتِ عامہ کو عالمگیر بنانے کے لیے اور سرگرداں ہو جا۔ اس عمل کے اندر **وَ اسْتَغْفِرْهُ** (110:3) اس سے اپنی حفاظت کا سامان طلب کر کہ اب اس کو عالمگیر بننا ہے۔ غور کیجیے' ان تمام مشکلات کے سر کرنے کے بعد ایسا نظر آتا ہے کہ پروگرام اب شروع ہوا اور ایک نکتہ اور بھی ہے جو کسی دوسرے وقت عرض کروں گا [2] کہ یہ جو فوج در فوج کہا ہے کہ لوگ اس دین میں داخل ہونے لگ گئے' یہ وقت واقعی ایسا تھا کہ یہ جو یوں شباشب فوج در فوج داخل ہوئے تھے' ان کی تعلیم و تربیت کا مرحلہ پہلے سے زیادہ مشکل تھا۔ پہلے مرحلے میں ایک ایک فرد آتا تھا۔ اس وقت آتا تھا جب وہ اپنے قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے ان صداقتوں کو سمجھ لیتا تھا' پا لیتا تھا' یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھیں' یہ ایک فرد ساتھ ملتا تھا تو یہ تو Asset ہی Asset ہوتا تھا اور اگر فوج در فوج آنے شروع ہوئے ہیں تو ان کی تو تعلیم و تربیت ایسے نہیں ہوئی تھی اور رسول ﷺ کا فریضہ تھا کہ **یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ** (2:129) اس نے تو تعلیم و تربیت کرنی تھی۔ **وَ یُزَکِّیْهِمْ** (2:129) اور اس طرح سے ان کی ذات کی نشوونما کرنی تھی۔ پہلے افراد تو یہ سب کچھ سمجھ سوچ کر' تنا کچھ حاصل کر کے' آئے تھے۔ اب یہ لوگ فوج در فوج آئے ہیں اور ایک نیا مرحلہ شروع ہو گیا ہے۔

---

[1] ان تمام نکات کی مکمل وضاحت کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' سورۃ الم نشرح' اور سورۃ النصر' ص ص 484 تا 487 اور 588 تا 596)۔

❷ اس کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' سورۃ النصر' ص ص۔ 588 تا 596

عزیزانِ من' یہ ہے وہ سیرت طیبہ' یہ ہے وہ انقلابِ عظیم۔ سارا قرآن اس تذکارِ جلیلہ سے بھرا ہوا ہے۔ یہ چیزیں ہیں کہ جب آپ کے ذہن میں دین ایک نظام کی شکل میں آئے گا' تو یہ ہیں وہ حضور ﷺ کی سیرت کے گوہرِ تابدار کہ جن کو اس طرح سے سامنے لانا ہوگا اور دنیا کو بتانا ہوگا۔ دنیا کو کیا' اب تو ہم خود کو بتانے کی ضرورت پیش آئے گی کہ یہ بات کیا تھی۔ میں کہہ رہا تھا کہ یہ جو کشمکش ہے' پچھلی آیات میں اس کا ذکر آ رہا ہے کہ رسول ﷺ! گھبراؤ نہیں' کوئی بات نہیں' صاحبِ ضربِ کلیم حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش کو یاد کرو' نوح علیہ السلام اور اس کی قوم عاد اور ثمود اور ان کی برابر کی قومیں' یہ ساری' اصحب الرس' حضرتِ شعیب علیہ السلام' حضرتِ نوح علیہ السلام' تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی سرگزشتیں بیان کیں۔ لہٰذا تم دیکھو گے کہ کیا کیا کچھ ان کے ساتھ نہیں ہوا۔ تُو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

مزاح اور استہزاء کے فرق کی روشنی میں سیرتِ رسول ﷺ کا مقامِ بلند

جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ یہ مخالفت ومخاصمت میدانِ جنگ میں یہ تیغ وسناں' اس قدر جگر پاش نہیں ہوتیں۔ اس میں ایک بات اور ہے جسے قرآن نے کئی دفعہ دہرایا ہے کہ **وَ اِذَا رَاَوْکَ اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا هُزُوًا** (25:41) سب سے زیادہ جگر پاش یہ ہے کہ کسی کا مذاق اڑایا جائے۔ عزیزانِ من! تلوار کا جواب تو تلوار اور ڈھال سے دیا جاسکتا ہے۔ جسے قرآن نے استہزاء کہا ہے اس میں عجیب بات یہ ہے کہ استہزاء وکمینگی کی انتہائی سطح پر پہنچا ہوا انسان' مقابلے میں اس حربے پہ آتا ہے کہ جس نے شرافت اور بردباری کی انتہائی سطح پہ کھڑے ہو کر جواب دینا ہوتا ہے' وہ اس سطح پہ آ ہی نہیں سکتا۔ یوں برابر کا حریف وہ نہیں ہوتا۔ استہزاء کو ہم تو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ہمارے ہاں تو مزاح اور استہزاء میں بھی فرق نہیں کیا جاتا۔

مزاح وہ چیز ہے جس کے لیے انگریزی میں Humour کا لفظ آتا ہے۔ وہ ایک اچھا لفظ ہے۔ بات کہنی پڑتی ہے۔ ہم لوگوں نے بڑا دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں کی اب جو صحافت ہے' اس سے ذرا پہلے ان اخبارات کے اندر کالم ہوتے تھے جنہیں مزاحیہ کالم کہتے تھے۔ اس میں مزاح ہوتا تھا۔ جب فریق مخالف کے خلاف کوئی بات کرتے تھے تو اس میں مزاح ہوتا تھا' Humour ہوتا تھا۔ اب آپ دیکھیے گا کہ اس میں یکسر استہزاء ہی استہزاء ہوتا ہے' کیچڑ اچھالی جاتی ہے۔ پنجابی اچ دساں: دندیاں چڑھائیاں جاندیاں نیں۔ ❶ اور اس پست سطح پہ پہنچ کے یہ چیزیں ایک دوسرے کے خلاف ہوتی ہیں' صحافت میں ہی نہیں ہے' عام تقریروں میں اور جلسوں میں' ایک دوسرے کے خلاف یہ کچھ ہوتا ہے۔ یہ روش ہی عام ہو چکی ہوئی ہے۔ اس مقام پہ دیکھیے کہ مقابل میں یہاں تو یہ ہے کہ وہ ایک چیز کہتا ہے تو دوسرا اسی کے انداز کی دس کہتا ہے لیکن وہاں دیکھیے کہ جہاں یہ سب کچھ کہہ رہے ہوں اور مقابلے میں ذرا سا بھی اپنی سطح سے نیچے نہ اترا جائے۔ قرآن کہتا

---

❶ پنجابی میں بتاؤں: کسی پہ خوب ہنسا جاتا ہے‘مذاق اڑایا جاتا ہے۔

ہے کہ وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ (94:4) تیرا شرف ومجد بلندیوں کی طرف جانے والا ہے‘ تیرا قدم اوپر کی طرف جانے والا ہے۔ استہزاء کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ اس کا اثر تو انسان کے اوپر یقیناً ہوتا ہے‘اور اس کا یہ اثر اس لیے ہوتا ہے کہ آپ نے دلائل و براہین سے جو بات کی ہوتی ہے‘ اسے لوگ ماننے کو تیار ہوتے ہیں لیکن یہ سب براہین و دلائل اس وقت تارِ عنکبوت کی طرح بکھر کر رہ جاتے ہیں جب جواب میں استہزاء کا ایک فقرہ کَس دیا جائے۔ اس نے یہ چیز کہی اور باقی لوگوں نے قہقہہ لگایا‘ تالیاں بجائیں بس معاملہ ختم کر دیا۔ اس سے اس پروگرام پہ بڑا اثر پڑتا ہے‘ اگر معاملہ ان لوگوں سے پڑ جائے جو دلیل کا جواب استہزاء سے دیں۔ عزیزانِ من! یہی وجہ ہے کہ وَ اِذَا رَاَوۡکَ اِنۡ یَّتَّخِذُوۡنَکَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیۡ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوۡلًا ❶ (25:41) وہ کہتے ہیں ”او دیکھنا ذرا بھئی ذرا دیکھنا‘ اس کا حلیہ (معاذ اللہ)‘ یہ ہیں ذاتِ شریف جو کہہ رہے ہیں کہ مجھے خدا نے رسول بنا کے بھیجا‘ یہ دیکھیے خدا کا رسول!! تالی بجائی‘ اور قہقہہ لگایا‘ مذاق اڑایا‘ اور چل دیئے۔ کسے سنائیں اور کیسے سنایا جائے‘ عزیزانِ من! اس کے لیے آپ سوچیے کہ کہا یہ جا رہا ہے کہ اے رسول! اس نظام کے قیام میں جن مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے اور اس کی آخری کامیابی میں جو تاخیر ہو رہی ہے‘ اس سے اثر پذیر اور ملولِ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تم ذرا سوچو کہ نبوت ملنے سے پہلے اور اس کے بعد کے ابتدائی مراحل میں‘ تمہاری پریشانیوں اور تفکرات کا کیا عالم تھا۔ تم تلاشِ حقیقت میں سرگرداں و پریشاں پھرتے تھے‘ تمہیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی اور کشاد کی کوئی راہ تمہارے سامنے نہیں کھلتی تھی۔ اس مقام پہ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ (94:1) ہم نے تمہیں وحی عطا کی جس سے زندگی کی تمام راہیں روشن ہوگئیں۔ تمہارے سینے میں اس قدر کشاد پیدا ہوگئی کہ جو مہم پہلے ناقابلِ تسخیر نظر آتی تھی اس کا سر کرنا ممکن دکھائی دینے لگا۔ عزیزانِ من! اس کے لیے کتنا بڑا جگر چاہیے تھا‘ یہ کس قدر تکلیف دہ صورت حال تھی!

آپ ﷺ کے لیے سراجِ منیر کا لقب بڑا ہی غور طلب لقب ہے

قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ کو سِرَاجًا مُّنِیۡرًا (33:46) کہا ہے: چراغ‘ روشن دیا‘ بجھا ہوا نہیں‘ روشن دیا۔ یہ جو روشن ساتھ کہا ہے‘ روشنی دینے والا‘ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ یہ چراغ کی بڑی صفت ہے کہ وہ روشنی دیتا ہے۔ عزیزانِ من! جب تک چراغ اپنے آپ کو جلاتا نہیں ہے‘ روشنی نہیں دے سکتا۔ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا اس وقت بنتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پہلے جلاتا ہے‘ یہ جگر سوزیاں ہیں جو اس کے بعد پھر منیر بناتی ہیں۔ چراغ اپنے آپ کو جلائے نہیں تو روشنی نہیں دے سکتا‘ اور یہ تو اتنے بڑے چراغ تھے‘ اس زمانے میں بھی

---

❶ یہ لوگ جب تجھے دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور (ایک ایسے انداز سے جس میں استہزاء واستخفاف پوشیدہ ہوں) کہتے ہیں کہ ''اچھا! یہ ہیں وہ جنہیں خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے!'' (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔824)۔

کرّہ ارض کو انہوں نے منیر بنایا اور قیامت تک کے لیے یہ چراغ جلے اور پھر چراغ کا تو جلتے رہنا ہے۔ یہ کوئی کچھ کم جلتے رہنے کی بات' کچھ کم جگر سوزی اور دلدوزی کی بات نہیں بلکہ آپ کی ذاتِ اقدس پر وہ استہزاء تک اترے ہوئے ہیں جبکہ آپ ﷺ نے مقابلے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ **اِنۡ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنۡ اٰلِهَتِنَا لَوۡ لَاۤ اَنۡ صَبَرۡنَا عَلَيۡهَا** (25:42) یہ تو ہمارے الٰہوں سے ہمیں الگ کر دیتا اگر ہم ثابت قدمی سے اپنے مسلک پر جمے نہ رہتے۔ عربی زبان کے اندر ''الٰہ'' کا لفظ موجود ہے۔ قرآن میں ان بتوں کے لیے خود ''وثن'' (و ث ن) وغیرہ کے الفاظ بھی آئے ہوئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ الٰہ ہی کا لفظ یہاں کیوں آتا ہے؟ الٰہ کے معنی ہی ''صاحبِ اقتدار'' کے ہیں اور عبودیت کے معنی محکومیت کے ہیں۔

عالمگیر انسانیت کے لیے آزادی کا پیامبر عظیم

میں ابھی عرض کر دوں کہ عید میلاد النبی ﷺ پر ہمارا ایک خصوصی درس ہوا کرتا ہے۔ اس دفعہ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس تقریب سعید پر میرا خطاب ہو'یا درسِ خصوصی ہو۔ میں اس کا عنوان ہی یہ رکھنا چاہتا ہوں: ''آزادی کا پیامبرِ عظیم''۔ حضور ﷺ نے انسانیت کو آزادی عطا فرمائی۔ کس قسم کی آزادی عطا فرمائی؟ سب سے بڑی نعمت' سب سے بڑا احسان' سب سے بڑا کارنامہ' جو حضور ﷺ نے سرانجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے نوعِ انسانی کے لیے آزادی عطا فرمائی۔ میں ابھی سے یہ عرض کر دوں کہ یہ فروری کی بیس تاریخ کو ہے۔ ویسے تو وہ دن ہی عید میلاد النبی ﷺ کا ہے لیکن اس دن کی تو تخصیص نہیں ہے۔ ہمارا درس اب اگلے جمعہ کو ہی آئے گا' چوبیس تاریخ ہوگی۔ تو چوبیس تاریخ کے جمعہ کا جو صبح کا درس ہوگا' وہ ساڑھے نو بجے کے بجائے دس بجے ہوگا' اور اس میں میرا یہ خصوصی درس ہوگا جس میں موضوع ہے: ''آزادی کا پیامبر عظیم''۔ میں اس میں بتاؤں گا کہ وہ کون کون سی زنجیریں تھیں جو انسانیت کو پہنائی گئی تھیں اور جن کو کاٹ کے حضور ﷺ نے انسانیت کو آزادی عطا فرمائی تھی۔ یہ اگلے جمعہ کے صبح کے درس میں ہے۔ کارڈ چھپے ہوئے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہو گیا ہے' ساتھ لیتے جائیے گا اور جو صاحب ذوق احباب' ان امور سے دلچسپی رکھیں' ان تک پہنچا دیجیے گا تا کہ اس کا اعلان عام ہو جائے۔ اعلان کا کوئی اور ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے اس لیے اسی کے ذریعے اعلان کو عام کیجیے گا۔

آئندہ درس میں عرض کروں گا کہ یہ الٰہ کیا تھے۔ یہ بتوں کی بات نہیں تھی۔ یہ مختلف الٰہ تھے جنہوں نے انسانوں کو اپنا غلام محتاج محکوم بنا رکھا تھا۔ ان کی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے یہ پیغمبر ﷺ آیا تھا۔ یہ تھا ان کا اعتراض کہ اگر ہم اپنے ان پروگراموں کے اوپر جم کے نہ رہتے تو اس نے تو آ کے ان کا تختہ الٹ کے رکھ دیا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَ سَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ حِيۡنَ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ مَنۡ اَضَلُّ**

سَبِيْلًا (25:42) انہیں جب ان کے اس غلط نظام کے نتائج میں تباہیوں کا سامنا کرنا پڑے گا تو اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ وہ کون ہے جو صحیح راستہ چھوڑ کر' غلط راہ پر چل رہا ہے' وہ کون ہے جس نے ان کے خلاف ظلم کیا ہے اور یہ محسنِ انسانیت ہے جس نے انہیں کس کس غلامی سے چھڑا دیا ہے۔ یہ انہیں اس وقت پتہ چلے گا۔

الٰہ کا قرآنی مفہوم

قرآن نے اگلی بات بڑی اہم کہی ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں' یہ نہ تو دلیل و برہان پہ مبنی ہے' نہ واقعات اور حقیقت پہ مبنی ہے۔ یہ تو ان کی مفاد پرستیوں کی خواہشات ہیں' ان کے پست جذبات ہیں جن کی بنا پہ یہ سب کچھ کہتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے جذبات ہی کو اپنا ''معبود'' بنا رکھا ہے۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ❶ (25:43)۔ دیکھیے یہاں وہ لفظ الٰہ آ گیا۔ ترجمہ یہ ہے کہ تو نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا کہ جس نے اپنے جذبات' اپنی خواہشوں' ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ ظاہر ہے کہ جو الٰہ ہے اگر ہم عام معنی کہیں' جس کی پرستش کی جاتی ہے' تو یہ تو پھر اپنی خواہشات اور اپنی آرزوؤں اور اپنے جذبات ہیں' جن کی پرستش تو کوئی نہیں کرتا۔ یہ کیا چیز ہے کہ انسان کا فیصلہ اس کے جذبات کے تابع ہو' اس پر جذبات غالب رہیں' اور وہ اس طرح اپنے جذبات میں مغلوب رہے؟ یہ تو الٰہ وہ ہے جس کو اپنے اوپر غالب کر لیا جائے' جو اپنے آپ کو دوسروں کے اوپر غالب کر دے وہ اس کا الٰہ ہو جاتا ہے۔ کہا کہ دیکھا' تم نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا کہ جس نے اپنے جذبات' اپنی خواہشات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ وحی تو بہت بڑی چیز ہے۔ عقل و فکر کی رو سے اپنے معاملات کا فیصلہ نہیں کر رہا' جذبات کی رو سے فیصلہ کرتا ہے اور جو جذبات سے مغلوب ہو جائے' آپ جانتے ہیں کہ اس کے فیصلے کیا ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے تو ان شرابیوں وغیرہ کی محسوس شکل آتی ہے جس میں سمجھتے ہیں کہ آدمی پاگل ہو گیا۔ وہ بھی کیا ہوتا ہے؟ جذبات تیز ہو جاتے ہیں لیکن یہ شراب تو وہی نہیں ہے جو پیالے کے اندر ڈال کے پی جاتی ہے۔ نشہ لانے والی شرابیں تو کوئی ایسی ہیں جو بڑی غیر محسوس ہوتی ہیں۔ جذبات کا تیز ہو جانا' یہ ہے کہ جو حقیقت میں انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ دیوانگی پر لے آتا ہے' جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟ یہ پاگل تھوڑے سے وقت کے لیے ہوتا ہے' اس کے بعد غصہ فرو ہو جاتا ہے' جذبات کی شدت کم ہو جاتی ہے تو نارمل ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کا عرصہ لمبا ہو جائے تو اسے مینٹل ہاسپٹل (پاگل خانہ) میں بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ تو صرف Duration (دورانیہ) کا فرق ہوتا ہے۔ تھوڑے سے عرصے کے لیے ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جو جذبات سے مغلوب ہوتا ہے' تھوڑے سے عرصے کے لیے پاگل ہوتا ہے۔ اگر مستقل طور پہ ہوتا ہے' تو جیسا کہ میں نے کہا ہے' وہ پاگل خانے میں ہوتا ہے۔ کہا کہ جو جذبات سے مغلوب ہو کر باتیں کرے' اسے دلیل و برہان کیا کام دے؟ یہ جو مذاق اڑا رہے ہیں' اور اس سطح پہ پہنچے ہوئے ہیں' یہ جذبات سے مغلوب ہو چکے ہیں۔

---

❶ سو جو شخص اپنی خواہشات کا غلام اور پرستار بن جائے' اسے کون راہِ راست پر لا سکتا ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔824)۔

صرف قرآنِ حکیم ہی انسانی جذبات کی راہنمائی کرتا ہے

یاد رکھیے' انسانی جذبات معیوب چیز نہیں ہے کہ قرآن ان کے پیچھے لٹھ لے کر پھر رہا ہے۔ یہ تو بڑی چیز ہیں۔ جذبے کے بغیر تو کوئی عمل ہی سرزد نہیں ہوتا۔ غیرت کس کا نام ہے؟ یہ ایک جذبہ ہے۔ جسے مال صدقہ جان کہتے ہیں' اس میں انسان عقل وفکر کی رو سے کرتا یہ ہے کہ جان بچانے کے لیے مال صرف کر دیا۔ لیکن جب ہم جان صدقہ آبرو کہتے ہیں تو یہاں تو ایک جذبہ کام دیتا ہے۔ جو آبرو کی اہمیت اور قیمت کو جانتا ہے' اسے غیرت کہتے ہیں۔ بے غیرت کون ہوتا ہے؟ وہ جس کے دل میں آبرو کو بچانے کے لیے جذبہ نہ ابھرے۔ حق کی خاطر آپ جان دیتے ہیں تو جذبے کے ماتحت دیتے ہیں۔ یہ بڑی چیز ہے۔ بات ساری یہ ہے کہ اگر آپ میں غصے کا ایک جذبہ ابھرتا ہے' آپ ایک کمزور ناتواں مظلوم کے سینے میں چھری گھونپ دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک جذبہ ہے۔ اس کے برعکس آپ کے دل میں مظلوم کی حفاظت کا جذبہ ابھرتا ہے' آپ اس ظالم کا گلا کاٹتے ہیں۔ یہ بھی جذبہ ہے۔ تو جذبہ بجائے خویش کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو قابلِ مذمت ہے یا باعثِ تعریف ہے۔ وہ تو ایک تلوار ہے' اگر آپ اس تلوار کو کمزور اور مظلوم کے سینے میں گھونپ دیں گے' تو تلوار آپ کے ہاں کی مذموم ہو جائے گی' قابلِ نفرت ہو جائے گی' اگر ظالم کے سینے میں آپ اس کو اتاریں گے' تو وہ وجہ تعریف ہو جائے گی۔ یہ قرآن کی عجیب چیز ہے۔

مذہب کی دنیا انسان کو نفس کشی کا سبق دیتی ہے

قرآن کے اس تصورِ جذبات کے برعکس' مذہب کی دنیا میں' روحانیت کی دنیا میں' وہ جذبات کے پیچھے لٹھ لیے پھر رہے ہیں۔ نفس کشی کر کے ان کے ہاں سب سے بڑا مرتبہ روحانیت کا ہے۔ ہو جا ککھ مسیت دا' سب دے پیراں تھلے اوندا تریا جا' رڑک وی نا۔ ❶

تھے ہم پوت پٹھان کے' دَل کے دَل دیں موڑ
شرن پڑے رگناتھ کے' سکیں نہ تنکا توڑ ❷
(وحید خاں ❷)

---

❶ بے قدر و منزلت ہو جا' اس پر کاہ کی طرح ہو جا جو بغیر محسوس ہوئے ہر ایک کے پاؤں تلے روندا جاتا ہے یعنی مدافعت کے جذبات کو روند کر مسجد کی صف کے ٹوٹے ہوئے تنکے کی طرح ہو جا جو نمازیوں کے پاؤں تلے چیخنے کی سکت بھی نہیں رکھتا۔

❷ وحید خاں ایک پنجابی شاعر تھا جو کسی ہندو جوگی کا مرید ہو کر فلسفۂ وہدایت (ویدانت اور وحدت الوجود ایک ہی چیز ہے) کا قائل ہو گیا تھا۔ اس تبدیلئ خیال وعقیدہ نے جو اثر اس پر کیا ہے' اسے وہ خود اس شعر میں بیان کرتا ہے کہ ''میں پٹھان تھا اور فوجوں کے منہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگناتھ جی کے قدم پکڑے ہیں یا بالفاظ دیگر یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود جاری وساری ہے' میں ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دُکھ پہنچنے کا

احتمال ہے۔'' کاش وحید خاں کو یہ معلوم ہوتا کہ زندگی نام ہی دُکھ اٹھانے اور دُکھ پہنچانے کی قوت رکھنے کا ہے۔ زندگی کا مقصد زندگی ہے' نہ موت۔ (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور' 1992ء-ص295)۔

یہ ہے جناب! شرافت کی دنیا میں اس کو بے غیرت نہیں کہتے' تو اور کیا کہتے ہیں! یہ بدترین قسم کی مذمت ہے۔ یہ وہ ہے جسے بے حیا اور بے غیرت کہتے ہیں۔ اس کے اندر مدافعت کا وہ جذبہ نہیں ہوتا۔

جذبات کو فنا کرنا تو قوتِ عمل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جذبہ بجائے خویش ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی مذمت کی جائے۔ قرآن کی تعلیم کا کیا پوچھتے ہیں' عزیزانِ من! آپ شروع سے تاریخ دیکھ لیجیے گا۔ یہ مذہب کی تاریخ' جو رہبانیت میں یا روحانیت میں آ کر بلندیوں تک پہنچتی ہے' اس میں ہر جگہ آپ کے ہاں نفس کشی کو انسانیت کا بلندترین معراج بتایا جائے گا۔ قرآن آ کر کہتا ہے کہ جذبات کو الگ کر دیجیے تو انسان کے اندر قوتِ عمل ختم ہو جاتی ہے۔ جذبات تو وہ پانی ہے جو پہاڑوں سے ندیوں کی شکل میں آتا ہے۔ اس سے کہا ہے کہ اس کو ساحلوں کے اندر رکھو' تو دریا ہو گا' اس سے زندگی ملے گی' نشوونما ملے گی' ساحل توڑ دیجیے تو یہ سیلاب بن جائے گا' اس سے تباہیاں ہوں گی۔ پانی تو ایسا وجہ مذمت نہیں ہے۔ پانی کی رفتار اور روانی ہے جو دیکھنے کی چیز ہے کہ وہ ساحلوں کے اندر مقید رہتا ہے یا بیباک ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم اس باب میں پہلے تو یہ کہتا ہے کہ جب جذبات کسی کے اوپر غالب آ جاتے ہیں تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ **اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰٮهُ** (45:23) یعنی اس کی حالت پہ بھی تم نے غور کیا ہے کہ جو اپنے جذبات سے ہی مغلوب ہو جائے۔ اب الٰہ کے معنی یہ ہو گئے کہ ''خدا بنا لے''۔ جسے ہم کہتے ہیں کہ اپنے جذبات ہی کو خدا بنا لے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ **وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ** (45:23) وہ علم کے باوجود غلط راستے پہ چلنے لگ جاتا ہے۔ اس وقت علم کام نہیں دے سکتا' عقل و ہوش ہی نہیں رہتی۔ جذبے میں آ کر تو علم کام نہیں دیتا۔ پھر **وَ خَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَ قَلۡبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً** (45:23) اندھا ہو جاتا ہے' بہرہ ہو جاتا ہے' پاگل ہو جاتا ہے' اس کے حواس (Senses) کام ہی نہیں دیتے۔ آپ دیکھ لیجیے۔ شرابی کی مثال تو آپ کے سامنے ہے۔ جو شخص غصے میں ہوتا ہے' وہ پاگل ہو گیا ہوا ہوتا ہے' اندھا ہوتا ہے' بہرا ہوتا ہے' کسی کی سنتا نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہوتا ہے جب جذبات کو اس طرح سے اپنے اوپر غالب کر لیا جائے۔ کہتا ہے کہ **فَمَنۡ يَّهۡدِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ** (45:23) ایسے شخص کو کون صحیح راستے پہ لا سکتا ہے' جو نہ دیکھے' نہ سنے' نہ سمجھے' جذبات اس کے اوپر غالب آئے ہوئے ہوں۔ آپ اس کو سمجھا ہی نہیں سکتے' پھر تو گویا جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ جذبات کو فنا کر دو' وہ انہیں حدودِ خداوندی میں رکھنا چاہتا ہے۔

وحی خداوندی سرکش جذبات کو ساحلوں میں محصور کر دیتی ہے

دوسرے مقام پہ قرآن کہتا ہے کہ **فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ** (28:50) یہ جو تمہاری اس قدر منفعت بخش، انسانیت ساز، آواز پہ بھی لبیک نہیں کہتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جذبات سے مغلوب ہو رہے ہیں۔ اور آگے ہے وہ بات جو کہنی ہے۔ کہا کہ **وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ** (28:50) اس سے زیادہ غلط راستے پہ چلنے والا کون ہو سکتا ہے جو اپنے جذبات ہی کا اتباع کرتا چلا جائے۔ بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اگلی بات یہ ہے کہ **مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ** (28:50) جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر جذبات کے پیچھے چلتا چلا جائے تو گویا ہدایت خداوندی کے تابع جذبات کے پیچھے اگر چلتا جائے تو وہ چیز ہے جو نفع ہی نفع دیتی ہے، منفعت بخش ہوتی ہے: **مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ** (28:50) یہ ہے اصل چیز۔ **بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ** (28:50) جذبات کا اتباع کرے گا تو تباہی آئے گی، سرکشی آئے گی۔ ہدایتِ خداوندی کے ساحلوں کے اندر اس کو محصور رکھے گا تو یہ دریا منفعت بخش بن جائے گا۔ یہ ہے قرآن کی تعلیم۔ یہ جتنے لوگ تباہیاں لانے والے گزرے ہیں یہ وہ تھے جنہوں نے اپنے جذبات سے کام لیا یعنی **بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ** (28:50) رہے، خدا کی رہنمائی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کی پیروی کرتے رہے۔ اپنے جذبات کو ہمیشہ ہدایت خداوندی کے تابع رکھنا چاہیے۔ اگر یہ ہے تو جذبات خویش کوئی بری چیز نہیں ہیں جن کا اتباع جرم قرار پا جائے۔

وحی انسانی جذبات کی کمزوریوں سے ماوراء حقیقت ہے

عزیزانِ من! یہاں سے پھر ایک اور اہم بات سامنے آئی: وحی کا یہ اتباع قرآن نے کیوں ضروری قرار دیا ہے، وحی کے اتباع پہ وہ اتنا زور کیوں دے رہا ہے؟ زور کے علاوہ وہ کہتا ہے کہ یہی ایک راستہ ہے جس سے انسان بھٹکتا نہیں، یہ صرف وحی کا راستہ ہے۔ کیا تخصیص ہے اس راستے کی، کیا خصوصیت ہے اس راستے کی؟ کیا بتاؤں، عزیزانِ من! قرآن کیا کچھ کہہ جاتا ہے! معاف رکھیے، وہ کہتے ہیں کہ جتنا بلندیوں پہ انسان ہو وہاں اتنی ہی زیادہ ٹھنڈ ہوتی ہے۔ آپ کے مقابلے میں مجھے اس لیے زیادہ ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ عزیزانِ من! وحی کا یہ بڑا عجیب نکتہ ذہن میں آ گیا، جو کہا کہ وحی کی ایسی کیا خصوصیت ہے؟ ہمارے ذہن میں تو یہ ہے کہ صاحب! وحی خدا کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ بس یہ خصوصیت ہے کہ خدا کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ اپنے ذہن سے فیصلہ کریں، کوئی دوسرا فیصلہ کرے، ایک انسان فیصلہ کرے، جتنے انسان جی چاہے فیصلہ کر لیں، مل کے ڈیما کریسی (جمہوریت) فیصلہ کر لے، سارے اکٹھے ہو کر فیصلے کر لیں، وہ کہتا یہ ہے کہ انسان جب شعوری یا غیر شعوری طور پہ کوئی فیصلہ کرے گا تو اس کے جذبات کی آمیزش، اس فیصلے کے اندر کسی نہ کسی حد تک ضرور ہو جائے گی۔ خالصتاً جذبات کی آمیزش کے بغیر، خالصتاً عقل کا فیصلہ نہیں ہوگا۔ آج اس حقیقت کو سائیکولوجسٹ تسلیم کر رہے ہیں۔ ان سے پوچھیے، Psycho Analysis (تحلیلِ نفسی) والوں سے پوچھیے۔ ان کے پاس جن لوگوں کے Cases آتے ہیں، ان میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ "وہ ان کو ایسا بیان کرتے ہیں کہ جیسا ان میں جذبات کی کوئی آمیزش، ذرا سی رمق بھی نہیں ہوتی"، بالکل صاف الگ ہٹے

ہوئے ہیں جیسا کہ وہ یہ کچھ کرتے ہیں لیکن جب وہ تھوڑا سا کرید کے ذرا نیچے جاتے ہیں' نظر آتا ہے کہ "انہیں خود بھی علم نہیں تھا کہ ان کے وہ چھپے ہوئے جذبات اندر ہی اندر کیا کر رہے تھے' ان کے فیصلے کو کدھر موڑ رہے تھے"۔

انسانی فیصلوں میں انسانی تخیلات کا ہمیشہ دخل رہا ہے

ان Psycho Analysis (تحلیلِ نفسی) والوں کا کام ہی یہ ہے' عزیزانِ من! کہ وہ مریض کو بتائیں کہ تمہارے اس فیصلے کے اندر تمہارے چھپے ہوئے جذبات کا کتنا حصہ تھا' اس لیے تم جو اپنے آپ پہ مطمئن ہو کہ نہیں صاحب! میں نے یہ جذباتی فیصلہ نہیں کیا' میں نے بالکل عقل و ہوش کی رو سے یہ سارا فیصلہ کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ صاحب! جس کو تم پورا عقل و ہوش سے کہہ رہے ہو' اس کے اندر تمہیں پتہ نہیں ہے جذبات کا کتنا تعلق ہے' اس میں کتنی آمیزش تھی۔ قرآنِ کریم کہتا یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی وجہ سے انسانوں کو مجرم قرار دے دیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ چیز دراصل یہ ہے کہ جذبات انسان کے قلب کی گہرائیوں کے اندر پیوست ہوتے ہیں' اس کے خون کے اندر حلول کیے ہوتے ہیں' اس لیے شعوری طور پہ ان کو معلوم نہ بھی ہو' غیر شعوری طور پر بھی ان کے اندر کچھ نہ کچھ اس کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فیصلہ وہی صداقت پر' حقیقت پر' مبنی ہو سکتا ہے جس کے اندر ان جذبات کی قطعاً آمیزش نہ ہو اور وہ کہتا یہ ہے کہ کسی انسان کے فیصلے میں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ نہ ہوں' اس لیے یہ فیصلہ کسی ایسے مقام سے آنا چاہیے' یہ حکم' یہ قدر' یہ قانون ایسے مقام سے ملنا چاہیے جہاں جذبات نہ ہوں' اور کہا ہے کہ صرف خدا کی ذات ایسی ہے جس میں جذبات نہیں ہیں۔ بڑی عجیب چیز سامنے آ گئی' دیکھیے کس حسین انداز سے وہ سورۃ النجم میں بات کر رہا ہے!

ستاروں کی شکل میں راہنمائی کا ایک مستقل اور نہ بدلنے والا سہارا

حضور ﷺ کی دعوت یہ تھی کہ وحی کا اتباع کرو۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ وحی کے اتباع سے ہم غلط راستے پہ نہیں پڑ جائیں گے' وہ کسی بھی وقت دھوکا نہیں دے گا' بہکا نہیں دے گا' بھٹکا نہیں دے گا' اس کی ضمانت کیا ہے؟ کہا کہ تم ریگستان کو دیکھو۔ وہاں کسی چیز کا نشان تک نہیں۔ راہرو کبھی ایک دفعہ کہیں کوئی نشان بنا بھی لیتے تھے کہ یہاں یہ ٹیلا ہے' یہاں یہ تھوڑا سا پتھر ہے' یہاں یہ کوئی درخت وغیرہ ہے' آندھی کا ایک جھونکا آتا تھا تو ریت کے ٹیلوں کے ٹیلے ان کے اوپر چڑھ دوڑتے تھے' سارے نشان ہی مٹ جاتے تھے۔ کہا کہ تم یہ سفر کرتے ہو اور سفر بھی دن میں نہیں کرتے۔ دن میں تو بڑی گرمی ہوتی تھی' تپش ہوتی تھی۔ یہ لوگ راتوں کو سفر کرتے تھے۔ کہتا ہے کہ ان صحراؤں میں سفر کرنا' جہاں راستہ ہی کوئی نہیں' پھر راتوں کو سفر کرنا' روشنی بھی نہیں تھی' تو کہا اس کے باوجود تمہاری کیفیت یہ ہے کہ کبھی تمہارا قافلہ بھٹکتا نہیں ہے' صحیح راستے پہ چلا جاتا ہے۔

کس طرح چلا جاتا ہے؟ وہ ستاروں سے راہنمائی لیتے تھے۔ آج تو بہر حال ہم سڑک پہ جو لائٹ سگنل ہیں اس سے راہنمائی نہیں لیتے تو روزا ایکسیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیں کیا پتہ ستاروں کی راہنمائی کیا ہوتی ہے' جہازوں کے کپتان آج بھی یہ جانتے ہیں۔ وہ ستاروں سے راہنمائی لیتے تھے۔ کہا کہ بتاؤ' ستاروں سے جو تم راہنمائی لیتے ہو تو کبھی انہوں نے تمہیں دھوکا دیا ہے' کبھی بھٹکایا ہے' کبھی بہکایا ہے' کبھی ایسا ہوا ہے کہ آدھی رات کے بعد یہ تمہارا ساتھ ہی چھوڑ گئے ہوں' کبھی کسی طرح سے بھی ساری زندگی میں؟ تم شہادت دو اس بات کی کہ کبھی ایسا ہوا ہے۔ کیوں نہیں ایسا ہوتا؟ اس لیے نہیں ہوتا کہ ستارے قانونِ خداوندی کے تابع اپنی روش کو قائم رکھتے ہیں اور دوسری چیز یہ کہ ان میں اس کی صلاحیت اور استعداد نہیں ہے کہ یہ اس کی خلاف ورزی کر سکیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خارجی کائنات کی ان چیزوں کی طرف ہم نے وحی کی ہوئی ہے: سماء کی طرف وحی ❶ ارض کی طرف وحی ❷ شہد کی مکھی کی طرف وحی ❸ اور ان میں اس کی استعداد و صلاحیت ہی نہیں کہ اس وحی کی خلاف ورزی کر سکیں لیکن یہ جو تم دیکھتے ہو کہ وہ صحیح محکم راستے پر چلتے رہتے ہیں کبھی دھوکا نہیں دیتے' نہ خود بھٹکتے ہیں' نہ تمہیں بھٹکاتے ہیں' نہ فریب دیتے ہیں' تو یہ کیا چیز ہے؟ چیز یہ ہے کہ یہ وحی کے تابع چل رہے ہیں اور تم یہ مانتے ہو کہ یہ اس چیز کی شہادت ہے۔ دیکھو: **وَ النَّجۡمِ اِذَا ھَوٰی** (53:1) یہ ستارہ روز اپنے مقام سے نکلتا ہے' ایک خاص سفر طے کرتے ہوئے' خاص مقام پہ جا کر ڈوب جاتا ہے۔ جب سے اس کائنات نے آنکھ کھولی ہے یہ اسی روش پہ چلے جا رہا ہے' چلتا جا رہا ہے' کبھی دھوکا نہیں دیتا' کبھی بھٹکا تا نہیں ہے۔ یہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ **مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَ مَا غَوٰی** (53:2) یہ جو تمہارا ساتھی ہے جو تم سے راہنمائی کی باتیں کرتا ہے' یہ بھی تمہیں اس ستارے کی طرح دھوکا نہیں دے گا اور نہ ہی بہکائے گا۔ ستاروں کی روش اس بات کی شہادت ہے۔ اس لیے کہا کہ **وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی** (53:3) جو کچھ تمہیں یہ کہتا ہے اس میں اس کے اپنے جذبات کا دخل نہیں ہوتا بلکہ **اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی** (53:4) یہ وحی کی رو سے تمہیں یہ کچھ کہتا ہے۔ یہ ہے وحی کی خصوصیت۔

وحی کے اندر انسانی جذبات کا دخل نہیں ہوتا

عزیزانِ من! وحی میں انسانی جذبات کی کوئی آمیزش نہیں ہوتی۔ آپ نے سمجھ لیا کہ وحی کی Definition (تعریف) کیا ہے' اس کی خصوصیت کیا ہے' اس وحی کے متعین کیے ہوئے نشاناتِ راہ کیوں ایسے ہیں جس سے انسان بھٹک نہیں سکتا۔ ایک آیت میں بتایا کہ **مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی** (53:3) تمہارا یہ رفیقِ سفر خود اپنی طرف سے نہیں بات کر رہا' یہ اپنی بات نہیں کہہ رہا' تم سے بہ حیثیت رسول کہہ رہا ہے۔ کوئی انسان تم سے یہ نہیں کہہ رہا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی طرف سے کہے تو اس میں جذبات کی آمیزش کا شائبہ ہو سکتا ہے۔ یہ اپنی

---

❶ اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ (41:12)

❷ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَھَا (99:5)

❸ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ (16:68)

طرف سے یہ بات نہیں کہہ رہا بلکہ اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (53:4) یہ تو وہی راہنمائی ہے جو اس کی طرف وحی کے ذریعے بھیجی جاتی ہے اور وہ تم تک پہنچاتا ہے۔ لہٰذا خدا کی وحی کے مطابق چلنے والے ستارے اگر تمہیں دھوکا نہیں دیتے اور صحیح راہنمائی کرتے ہیں تو یہ وحی جو تم تک پہنچا رہا ہے' یہ بھی اسی طرح سے تمہاری راہنمائی کرے گا اور کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ اس لیے کہا جا رہا ہے کہ اس کا اتباع کرو۔

عزیزانِ من! پوری کی پوری سورۃ النجم سامنے ہے۔ بہت جی چاہتا ہے کہ میں کہتا چلا جاؤں لیکن اس کے لیے تو بڑا وقت چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے یہ مقامِ محمدی میں سلیم کے نام خطوط ❶ میں اس کی پوری تفصیل لکھی ہوئی ہے۔ بڑی ہی جذب و کیف کے اندر یہ چیز آئی ہوئی ہے اور پوچھو نہیں کہ قرآن میں بھی کہاں کیا کیا کہا گیا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی o ذُوۡ مِرَّۃٍ ؕ فَاسۡتَوٰی o وَ ھُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی o ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی o فَکَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی o ❷ (53:5-9)

عزیزانِ من! میں کیا بتاؤں کہ یہ آپ کو کیا بتاتے ہیں! اور یہ قَابَ قَوۡسَیۡنِ کیا ہے؟ بہرحال یہ تو باتیں ہی اور ہیں' اب تو افسانے رہ گئے ہیں۔ مذہب میں افسانے ہوتے ہیں' مذہب کا سامری ہوتا ہے۔ سامری کے معنی ہی داستان گو' کہانیاں کہنے والا' راتوں کو کہانیاں کہہ کے سلانے والا' ہوتے ہیں۔ یہ قَابَ قَوۡسَیۡنِ (53:5) بڑی عظیم چیز ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوٰىہُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِ وَکِیۡلًا (25:43) ایسے آدمی کی تم راہ نمائی کر سکتے ہو' اس کی نگرانی کر سکتے ہو' اس کو صحیح راستے پہ لا سکتے ہو' اس کی وکالت کر سکتے ہو' جو عقل و ہوش میں ہی نہیں

---

❶ پرویزؒ (1984)۔ سلیم کے نام جلد دوم (انیسواں خط: مقامِ محمدی)' لاہور: ادارہ طلوعِ اسلام' ص ص۔ 24 تا 49۔

❷ یہ (وحی) اُسے' اُس خدا کی طرف سے ملتی ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے (اس کی قوتوں کا اندازہ تو تم' نظامِ کائنات' بالخصوص ستاروں کی دنیا سے کر سکتے ہو کہ یہ عظیم الجثہ آسمانی کرّے اس کے قوانین میں جکڑے ہوئے' کس نظم و ضبط سے اپنی اپنی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح اُس نے جو قوانین وحی کے ذریعے' انسانی راہنمائی کے لیے دیئے ہیں' وہ بھی اپنی نتیجہ خیزی میں سر مو ادھر اُدھر نہیں ہوتے) (53:5)۔ وہ خدا صرف لامحدود قوتوں کا مالک ہی نہیں' وہ زندگی کی مختلف گزرگاہوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے' فلہٰذا اس قابل ہے کہ ایسی ہمہ گیر راہ نمائی دے جو انسان کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کے تمام شعبوں کو محیط ہو۔ (ظاہر ہے کہ جس شخصیت (رسول) کو اس قسم کی وحی کا حامل ہونا ہو' اسے حسنِ سیرت کی کن رعنائیوں اور علم کی کن بلندیوں کا پیکر ہونا چاہیے؟ چنانچہ اس رسول کی ذات میں پورا پورا توازن پیدا ہوا اور پاکیزگی سیرت اپنی انتہا تک پہنچ گئی۔ (53:6) اس کے ساتھ ہی وہ (وحی کی رو سے) علم کی ان بلندیوں پر بھی جا پہنچا جہاں عقلِ انسانی کی رسائی ناممکن ہے۔ (53:7 نیز 81:23)

وہاں پہنچ کر وہ حقائقِ کائنات سے قریب تر اور قوانین خداوندی کی گہرائیوں میں ڈوب کر' ان سے ہم آہنگ ہو گیا (53:8)۔ قوانین خداوندی سے ہم آہنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انسانی دنیا میں' خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے خدا کا رفیق بن گیا (8:17)۔ جس طرح تم باہمی رفاقت اور معاہدہ کی پختگی

کے لیے دو کمانوں کو اس طرح ملاتے ہو کہ وہ ایک ہی قاب (چلہ) والی بن جاتی ہیں' اور دونوں مل کر اکٹھا تیر چلاتے ہو' خدا کے ساتھ' رسول کے عہد رفاقت کی یہی مثال ہے۔ بلکہ اس کی رفاقت اس سے بھی زیادہ محکم اور گہری ہوتی ہے (53:9)۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔1238 تا 1239)۔

ہے۔اے رسول! کیا تیرے لیے ممکن ہے کہ تو اس قسم کے آدمی کی اس طرح نگہبانی کر سکے کہ وہ تباہی کے جہنم میں نہ گرے؟ تو ایسے شخص کا کبھی ذمہ نہیں لے سکتا' شرابی کو بھی کچھ سمجھانا ہوتا ہے تو جب اس کو بٹھا رکھتے ہیں' سلا دیتے ہیں کہ ٹھہر جاؤ بھئی! جب ہوش میں آئے گا' اس وقت پھر بات کی جائے گی۔اس وقت ان لوگوں سے یہ بات کہنا بیکار ہے۔قرآن کہتا ہے کہ **اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَکۡثَرَهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ یَعۡقِلُوۡنَ** (25:44) انسان یہ دیکھ کر دھوکا کھا جاتا ہے کہ صحیح شکل وصورت انسان کی سی ہے۔ٹھیک ہے' شراب کے نشے کی منہ سے بو بھی نہیں آرہی' شرابی تو ہے نہیں' یہ خواہشات کا غلام اور پرستار بنا بو والی شراب نہیں ہے۔تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ شرابیں کس قسم کی ہیں۔اس کی بو نہیں آتی' یہ ان دکانوں سے نہیں ملتی' اس لیے کسی پرمٹ اور لائسنس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی' ان کی بھٹیاں تو دل کی گہرائیوں میں لگی ہوئی ہوتی ہیں' یہ تیار کیا جاتا ہے' گٹا گٹ پیے جاتا ہے۔قرآنِ کریم کہتا ہے کہ کیا تو اس شخص کو سمجھتا ہے؟ یہ دیکھ کہ اس کی شکل وصورت اچھے آدمیوں جیسی ہے' کہ یہ نشے میں نہیں ہے مگر یہ غلط ہے۔یہ نہ سنتے ہیں' نہ سمجھتے ہیں۔یہ نشہ عجیب قسم کا نشہ ہے: قوت کا نشہ' نام نہاد روحانیت کا نشہ' وہ جو آ کے پاؤں چومتے ہیں' عزیزانِ من! پوچھو نہیں کہ ''کیڈا اوڈا اٹھرا ہونداا ے' جیہڑ اا وپیندا اے آدمی۔''[1] قرآن کہتا ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سنتے ہیں' سمجھتے ہیں؟ یہ سنتے سمجھتے نہیں ہیں۔

بات کو سمجھانے کے لیے قرآنِ حکیم کا محاکاتی انداز

یاد ہے وہ (67:10) میں اہل جہنم کی بات چلی آرہی تھی کہ وہ نہ سمجھنے والے ہیں' نہ سننے والے ہیں۔اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ اس واعظ کو دیکھیے کہ

کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت [2]

یعنی یہ اہل جہنم کی ایسے بات کر رہا ہے جیسے یہ دوسروں کی بات ہے' یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی بات کرے۔وہ باتیں کر رہا ہے اہل جہنم کی' کہتا ہے کہ ان کی مت ماری ہوئی ہے۔باتیں تو اس آیت سے اوپر سے ہوتی چلی آرہی ہیں۔جہنم کے داروغے پوچھتے ہیں' قرآن بڑے محاکاتی انداز میں ان باتوں کو سمجھاتا ہے کہ یہ پوچھتے ہیں کہ صاحب! تم اچھے بھلے شریف آدمی نظر آتے ہو' یہاں کیسے حوالات میں آ گئے؟ جیل خانے کا داروغہ' یہ سپرنٹنڈنٹ' دروازے پہ ہی ان کو پوچھتا ہے کہ کیوں میاں! تم تو' بڑے اچھے بھلے سمجھ دار تھے' تو تم کیسے یہاں آ گئے؟ انہوں نے کہا کہ تم کہتے ہو کہ ہم سمجھ دار تھے' سنو! **وَ قَالُوۡا لَوۡ کُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡ نَعۡقِلُ مَا کُنَّا فِیۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ** (67:10) اگر ہم اپنے عقل وہوش اور علم وعقل سے کام لیتے' نشے میں نہ رہتے' تو کبھی اہل جہنم میں نہ ہوتے۔نشے کا خمار انسان

---

[1] وہ (نشہ) کس قدر طاقتور ہوتا ہے جسے یہ انسان پیتا ہے!

❷ زدوزخ واعظِ کافر گرے گفت حدیثِ خوشتر ازوے کافرے گفت
نداند آں غلام احوالِ خودرا کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت‘‘

کی ہڈیاں توڑ دیتا ہے۔ پوچھو نہیں کہ پھر اس کے بعد وہ جہنم کیا ہوتی ہے‘ اندازہ لگائیے‘ کہا کہ اگر ہم سمجھتے‘ اگر ہم کہیں غور وفکر سے کام لیتے‘ تو ہم کبھی اہل جہنم میں سے نہ ہوتے۔ وہ جو سورۃ الاعراف میں قرآنِ کریم نے بتایا ہے‘ وہ یہ ہے کہ **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا** (7:179) آدمی ان کا دھوکا کھا جاتا ہے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں‘ اس سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں بھی دی ہیں خدا نے‘ دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان بھی دیئے ہیں خدا نے‘ سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ ہیں اہل جہنم۔ یہاں (7:179) میں بھی کہا اور وہاں (25:44) میں بھی کہا کہ **اِلَّا كَالْاَنْعَامِ** (25:44) یہ عقل وہوش سے کام ہی نہیں لیتے۔ یہ تو انسان نہیں‘ حیوانات ہیں۔ پھر اُسی وقت کہا کہ نہیں نہیں: **بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا** (25:44) یہ ان سے بھی زیادہ غلط راہ پر چلتے ہیں۔

اختیار وارادہ کے ہوتے ہوئے عقل سے کام نہ لینے والا جہنم کا ایندھن ہوتا ہے

حیوانات تو پھر بھی اپنی Instinct (جبلت) سے کام لے کر ایک راستے پہ چلتے ہیں۔ یہ انسان تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ ہم نے ان کو جبلت نہیں دی کہ اس سے ارادہ سلب ہو جاتا ہے۔ جبلت سے ارادہ نہیں رہتا۔ بکری کو کوئی Choice (اختیار) نہیں ہے کہ وہ چاہے تو پتے کھائے اور چاہے تو گوشت کھا لے۔ اسے چوائس (اختیار) نہیں ہے‘ اس کے لیے جبلت ہے۔ ہم نے انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ بنایا ہے‘ جبلت میں تو یہ بات داخل نہیں کی۔ یہ اپنے اختیار وارادہ کو اس طرح برتتا ہے جیسے شرابی برتتا ہے۔ اب یہ کیا ہوئے؟ کہا کہ انسان نہیں رہے۔ ہم نے کہا کہ حیوان ہو گئے۔ کہنے لگے: حیوان بھی نہیں رہے۔ اس لیے کہ انسان جب گرتا ہے تو جسے یہ اپنے ذہن میں پستی سمجھتا ہے‘ یہ اس سے بھی زیادہ پستی میں جا گرتا ہے حالانکہ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ** (95:4) خلقت کے اعتبار سے تو ہم نے اس کو نہایت متوازن ہیت میں پیدا کیا تھا‘ اسے احسن تقویم دی تھی **ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ** (95:5) یہ کمبخت گرنے پہ آتا ہے تو جنہیں یہ اپنے ذہن میں پستی سمجھتا ہے‘ یہ اس سے بھی زیادہ پستی کے گڑھے میں گرتا ہے۔ ❶ آخر یہ کیا چیز ہے جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مسلوب اور مفلوج کر دیتی ہے؟

عالم گیر سطح پر انسان کے لیے ذلت وخواری کے سبب کی اصل وجہ

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ سب سے بڑا تند وتیز نشہ انسان پر اپنی حکومت قائم کرنا ہے‘ خواہ وہ کسی شکل کے اندر کیوں نہ ہو۔ بہت بڑا نشہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے قرآن انسانوں کے ذہن سے اتارتا ہے اور وہ کسی انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے انسان سے اپنا حقِ حکومت منوائے۔ زندگی رہی تو انہی دروس کے اندر میں یہ عرض کرونگا کہ یہ ہے آزادی جو رسول اللہ ﷺ نے

---

❶ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، پارہ 30 (مکمل)، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2006، ص ص 488 تا 494۔

دی تھی جو قرآن نے دی تھی کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر حکومت نہیں کرسکتا، سب برابر کی سطح کے اوپر ہیں۔ کہا کہ یہ ہے وہ چیز کہ جو لوگ جذبات سے مغلوب ہوجاتے ہیں، نشے میں رہتے ہیں، وہ حیوانوں کی سطح سے بھی بدتر چلے جاتے ہیں۔

حقائق کو سمجھانے کے لیے قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان بڑا ہی غور طلب ہے

یہاں (25:44) میں کہا کہ ہم نے حیوانات کی مثال دی ہے جو ہمارے قوانین پہ بلا چوں وچراں عمل کیے ہوئے، لگے بندھے، چلے جاتے ہیں، ان میں مجالِ سرکشی نہیں ہے۔ کہا کہ حیوانات کو تو پھر بھی چلتے پھرتے دیکھتے ہو، کہ اگر انہیں کہیں دھوپ میں گرمی لگے تو وہ سائے میں چلے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے آگے چلیے۔ وہ جو یہاں کائنات کی جامد چیزیں ہیں، انہیں دیکھیے اور سوچیے کہ خدا قانون کی اطاعت کرنے والی کن کن چیزوں کی مثالیں دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ذرا دیکھیے تو **اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوۡ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَیۡہِ دَلِیۡلًا o ثُمَّ قَبَضۡنٰہُ اِلَیۡنَا قَبۡضًا یَّسِیۡرًا** ❶ (25:45-46)۔ میں نے کہا ہے کہ یہ صحرانشیں، اس سطح کے لوگ ہیں۔ انہیں بھی یہ سمجھایا جارہا ہے، آج کے آئن سٹائن (Einstein: 1879-1955) کو بھی بات سمجھائی جارہی ہے۔ بات یہ بتائی ہے کہ خارجی کائنات میں کوئی چیز اپنے اختیار وارادے سے کچھ نہیں کرتی کیونکہ ان کے اندر جذبات نہیں ہوتے۔ اُسے کہا کہ ذرا چیزوں کے سائے کو دیکھیے۔

بڑی عجیب مثال ہے، عزیزانِ من! کہا کہ کیا کسی شے کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ اپنا سایہ اپنی مرضی کے مطابق مقرر کرے؟ نہیں، نہیں، اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمارا ایک قانون ہے۔ سورج یوں بلند ہو، وہ جس طرح سے بلندیوں کے اوپر جاتا ہے، اس کے مطابق سایہ بنتا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ اتنا ہی نہیں، یہ جو حضرتِ انسان اتنا پھنے خاں بنا پھرتا ہے، بہت صاحب اختیار وارادہ ہے۔ ذرا اس سے پوچھیے کہ اگر سورج اس کی Back (پشت) پہ یعنی پیچھے سے نکل رہا ہو تو اس کا سایہ کدھر پڑے گا؟ اسے کہیے تو سہی کہ وہ ذرا اپنا سایہ اُدھر ڈال

---

❶ (حیوانات تو ایک طرف، خارجی کائنات میں بے جان اشیاء تک بھی ایک ہی روش پر چلتی رہتی ہیں) کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا کا قانونِ کائنات کس طرح (زوالِ آفتاب کے بعد) سائے کو لمبا کرتا ہے۔ اگر ہم چاہتے تو ایسا قانون بھی بنا سکتے تھے کہ (زمین گردش نہ کرتی اور اس طرح) سایہ ہمیشہ ایک جیسا رہتا۔ (لیکن ہم نے زمین اور سورج کی گردش کا باہمی تعلق اس قسم کا رکھا ہے کہ) ہر شے کا سایہ، سورج کی نسبت سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اس طرح سورج، اس کے گھٹنے بڑھنے کی دلیل بن جاتا ہے۔ یعنی سورج کے مقام سے ہم فیصلہ کرسکتے ہیں کہ فلاں وقت پر سایہ کا انداز کیا ہوگا (25:45)۔ (یوں زوالِ آفتاب کے وقت سے سائے بڑھنے شروع ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ) ہم انہیں آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ (یعنی غروبِ آفتاب کے

ساتھ یہ سائے بھی ختم ہو جاتے ہیں) (پرویزؒ: مفہوم القرآن ٗص۔825)۔

دے۔اسے اس کا تو اختیار ہے کہ چاہے تو مشرق کی طرف چلا جائے ٗ چاہے مغرب کی طرف چلا جائے۔مگر یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہے کہ مغرب کی طرف جائے تو اپنا سایہ اپنے پیچھے لے جائے۔کہا کہ جو ہمارا قانونِ کائنات ہے ٗاس کے سامنے تو یہ بھی اتنا بے بس ہے لیکن جہاں اس کا اپنا اختیار وارادہ آتا ہے وہاں اس کمبخت کی یہ کیفیت ہے کہ اس کی عقل و ہوش سب ماری جاتی ہے ٗ ورنہ اگر وہ ہمارے قانون کے تابع اپنے اختیار وارادے کو بھی کام میں نہ لائے تو کم از کم اتنا تو دیکھ لے کہ ہم نے جو سائے کا قانون مقرر کیا ہے کس طرح وہ سایہ مجبور ہوتا ہے ٗ اس کے اختیار میں ہی نہیں ہے۔ہزار آدمی مل کے بھی چاہیں کہ اس کے سائے کو دوسری سمت میں الٹا دیں ٗ الٹا ہی نہیں سکتے۔ہمارا قانون تو اس طرح سے چلتا ہے۔

سائے کے اوپر کیا مثالیں دیتا ہے قرآن! کہا کہ سایہ بھی اس شے کی اپنی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا۔خارج میں ایک چیز ہوتی ہے ٗ جسے سورج کہتے ہیں۔یہ دیکھیے کہ وہ سورج اس سائے کو متعین کرتا ہے ٗ اس سائے کو کہ کتنا لمبا چوڑا ٗ کتنا چھوٹا ٗ کتنا بڑا ٗ کس سمت میں ٗ وہ آہستہ آہستہ ہو جائے۔جب سورج ڈوب جاتا ہے تو **ثُمَّ قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا قَبۡضًا يَّسِيۡرًا** (25:46) یہ کتنے آسانی سے اس سائے کو ہم پھر سمیٹ کے ختم کر دیتے ہیں۔بڑے سے بڑے پہاڑ کو بھی کہو کہ اس کے بعد اپنا سایہ کہیں پھینک کے بتائے ٗ یہ نہیں ہو سکتا۔اب ''الینا'' پر بات دوسری طرف چلی جائے گی۔یہاں کہا کہ **قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا** (25:46) ہم اس کو اپنی طرف سمیٹ کے لے جاتے ہیں۔یہاں ''الینا'' ہے یعنی اپنی طرف لے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا مفہوم کیا ہوا؟

قرآنِ حکیم کی روشنی میں انا للہ وانا الیہ راجعون کا مفہوم

عزیزانِ من! اسی اِلَيۡنَا پر دیکھیے۔کہا کہ **قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ** (2:156)۔اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم اس کی طرف جانے والے ہیں یعنی خدا کہیں ہے اور ہم اس کی طرف جائیں گے ٗ وہ کہیں بیٹھا ہوا ہے۔جی ٗ الیہ راجعون جو ہوا ٗ کہ اس کی طرف ہم جانے والے ہیں۔اس کے جو اصل معنی ہیں ٗ وہ تو میں اپنے مقام پہ بیان کر چکا ہوں۔میں یہاں یہ کہہ رہا ہوں کہ ''الیہ راجعون'' کے ان کے ہاں معنی خدا کی سمتیں ہیں۔وہ کہتا ہے کہ **قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا قَبۡضًا يَّسِيۡرًا** (25:46) سائے کو ہم اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔یہ کہتے ہیں کہ ''قبض'' کے معنی یہ ہیں کہ خدا کہیں بیٹھا ہوا ہے ''تے سارے سائے جیہڑے نیں ایناں نو سمیٹ سمیٹ کے لئی جاندا اے اپنے تخت دے تھلے کہ چلو اوئے چلو اوئے جس طراں بکریاں بکریاں والا بکریاں لیاندا اے اپنی۔''[1] الینا کے یہ معنی نہیں ہیں۔

---

[1] پھر تمام سایوں (Shadows) کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے تخت کے نیچے لیے جا رہا ہے (اور زبانِ حال سے کہہ رہا ہے) کہ چلو ٗ اب چلو۔یہ بالکل اسی طرح

ہے جیسے بکریاں چرانے والا اپنی بکریوں کو ہانکے لیے جاتا ہے۔

کائنات کی مثالوں کو بیان کرنے کا مقصد حقائق کو باور کرنا ہے

عزیزانِ من! عربی زبان کے اندر ''الینا'' کے معنی یہ نہیں ہیں۔ کیا عرض کیا جائے یہ قرآن کو کہاں لے گئے ہیں۔ ہمارے قانون کے مطابق یہ جو بسط اور کشاد ہے یہ سب ان کے لیے ہے۔ یہ ہمارے قانون کے مطابق ہوتی ہے' قانون کے مطابق سورج بلند ہوتا ہے' اس کی روشنی کی کرنیں' ان کے سائے کو متعین کرتی ہیں۔ وہ قانون کے مطابق ڈوب جاتا ہے تو یہ سائے قانون کے مطابق ختم ہو جاتے ہیں' دوسرے دن جب سورج چڑھتا ہے تو یہ پھر نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے یسیراً۔ جو کچھ خدا کہتا ہے اسی طرح رات اور دن کی گردش بھی خدا کے اسی قانون کی رو سے واقع ہوتی ہے۔ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ❶ (25:47)۔ خارجی کائنات میں ہمارے قانون کی کارفرمائیاں دیکھیے تو سہی کہ دن کے بعد رات' رات کے بعد دن آتا ہے۔ رات آرام کے لیے ہے اور پھر وہ اپنی تاریکیوں کی چادر میں' ایک لباس کی طرح' کائنات کی چیزوں کو اپنے اندر ڈھانپ لیتی ہے۔ کیا انداز ہیں کہنے کے! ❷ اور پھر دن ہے کہ اس میں ہر شے کی نمود ہو جاتی ہے' ہر شے ابھرتی ہے' آنکھیں ملتی ہوئی تمام چیزیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ تم بھی ایسا ہی کرتے ہو۔ خدا کے اسی قانون کے مطابق' زمینی پیداوار کا سلسلہ قائم ہے۔ دیکھو کہ وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ❸ (25:48)۔

خارجی کائنات کی یہ مثالیں' یہ بتانے کے لیے ہیں کہ وہاں تم دیکھو کہ قانون کی خلاف ورزی کہیں نہیں ہوتی' وہ وحی کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں اور تم اس کے متعلق Anticipate (پیش بینی) کر سکتے ہو' پیشین گوئی کر سکتے ہو کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے والے کے متعلق یہ کچھ کہا جا سکتا ہے اور یہی چیز ہے جو وہ یہ کچھ کہتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ مومن کے متعلق تم پہلے سے کہہ سکتے ہو کہ اگر ایسا ہوا تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا کیونکہ اس کا وہ ردِعمل اس کے اپنے جذبات کے تابع نہیں ہوتا' ہماری وحی کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ جو مثالیں دیتا ہے' کہتا ہے کہ ان ہواؤں کو دیکھو کہ بارش سے پہلے کس طرح سے یہ ایک نئی زندگی کے پیامبر بن کے ہمارے ہاں آتی ہیں۔ ہواؤں کا علم رکھنے والے یہ محکمہ موسمیات والے کتنا پہلے سے اس کے متعلق پیشین گوئی کر دیتے ہیں کہ کہاں کیا ہونے والا ہے' کہاں کیا آنے والا ہے؟

---

❶ رات کو اس نے تمہارے لیے پردہ پوش بنایا (کہ تم اس کی تاریکیوں کی چادر میں اپنے آپ کو لپیٹ لیتے ہو) اور نیند کو ایسا بنایا (کہ اس میں تمہارا شعور وقتی طور پر معطل ہو جاتا ہے اور اس طرح تمہارے اعصاب کو) سکون مل جاتا ہے۔ اس کے بعد دن نمودار ہو جاتا ہے جس میں تم پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہو اور اپنے کام کاج کے لیے اِدھر اُدھر پھیل جاتے ہو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 825)۔

❷ اس آیت اور سبات' سبت کے قرآنی مفہوم کے لیے اگلا درس یعنی گیارھواں باب دیکھیے۔

❸ وہ بارش سے پہلے' جو ہر ذی حیات کے لیے سامانِ نشوونما کا ذریعہ ہوتی ہے' خوشگوار ہواؤں کو قاصد بنا کر بھیجتا ہے کہ لوگوں کو جا کر بارش کی خوشخبری دیں۔

اس آیت کے حوالے سے اس کی مزید تفصیل کے لیے اسی کتاب کا گیارھوں باب (آیات 47 تا 52) ملاحظہ کیجیے۔

انسان کے مقابلے میں خارجی کائنات کی ہر شے تعمیری نتائج پیدا کرتی ہے

معاف رکھیے گا، آپ کہیں گے کہ یہ تو جو بھی وہ محکمہ موسمیات والے کہتے ہیں، بالکل ہی اس کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ جو کچھ یہ جو لوگ کہتے ہیں، وہ تو واقعی اس کے خلاف ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر مشینوں پہ چھوڑ دیا جائے تو کبھی ایسی بات نہ ہو، مشینیں سچ بولتی ہیں۔ ''انسان تے ایس مشین نوں وی جس طراں او ٹیکسی والا اپنے میٹر نال کردا اے، اے حال ہو جاندا اے فیر۔''[1] جہاں انسان کا ہاتھ بیچ میں آتا ہے یہی ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خالصتاً خارجی کائنات میں دیکھیے کہ ہمارا قانون کس قاعدے کے مطابق، کس اصول کے مطابق، حسن تعمیر کے نتائج پیدا کرتا چلا جاتا ہے، دیکھیں کہ وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (25:48) پہلے ہوائیں آتی ہیں، بادل آتے ہیں، پانی برساتے ہیں اور وہ پانی مَآءً طَهُوۡرًا (25:48) ہے یعنی ایسا صاف پانی ہے اور پھر جب وہ پانی تمہارے ہاتھوں میں آجاتا ہے تو پوچھو نہیں کہ تم اسے کتنا گدلا کر دیتے ہو۔ ہم برساتے ہیں تو کتنا پاک صاف کشید کیا ہوا، ہر قسم کی کثافتوں سے پاک اور صاف پانی ہوتا ہے اور اس سے ہر قسم کی کثافتیں دور کی جاتی ہیں۔ قرآن نے کئی مقامات پر اس کی مثال دی ہے۔

سورج کی شعاعوں سے کشید کیے ہوئے پانی کی مثال

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ اس پانی کی مثال ربوبیت کی بڑی عظیم مثال ہے۔ پانی کے اوپر تو انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ ساری زراعت کا، نشوونما کا، دارومدار ہی پانی پہ ہے۔ کس پانی پہ ہے، کیا وہ سمندر کا پانی ہے؟ نہیں، وہ پرانی ایک نظم ہوتی تھی:

Water, water, every where
But not a drop to drink[2]

یعنی یہ اتنا بڑا سمندر ہے مگر

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

وہاں انسان پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستا ہے۔ وہ پانی اس قابل ہی نہیں ہوتا۔ سمندر پانی کا ذخیرہ ہے۔ پانی پہ سارا زندگی کا دارومدار ہے: جہاں بھی زندگی ہے، خواہ انسان میں ہے، یا خارجی کائنات میں ہے، سمندر کا وہ پانی تو موت ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ جناب! اس کا

---

[1] جس طرح ٹیکسی والے اپنے میٹر کو کر لیتے ہیں، انسان بھی اس مشین کو اسی طرح کر لیتا ہے تو پھر یہی صورتِ حال ہوتی ہے۔

❷ یہ Samuel Taylor Coleridge(1772-1834AD) کی ایک نظم The Rime of the Ancient Mariner کا ایک شعر ہے۔

انتظام دیکھیے' سورج کی کرنیں اسی پانی کو جس کے اندر اتنے زہریلے نمکیات گھلے ہوئے ہوتے ہیں' قابل استعمال بناتی ہیں۔ سائنسدان یہ جانتا ہے کہ وہ پانی فلٹر نہیں ہوسکتا۔ سورج کی کرنوں کی حرارت اس پانی کو کشید کرتی ہے اور اس قسم کی تمام ملی ہوئی زہریلی چیزوں کو نیچے چھوڑ جاتی ہے اور صاف پانی **مَـــآءً طَهُـــوْرًا** (25:48) کو اوپر کھینچ کر لے جاتی ہیں' ڈول بھر بھر کے وہ کرنیں لے جاتی ہیں۔ وہ لے جائیں تو پھر کیا کریں' کہاں رکھیں؟ وہاں کوئی ان کے ہاں ٹینکیاں بنی ہوئی نہیں ہیں۔ وہاں جا کر یہ اوپر چلا جاتا ہے۔ ذرا سی ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جو نیچے سے لے جاتی ہیں' ذرا سی وہ وزنی سی بھاپ بنتی ہے' جس کو بادل کہتے ہیں۔ اب بادل اگر وہیں رہیں' جہاں نیچے سمندر ہے تو وہ وہیں برسے۔ وہاں سے پھر' یہ جو کہا ہے' ہوا چلتی ہے۔ قرآن نے ان کو سقا (25:49) کہا ہے۔ ساڈے سقے اوندے نے پئے۔ اے ہن لاہورئیے منڈے تے اے وی نئیں جاندے ہون گے کہ سقا کنوں کیندے نیں۔ ایناں دے گھر اج نلکا بند ہووے تے سارا ٹبر پیاسا مرجاندا۔ اے سقا ای ہے نئیں۔ تے او ڈول تے ڈولکیاں لیے ہوئے اس نلکے دے تھلے فیر اوناں نوں گالیاں دیندے رہندے ہیگے نیں۔ سقا ای کوئی نئیں رہیا' کھوہ ای نئیں رہئے ہیگے' تے سقا کی رہنا۔ ❶ کہا کہ وہ ہمارے سقے آتے ہیں' وہ ان کو لے جاتے ہیں۔ جہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں اس مشکیزے کا منہ کھول دیتے ہیں۔

مومن کی صفت قانت کا قرآنی مفہوم

کیا بات یاد آ گئی' عزیزانِ من! قرآن نے مومن کی صفت **قـــانـــت** ❷ بھی بتائی ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ سقے کی بھری ہوئی مشک کا منہ بھی بند ہوتا ہے' ساری مشک سی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ پانی کا ایک قطرہ بھی ادھر اُدھر گرنے نہیں دیتا لیکن جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ اس مشکیزے ❸ کا منہ کھولتا ہے' اتنا پانی ڈالتا ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے' پھر بند کر دیتا ہے۔ یہ جو پانی کے Preserve (محفوظ) رکھنے کا طریق ہوتا ہے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اتنا ہی دینے کا' جتنی ضرورت ہوتی ہے اسے عربی زبان میں قانت کہتے ہیں۔ مومن

---

❶ ہمارے ہاں سقے (ماشکی) آیا کرتے ہیں۔ یہ لاہوری بیٹے تو یہ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ سقا کسے کہتے ہیں؟ اگر آج ان کے گھر نلکا بند ہو جائے تو سارا خاندان (پیاسا) مرجائے۔ یہ سقا ہے ہی نہیں۔ پھر وہ ڈول اور برتن لیے اس نلکے کے نیچے رکھے اسے گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ سقا ہی کوئی نہیں رہا۔ کنوئیں ہی نہیں رہے تو سقا کہاں سے آتا۔

❷ قَـانِتٌ کے معنی تاج العروس کے مطابق یہ ہیں: قوانین خداوندی کو قائم کرنے والا' احکام خداوندی کو لے کر کھڑا ہو جانے والا۔ مومنین کے حوالے سے یہ لفظ یوں آیا ہے: اَلْـقَـــانِتِيْـنَ وَالْقَـانِتٰتِ (33:35) ''اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے' انہیں صرف وہاں صرف کریں جہاں صرف کرنے کا حکم قوانین خداوندی کی رو سے ملے'' (خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔974)۔

❸ بقول تاج العروس سِـقَـاءٌ قَنِيتٌ اس مشکیزے کو کہتے ہیں' جو پانی کو اس طرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو (پرویزؒ: لغات القرآن'

جلد سوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص۔1390)۔

قانت ہوتا ہے۔اس کے اندر جتنی صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ انہیں Preserve (محفوظ) رکھتا ہے۔ جہاں وحی کی ہدایت کے مطابق ضرورت ہوتی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کے اس مشکیزے کا منہ کھول دیتا ہے اس کے بعد پھر بند کر کے رکھ لیتا ہے۔ نہ اپنی مرضی کے مطابق ان کو ضائع کرتا ہے' نہ اپنی مرضی کے مطابق بند کر دیتا ہے۔ مومن قانت ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہاں **مَآءً طَهُوْرًا** (25:48) کہا ہے یعنی اس قسم کا پانی جو خود بھی ہر قسم کی کثافتوں سے پاک اور صاف ہو اور اس سے ہر قسم کی کثافتیں دور ہو جائیں۔ اس کے بعد کہا کہ **لِّنُحْیِیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّ نُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ كَثِیْرًا** (25:49) ❶۔اور پھر وہاں زمینِ مردہ پہ وہ بارش برستی ہے کہ اس زمینِ مردہ میں آپ زندگی دیکھو۔اس بارش سے پہلے اس زمینِ مردہ کو کھود کے دیکھو تو زندگی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔قرآن کہتا ہے کہ بارش کے اس پانی کے امتزاج سے آپ دیکھیے کہ پھر زندگی کس طرح قہقہہ بار تبسم ریز اس کے اندر سے ابھرتی اور نکھرتی چلی آتی ہے۔ زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ مل جاتی ہے اور اس سے پھر مویشی بھی سیر ہوتے ہیں' انسان بھی سیراب ہوتے ہیں۔ کہا کہ اگر وحی خداوندی کو تم اپنے ہاں اس طرح سے استعمال کرو تو دیکھو کہ تمہاری مردہ قوم میں کس طرح سے نئی زندگی ابھر آتی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی آیت 49 تک ہم آ گئے' 50 ویں سے آئندہ لیں گے۔ ❷

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

❶ (بارش سے یہی مقصد نہیں ہوتا کہ اس سے لوگ نہا دھو لیں) اس سے ہم مردہ بستیوں کو زندگی عطا کرتے ہیں۔(بنجر زمینوں سے نباتات اُگتی ہیں۔) نیز یہ ہماری بے شمار مخلوق' مویشیوں اور انسانوں' کے پینے کے کام آتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 825 تا 826)۔

❷ آیات 47 تا 49 کی مزید تشریح اگلے درس (گیارھواں باب) میں کی گئی ہے۔اُسے وہاں بھی دیکھ لیجیے۔

گیارھواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 47 تا 52)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ
نُشُوْرًا ﴿٤٧﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً
طَهُوْرًا ﴿٤٨﴾ لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿٤٩﴾ وَلَقَدْ
صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ڮ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٥٠﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ
قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1978ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 47 [1] سے ہو رہا ہے: (25:47)۔

گزشتہ سے پیوستہ نفسِ مضمون

سابقہ درس' خصوصی عنوان' بموقعہ عید میلاد النبی ﷺ تھا۔ اس سے پہلے درس میں جو سابقہ آیات ہمارے سامنے آئی تھیں' ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ قوانین خداوندی تو ساری کائنات میں جاری وساری ہیں اور یہی قوانین ہم نے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھی بذریعہ وحی

---

[1] گزشتہ درس (منعقدہ 17 فروری 1978ء) میں آیات 47 تا 49 لی جاچکی تھیں تاہم اس درس میں سبت' نیند کی حالت میں انسانی شعور' میموری' حیات بعد الممات' موت کے بعد شعور کا واپس آنا' خواب میں شعور کی کیفیت' شعور کا مربوط ہونا' موت کے بعد کی زندگی کے درمیان وقفہ' چھٹی کے تصور کا نہ ہونا' جمعہ کے روز جمع ہونے کا مقصد' نعمائے خداوندی کا تذکرہ اور حیات بعد الممات کے سلسلے میں زمین مردہ' کے حوالے سے بھی یہی آیات بار دگر لی گئی ہیں۔

دیئے ہیں' فرق یہ ہے کہ اشیائے کائنات تو مجبور واقع ہوئی ہیں' انہیں اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ جی چاہے تو ان قوانین کی اطاعت کریں اور جی چاہے تو ان سے سرکشی برت لیں' وہ ان کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ انسانوں کی صورت میں قوانین ہم نے دے دیئے اور یہ پھر ان پہ چھوڑ دیا کہ **فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ** [1] (18:29)۔ جس قسم کا وہ راستہ اختیار کرے گا' اس کا نتیجہ بھگتے گا۔

اشیائے کائنات کے متعلق ذکر چلا آ رہا تھا کہ وہ ان قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ کچھ مثالیں پہلے دی تھیں اور اب اسی تسلسل میں اگلی بات آئی کہ **وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا** (25:47)۔ عام ترجمہ تو یہی کیا جاتا ہے کہ خدا نے تمہارے لیے رات کو لباس بنایا' نیند کو سبات بنایا' نہار کو نشور بنایا۔ اس میں تین لفظ آئے ہیں۔ عام طور پر یہ ہے کہ رات نیند کو' آرام کو' اور دن چلنے پھرنے کو لیکن جیسا کہ میں نے اکثر کہا ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ سے یونہی آگے نہیں گزر جانا چاہیئے' وہ تو ایک ایک لفظ کے انتخاب میں معنی کی ایک دنیا سمیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ رات کو لباس بنایا یعنی ایسی چیز جو کسی کو لپیٹ لے' جیسے تاریکی کی چادر کہی جائے گی۔ اس پورے خطے کو جس کے اوپر رات کی تاریکی کی یہ چادر آ جاتی ہے' وہ اس کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کے دو معنی ہوتے ہیں: کسی چیز کو ڈھانپ لینا' جیسے تاریکی میں' اور تاریکی میں ہر شے خلط ملط ہو جاتی ہے مگر روشنی میں ہر شے اپنے اپنے مقام پہ الگ الگ نظر آتی ہے' معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہے' اور تاریکی میں یہ ہر شے خلط ملط ہو جاتی ہے' اس میں محسوس اور معلوم ہی نہیں ہوتا' سانپ اور رسی میں بھی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ان کے ہاں یہ ایک ہی ''لبس'' کا لفظ تھا' ان کے ہاں التباس بھی تھا۔ یہ لبس خلط ملط ہو جانا اور کسی چیز کو ڈھانپ بھی دینا ہے۔ جب بھی کوئی چیز ڈھانپ دی جائے گی' تو وہ خلط ملط ہو جائے گی۔ رات کے متعلق تو اس نے صرف اتنا ہی کہا ہے۔ رات کے متعلق یہ نہیں کہا وہ آرام کے لیے بنائی ہے۔

لفظ سبات کا استعمال اور یومِ سبت

رات میں اگلی بات یہ ہے کہ **وَ النَّوْمَ سُبَاتًا** (25:47)۔ نیند کو اس نے سبات بنایا۔ سبات کے معنی اگر آرام لیے جائیں تو میں ابھی عرض کروں گا کہ یہ بات اور گہری ہے۔ نیند کو' پوری رات کو نہیں' صرف نیند کو' اس نے آرام کے لیے بنایا۔ رات کے سمے تو کام کیا جاتا ہے' ساری ساری رات کام کیا جاتا ہے۔ رات میں جو حصہ نیند کا ہے' اسے اس نے کہا کہ سبات بنایا۔ یہ سبات کیا چیز ہے؟ یہاں کہا ہے کہ سبات بنایا۔ آرام کے لیے تو عربی زبان میں بیسیوں الفاظ موجود تھے مگر یہاں کہا کہ اسے سبات بنایا۔ سبت کے لفظی معنی تو ہوتے ہیں ''کسی چیز کو کاٹ دینا' منقطع کر دینا۔'' اصطلاحی طور پہ یہ لفظ یہودیوں کے ہاں استعمال ہوتا تھا۔ اسے **یوم السبت** کہا جاتا ہے' جسے

---

[1] پس جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

انگریزی میں Holiday (تعطیل) کہا جاتا ہے۔ یہودیوں کے ہاں تورات میں عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے چھ دن میں اس کائنات کو پیدا کیا۔ وہ مسلسل چھ دن کام کرنے سے بالآخر تھک گیا تو ساتویں دن اس نے آرام کیا۔ سبت کا لفظ وہ اس معنی میں لیتے ہیں کہ اس نے کام کاج کو یا عمل کو منقطع کر دیا' تو سنتِ خداوندی کے اتباع میں ہفتے میں ایک دن یعنی Saturday (سنیچر) کا دن یہودیوں کے ہاں یومِ سبت کہلاتا ہے۔ ان کے ہاں اس دن ہر قسم کا کاروبار منقطع ہو جاتا ہے' وہ کوئی بھی کام نہیں کرتے۔

عیسائیوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات نفرت پر مبنی تھے

عیسائیوں کے ہاں موجودہ انجیل میں تو یہ قانون نہیں ہے۔ یہ یہودیوں کے ہی قانون پہ تھے لیکن یہودیوں کے ساتھ ان کو سخت نفرت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودیوں نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرایا تھا' ان کے خلاف مقدمہ چلایا تھا' اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق انہیں صلیب بھی دی تھی۔ جن یہودیوں کی یہ کیفیت تھی' ان کے ساتھ ان کا دوستی کا معاملہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ نفرت اس حد تک تھی کہ جو کچھ یہودی کرتے تھے وہ علی الرغم اس کے خلاف کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ عیسائیوں نے بعد میں یہ چیز اپنے ہاں جاری کی ہے کہ یہودیوں کے علی الرغم یہ کچھ کیا جائے گا۔ مثلاً یہودیوں کے ہاں خنزیر حرام تھا انہوں نے کہا ہم کھل کر کھائیں گے' یہودیوں کے ہاں ختنہ کراتے تھے انہوں نے کہا بالکل نہیں ہوگا' یہودیوں کے ہاں یہ جو زیرِ نظر بات ہفتے کے دن کی ہے' جسے آپ Saturday (سنیچر) کہیں گے' وہ یومِ سبت تھا' چھٹی کا دن (Holiday) تھا' مقدس دن Holy day تھا' انہوں نے کہا کہ نہیں' ہمارے ہاں اتوار (Sunday) ہوگا۔

بتوں کے نام پہ دنوں کے نام رکھے گئے

عزیزانِ من! یہ میں کبھی دوسرے وقت بتاؤں گا کہ یہ جو Sunday (اتوار) اور Monday (سوموار) ہے' یہ سورج کا دن اور چاند کا دن ہے۔ یہ سورج (Sun) اور چاند (Moon) دو ہی دیوتا تھے۔ اصل میں ان سے بہت پہلے' جس زمانے میں Christianity (عیسائیت) وغیرہ ابھی نہیں آئی تھی' ان کے ہاں بت پرستی تھی۔ جن قبائل میں یہ رہتے تھے انہوں نے بتوں کے نام پہ دنوں کے نام[1]

---

[1] Sunday یعنی Sun (سورج) دیوتا کا دن' Monday (سوموار) یعنی Moon (چاند) دیوتا کا دن' Tuesday (منگل) یعنی Tiu (جرمنی دیومالا میں) جنگ اور آسماں کے دیوتا کا دن' Wednesday (بدھ) یعنی Woden's day یعنی اینگلوسکسن دیومالا میں سالار دیوتا کا دن' Thursday (جمعرات) یعنی Thor's day یعنی Thor اسکنڈینیوژن ممالک میں گرج کے دیوتا کا دن' Friday (جمعہ) یعنی Day of Frig یعنی اسکنڈینیوژن ممالک کی دیومالا میں گھربار اور رسمیائی ازدواجی زندگی کی دیوی کا دن۔

رکھے ہوئے تھے۔ خود مصر میں بھی سورج دیوتا ❶ کی پرستش ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے وہ ایک ہی دن جو اس دیوتا کا تھا' وہ اسے Sunday (اتوار) کہتے تھے یعنی Sun (سورج) دیوتا کا دن اور اسی طرح سے Moon دیوتا کا دن یعنی Monday (سوموار)۔ قرآن میں کبھی یہ بات آئی تو میں عرض کروں گا کہ انہوں نے اپنے ہاں یہ کچھ کر رکھا تھا۔

عزیزانِ من! انہوں (عیسائیوں) نے یہ کہا کہ ہم Saturday (سنیچر) کو چھٹی نہیں کریں گے بلکہ ان (یہودیوں) کے علی الرغم Sunday (اتوار) کو چھٹی کریں گے تو ان کے ہاں وہ Sunday ایک دن چھٹی کا آ گیا' اور انہوں نے اس کو مقدس دن Holy day قرار دیا۔

قرآنِ حکیم نے زندگی بھر کسی دن کو بھی چھٹی کا دن قرار نہیں دیا

قرآنِ کریم نے کسی دن کو بھی چھٹی کا دن نہیں کہا۔ زندگی کام کرنے کے لیے ہے' چھٹی کے لیے نہیں ہے۔ اس نے کسی دن کو بھی Holy day (مقدس دن) نہیں کہا۔ ہر دن مقدس دن ہے' ہر دن یکساں دن ہے۔ وہ تو ان کے ہاں کے دیوتاؤں کے نام پہ تھے' اس لیے ان میں سے دیوتے کی تقدیس کے لحاظ سے وہ اس کو مقدس دن (Holy day) کہتے تھے۔ قرآن کی رو سے' کسی ایک دن کو بھی خدا نے مقدس دن (Holy day) نہیں کہا اور ہفتے میں تو ایک طرف رہا وہ تو زندگی بھر میں کسی دن کو بھی چھٹی کا دن قرار نہیں دیتا۔ وہاں چھٹی کا یہ تصور نہیں ہے۔ اس نے تو سبت کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اب اس سبت کی طرف آیئے۔ وہ تو صرف نوم (نیند) کی حالت کو سباتا کہتا ہے۔ یہ سبت کی حالت نیند کی حالت ہے اور اگر یہ لفظ آپ صرف کام کے منقطع ہونے کے لیے لیتے ہیں تو پھر تو ٹھیک ہے کہ نیند کی حالت میں تو کام نہیں کیا جا سکتا اور جاگتے ہوئے تو خواہ وہ دن ہو یا رات ہو' وہ تو کام کے لیے ہے۔ نوم کو سبت کہنے سے' آپ نے دیکھا کہ بات کہاں پہنچا دی۔ اس نے کہا کہ نہ صرف یہ کہ ہفتے میں کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ جو کوئی سبت کا ہے جس میں کام نہیں کیا جائے گا اور اُدھر کوئی رات بھی ایسی نہیں ہے جو سبت کی ہو۔ وہ تو نیند کی حالت ہے جس میں عمل منقطع ہوتا ہے یا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ جاگنے والا اگر کام نہیں کرتا تو وہ تو موت ہے' زندگی نہیں ہے۔

نیند کی حالت میں انسانی شعور کی کیفیت

اب آگے بڑھیے تو پھر بات یہ ہے کہ ہم اس دور میں آ پہنچتے ہیں جہاں پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے سبات کا یہ لفظ کیوں استعمال کیا

---

❶ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ آمن رع (سورج کا دیوتا) اِن سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فاراع (یعنی سورج کے دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ (پرویزؒ: برقِ طور' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1993ء' ص۔4)

ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عربوں کے ہاں اس لفظ کے بنیادی معنی Cut-off (منقطع) کے ہیں یعنی کسی سلسلے کا منقطع کر دینا۔ آپ کو پتہ ہے کہ نیند کی حالت میں ہوتا کیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جو لوگ بھی انسانی علم میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں وہ قرآن کو سمجھ سکتے ہیں اور پھر عالمِ آفاق میں تو باہر کی یہ ساری Sciences (سائنس کے تمام علوم) آ جاتی ہیں جن کا تعلق Outer World (خارجی دنیا) سے ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم اپنی نشانیاں عالم انفس میں' نفوس کی دنیا کے اندر بھی' دکھائیں گے۔ ❶

اب ہمارا یہ دور شروع ہوا ہے۔ اِس میں نفسِ انسانی کے متعلق تحقیقات شروع ہوئی ہیں۔ اِسے عام طور پہ سائیکولوجی (علم نفسیات) کہا جاتا ہے۔ اس کے ماہرین ان چیزوں کو جو قرآن کہہ گیا ہے Appreciate (پسند) کریں گے کہ نیند کی حالت میں ہوتا کیا ہے؟ اس حالت میں جسم کا سارا سلسلہ اسی طرح سے' ساری مشینری اسی طرح سے' سرگرمِ عمل رہتی ہے: دل چلتا ہے' دورانِ خون ہوتا ہے' سانس اسی طرح سے چل رہا ہوتا ہے' ہر چیز اسی طرح سے ہوتی ہے۔ کیا چیز ہے جو منقطع ہو جاتی ہے' کیا سلسلہ ہے جو Cut-off (منقطع) ہو جاتا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ جسے آپ بجلی کا کرنٹ کہتے ہیں اُس کا یہ سوئچ آپ نے آف کیا ہے تو وہ جو وہاں Positive (مثبت) اور Negative (منفی) کے دو تار آپس میں ملتے ہیں ان کو آپ الگ کر دیتے ہیں۔ آپ نے بجلی کے مکینک کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ جی Cut-out نہیں ہے یعنی یہ اصطلاح ہے کہ وہ دو تاریں آپس میں جڑتی ہیں تو بجلی کا کرنٹ کام کرتا ہے' یہ Cut-out ہو جاتی ہیں' ان دونوں کے اندر کرنٹ موجود ہوتی ہے مگر اس کا جو دائرہ ہے' سلسلہ ربط ہے' کنکشن ہے' کنٹیکٹ ہے' وہ نہیں رہتا تو بجلی کی کرنٹ (رو) کام نہیں کرتی۔

---

❶ یہ مکمل آیت قرآن یوں ہے: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط اَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (41:53) (یہ لوگ قرآن کی صداقت سے اس وقت انکار کرتے ہیں تو کرنے دو) ہم ایسے حالات پیدا کرتے جائیں گے کہ ان لوگوں کو خود اپنی قوم میں (نفوس کی دنیا کے اندر) اور اپنے گرد و پیش کی اقوام میں (جب یہ نظام مرکز عرب سے آگے بڑھ کر' اور علاقوں میں پھیل جائے گا) ہمارے قانون کی صداقت کی محسوس نشانیاں نظر آ جائیں گی' حتیٰ کہ یہ حقیقت ان کے سامنے نکھر کر آ جائے گی کہ قرآن نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہ حق پر مبنی تھا' اور ٹھیک اسی طرح واقع ہو کر رہا۔

(اور یہ چیز صرف اس زمانے کے مخاطبین عرب تک ہی محدود نہیں۔ جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائے گا اور دنیا پر نئے نئے حقائق منکشف ہوتے جائیں گے' وہ انسان کی داخلی دنیا سے متعلق ہوں' یا خارجی کائنات سے' وہ سب قرآن کے دعاوی کی زندہ شہادتیں بنتے جائیں گے اور یوں دنیا رفتہ رفتہ دیکھ لے گی کہ قرآن کی ہر بات حقیقت پر مبنی ہے۔) یہ اس لیے کہ یہ کتاب اُس خدا کی طرف سے ہے جو کائنات کی ہر شے پر نگران ہے۔ اس لیے اُسے خوب معلوم ہے کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ لہٰذا اس کا ایسا ہمہ گیر علم ہی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ حقیقتِ ثابتہ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1124)۔

نیند کی حالت میں انسانی شعور اعصاب سے لاتعلق ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ نیند کی حالت میں وہ کون سی چیز ہے جو Cut-off (منقطع) ہوتی ہے؟ وہ شعور ہے جو Cut-off (منقطع) ہوتا ہے۔ Consciousness (شعور) نہیں رہتا' دماغ اسی طرح سے کام کر رہا ہوتا ہے۔ دماغ کا کام تو اعصاب کے ذریعے سے جسم کی مشینری کو کنٹرول کرنا ہے۔ وہ مشینری تو اسی طرح سے اس کے کنٹرول میں ہوتی ہے: یہ دل دھڑکتا ہے' دورانِ خون ہوتا ہے' سانس آ جاتا ہے' پھیپھڑے کام کرتے ہیں' اندر کے سارے اعضا اسی طرح کام کر رہے ہوتے ہیں وہ اس کنٹرول میں ہوتے ہیں اور دماغ کے بھی باقی سارے حصے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک چیز ہے جس کا وہ کنکشن (سلسلہ ربط) Cut-off (منقطع) ہو جاتا ہے۔ وہ ہے Consiousness (شعور)۔ اس میں شعور نہیں ہوتا۔ شعور کی جو تاریں اعصاب کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہیں ان کو نوم کی حالت میں منقطع کر دیا جاتا ہے۔ سبات یہ لفظ ہے جو Cut-off (منقطع) کے لیے آیا ہوا ہے۔ اب دیکھیے قرآن کیا کہہ گیا ہے؟ یہ (39:42) قرآن کی بڑی اہم آیت ہے اور اس دور میں آ کر یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ یہ کیا کہا ہے؟ اس سے پہلے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہاں کہا ہے کہ **اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا وَ الَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا ۚ فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَ یُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ** (39:42)۔

قوم ہمیشہ وہ تباہ ہوتی ہے جس کا غور و فکر کا سوئچ کام کرنا چھوڑ دے

عزیزانِ من! (39:42) کا مفہوم سمجھنے سے پہلے ابھی جو عالم النفس کی بات کی گئی ہے' اس کے الفاظ سن لیجیے۔ یہ ہم نے اوپر (41:53) کے حوالے سے بات کی ہے' کہا ہے کہ وہ لوگ جو غور و فکر سے کام لیں گے' ان کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں اس میں موجود ہیں۔ اگر غور و فکر سے کام لینے کی کوئی بات ہے تو یہ بات ایسی ہے جس میں غور و فکر ضروری ہے۔ غور و تدبر سے یہ بات سمجھ میں آئے گی جو میں کہہ گیا ہوں اور قرآن کہہ رہا ہے۔ اب جس قوم کے ہاں غور و فکر کا سوئچ (Switch) ہی آف (Off) ہو گیا ہو' وہ سوچتی ہی نہیں' اس کا پیچھے سے پاور ہاؤس ہی ختم کر دیا ہوا ہے' یہ بات ان کی سمجھ میں کیسے آ سکتی ہے۔ وہ جو قرآن دینے والا ہے' لکھنے والا ہے' بتانے والا ہے' وہ کہتا ہے کہ یہ بات صرف ان کی سمجھ میں آئے گی جو غور و فکر سے کام لیں گے۔ یہ اتنی بڑی اہم بات کہہ گیا ہے تو یہ غور و فکر سے کام لینے والوں کے لیے ہے۔ یہ دور غور و فکر کرنے والا آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیند کی حالت میں بھی اور موت کی حالت میں بھی ایک قدرِ مشترک ہے اور وہ ہے نفس۔ اب (39:42) میں لفظ انفس کہا تھا۔ اس زمانے میں نفس کا لفظ ہے۔

نینداور موت دونوں حالتوں میں شعور کو روک لیا جاتا ہے

قرآن کے ہاں (39:42) میں کہا گیا ہے کہ نیند کی حالت میں بھی ہم شعور کو اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں، یعنی شعور کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، موت کی حالت میں بھی یہ کچھ کر لیتے ہیں۔ نیند کی حالت کے بعد اسے واپس بھیج دیتے ہیں مگر موت کی حالت میں اسے اپنے ہی پاس رکھ لیتے ہیں، اس کو فنا نہیں کرتے۔ نیند کی حالت میں بھی شعور کا وہ سلسلہ اتنے وقت کے لیے Cut-off (منقطع) ہوا ہوتا ہے۔ جس وقت بھی آپ وہ سوئچ آن کر دیتے ہیں، یعنی دونوں تاریں پھر جوڑ دیتے ہیں، آپ کا سارا شعور اسی طرح سے برقرار ہو جاتا ہے: وہی حافظہ، وہی میموری (Memory)، وہی واقعات، الغرض وہ تمام چیزیں برقرار ہو جاتی ہیں۔

شعور کے تسلسل کا ہی دوسرا نام میموری (Memory) ہے

عزیزانِ من! اگر اس حالت میں جب شعور کا یہ پچھلا سارا سلسلہ Cut-off (منقطع) کیا تھا، جب وہ تمام نقوش جتنے بھی ہیں جنہیں آپ میموری (حافظہ) وغیرہ کہتے ہیں، کہیں وہ غائب ہو گئے ہوتے تو سوچیے ہماری کیا حالت ہوتی۔ آج تو اگر آدھی رات بھی آنکھ کھلتی ہے تو شعور آجاتا ہے۔ اگر میموری (حافظہ) ختم ہو جاتی تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم کہاں ہیں۔ میموری (حافظہ) تو شعور کے تسلسل کا نام ہے یعنی یہ چیز ہے کہ اس کو صرف وہ جو کنکشن تھا اس کو Cut-off (منقطع) کیا تھا، کرنٹ بدستور رکھی، پاور ہاؤس بدستور رہا، ہم نے اس کو اپنے ہاں رکھا، ضائع نہیں ہونے دیا، فنا نہیں کیا، اس کو نہایت امانت کے ساتھ اپنے پاس رکھا۔ نیند کے بعد اس کو واپس بھیج دیا۔ جب وہ آپ کا سارا شعور واپس آتا ہے تو اس میں وہ آپ کے ہاں کی ساری چیزیں، یادداشتیں، میموری (حافظہ)، ہر فکر، تدبر، غور، عقل ہر چیز اسی طرح سے واپس آجاتی ہے جو نوم کی حالت میں یعنی نیند کی حالت میں ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی، وہ ساری واپس آجاتی ہیں۔ یہاں (39:42) میں کہا کہ نیند کے بعد جب تم جاگتے ہو تو اسے ہم تمہیں واپس دے دیتے ہیں، موت کی حالت میں اسے کچھ وقت کے لیے اپنے پاس روکے رکھتے ہیں، رہتا وہ اسی طرح سے ہے جس طرح سے یہ نیند کی حالت میں رہتا ہے۔ یعنی موت کی حالت میں شعور خدا کے ہاں اس طرح رہتا ہے کہ اِس کی ساری خاصیتیں، خصوصیات، صلاحیتیں، میموری، حافظے، یادداشتیں، یہ سب برقرار رہتی ہیں، فنا نہیں ہوتیں۔

''سبات'' کا یہ ایک لفظ حیات بعد الممات کی پوری کیفیت کا ترجمان ہے

قرآن یہ کہتا ہے کہ اسی طرح سے شعور کی کیفیت ہے۔ اسے ہم جو اپنے ہاں رکھتے ہیں تو اس کی بھی یہی کیفیت رہتی ہے ہاں البتہ ادھر نیند کے بعد ہم وہ سب کچھ لوٹا دیتے ہیں جو کچھ تمہارے ہاں ہوتا ہے اور اسی طرح وہ تمام وہاں موت کے بعد لوٹا دیں گے جو کچھ

تمہارے ہاں شعور میں ہوگا۔ اب سوچیے صاحب! کہ جسے حیات بعد الممات کہتے ہیں اُسے قرآن اس ایک لفظ ''سبات'' میں سمو کر کتنی بڑی اہم بات کہہ گیا ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے جو اس نے کہا تھا کہ یہ بات غور و فکر کرنے والوں کو سمجھ میں آئے گی کہ میں نے کیا کہا ہے۔ [1] اب معلوم ہوا کہ قرآن میں جو الفاظ کا انتخاب ہے، تو یہ قرآن کا معجزہ ہے، عربوں کا تو یہ احسان تھا کہ انہوں نے یہ زبان بنا کے ہمیں دے دی، ہمیں کیا دے دی، معاف رکھیے گا، اُسے دے دی جس نے قرآن نازل کرنا تھا۔ یہ زبان نہ ہوتی تو معلوم نہیں، معاف رکھیے گا، کیا مشکل پڑ جاتی۔ تو یہی زبان تھی جو اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ آج چودہ سو سال بعد اس بیسویں صدی [2] میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے سبات کا یہ لفظ وہاں کیوں استعمال کیا تھا؟ اس نے یہ ''سبت'' کیوں کہا ہے؟ یہ ایک چیز کو، ایک رابطے کو کچھ وقت کے لیے Cut-off کر دینا ہے، وہ کنکشن جو ہے، اس کو الگ الگ کر دینا ہے۔ اس رابطے کے Cut-off ہو جانے سے وہ جو شعور ہے وہ نہیں رہا، سبات نوم کے لیے کہا، اور یہاں (39:42) میں کہا کہ موت اور نوم دونوں میں ایک ہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ جو شعور کو پاور ملتی ہے جس سے شعور بیدار ہوتا ہے، وہ جو کرنٹ ہے جو شعور کو روشنی دیتا ہے، صرف وہ منقطع کر دیتے ہیں، دونوں تاروں کو ہم الگ کر دیتے ہیں جس سے شعور معطل ہو جاتا ہے اور کچھ نہیں کرتے۔ کیا بات ہے! میں کیا کیا عرض کروں کہ ایک لفظ میں قرآن کیا باتیں کر گیا ہے: **فَيُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى** (39:42) اور ادھر جو ہم اسے نیند کے بعد بھیجتے ہیں تو یہ ابدی طور پہ نہیں بھیجتے، ایک مدت تک کے لیے پھر دے دیتے ہیں، پھر اس کے بعد اسے موت آ جاتی ہے۔ وہ جو ہمارے ہاں کسی پرانے نے یہ بات کہی تھی، معلوم نہیں اس کے ذہن میں یہ بات تھی یا کچھ اور ہے، اس نے کہا یہ تھا کہ

خواب را مرگِ سبک داں
مرگ را خوابِ گراں

اس نے بات بڑی پتے کی کی ہے۔ کہا کہ موت اور نیند کی حالت میں، دونوں میں، ایک شے قدرِ مشترک (Common Denominator) ہے۔ یہ حالت نیند میں تھوڑے وقت کے لیے ہے یا ہلکے انداز کی ہے۔ وہ اس نے سبک کہا تھا یعنی یہ ہلکے انداز کی ہے مگر موت میں وہی کیفیت بھاری انداز کی ہوتی ہے لیکن یہ بات تو قرآن کی ہے۔ وہ جو کہتا ہے کہ یہ جو نفس ہے، جو انسان کا شعور ہے نیند کی حالت میں وہ شعور ضائع نہیں ہوتا، ختم نہیں ہوتا، فنا نہیں ہوتا۔ وہ سبات ہے، وہ جو دو تاریں مل کر شعور کا شعلہ بیدار کرتی ہیں، اس میں

---

1. اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (39:42) ان حقائق میں، ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں، حقیقت تک پہنچنے کی واضح نشانیاں ہیں۔
2. یاد رہے یہ بات مارچ 1978ء کی 3 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

چمک پیدا کرتی ہیں، وہ سلسلہ اس وقت تک کے لیے منقطع ہو جاتا ہے۔ نیند سے بیدار ہونے کی حالت میں وہ تاریں پھر جڑ جاتی ہیں، شعور اسی حالت میں واپس آ جاتا ہے، اس میں کچھ کم نہیں ہوتا۔ یہ بڑی چیز ہے، عزیزانِ من! اس میں اس شعور کا سلسلہ معطل رہتا ہے لیکن جب پھر تاریں جڑ جاتی ہیں تو اس میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں واقع ہوتی تو نیند اور موت کی دونوں صورتوں میں، قرآن کہتا ہے، کہ ایک ہی کیفیت ہوتی ہے یعنی شعور معطل ہو جاتا ہے۔

نیند کے بعد صرف معلومات ہی نہیں بلکہ احساسات اور جذبات بھی واپس آ جاتے ہیں

جس طرح نیند کے بعد جب انسان جاگتا ہے تو اس کا سارا ماضی، اس کے ساتھ ہوتا ہے، پوری Memory (حافظہ) اس کے ساتھ ہوتی ہے، احساسات اور جذبات تک اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جو میموری ہے وہ صرف یہی نہیں ہے کہ معلومات واپس آ جاتی ہیں، یعنی مجھے کل تک جو کچھ معلوم تھا میرا وہ علم واپس آ تا ہے، میری محسوسات اور میرے جذبات، واپس آتے ہیں۔ حافظہ تو ایسی چیز ہے کہ مثلاً اگر بیس سال پہلے کسی کی ایک بات سے آپ کے دل کو کوئی زخم ہوا تھا، آپ کو صدمہ پہنچا تھا، کوئی ذہنی، قلبی تکلیف پہنچی تھی، بیس سال کے بعد بھی جب آپ کی میموری اس چیز کو واپس لاتی ہے، تو اسی طرح سے انسان کے قلب کے اندر وہی ٹیس اٹھتی ہے مگر یہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ یہاں کے جو اعمال ہیں وہ مرنے کے بعد پھر کس طرح سے بیدار ہوں گے۔

خواب میں شعور کی نوعیت

قرآن کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کی حالت کو تو تم نہیں سمجھ سکتے، نیند کے بعد کی حالت کو تو سمجھتے ہو۔ یہ تو ہر روز تمہارے ساتھ واقعہ (Event) گزرتا ہے، نیند کے دوران بالکل موت کی سی کیفیت ہوتی ہے، تمہاری کوئی چیز بھی تمہارے ذہن میں نہیں ہوتی: نہ حافظہ، نہ شعور، نہ جذبات، نہ احساسات۔ مجھ سے پوچھیے گا۔ میں ہفتہ بھر یہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ میں ابھی دو لفظوں میں بتاؤں گا کہ Dreams کیا ہوتی ہیں؟ میرے عزیز! بتا دیتا ہوں۔ ہمارے ہاں اس دور کی دو اصطلاحات ہیں جو انہوں نے اس دور میں وضع کی ہیں۔ وہ ہیں: Consciousness اور Unconsciousness یا Subconsciousness یعنی نفسِ شعوری اور نفسِ غیر شعوری یا نفسِ نیم شعوری۔ نیند کی حالت میں یا جب ہپناٹائز کیا جائے تو اس حالت میں، جب شعور کے اس سلسلے کو منقطع کیا جائے، Disconnect کیا جائے، تو یہ کہتے ہیں کہ انسان کے تحت الشعور میں ایک کیفیت ہوتی ہے، وہ کارفرما رہتی ہے اور جسے یہ Dreams (خواب) کہا جاتا ہے، وہ شعور کا فعل نہیں ہوتا، Consciousness کا نہیں ہوتا، وہ فعل Unconsciousness Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کا ہوتا ہے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی، ورنہ میں ابھی عرض کروں گا کہ اس وقت تک خوابوں کے متعلق کیا تحقیق ہوئی ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ شعور

میں واقعات کا تسلسل اور ربط قائم ہوتا ہے' جس طرح سینما کی ایک فلم کے اندر مربوط چیز ہوتی ہے۔ Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) کے Store House (کاڑ کباڑ خانہ) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جو وہی فلم ہے وہ اس کو قینچی سے کاٹ کاٹ کر اور ٹکڑے ٹکڑے ملا دیا کرتا ہے۔ اس کے Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) میں شعور کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اس فلم کو مربوط کرے۔ اسی طرح سے وہ جو ٹکڑے ٹکڑے ہیں وہ انہیں سامنے لاتا جاتا ہے: گھوڑا ہے' گھوڑے کا اگلا ٹکڑا ہے تو ریل گاڑی ہے' ریل گاڑی کے بعد دیکھا تو ایک بچھو چلا آتا ہے' اس کے بعد دیکھا آسمان سے کچھ اتر رہا ہے' پھر آم سامنے آ گیا ہے۔ وہ ایک مسلسل کہانی کی فلم تھی جس کو اس نے کاٹ کے خلط ملط کیا ہے۔ اسی لیے نیند کا جو شعور ہے' وہ غیر مربوط ہوتا ہے' وہ شعور نہیں ہوتا۔

شعور کا مربوط ہونا ضروری ہے

شعور اس وقت کہتے ہیں جب وہ مربوط ہوتا ہے' اس میں ربط ہوتا ہے۔ یہ جسے پاگل کہتے ہیں' اس میں ہوتا کیا ہے؟ اس کے اندر غیر مربوط شعور ہوتا ہے۔ وہ کبھی کچھ کہنے لگ جاتا ہے' کبھی کچھ' کبھی کوئی ایک حرکت کرتا ہے' کبھی کوئی دوسری' ان میں باہمی ربط نہیں ہوتا اور یہ پاگل خانے یعنی مینٹل ہاؤس والے ہی نہیں ہوتے' ہم میں چلتے پھرتے تو ننانوے فیصد پاگل ہوتے ہیں۔ نیند کی حالت جسے آپ شعور کہتے ہیں' میں بھی اس کی کیفیت معطل ہوتی ہے۔ آج کے وقت تک کی جو تحقیق ہے اس کے مطابق تو یہ ہے کہ وہ اس کو نفسِ غیر شعوری کہتے ہیں جو نیند میں کارفرما ہوتا ہے' وہ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوری) ہوتا ہے' شعور اس کے اندر نہیں ہوتا۔ وہ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کی کیفیت ہوتی ہے۔

موت کے بعد کی زندگی کے درمیان کا وقفہ

خواب کی حالت میں Unconsciouss Mind (نفس غیر شعوریہ) کی کیفیت رہتی ہے' وہی کارفرما ہوتا ہے شعور نہیں ہوتا۔ تو اب ہم نیند کی حالت سے ذرا آگے پہنچتے ہیں کہ موت ہے' یہاں کی Physical Death (جسمانی موت) ہے' اور وہ لائف (زندگی)' جس میں شعور واپس آنا ہے' اس کے دوران جو مدت ہے' اس میں اگر Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) نے کارفرما رہنا ہے' تو پھر اسے کہیے کہ اس قیامت کی زندگی اور اس موت کے درمیان کا جو آپ کے ہاں عذاب وثواب ہے وہ شاید یہ ہوگا' لیکن بہرحال قرآنِ کریم نے جو کہا ہے' وہ یہ ہے کہ موت اور نیند میں ایک قدرِ مشترک یہ ہوتی ہے کہ تمہارا جو نفس ہے' وہ معطل ہو جاتا ہے' سلب ہو جاتا ہے۔ اب یہاں یہ نفسِ شعوریہ (Conscious Mind) ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ یہ نفس شعور ہی کا نام ہے' اسی لیے ان لوگوں کو Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کہنا پڑا ہے کیونکہ اس حالت میں شعور نہیں ہوتا' اور یہ جو اندر غیر مربوط کیفیت ہوتی ہے' شعور تو کہا ہی نہیں جاتا جو غیر مربوط ہوتا ہے' وہ جو کوئی غیر مربوط چیزیں ہوتی ہیں مثلاً آرزوئیں' بھولے ہوئے افسانے' وہ احساسات و

جذبات' کہ شعوری طور پر یعنی جن کو ہم جان بوجھ کر بھی سامنے نہیں آنے دینا چاہتے' خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں' یہ تمام چیزیں Unconscious Mind (نفسِ شعوریہ) کے اسٹور ہاؤس میں جمع ہوتی ہیں لیکن اس کٹی ہوئی فلم کے ٹکڑوں کی طرح ہوتی ہیں' ان میں ربط نہیں ہوتا۔ جب Conscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) چھٹی پہ گیا ہوا ہوتا ہے' معطل ہوتا ہے' اُس وقت Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) تو گویا یوں ہوتا ہے کہ جیسے کہیں کہ ''تیری موج ہو جاندی اے جیوں بلی نہ ہووے تے چوہے نچن لگ پیندے۔''❶

کاش ایک کالج کی تعمیر کا میرا خواب پورا ہو جاتا

عزیزانِ من! اگر کہیں وہ کالج یا درسگاہ بن جاتا' تو میں اس میں نصاب (Curriculum) کی طرح یہ چیزیں پڑھاتا۔ پتہ نہیں میری یہ آرزو بھی مرنے کے بعد مجھے Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کی طرح ستائے گی۔ یہ چیزیں تو یوں درسگاہوں میں' کالجوں میں سمجھنے کی ہیں۔ قرآن بہت دور اونچا لے جاتا ہے اور ہم تو اس دور میں پیدا ہوئے ہیں' خوش قسمت ہیں کہ علمِ انسانی اس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

موت کے بعد شعور اس دنیا میں واپس نہیں آتا

بہرحال' قرآن کہتا یہ ہے کہ نیند اور موت دونوں میں یہ قدرِ مشترک ہے کہ شعور نہیں ہوتا' یہ معطل ہو جاتا ہے۔ نیند کے بعد یہ شعور لوٹا دیتے ہیں۔ بات شعور کی ہو رہی ہے' Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کی نہیں ہو رہی۔ موت کی حالت میں' اس دنیا میں' وہ شعور واپس نہیں آتا۔ جس طرح نیند کی حالت میں شعور ضائع نہیں کرتا' اسی طرح موت کی حالت میں بھی خدا شعور کو ضائع نہیں کرتا۔ خدا اسے سنبھال کر رکھتا ہے۔ وہ امین ہے' بالکل اسی طرح محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ موت کے بعد جب بیداری ہو گی' یہ شعور ہم اسی طرح سے لوٹا دیں گے۔ اب ''سبات'' کے معنی ہمارے سامنے آ گئے **جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِبَاسًا وَّ النَّوۡمَ سُبَاتًا**❷ (25:47)۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ اس نے سبات کیوں کہا۔ رات کو نہیں کہا۔ رات کو جب تک ہم جاگتے ہیں آپ کا شعور بیدار ہوتا ہے' آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسے وہ کیسے سبات کہہ دے! قرآن میں یہ دو❸ ہی جگہ آیا ہے۔ دونوں جگہ اس نے نوم کو سبات کہا ہے' لیل کو

---

❶ تم موج اڑاتے ہو بالکل اسی طرح کہ جب بلی نہ ہو تو چوہے ناچنے لگ جاتے ہیں۔ (یہ ہے تمہاری کارفرمائی!)

❷ رات کو اُس نے تمہارے لیے پردہ پوش بنایا (کہ تم اس کی تاریکیوں کی چادر میں اپنے آپ کو لپیٹ لیتے ہو) اور نیند کو ایسا بنایا کہ (اِس میں تمہارا شعور (Conscious Mind) وقتی طور پر معطل ہو جاتا ہے اور اس طرح تمہارے اعصاب کو) سکون مل جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 825)۔

❸ **جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِبَاسًا وَّ النَّوۡمَ سُبَاتًا** (25:47) اور **وَجَعَلۡنَا نَوۡمَکُمۡ سُبَاتًا** (78:9)

نہیں کہا۔عزیزانِ من! کیا چودہ سو سال پیشتر کوئی انسان یا اس کی فکر یہاں تک پہنچ سکتی تھی؟ نوم کو سبات کہا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا قرآنِ کریم تو زندگی اور حرکت یا عمل کو لازم وملزوم قرار دیتا ہے' وہ تو صرف نیند کی حالت ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ کام سے تمہیں چھٹی مل سکتی ہے کیونکہ کچھ وقت کے لیے اس زمانے میں شعور کو ہم معطل کر دیتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک چھٹی کا کوئی تصور ہی نہیں

اب یہ جو ہفتہ وار چھٹی کا یعنی ہفتے میں ایک دن کام چھوڑنے کا تصور ہے' یہ یہودیوں کا تصور ہے۔ عیسائیوں کے ہاں تو یہ سارا جیوش Law ہے' انہوں (عیسائیوں) نے بھی چھٹی کا تصور وہاں (یہودیوں) سے لیا ہے۔ قرآن میں چھٹی کا تصور نہیں ہے' اس میں کہیں چھٹی کی بات بھی نہیں ہے۔ کیا عرض کیا جائے' عزیزانِ من! یہ جو ہمارے ہاں تحریک چلی' غالباً اس دور سے پہلے' یہ بات ہوگئی تھی کہ یہاں اسلامی معاشرہ ہونا چاہیے' اسلامی نظام ہونا چاہیے' اسلامی قوانین ہونے چاہئیں۔ اس میں سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ اتوار کی بجائے جمعہ کی چھٹی کی جائے۔ پہلے تو میں نے عرض کیا ہے کہ چھٹی کا یہ تصور ہی قرآن میں نہیں ہے اور پھر یہ چیز کہ اتوار کی چھٹی غیر اسلامی ہے اور جمعہ کی چھٹی اسلامی ہے' ایک غیر قرآنی تصور ہے۔ ایک ہی چیز تھی جس کا تصور پہلے سے چلا آ رہا تھا' آپ کے ہاں شریعت کے قوانین وغیرہ تو رہے ایک طرف' یہ تھی ایک نئی چیز جو آپ کے ہاں اسلامی جمہوریہ مملکت پاکستان میں آئی۔ وہ تھی جمعہ کی چھٹی' یہ ایک ہی تبدیلی تھی۔ قرآن میں نہ صرف چھٹی کا تصور نہیں ہے بلکہ یہ جمعہ کے دن کی چھٹی بھی ایک غیر قرآنی تصور ہے۔

جمعہ کے روز جمع ہونے کا ایک مقصد تھا جسے نظر انداز کر دیا گیا

یہ عجیب بات ہے کہ ایک سورۃ 62 ہے' اس کا نام ہی سورۃ جمعہ ہے: **يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ** [1] (62:9)۔ اے جماعت مومنین! اب اس آیت میں یوم الجمعہ آیا ہے' یہ نہیں آیا ہے کہ یہ ہفتے میں کوئی ایک Particular day (متعین دن) ہے جسے متعین جمعہ کہا جاتا ہے' یہ اجتماع کا دن ہے۔ یہاں کہا ہے کہ جب تمہارا وہ جو سیشن ہے' اس کو کال کرنا ہو اور اس کے لیے تمہیں صلوٰۃ کی آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر آ جایا کرو۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن صلوٰۃ کا لفظ کہاں استعمال کرتا ہے؟ **وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (42:38) جو معاملات باہمی مشورے سے طے کرنے ہیں ان کے لیے جب تمہیں بلایا جائے۔ اسے قرآن نے الصلوٰۃ کہا ہے۔ اجتماع کے دن جب تمہیں مشاورت

---

[1] اے جماعت مومنین! جب تمہیں ملی اجتماعِ صلوٰۃ کے لیے آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر آ جایا کرو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1315)۔

کے لیے بلایا جائے' نودی (62:9) آواز دی جائے۔ تو کیا کرو؟ کہا کہ **ذَرُوا الْبَيْعَ** (62:9) کام کاج چھوڑ دو اور آ جایا کرو۔ تو گویا معلوم ہوا کہ اس آواز سے پہلے جو وقت ہے' قرآن اس میں کام کاج کرنے کی بات کہتا ہے۔ اگر وہ چھٹی کا ہی دن ہو تو یہ کہنے کی ضرورت کیا ہے کہ وہ کام کاج چھوڑ کے آیا کرو۔ ''سبت'' کے دن یہ کہنا کہ کام چھوڑ کے آ ؤ تو وہ کہیں گے کہ ''تہانوں ایناں وی پتہ نئیں کہ اسی تے چھٹی کتی ہوئی اے کارخانے دی' کم کاہدا؟ ❶ یہاں کہا ہے کہ کام کاج چھوڑ کے آ جایا کرو۔ اب ٹھیک ہے جی کہ آ گئے تو اب کیا کیا جائے؟ اس کے لیے کہا کہ **فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ** (62:10) جب صلوٰۃ کا وہ سیشن' وہ وقت ختم ہو جائے تو **فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ** (62:10) جاؤ' نکل جاؤ' پھر تلاشِ معاش کے اندر کام کاج کرو' کماؤ کھاؤ' اس کے بعد پھر جاؤ۔ وہ تو حکم ہے۔ یوم الجمعہ کے متعلق قرآن نے یہ تصریح کی۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ عالم خبیر تھا' اسے پتہ تھا کہ یہ دور آئے گا جس دن یہ کہیں گے کہ سارا دن چھٹی کرو حالانکہ اس نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اس آواز پڑنے پہ کام کاج چھوڑو۔ تو کام کاج تو اس کی رو سے جائز ہوا جب وہ سیشن' وہ وقت' وہ کال ختم ہو جائے تو جاؤ' پھر تلاشِ معاش میں' رزق حاصل کرو' کام کاج کرو' اور یہ عجیب چیز میں عرض کروں گا کہ یہ جو **فَانْتَشِرُوْا** (62:10) ہے' یہ ''ن ش ر'' ہے۔ نشر یہیں سے ہے جو ہمارے پاس ہے۔

بات سورۃ الفرقان میں یہ چلی آ رہی تھی کہ **وَ النَّوْمَ سُبَاتًا** (25:47) نیند کی حالت کے اندر کام کاج منقطع ہے اور اس کے فوراً ہی بعد اس آیت کا اگلا آخری ٹکڑا یہ ہے: **وَ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا** ❷ (25:47)۔ اس میں یہ لفظ وہی نشور ہے جو **فَانْتَشِرُوْا** (62:10) ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ سارا دن نشور کے لیے ہے۔ ''نشر'' کے معنی پھیل جانے کے ہوتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ** ❸ (62:10) اس نے اتنا ہی نہیں کہا کہ پھیل جایا کرو' پکنک منایا کرو' وہ کہتا ہے کہ **وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ** ❹ (62:10) اس معاش کی فکر میں اِدھر اُدھر جاؤ' پھر اس وقت روٹی کمایا کرو' قرآن کہیں آپ کو جانے ہی نہیں دیتا' ایسا باندھتا ہے۔ کہتا ہے کہ **فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ** (62:10) وہاں جو اکٹھا کیا تھا وہ تو تھوڑے وقت کے لیے تھا' اب جو پھیلایا ہے تو وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقے پہ رزق حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اور اس کے بعد کہا کہ **وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا** (62:10) یہ ذکر خداوندی بہت زیادہ ہے جو تم یوں کرو گے۔ لہٰذا اب جو تم کاروبار کے لیے نکلے ہو' تو قوانین خداوندی کو ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھو۔

---

❶ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم نے تو کارخانے کی چھٹی کی ہوئی ہے تو کام کیسا؟

❷ اس کے بعد دن نمودار ہو جاتا ہے جس میں تم پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہو اور اپنے کام کاج کے لئے ادھر اُدھر پھیل جاتے ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔825)۔

❸ پھر ارض میں پھیل جایا کرو۔

❹ اور تلاشِ معاش میں لگ جاؤ۔

نعمائے خداوندی کا تذکرہ پانی کے سلسلہ میں نظامِ قدرت

جہاں صاف پانی پینے کے لیے نہیں ملتا تو ان ملکوں سے جا کے پوچھیے۔ان لوگوں نے اب سمندر کے کنارے بڑی بڑی مشینیں لگا رکھی ہیں تا کہ کسی طرح سے پانی صاف ہو۔ اگر چہ اس سمندر کے پانی میں بہت مادے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر یہ مادے گھلے (Dissolved) ہوئے نہیں ہوتے' تو سمندر کا پانی فلٹریشن سے صاف ہو جاتا۔ وہ تو اس میں گھلے ہوئے ہوتے ہیں' وہ تو صرف کشید ہو سکتا ہے کہ پینے کے قابل بنے۔ اور اس میں اتنا خرچ آتا ہے کہ وہ پانی بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ وہ ممالک بڑی مصیبت میں ہیں جہاں یہ پانی نہیں مل رہا۔ قرآن نے اس پانی کو رَحْمَتَهٗ (25:48) کہا ہے۔ کہا ہے کہ یہ پانی جو ہم تمہیں جس شکل میں دیتے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے رحمِ مادر میں ماں کے خون سے دودھ جیسی چیز پیدا کر کے بچے کو دودھ پہ دودھ دیتے ہیں۔ اگر وہ اس طرح سے Convert (تبدیل) نہ کیا جائے اور خون کا خون ہی پلایا جائے تو بچہ ایک سانس میں ختم ہو جائے۔ کہتا ہے کہ ہم نے باہر تمہارے لیے کچھ ایسا انتظام کیا ہے کہ سورج کی تمازت (Heat) سے' جیسا میں کہا کرتا ہو کہ اس کی کرنوں کی حرارت سے عمل کشید (Distilation Process) ہوتا ہے۔ اس عمل کے لیے پانی Boil (ابالنا) کرنا پڑتا ہے' یہ اتنا بڑا عملِ کشید ہے۔ اگر یہ نیچے اتنا بڑا سمندر ہے تو اس کے اوپر اس سے تیرہ سو گنا بڑا سورج چمکایا گیا ہے۔ یہ اتنا بڑا ہیٹر لگا دیا ہے۔ اس عملِ کشید سے پانی سمندر کے اندر اپنی ساری کثافتیں چھوڑ دیتا ہے اور صاف پانی بخارات کی صورت میں لیے چلا جا رہا ہے۔ پھر اس پانی کو بھیجنے سے پہلے وہ بادلوں کا کہتا ہے کہ وہ سقوں کے مشکیزے ہیں جو بھر بھر کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ الفاظ ہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ [1] آپ کو بتایا تھا کہ ''یہ بھرے ہوئے مشکیزے'' تو عرب اپنے ہاں کہتے تھے۔ وہ مشکیزہ جو اس طرح سے Tight (کس کر) کر کے باندھا جائے کہ ویسے تو اس میں سے پانی کا ایک قطرہ نہ ٹپکے اور جہاں ضرورت ہو' وہاں منہ کھول دیا جائے کہ جتنا پانی چاہیے' اس میں سے لے لو۔ وہ اسے قانت کہتے تھے' یہ پائپ اور ان کی ٹونٹیاں تو حال ہی میں ایجاد ہوئی ہیں' اس زمانے میں تو یہ بات نہیں تھیں۔ اب بھی جہاں یہ نہیں جاتیں' وہاں یہی مشکیزہ اس قسم کا ہوتا ہے اور یہ جو خدا کے قوانین ماننے والے بندوں کی' مرد اور عورت دونوں کی' قانت [2] صفت اس نے بتائی ہے' وہ بڑی عجیب چیز ہے کہ یہ اپنی صلاحیتوں کو اس مشکیزے کی طرح محفوظ رکھتے ہیں جس طرح سے وہ پانی کا مشکیزہ بندھا ہوا ہوتا ہے اور یہ اُسے Tight کر کے ساری عمر نہیں رکھ چھوڑتے۔ وہ مشک کسی کام کی ہی نہیں ہے اگر اس میں کا یہ پانی نکال کے استعمال میں نہ لایا جائے۔ وہاں تو یہ ہے کہ جہاں ان صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے'

---

[1] اس کے لیے دیکھیے دسواں باب اور خاص کر اس کے عنوانات ''سورج کی شعاعوں سے کشید کیے ہوئے پانی کی مثال'' اور ''مومن کی صفتِ قانت کا قرآنی مفہوم''۔

[2] (33:35)۔

جتنی ضرورت ہوتی ہے، وہ انہیں وہاں صاف کرتے ہیں، پھر منہ بند کر کے رکھ لیتے ہیں۔ یہ ہے **قانت** (25:48)۔ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ بارش سے ذرا پہلے یہ جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں انہیں بھیج کر ہم تمہیں اطلاع بھی دے دیتے ہیں۔ آج کل تو، جو میں کہا کرتا ہوں، کہ کوئی چیز بھی اعتماد و بھروسے کی نہیں رہی۔

ہماری Economy (معیشت) ایگریکلچر ہے، زراعت ہے۔ زراعتی ملک کے اندر ہم نے اپنے بچپن میں دیکھا کہ کل تک ہمارے ہاں جو گاؤں کی زندگی تھی، اس میں بڑے بوڑھے کہتے تھے کہ ہاں بھئی! ٹھیک ہے۔ بھئی! پھگن [1] دی اینی تاریخ ہوگئی اے۔ اے ہن پہلا پروا چلنا ہیگا اے۔ [2] وہ اُدھر سے جو ہوا آتی تھی، انہوں نے اس کے دن گنے ہوئے ہوتے تھے کہ اس کے بعد موسم کی پہلی بارش آجاتی ہے، اس کے بعد پچھّم [3] ہن چلدی پئی ہیگی اے۔ [4] اس کے بعد یہ ہوگا، اتنے دنوں کے بعد پھر بارش ہوگی، اتنے دنوں یہ بند ہوگا، پھر یہ دھوپ آئے گی، پھر تیز ہوجائے گی، پھر کٹائی کے دن آجائیں گے، کاٹنے کے بعد پھر تیز ہوائیں چلیں گی، گندم کے سلسلہ میں بھوسا اڑانے کے دن آجائیں گے، اور کلاک کی طرح، لگے بندھے یہ دن، ان زمینداروں کے تجربے میں آئے ہوئے تھے، بالکل اسی طرح سے ہوتا چلا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ ہم کہتے تھے کہ ہمارا کاروبار گردشِ افلاک کے تابع چلتا ہے۔ ٹھیک ہے جی، اگرچہ شاعر تے اونوں گالاں ای کڈدے رہئے۔ ایناں نوں پکی پکائی مل جاندی سی۔ ایناں نوں ہل واہناں پیندا تے پتہ لگدا۔ [5] کہ اس کے لیے گردشِ افلاک کتنا ضروری ہے۔

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے (انشا)

کسی زمیندار توں پوچھ جا کے۔ اینوں وی دیندی اے تے ایہدے پیؤ نوں وی دیندی اے۔ [6] تو وہ جو گردشِ افلاک تھی اس کے تابع ہمارا یہ سارا کاروبار ہوتا تھا۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ اب جو زمانہ الٹا ہے تو گردشِ افلاک ہمارے تابع ہوگئی ہے، نہ ہمارا کوئی کام اعتماد کے قابل اور نہ گردشِ فلک پر اعتماد، اب پتہ ہی نہیں ہے کہ ہوا کب چلے گی، کس قسم کی چلے گی، بارش کب آئے گی۔ یہ پرسوں [7] پہلی بارش جو

---

[1] سال بکرماجیت کا گیارھواں مہینہ، ہندوؤں کے سال کا گیارھواں مہینہ، اخیر فروری سے وسط مارچ تک کا زمانہ۔
[2] آج پھاگن کی اتنی تاریخ ہوچکی ہے۔ یہ اب پورب کی پہلی ہوا چلے گی۔
[3] مغرب
[4] اب مغرب کی ہوا چل رہی ہے۔
[5] اگرچہ شاعر اُسے گالیاں ہی بکتے رہے۔ انہیں پکی پکائی مل جاتی تھی۔ اگر انہیں ہل چلانا پڑتا تو پھر اس کا بھاؤ معلوم ہوتا کہ............
[6] کسی زمیندار سے جا کر معلوم کرو۔ یہ اسے بھی چین دیتی ہے اور اس کے باپ کو بھی۔
[7] یعنی یکم مارچ 1978ء

ہے وہ موسمِ سرما کی آئی ہے' جسے دسمبر میں آنا چاہیے تھا:

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

بارشی پانی کے لیے طہوراً کی تشبیہ

عزیزانِ من! اب نہ فلک ہمارے تابع چل رہا ہے' نہ ساڈا کوئی اصول تے ٹھکانہ ہیگا اے' نہ اوہدا کوئی اصول باقی رہیا ہے۔ اکو جئے ہیگے ❶ **وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ** (25:48)۔ یہاں لفظ رحمتہ کی کیا بات ہے! اس پانی کو مدِ حیات بنانا کہ یہ بلامزد و معاوضہ ہے' ایک پیسہ خرچ نہیں ہو رہا۔ اس کے لیے رحمت کا لفظ آیا ہے اور اس کے لیے کہا ہے کہ **و انزلنا من السمآء مآءً طهورًا** (25:48)۔ یہاں اس پانی کے لیے **طهورًا** لفظ آ گیا: کشید کیا ہوا پانی۔ کیسی عمدہ تشبیہ ہے اس پانی کو مآء طہوراً کہنا! اور عربی زبان میں طہور خود جو چیز پاک اور صاف کثافتوں سے الگ ہو' اسے بھی کہتے ہیں اور جو دوسری چیزوں کو پاک وصاف کر دے اس کو بھی طہور کہتے ہیں۔ ایک ہی لفظ میں اسکی دونوں خصوصیات قرآن بیان کر گیا ہے۔ اس قسم کا پانی اس نے دے دیا۔

حیات بعد الممات کے سلسلہ میں زمینِ مردہ کی مثال

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ اس نے اس قسم کا پاک' صاف کشید کیا ہوا' ہر قسم کی کثافتوں سے منزہ پانی کاہے کے لیے دیا؟ اس کے لیے کہا کہ **لِنُحْیِ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا** (25:49) تا کہ اس پانی سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کر دی جائے۔ کئی مقامات پہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ پوچھتے ہیں کہ اس موت کے بعد جب زندگی کی یہ کیفیت ہوگی تو پھر دوبارہ زندگی کیسے عطا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ ذرا یہ جو زمین مردہ ہے اس کو کھود کے بھی دیکھو' نیچے تک کہیں تمہیں زندگی کا کوئی آثار نظر آتا ہے؟ اس شے کا ایک چھینٹا ہم دیتے ہیں جو زندگی پیدا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھیے کہ زندگی آنکھیں ملتی ہوئی کس طرح ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ **كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ** ❷ (35:9) اور انسانوں کو حیاتِ تازہ اسی قانون کے مطابق ملتی ہے: اس دنیا میں بھی' اور اخروی زندگی میں بھی۔ اس نے کہا کہ ہم چھینٹا دیں گے لیکن اسی زمین میں سے یہ طبقہ اٹھتا ہے جس میں اگانے کی صلاحیت ہوتی ہے' صرف پانی کی کسر ہوتی ہے' باقی سب چیزیں اس میں موجود ہوتی ہیں۔ حیات بعد الممات کے بھی معنی یہ ہیں کہ زندگی کی ساری صلاحیتیں موجود ہوں گی' وہ جو شعور Disconnect (منقطع) ہوا تھا' بس

---

❶ نہ اب فلک ہمارے تابع چل رہا ہے' نہ ہمارا کوئی اصول و مقام رہا ہے' نہ اس کا ہی باقی بچا ہے۔ اس معاملے میں ہم دونوں ہی یکساں ہو چکے ہیں۔

❷ وَ اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (35:9) اللہ تعالیٰ کا قانون ہواؤں کو ایک رخ پر چلاتا ہے۔ وہ سمندر کے بخارات (Vapours) کو بادل کی شکل میں اوپر لے جاتی ہیں۔ پھر ہم اس بادل کو ان مقامات کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں جن میں زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ وہاں جب بارش ہوتی ہے تو زمینِ مردہ ازسرِ نو زندہ ہو جاتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1005)۔

وہ سوئچ کو آن کر دے گا' زمینِ مردہ میں حیاتِ تازہ پیدا ہو جائے گی۔ کیا مثالیں ہیں اس کی صاحب' زمین مردہ کو زندگی عطا کرنے کے لیے! بہت اچھا جی' وہ تو جی' جس زمین کے اوپر جا کے پانی پڑے گا اس کو ہی زندگی ملے گی' ساڈے کول چپہ زمین نہیں۔ سانوں کی فائدہ ہو یا اوہدا؟❶ کہنے لگے کہ نہیں **وَ نُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا** (25:49) اسی سے تمہارے پینے کا انتظام بھی ہم نے کیا ہے اور مویشیوں کے پینے کا بھی۔ بارش کا پانی جمع کرو' تو وہ دریاؤں ندی نالوں میں آئے' سردی کے زمانے میں پہاڑ کی چوٹیوں پہ پڑے' تو برف کی شکل میں ہم اس کو Reservoir میں اکٹھا کر چھوڑتے ہیں کہ ابھی تمہیں ضرورت نہیں' گرمی آتی ہے' زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو وہی سورج جو سمندر سے پانی اٹھا کے لے گیا ہے' اسی کی شعاعیں اس جمع شدہ Reservoir سے پھر پانی بہا کے تمہارے ہاں لے آتا ہے۔ یہ ساری چیزیں بیان کرنے کے بعد کہا کہ **وَ لَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا** ❷ (25:50) کہا کہ یہ ساری چیزیں ہیں۔ یہاں **صَرَّفْنٰهُ** آیا ہے۔ یہ وہی تصریف آیات ہے یعنی پھیر کر ہم یہ چیزیں آیات کی رو سے لاتے ہیں تاکہ حقیقت تمہارے سامنے محسوس طور پر آ جائے۔ یہ جو ہم نے محسوس مثالیں دی ہیں یہ قانونِ خداوندی کی کارفرمائی تھی۔

خارجی کائنات میں خدا کی حکومت اور اپنی دنیا میں اپنے جذبات کا اتباع: ایک کھلا تضاد ہے

ہم یہ چیزیں بار بار پھیر پھیر کر تمہارے سمجھانے کے لیے لاتے ہیں تاکہ یہ بات محسوس طور پر تمہارے سامنے آ جائے لیکن اس کے باوجود ہم اتنا کچھ کرتے ہیں پھر بھی اکثریت کی یہ کیفیت رہتی ہے کہ اسکے باوجود وہ اس سے انکار ہی کیے چلے جاتے ہیں۔ باہر کی کائنات میں تو خدا کی خدائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک' اس کی کارفرمائی ہے مگر ہماری اپنی جو زندگی ہے' اس میں ہم خود ہی خدا ہونگے۔ وہ تو خدا سے مراد یہ ہے کہ وہ جو اپنے یہاں کے خدا ہم نے تجویز کیے ہیں' ان کی خدائی کے تابع ہم چلیں گے۔ یہ ہے **اَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا** ❸ (25:50)۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن سے انسان کے اندر ایک سپردگی کا عالم پیدا ہونا چاہیے تھا' جھکنے کا عالم پیدا ہونا چاہیے تھا' یہ اس کی اتنی واضح مثالیں ہیں تو اس سے جب وہ اپنی زندگی کی طرف آتے ہیں تو اس میں سرکشی اختیار ہو جاتی ہے۔

---

❶ ہمارے پاس چپہ بھر زمین نہیں ہے اس کا ہمیں کیا فائدہ ہوا؟

❷ (یہ ہے وہ ہمارا قانونِ کائنات جسے) ہم مختلف پیراؤں میں (بار بار) پیش کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ' اس حقیقت کو سمجھ لیں (کہ جب کائنات کی ہر شے قوانین خداوندی کا اتباع کرتی ہے' اور اس سے اس قدر تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں' تو اگر انسان بھی اُس کے قوانین کے مطابق چلے تو اس کی زندگی بھی خوشگواریوں کی حامل ہو جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود) اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ انہیں قوانین خداوندی سے انکار اور سرکشی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 826)۔

❸ اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہیں قوانین خداوندی سے انکار اور سرکشی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

مختلف مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد انسان کو حقیقت سے آشنا کرانا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں ہے کہ ہم نے بسلسلۂ رشد و ہدایت یہ سارا کچھ جو قرآن نے کہا ہے' دیا۔ یہ کوئی بائیالوجی کی' زوالوجی کی' کتاب نہیں ہے کہ یہ سبق دے رہا ہے۔ وہ تو ان مثالوں سے کسی ایک مقصد تک پہنچانے کے لیے بات سمجھا رہا تھا لہٰذا بات اس نے پھر وہیں آ کے کہی کہ یہ جو قوانین ہم نے وحی کے ذریعے انسانوں کو دیئے ہیں' ان سے مقصد تو یہ ہے کہ بذریعہ انبیائے کرام علیہم السلام ہمارا یہ سلسلہ رشد و ہدایت جو شروع سے جاری تھا' وہ واضح طور پر انسانوں تک پہنچ سکے۔ قرآن کہتا ہے کہ شروع میں یہ کیفیت تھی کہ ہر قریہ میں ایک رسول آتا تھا' ہر بستی میں رسول آتا تھا۔ یہ مواصلات کا سلسلہ ایسا نہیں تھا' یہ Communication (مواصلات) کے ذرائع ایسے نہیں تھے جیسے آج ہیں۔ ایک جگہ کی بات دوسری جگہ نہیں پہنچتی تھی۔ اس لیے اس کی ضرورت تھی۔ جوں جوں یہ تمدنی زندگی آگے بڑھتی گئی' آپس میں اختلاف اور ارتباس کے سلسلے زیادہ ہوتے گئے' تو ہر بستی' ہر قوم' میں رسول بھیجنے کی ضرورت کم ہوتی چلی گئی تا آنکہ وہ دَور آ گیا جب گھر کے اندر خاموشی سے کی ہوئی بات چاند پہ بھی جا پہنچے' تو کہا کہ اب ضرورت نہ رہی کہ ہم ہر بستی میں الگ الگ رسول بھیجیں۔

قرآنِ حکیم کا مکمل ہونا اور پھر محفوظ ہونا بذاتِ خود ختمِ نبوت کی دلیل ہے

خود اس سورۃ کے شروع میں بھی یہ کہا کہ تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا[1] (25:1)۔ اب یہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت کا موجب ہو گیا' تمام اقوام کے لیے ہو گیا' تمام ممالک کے لیے ہو گیا: لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (25:1) اور اسی لیے تو ختمِ نبوت کی بحثیں چلا کرتی تھیں کہ جی! یہ قرآن سے دلیل ہے۔ بہر حال وہ جو میری کتاب ''ختمِ نبوت'' پہ ہے اس میں' میں نے یہ کہا ہے۔ یہ نہ بھی ہوتا' تو بھی رسول اللہ ﷺ کے متعلق خاتم النبین والی یہ بات' یہ چیز کہ قرآن تمام اقوام کے لیے' قیامت تک کے لیے' محفوظ' غیر متبدل' ایک ضابطہ حیات ہے' تو اس کے بعد پھر نبوت کے اجرا کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ یہ مکمل ضابطہ حیات آپ کے پاس موجود ہے' محفوظ ہے' اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہے' اس کو غیر متبدل کہا ہے۔ اسے للعٰلمین کہا' قیامت تک کے نوعِ انسانی کے لیے کہا تو پھر اور کوئی رسول کاہے کے لیے آئے گا؟ پیغامبر تو پیغام دینے کے لیے آتا ہے۔ معاف رکھیے' وہ جو میں کبھی

---

[1] کس قدر فراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار کی حامل اور حق و باطل اور صحیح اور غلط میں امتیاز کر دینے والی ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھیجی گئی ہے تا کہ اس کے ذریعے تمام اقوامِ عالم کو آگاہ کر دیا جائے کہ ان کے سفرِ زندگی میں کون کون سے خطرناک مقام آتے ہیں اور ان سے بچ کر چلنے کا طریق کیا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 815)۔

کبھی کہا کرتا ہوں کہ وہ چٹھی رساں سال اچ اک دن ایسا وی اوندا اے' جدوں او چٹھی نئیں پہنچاندا ہوندا۔ اوا وندا ہوندا اے عیدی لین۔ ختم نبوت کے بعد جے نبی اون گے او عیدیاں لین اون گے' چٹھیاں نئیں لے کے اون گے۔ چٹھی تے آ چکی ہوئی اے۔ بڑیاں عیدیاں ملدیاں نے اس قوم کولوں صاحب' پوچھونا جاگیراں بنیاں ہویاں ہیگیاں' ریاستاں بن جاندیاں ہیگیاں۔ آپ پاویں ننگے بھوکے گذارے کرن' عیدیاں دیندے ہیگے' عیدیاں جتھے دیندے نیں سونے دے دروازے کھڑے کردے نیں۔ ❶ **وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا** (25:51) اگر ہماری مشیت ہوتی تو ہم اس سلسلے کو جاری رکھتے' ہر بستی میں' ہر قریئے میں رسول بھیجا جاتا تھا۔ اب یہ **لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا** (25:1) یعنی مواصلات کا سلسلہ اتنا عام ہو چکا ہوا ہے کہ اب ہر بستی اور ہر قریئے میں تو کیا' اس کے بعد کسی رسول کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب قرآن آ گیا ہے' جو ہم نے کہنا تھا کہہ دیا۔ اب تو **وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ** (6:115) ساڈیاں گلاں مک گیاں۔ ❷ کیا لفظ ہے! تکمیل تو اس نے دین کو کہا تھا۔ کلمت کے لیے تمت کا لفظ آیا ہے۔ اب بھی ہمارے ہاں' وہ جو پرانے زمانے کی کتابیں اور پارے چھپتے ہیں ان کے آخر میں تمت بالخیر لکھا ہوا ہوتا ہے' اس کے بعد ایک لفظ بھی اور نہیں لکھا جاتا۔ یہ کہتے ہیں کہ جی نہیں' اس کے بعد بھی وہ آنے والے آئیں گے۔ کچھ رہ گئی سی گل' او مگروں لکھن والے اون گے۔ ❸ ہماری مشیت جو شروع سے چلی آ رہی تھی تو اس میں یہ نہیں تھا کہ اس کے بعد کچھ رسولوں کا (معاذ اللہ) سٹاک ختم ہو گیا تھا اس لیے ہم نے بھیجنے بند کر دیئے' یہ جو ہیں ان کو مہنگے داموں بیچو۔ یہ بات نہیں ہے۔ مشیت کا پروگرام یہ تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب اس کے بعد رسول سے کہا جا رہا ہے کہ پروگرام یہ ہے کہ **فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ** (25:52) جو ان صداقتوں کو نہیں مانتے' تو ان کی اطاعت مت کر' اے رسول! تو ان منکرینِ صداقت کی بات پر دھیان نہ دے کہ ہر قبیلے میں الگ الگ رسول ہونا چاہیے تھا۔

---

❶ سال میں ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ وہ ڈاکیا بھی اس دن خط دینے نہیں آتا۔ وہ آتا ہے عیدی لینے۔ ختمِ نبوت کے بعد اگر نبی آئیں گے تو عیدی لینے آئیں گے' خط لے کر نہیں آئیں گے۔ خط تو آ چکا ہے۔ صاحب! اس قوم سے بڑی عیدیاں ملتی ہیں۔ آپ ذرا پوچھیں تو جاگیریں بنی ہوئی ہیں' ریاستیں بنی ہوئی ہیں۔ خواہ وہ خود بھوکے رہیں مگر عیدی ضرور دیں گے' جہاں عیدیاں دیتے ہیں وہاں سونے کے دروازے اور کھڑکیاں کھڑے کر دیتے ہیں۔

❷ ہماری باتیں اختتام کو پہنچیں۔

❸ کچھ بات لکھنے سے رہ گئی تھی اسے لکھنے کے لیے بعد والے آئیں گے۔

رسول کی بعثت کا مقصد

یہ بڑی بات ہے۔اس کی تشریح کسی دوسرے وقت پر رکھتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ کروں کیا؟ ضابطہ تو مکمل ہو گیا' راہنمائی مکمل ہوگئی۔مقصد صرف یہ ضابطہ ہدایت دینے سے نہیں تھا' نظری طور پر (Theoretically) اس طرح سے Guidance (راہ نمائی) دے کر رسول بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔اگر اتنا ہی کام ہوتا تو میں نے کہا ہے کہ اگر وہ آسمان سے' جیسے وہ لکھی لکھائی کتاب مانگتے تھے' خدا بھیج سکتا تھا' کسی چٹان پہ بھی لکھ کر دے سکتا تھا مگر اس نے اس کے ساتھ رسول بھیجا اور یہ کہا کہ یہ اس لیے بھیجا ہے کہ یہ اس پہ عمل کر کے دکھائے گا' اس کو ایک نظام کی شکل میں متشکل کرے گا' تو اس کے بعد قرآن باقی رہے گا' رسول چلا جائے گا' یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی کہ اس نظام کو اسی طرح سے مسلسل آگے بڑھاتے چلے جاؤ لیکن اس نظام کو متشکل کرنا کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے' یہ موت کا پیغام ہے ہر نوعِ غلامی کے لیے۔جنہوں نے غلامی کی زنجیریں اتنی اتنی محنت سے تیار کر کے پہنائی ہوتی ہیں' وہ کیسے آسانی سے ان کو اتار کے پھینک دیتے۔یہ تو مسلسل جدوجہد کا متقاضی تھا اور جدوجہد بھی وہ کہ جس کا آخری مرحلہ جا کر میدانِ جنگ میں تکمیل تک پہنچتا ہے۔جہاد کا لفظ قرآنِ کریم نے ''قتال'' کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے اسی لیے' ویسے تو یہ جدوجہد زندگی کے ہر سانس میں جاری رہتی ہے' یہ آپس کے ٹکراؤ' یہ ان لوگوں کے ساتھ کشمکش' یہ تصادم' یہ تزاحم' ہر گوشے کے اندر ہوتا ہے اور جب آخر میں وہ تنگ آ کے میدانِ جنگ میں آ اترتے ہیں تو قرآن نے کہا ہے کہ **فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ** (25:52) جو اس سے انکار کرنے والے ہیں' ان کی اطاعت مت کرو۔یہ تو مقابلہ کریں گے۔اگر ان کے نظام کی آپ اطاعت نہیں کریں گے تو خلا تو نہیں ہوگا' دوسرے نظام قائم کریں گے تو مقابلہ کریں گے۔یہ تو مخالفت کریں گے۔

لفظ کبیر کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اس جدوجہد کے لیے قرآن نے کہا کہ **وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا** (25:52)۔یہ بڑی غور طلب آیت ہے۔اس میں ایک لفظ ہے جس پہ غور ہی نہیں کیا جاتا: **وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا** (25:52) تم اس کے ساتھ' اس کے ذریعے جہادِ کبیر کرو یعنی جدوجہد تو مسلسل تھی مگر ایک چیز ہے جسے جہادِ کبیر کہا ہے۔

یہ جہادِ کبیر کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا** [1] (17:111)۔خدا کی کبریائی کے متعلق بار بار کہا ہے۔دین

---

[1] وہ خدا' بلاشریک وسہیم' تمام قوتوں کا مالک ہے۔

کے متعلق کہا ہے کہ **لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ** (9:33) دنیا کے ہر نظام کے اوپر یہ نظام غالب آئے گا۔ یہ تمام چیزیں قرآن نے کہی ہیں۔ کبریائی کا لفظ تو تکبیر کے متعلق ہے' یعنی یہ جو چیز ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوگا اور اس کے لیے مسلسل جد و جہد ہوگی اور آخر میں ہے یہ **جِهَادًا كَبِيْرًا** ❶ (25:52)۔ ذرا یہ دیکھ لیجیے گا کہ یہ جو یہاں کبیر کا لفظ آیا ہے' اس کے معنی قرآن خود کیا واضح کرتا ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ قرآن نے کہا کہ **ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا** (40:12) لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کو خدائے واحد کے قوانین کی اطاعت کی طرف بلایا جاتا ہے تو اس سے انکار کرتے ہیں' سرکشی برتتے ہیں۔ جب اس کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو ساتھ ملا دیا جاتا ہے' تو اس کے سامنے کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے صاحب! اب ہم مانیں گے۔ کہا کہ **فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ** ❷ (40:12) اس طرح سے خدا عَلِیٌّ ہے۔ عَلِیٌّ کے معنی ہوتا ہے اعلیٰ غلبہ والا ہونا' کبیر ہونا' جس کے اوپر کوئی اور نہ ہو' کبریائی اس کے ہاتھ میں ہو۔ اسی لیے کہا کہ **فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ** (40:12) حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ ہے دین کا منشا' یہ ہے وہ جو کبیر کا لفظ یہاں آیا ہے۔

میں ابھی بتاؤں گا کہ میں کیوں بار بار اس پہ زور دے رہا ہوں۔ یہ جو آپ کا اب پانچ دفعہ دن میں اللہ اکبر کا اعلان ہوتا ہے تو یہ اللہ اکبر کا کیا اعلان ہوتا ہے' اور اس کے کیا معنی ہیں؟ اعلان ہی یہ تھا کہ کبریائی' حقِ حکومت' غلبہ' قوت' اقتدار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا' یہ اعلان چھت پہ ہی نہیں' مینار پہ کھڑے ہو کے ساری دنیا کے سامنے اعلان ہے' ایک دن میں اتنی مرتبہ اعلان ہے: اللہ اکبر کہ اللہ سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ یہ تھا کبیر۔ اسی لیے کہا کہ **فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا** ❸ (25:52)۔ اب آپ نے بات سمجھ لی کہ جہادِ کبیر کیا ہوگا: آخری کشمکش' آخری آویزش' آخری ٹکراؤ' جو خدا کی کبریائی کو ثبت کرنے کے لیے آئے گا جہادِ کبیر ہوگا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاں جہادِ کبیر اور جہادِ صغیر کا فلسفۂ تعلیم و عمل

آپ کہیں گے کہ یہ بات اتنی واضح ہے تو پھر تم نے بار بار اتنا وقت اسے کیوں دے دیا؟ میں ابھی بتاتا ہوں۔ ہمارے ہاں یہ جو قریب والا نبی ❹ 'آیا تھا' کہتا ہے کہ وہ ایک پیغامِ خاص لے کر آئے ہیں' اور وہ پیغام یہ تھا کہ وہ اُس زمانے میں (معاذ اللہ) یونہی غلطی سے کہہ دیا تھا کہ تلوار کے ذریعے سے جہاد کرو' یا میدانِ جنگ میں ان مخالفین کا مقابلہ کرو۔ کہا کہ میں یہ کہنے کے لیے آیا ہوں' مجھے خدا نے

---

❶ سر توڑ کوشش ہے' ایسی کوشش جو آخر الامر غالب آ کر رہے۔

❷ تمام فیصلے خدا اور صرف خدا کے قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ بڑی کبریائی کا مالک اور سب سے ارفع و اعلیٰ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1091)

❸ لہٰذا اے رسول! تو ان منکرین صداقت کی بات پر دھیان نہ دے (کہ ہر قبیلے میں الگ رسول ہونا چاہیے تھا۔) اور ان کی بات نہ مان' بلکہ ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کیے جا' ایسی کوشش جو آخر الامر ان پر غالب آ کر رہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 826)

❹ یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1908-1835) کی طرف ہے۔

یہ کہنے کو بھیجا ہے کہ بھئی! اک گل توں بھی کہہ۔ ❶ اور وہ یہ ہے کہ اب تلوار کے ساتھ جہاد منسوخ ہو گیا ہے۔ میں یہ ایک ہی بات کہنے کے لیے آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ قرآنِ کریم میں تو جہاد کے متعلق یہ اتنا کچھ آیا ہوا ہے' وہ سارے کا سارا منسوخ ہوا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ پھر یہ جو جہاد والی بات ہے وہ کیا ہوگی۔ اس کے جواب میں کہا کہ تم لوگ سمجھتے نہیں ہو۔ اس نے حکم دیا تھا کہ جہادِ کبیر کیا کرو۔ اچھا جی' پھر اس حکم کے کیا معنی ہوئے؟ حکم کے معنی کے لیے ایک حدیث پیش کر دی۔ وہ بڑا آسان ہے۔ کیا حدیث پیش کر دی؟ کہ نبی اکرم ﷺ ایک جنگ کے بعد' فتح کرنے کے بعد' جب واپس لوٹے' تو آپ ﷺ نے کہا کہ ہم جہادِ صغیر سے فارغ ہو کر جہادِ کبیر کی طرف جا رہے ہیں' یعنی اب ہم تبلیغ کیا کریں گے' میدانِ جنگ والا جہاد' جہادِ صغیر ہے اور یہ جو تبلیغ والا جہاد ہے' یہ جہادِ کبیر ہے۔ مرزا صاحب ❷ نے لکھا ہے کہ اب کہا یہ گیا ہے کہ جہادِ صغیر کا دور ختم ہو گیا ہے' اب جہادِ کبیر کا دور آیا ہے۔ یہ ہے وہ جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ کہاں سے سندیں لائی جاتی ہیں۔ انہوں ❷ نے کہا کہ یہ جہادِ کبیر قلم کے ذریعے ہوگا' وعظ کے ذریعے ہوگا' تبلیغ کے ذریعے ہوگا' جو جہاد ہے وہ منسوخ ہو گیا ہے' یہ ہے جہادِ کبیر' جو اب کہا گیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اب ہم جہادِ کبیر کی طرف جا رہے ہیں' جو جہادِ صغیر ہے' وہ دور اب ختم ہو گیا' اور تو اور کسی نے اُس ❷ سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ بھئی! حضور ﷺ نے اپنی زندگی کے کس ایک جہاد کے بعد یہ بات کہی ہوگی؟ آپ ﷺ کی کیفیت یہ تھی کہ زندگی کے آخری دَور کے اندر بھی جنگ تبوک ❸ کی طرف آپ ﷺ گئے اور اس جنگ کے لیے آپ ﷺ نے لشکر تیار کیا ہوا تھا کہ اس دوران میں حضور ﷺ کی

---

❶ ایک بات تم بھی کہو۔ ❷ مرزا غلام احمد قادیانی (1908-1835)۔

❸ جنگ تبوک کی مہم (رجب 9ھ مطابق نومبر 630ء) اور لشکر اسامہ بن زیدؓ (11ھ بمطابق 632ء)۔ ہوا یہ تھا کہ جنگ موتہ (8ھ مطابق 630ء) میں موتہ کے مقام پر جیوشِ اسلامیہ کی پسپائی سے رومیوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے اور انہوں نے اسی وقت سے جارحانہ تیاریاں شروع کر دیں۔ رجب 9ھ میں' مدینہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ رومیوں کا لشکر حملہ کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ حضور نے حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ فرمایا کہ دشمن کے حملہ کا انتظار کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس کی طرف سبقت کی جائے۔ مہم کی اہمیت کے پیش نظر حضور نے فوج کی کمان خود سنبھالی اور لشکر' شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ تبوک کے مقام پر (جو مدینہ اور دمشق کی قریب نصف مسافت پر واقعہ ہے) معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی۔ وہاں آپ نے قریب بیس روز تک قیام فرمایا اور گرد و نواح کے رؤسا کے ساتھ امن و اطاعت کے معاہدات کر کے' واپس تشریف لائے...... جب آپ حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ایک جرار لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ لشکر تیار ہوا تو آپ نے اس کی سپہ سالاری کے لیے (حضرت زید بن حارثؓ کے بیٹے) حضرت اسامہ کو منتخب فرمایا۔ یعنی دنیا کے عام الفاظ میں' ایک غلام ابن غلام کو' اس لشکر کا سالار مقرر فرمایا جس میں حضرت ابوبکر و عمرؓ جیسے اولوالعزم صحابہؓ بطور سپاہی شریک تھے۔ لشکر کی روانگی کے انتظامات ہنوز مکمل بھی ہونے نہ پائے تھے کہ حضور علیل ہو گئے اور یہ علالت اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ لشکر کی روانگی ملتوی کرنا پڑی۔ اسی علالت میں حضور دنیا سے تشریف لے گئے اور حضرت اسامہؓ کا لشکر روانہ نہ ہو سکا...... حضرت ابوبکر صدیقؓ نے (11ھ بمطابق 632ء) کو خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کی روانگی کا حکم دے دیا۔ اس لشکر نے اس مقام کے قریب جا کر ڈیرے ڈال دیئے جہاں جنگ موتہ ہوئی تھی۔ (حوالہ پرویزؒ (1987)۔ شاہکارِ رسالت' لاہور: ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' ماخوذ از ص۔ 166 تا 167)

وفات ہوئی۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اس کا جرنیل تھا تو وہ تو زندگی کے آخری سانس تک اس جہاد کے اندر رہے۔ آپ علیہ السلام تو یہی کرتے رہے تو پھر کیا زندگی کے آخری دور جہاد تو جہادِ صغیر ہوا؟ کیا بتائیں' عزیزانِ من! کہ ہم پہ کیا کیا گزری اور آپ نے غور کیا کہ یہ گزری کیوں ہے؟ جواب میں وہ ایک حدیث بتادی۔ پتہ نہیں' جس دور میں جب اس سرتاپا باعمل اور سرتاپا باقوت قوم کو انہوں نے راکھ کا ڈھیر بنانا تھا تو اس قسم کی حدیثیں وضع کی گئیں: حدیث یہ بنائی کہ جو جہاد بالسیف ہے' تلوار کے ذریعے جہاد ہے' یہ جہادِ صغیر رہ گیا ہے اور جہادِ کبیر یہ رہ گیا ہے کہ وعظ و نصیحت کرو اور کتابیں لکھا کرو۔ ایک حدیث سے سارا قرآن منسوخ کردیا جب کہ حکم قرآن یہ تھا کہ **وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا** (25:52) ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کیا کرو' ایسی کوشش جو آخر الامر ان پر غالب آ کر رہے۔

ضابطہ حیات کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف کا نزول بھی

عزیزانِ من! قرآن کی آیت (57:25) دیکھیے' بڑی عجیب چیز ہے۔ اس میں کہا ہے کہ **لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ** (57:25) آؤ ہم بتائیں کہ یہ جو سلسلہ رشد و ہدایت ہے' اس کا طریقہ کیا ہے' پروگرام کیا ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ' **بالبینت** یعنی یہ دلائل و براہین کی رو سے باتیں سمجھاتا ہے' دلیل سے بات کرتا ہے' ان سے بھی کہتا ہے کہ **هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** (2:111) اگر اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل لاؤ: **بِالْبَيِّنٰتِ** (57:25) جب لوگ دلائل کے ذریعے سے قائل ہو کے ساتھ ملتے چلے جاتے ہیں تو **وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ** (57:25) انہیں ضابطہ قانون دیا جاتا ہے۔ اس نظام کے قائل ہی نہ ہوں تو پھر اس کے لیے ضابطہ قانون کے معنی کیا ہیں' کچھ نہیں۔ ان کے لیے تو پھر **وَ الْمِيْزَانَ** (57:25) اور میزانِ عدل ان کے لیے ہے۔ ان کے لیے انصاف کی میزان کھڑی کی جاتی ہے۔ **لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ** (57:25) تاکہ لوگوں میں عدل اور انصاف قائم کیا جائے۔ کتاب یا قانون اس لیے دیا جاتا ہے۔ یہ ہے مقصد قانون دینے کا' انصاف یعنی عدل قائم کرنا۔ یہ بھی دیا گیا تھا۔ کہا کہ اب اس کے بعد وہ لوگ رہ جائیں گے جو اس کی مخالفت کریں گے' سرکشی اختیار کریں گے' وہ اس قانون کے اوپر نہیں آئیں گے' عدل کے خلاف کریں گے' دھاندلی کریں گے' ناانصافیاں کریں گے' بیّنٰت سے وہ نہیں مانیں گے۔ انہوں نے قانون سے سرکشی برتی' تو پھر اس کے لیے کہا کہ اس کے لیے ہم بےبس اور بےکس نہیں ہو گئے' بےچارگی نہیں ہے۔ یہاں وعظ نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ** (57:25) ہم نے اس کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف بھی دے دی ہے' ہم نے اسے بھی نازل کیا ہے یعنی انزلنا یہ بھی ساتھ بھیجی ہے۔ یہ قرآن کہتا ہے۔ یہ بڑے الفاظ ہیں' صاحب! پھر آگے کہا کہ **فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ** (57:25) اس تلوار کے اندر بڑی سختی ہے۔ ایک طرف کہا ہے کہ بڑی سختی ہے' دوسری طرف کہا ہے کہ **مَنَافِعُ لِلنَّاسِ** (57:25) نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش بھی ہے۔ سختی ہے ظالم کے لیے' منفعت بخش

ہے مظلوم کے لیے۔ شمشیر کی دونوں صفات ہیں۔ کہا کہ ہم نے یہ بھی دے دی ہے' تو یہ وقتی طور پر تو بات نہیں ہے۔ سرکشی کا اور دھاندلی کا تو آخری علاج ہی یہ ہے۔ یہ ہے وہ نظام جو قرآن نے قائم کیا تھا۔

جہادِ کبیر کے لیے تلوار اور تلوار کے ساتھ قرآن: یہ دونوں لازم وملزوم ہیں

اب اس کے ساتھ کہا ہے کہ **وَ جَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا**[1] (25:52)۔ بس یہ ہے' عزیزانِ من! وہ جو منفرد کرتا ہے اس قوت کو' تلوار کو' جو دین کی خاطر اٹھائی جائے' اور اس تلوار کو جو ظلم کی خاطر اٹھائی جائے۔ ویسے تو وہ ایک ''حرفِ جار ہے' یوں تو اس کے کچھ معنی ہی نہیں ہوتے' لیکن یہ تو بڑی اہم چیز ہے' یہ جہادِ کبیر ہے جو تلوار کے ذریعے کیا جائے گا۔ کہا کہ یہ کچھ قرآن کے زیر سایہ کیا جائے گا اور یہاں اقبالؒ (1877-1938) پھر جس طرح ''جاوید نامے[2]'' میں سمجھا جاتا ہے' یاد آتا ہے۔ انہوں نے خاتون شرف[3] النساء (مرحومہ) بیگم رفیق کا واقعہ لکھا ہے۔ یہ پنجاب کے گورنر تھے۔ یہ نواب عبدالصمد خان کی بیٹی تھی' وہ قرآن کی تلاوت کرتی تھی' اپنے ساتھ تلوار کو باندھ لیتی تھی۔ عورت تلوار کو باندھ کے رکھتی تھی۔ مرتے وقت ماں سے کہا کہ میری قبر میں تلوار اور قرآن دونوں چیزیں رکھ دیں اور اس نے یہ بات سمجھائی۔ یہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ

این دو قوت حافظِ یک دیگراند

قرآن بھی ایک قوت قانون ہے تلوار بھی ایک قوت ہے' یہ دونوں ایک دوسرے کی محافظ ہیں۔ قرآن محافظ ہے تلوار کا کہ بے داغ نہ ہونے پائے' تلوار محافظ ہے قرآن کی کہ وعظ بن کے نہ رہ جائے:

این دو قوت حافظِ یک دیگراند
کائناتِ زندگی را محوراند

اور اسی لیے اس نے پھر کہا کہ

موموناں را تیغ با قرآں بس است [4]

---

[1] ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے سرتوڑ کوششیں کیے جاؤ' ایسی کوشش جو آخرالامر ان پر غالب آ کر رہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔826)۔

[2] جاوید نامہ 1932ء

[3] پرویزؒ نے تصوف کی حقیقت میں ان کی تھوڑی سے تفصیل یوں دی ہے کہ ''انہوں (علامہ محمد اقبالؒ) نے جاوید نامہ میں لکھا ہے کہ پنجاب کے صوبہ دار کی صاحبزادی شرف النساء (مرحومہ) قرآنِ پاک کی تلاوت کرتیں تو تلوار کو اپنی کمر کے ساتھ پیوست رکھتیں۔ یہ اس کا زندگی بھر کا شعار تھا (ص۔255۔1992ء)۔

[4] موموناں را تیغ با قرآں بس است   تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

ایک قرآن' ایک کتاب' ایک قرآن کے ساتھ تلوار۔ اب آیئے یہ ''ب'' جو ''حرفِ جار'' میں نے کہا ہے' معنی نہیں ویسے رکھتا: **وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا** (25:52)۔ یہ جہاد' جہادِ کبیر اس صورت میں بنے گا کہ یہ تلوار ہو' قرآن کے ساتھ ہو' اس کی حدود کے اندر ہو' اس کے قواعد کے ساتھ ہو' اس کی روشنی کے ساتھ ہو۔ جب تلوار اس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اٹھے گی تو **مَنَافِعُ لِلنَّاسِ** (57:25) نوعِ انسانی کے لیے حیات بخش ہو جائے گی۔ اگر آپ اس کو الگ کر دیں گے تو یہ پھر چنگیز [1] ہو جائے گی' ہلاکو [1] ہو جائے گی:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ تھا قرآنِ حکیم کا ضابطہ حیات اور اگر یہ ساتھ نہ رہے تو پھر یہ چنگیزیت ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ من! یہ جتنے میگنیٹک ٹیپ [2] (Magnetic Tapes) لگے ہوئے ہیں ان میں متعین وقت کے لیے ایک ٹیپ چلتی ہے۔ اگر اس متعین وقت سے آگے بڑھ جائے تو پھر وہ ریکارڈ نہیں ہوگی اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ سارے ریکارڈ یہاں پاکستان میں ہی نہیں' اس کے بعد امریکہ میں' یورپ میں' یہ سب جگہ' یہ جو درس ہے' یہ چلتا ہے۔ اگر درس کا یہ وقت بڑھ جائے اور ٹیپ ختم ہو جائے تو درس نا تمام رہ جاتا ہے۔ اس لیے مجھے ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے درس کا وقت مقرر کرنا پڑتا ہے۔ یہ درس والی بات ہو گئی۔

عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی آیت 52 تک ہم آ گئے' 53 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] ہلاکو خان اور چنگیز خاں کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص 310 (فٹ نوٹ 2)۔

[2] مراد ہے ریکارڈ کرنے کے آلات

بارھواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 53 تا 58)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا
وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ﴿۵۴﴾
وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَا یَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰی رَبِّهٖ ظَهِیْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ
اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ
سَبِیْلًا ﴿۵۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰی بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرًا ﴿۵۸﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1978ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 53 سے ہو رہا ہے: (25:53)۔

کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں

سابقہ آیت فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا (25:52) میں لفظ "کفرین" آیا تھا اور کہا یہ گیا تھا کہ ان کی اطاعت نہ کرو، یہ تمہاری مخالفت کریں گے، ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد جاری رکھو حتی کہ یہ میدانِ جنگ تک اتر آئیں گے، وہاں بھی ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ان کے ساتھ Compromise (مفاہمت یا مصالحت) کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا، اس لیے کہ یہ ایسے دو متضاد نظریاتِ حیات ہیں کہ جن میں باہمی مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ میں کافر یا کافرین کے سلسلے میں یہ عرض کردوں کہ ہمارے ہاں کافر کا لفظ کچھ ایسا ہے جیسے گالی ہوتی ہے اور یہ غیر مسلم اسے سمجھتے بھی اسی طرح سے ہی تھے جیسے گالی دی ہو۔ یہ گالی نہیں ہے۔

کارخانہ قدرت میں اقسام تفریق کی ایک حیران کن مثال

انسان دنیا میں پیدا ہوا اور آپ دیکھیے گا کہ پوری نوعِ انسان میں مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں مختلف اقسام تو ایک طرف رہیں' یہاں تو ایک فرد دوسرے فرد سے نہیں ملتا۔ ان میں امتیاز' افتراق' تخصیص اور تمیز پہ آپ نے کبھی غور نہیں کیا کہ اس کے لیے کوئی کتنا بڑا ڈیپارٹمنٹ مشیت خداوندی کے اندر ہے اور کتنا Efficient (کارگزار) ہے۔ اس ایک اتنی سی چیز پہ غور کیجیے کہ ایک شخص کے انگوٹھے کی کتنی ہی لکیریں ہیں۔ یہ مقام ایک انچ کے برابر تو ہے مگر یہ دنیا میں کسی دوسرے شخص سے نہیں ملتیں اور یہ جو ہمعصر انسان ہیں' مثلاً آج کی دنیا کے انسان دو ارب سمجھ لیجئے' انہی کی بات نہیں' یہ تو جب سے انسان پیدا ہونا شروع ہوا ہے اس کی آج تک کی بات ہے۔ ذہن میں لائیے کہ یہ کتنے انسانوں کی بات کر رہا ہے' مثلاً جو اس کا پہلا انسان تھا اور جو آج ہے' ان کے بھی دو انگوٹھے ہیں۔ وہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے اور نہ آج کے انسان کے ملتے ہیں یعنی انفرادی تفریق کی کیفیت تو یہ ہے کہ یہ ایک انچ جگہ ہے اور میں کہتا ہوں تصور میں نہیں آتا کہ چند لکیروں کے اندر اتنے مختلف ڈیزائن بناتے جانا کہ ایک ڈیزائن دوسرے سے ملے ہی نہیں' معلوم نہیں وہ کتنا بڑا کوئی حساب داں فرشتہ' اس کے اوپر لگا رکھا ہوگا اور اس کے بعد Accuracy (عین بعین) کی یہ کیفیت کہ وہ کبھی غلطی نہیں کرتا۔ صاحب! دنیا بھر کے حساب دان بیٹھ جائیں وہ لکیروں کو اِدھر اُدھر ہی کچھ کرنا ہے تو ان سے کوئی ادب کا نہیں' کوئی حساب کا سوال نہیں' چند لکیریں ہیں ایک انچ کے اتنے سے رقبے کے اندر اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے انسانوں سے لے کے آج تک کوئی دو انسان ایسے نہیں جن کی یہ لکیریں ایک جیسی ہوں اور پھر یہ بھی نہیں کہ ان میں ذرا ذرا سا فرق ہے' کچھ ابہام' کچھ ملتی جلتی سی ہیں۔ نہیں' قطعاً نہیں یعنی انہی چند لکیروں سے اس طرح شناخت ہوتی ہے کہ کسی اور طریق سے اس کی متعین طور پر شناخت نہیں ہوتی۔ لکیر سے جو یہ مجرموں کو شناخت کرتے ہیں اس سے بہتر شناخت کا کوئی اور طریقہ ہی نہیں ہے۔ کیفیت تو آپس میں ایک فرد کی دوسرے فرد کے درمیان یہ ہے۔

قرآنِ حکیم نے انسانوں کو صرف دو گروہوں میں ہی تقسیم کیا ہے

انسانوں کی اقسام گن لیجیے۔ نسلیں' قبیلے' قومیں' رنگ' زبان' شکل اور شباہت کتنے ہی ہیں جبکہ قرآنِ کریم نے تمام انسانوں کو دو کیٹگریز (Categories: گروہوں) میں تقسیم کیا ہے' هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (62:2)۔ اللہ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے سو تم یہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہو جبکہ تمام انسان ایک ہی گروہ ہے۔ ان میں سے ایک کو وہ مومنین کہتا ہے' دوسرے کو وہ کافرین کہتا ہے۔ مومن وہ ہیں جو خدا کی بتائی ہوئی صداقتوں کو صحیح مانتے ہیں' کافر وہ ہیں جو انہیں صحیح نہیں مانتے۔ عملی زندگی میں آیئے تو ہمارے ہاں ایک سوسائٹی بنائی جاتی ہے۔ اس سوسائٹی کے کچھ ممبرز بنتے ہیں۔ جو ممبر نہیں ہوتے وہ Non-members

(غیرممبر) ہوتے ہیں۔ جس اصطلاح میں آج ہم Non-member (غیرممبر) کا لفظ استعمال کرتے ہیں قرآن کی رو سے وہی معنی کافر کے ہیں۔ یہ جو ایک جماعت بنی ایک پارٹی بنی ایک سوسائٹی بنی ایک امت بنی یہ تو ایک جماعت ہوگئی ایک گروہ ہوگیا۔ انہیں مومنین کہا اور جو اس سوسائٹی کے ممبر نہیں بنے وہ کافر ہوگئے۔ یہ کوئی گالی نہیں ہے یہ تو ایک واقعہ ہے۔ کسی کو Non-member (غیرممبر) کہہ دینے سے یہ تو نہیں کہ آپ اسے طمانچہ مار دیتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے وہ بھی کہتا ہے کہ میں Non-member (غیرممبر) ہوں تو آپ اگر اس چیز کے متعلق لوگوں سے کہتے کہ بھئی! یہ تو Non-member (غیرممبر) کے لیے ایک اصطلاح ہے تو کوئی بھی برا نہ مناتا۔ آپ رکنیت کے فارم بھر دیجیے ممبروں کی صف میں شمار ہو جائیں گے۔ اگر آپ ممبر نہیں ہیں تو آپ Non-members (غیرممبر) ہیں۔ قرآن کی رو سے انسانوں کی یہ دو ہی کیٹگریز ہیں۔ ضمناً یہ جھگڑا چلا ہوا ہے کہ یہ دو قومی نظریہ کیا ہے اور غیر منقسم ہندوستان میں کیوں یہ اصطلاح وضع کی گئی؟ یہ جھگڑا لمبا چوڑا ہے مجھے اس سے واسطہ نہیں ہے۔ سوچتے نہیں کہ یہاں تو بنیادی طور پہ بات ہی دو قوموں سے شروع ہوئی ہے: **فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّ مِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ** (62:2) وہ تو شروع سے ہی انسانوں کو مومن اور کافر کی ان دو کیٹگریز میں تقسیم کر رہا ہے اسی کا نام دو قومیں ہے۔

انسانوں کے مابین ٹکراؤ کی وجہ جواز صداقتوں کی نفی ہے

اب رہی آپس میں ٹکراؤ کی بات تو اس نے کہا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے انسانیت کی جو ساری تاریخ ہے اس کی شاہد ہے کہ ہمیشہ ٹکراؤ انہی نظریات کے اندر ہوا ہے۔ آج بھی آپ ذرا چھوٹی سطح پہ آ جائیے شریف اور بدمعاش انسانوں کی دو کیٹگریز ہیں رنگ نسل زبان وطن کا افتراق کچھ شے نہیں ہے۔ انسان کی خصوصیت کی بنا پہ یہ تفریق پیدا ہوئی ہے۔ بعض انسان ہیں ان کی یہ خصوصیات ہیں کہ وہ شریف انسان تھے بعض لوگ ہیں کہ وہ شریف نہیں ہیں وہ بدمعاش ہیں غنڈے ہیں۔ ان کی خصوصیت کی بنا کے اوپر آپ ان کو یہ کہتے ہیں اور اس طرح آپ کے ہاں دو کیٹگریز ہوگئیں۔ ایک محلے میں رہنے والے ایک گھر میں بسنے والے ایک قوم کے افراد ان دو کیٹگریز میں بٹ جاتے ہیں۔ تو یہ جو قرآن نے صداقتیں دی ہیں انہیں نہ ماننے والے کافر ہیں Non-members (غیرممبران) ہیں۔ مخالفت کرنے والے وہ یہی لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ آویزش رہے گی کشمکش رہے گی ٹکراؤ رہے گا تصادم ہوگا مقابلہ ہوگا۔ یہ ان کے ساتھ جہاد ہے آخر تک ٹکراؤ ہوگا بدر ❶ کے میدان میں ہوگا اور احد ❷ کے میدان میں ہوگا۔ تو یہ دو ہی کیٹگریز ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ سارے انسان بظاہر اکٹھے ایک ہی جگہ رہتے ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ ان دو انسانوں کے اندر دو بنیادی تفاوت کس قدر ہیں کہ یہ دونوں آپس میں مل ہی نہیں سکتے۔

---

❶ 17 رمضان 2ھ بمطابق 13 مارچ 624ء

❷ 14 شوال 3ھ بمطابق 29 مارچ 625ء

اب جیسا کہ اس کا انداز ہے وہ اسے ایک طبعی مثال' ایک محسوس مثال سے سمجھا تا ہے کہ **وَ هُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا** (25:53)۔ مثال تو اس نے یہ دی ہے۔ عام طور پہ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ دو سمندر ہیں۔ ایک کھاری ہے' ایک میٹھا ہے۔ سمندر سے نیچے اتر کے کوئی اس کا ترجمہ دریا کر دیتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا پردہ ہوتا ہے جو انہیں ملنے نہیں دیتا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بحر کا یہ ترجمہ کرنے میں غلطی کر گئے۔ ایسے دریا تو کوئی نہیں نظر نہیں آتے جو ساتھ ساتھ بہتے ہوں۔ اب تو قریباً سارے کرۂ ارض کی سروے ہوگئی ہے کہ ایسے دو دریا آپس میں چلے جا رہے ہوں جو ایک بہت کھاری ہو اور ایک میٹھا پانی ہو اور دونوں ساتھ کے ساتھ بہتے چلے جا رہے ہوں اور وہ آپس میں ملے نہیں۔ یہ ایسا نہیں ہے۔

عربوں کی تمدنی زندگی پر ایک نظر

عربوں کے ہاں یہ جو بحر کا لفظ ہے' یہ سمندر کے لیے ہی نہیں بولا جاتا تھا۔ آپ سوچیے کہ یہ بیچارے صحرا میں بسنے والے لوگ تھے۔ ان کے ہاں تو کہیں "ذرا اگر پانی دا چھپڑ وی کتھے ہوندا ہیگا سی" [1] اور اس کے اوپر چار کھجور کے درخت اگ جاتے تھے تو وہ اسے جنت کہتے تھے۔ یہ مال' جسے آپ سب سے بڑا کہتے ہیں' جس کے ہاں پانی کا مشکیزہ ہوتا تھا' اسے وہ مالدار کہا کرتے تھے۔ پانی کی قدر وہاں معلوم ہوتی ہے۔ یہ تالاب ذرا سا گہرا ہو تو وہ اسے بحر کہتے تھے۔ یہ جو قرآن میں **جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ** (2:25) آتا ہے یعنی باغ یا باغات جن کے نیچے انہار بہہ رہی ہیں۔ ہم تو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ باغ کے نیچے سے نہر کیسے بہہ رہی ہے' اور یہاں انہار آیا ہے کہ نہریں بہہ رہی ہیں۔ یہ ہمارے ہاں کا جو نہر کا تصور ہے اس کی رو سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ "آ جنوں اسی آڈاں کہنے آں نا" [2] یہ نالیاں جو پانی کی ہوتی ہیں' ان کو وہ نہر کہا کرتے تھے۔ سچے تھے بیچارے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ ایسے Concept (تصور) کے اندر انہار کسے کہتے تھے' بحر کسے کہتے تھے؟ ہمیں اپنے تصور کے مطابق' نہریں' بحر اور سمندر نہیں لے آنے چاہئیں۔ جو ذرا گہرائی [3] میں ہو' وہ اسے بحر کہتے تھے۔

---

1. اگر کہیں پانی کا تالاب بھی ہوتا تھا۔
2. یہ جنہیں ہم نالیاں کہتے ہیں۔
3. کتاب الاشتقاق میں لکھا ہے کہ کثیر پانی کو خواہ میٹھا ہو خواہ کڑوا بَحرٌ کہتے ہیں۔ دراصل بَحرٌ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بہت سا پانی جمع ہو۔ مزید حوالہ جات کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (1960)۔ لغات القرآن جلد اوّل' لاہور: ادارہ طلوع اسلام' ص ص 298 تا 299۔

زمین کے نیچے قدم قدم پر بہتے ہوئے پانی کی کیفیت

اب یہ چیز سمجھ میں آ جاتی ہے کہ پانی کی لہریں (Streams) زیرِ زمین چل رہی ہیں۔ اوپر والا پانی تو پہاڑوں کے اوپر سے آ تا ہے' بارش کا آ تا ہے' انسانوں کے لیے اصل پانی کا جو ذخیرہ ہے وہ تو زمین کی سطح کے نیچے ہے۔ اُسے آپ وہاں دیکھیے۔ یہاں ایک کنواں کھودیئے' سخت کڑوا پانی نکلتا ہے' اب اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ صاحب! یہاں کھودیئے میٹھا پانی نکلے گا۔ یہ یہاں کڑوا پانی' نمکین کھاری پانی ہے' وہاں یہ میٹھا پانی ہے' اور پھر اس کنویں سے ہمیشہ کڑواہی پانی' ساتھ والے کنویں سے ہمیشہ میٹھا پانی' کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ نیچے وہ دونوں مل جائیں تو چلیے وہ کھاری میٹھا نہ رہے کچھ کڑوا تو تھوڑا بہت ہو جائے'' تلخ تے تھوڑا جیا ہو جاوے او'' [1] یہ کبھی نہیں ہوتا۔ یہ اس کی بڑی رحمت ہے' زمین کے نیچے سے یہ جو پانی کی Streams ہیں' لہریں ہیں' پانی کی ندیاں ہیں وہ رواں دواں جاتی ہیں اور اس افراط میں جاتی ہیں کہ اتنے اتنے ٹیوب ویل نصب ہوئے ہوتے ہیں' دن رات چلتے چلے جاتے ہیں' وہ نیچے سے پانی ختم ہی نہیں ہوتا اور پھر اگلی بات وہی ہے کہ چند ہی قدم کے فاصلے کے اوپر دوسرا کنواں بور کیجیے تو اس سے کھاری پانی نکل رہا ہے اور نکلتا چلا جا رہا ہے' نیچے کی یہ Streams ساتھ ساتھ بہہ رہی ہوتی ہیں' کبھی نہیں ملتیں۔ اسے قرآن نے **وَ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا** (25:53) کہا ہے۔

اب بات یہاں چلی آئی کہ نیچے وہ پتھر کی چٹانیں یا پتھر کی دیواریں ہیں یا آپس میں اوٹ آڑ اور روک اس قسم کی ہوتی ہے جبھی وہ نہیں ملتے۔ اگر وہ کہیں مٹی کی یا ریت کی ہوں' تو وہ تو فوراً مل جائیں۔ یہاں کہا ہے کہ **بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخًا وَّ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا** (25:53) ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے اور جو پردہ ہے وہ پتھریلا ہوتا ہے۔

چودہ سو سال پہلے کی زمین کے نیچے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ اس عرب کی ہو رہی ہیں جو زمین کے اوپر کی باتیں بھی ابھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ بات یہ سمجھائی کہ یہ سارے انسان اکٹھے بستے ہیں' ساتھ ساتھ رہتے ہیں' ساری عمر اکٹھے ہی چلتے ہیں' پھر ان دونوں کے درمیان اتنا بیّن تفاوت ہے کہ ایک شرافت کا مجسمہ ہے' ایک سر سے پاؤں تک آپ کو غنڈہ نظر آ رہا ہے' ایک ان صداقتوں کو ماننے والا ہے' دوسرا اس سے انکار ہی نہیں بلکہ ساری عمر اس کی مخالفت کرتا ہے' دونوں انسان ہی کے گروہ ہیں' اکٹھے بستے ہیں' اکٹھے رہتے ہیں۔ کہا کہ تعجب کی کون سی بات ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ یہ دو قسم کے پانی ساری ساری عمر ساتھ ساتھ بہتے رہتے ہیں' تو ساتھ ساتھ رہنے میں انسانوں کی یہ بات نہیں ہو جاتی کہ چونکہ ان کو انسان کہا جاتا ہے' اس لیے ہم سمجھیں کہ وہ دونوں ایک ہی خصوصیات کے مالک ہو گئے۔ ان کی الگ الگ خصوصیات ہوتی ہیں' اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ صاحب! یہیں کے رہنے والے ہمیں میں سے یہ قریش' ہمیں میں سے

---

[1] وہ قدرے تلخ تو ہو جائے۔

عرب یہ لوگ اس زمانے کے کہہ لیجیے باقی انسان بھی ایک ہی جیسے انسان اور اس کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی ساری عمر مخالفت ہی کرتے گزر گئی میدانِ جنگ تک اتر آئے تو کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔

زندگی کے تسلسل کو ماننے والوں اور اس سے انکار کرنے والوں کے مابین ایک پردہ حائل ہے

یہ جو کہا ہے کہ ان کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے اب یہاں اس محسوس مثال کے بعد وہ انسانوں کے اوپر یہ مثال لے کر آتا ہے تو دیکھیے۔کہا کہ **وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ** ❶ (17:45)۔اب یہاں لفظ قرأت آیا ہے۔قرأت کے معنی عام طور پہ پڑھنا ہی کیے جاتے ہیں۔تو قرأت میں یہ ہمارے ہاں کے جو قاری ہوتے ہیں ان کے نزدیک وہ قرآن کو پڑھنا ہی ہوتا ہے خواہ اس فن کے حساب سے پڑھے یا گا گا کر پڑھے ورنہ عربی زبان میں اس کے معنی Proclamation (اعلامیہ) ہوتا ہے یہ کسی بات کا اعلان کرنا ہے یہ قرآن کا پیغام ہے۔کہا جب تو اس پیغام کو عام کرتا ہے تو قرآن پیش کرتا ہے۔آپ اس کے کچھ بھی معنی لے لیجیے۔اس کے بعد ساتھ ہی کہا کہ **جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَایُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ** (17:45) تم اور وہ لوگ جو زندگی کے تسلسل کو حیات بعد الموت کو نہیں مانتے ہیں ان دونوں کے درمیان **حِجَابًا مَّسْتُوْرًا** (17:45) ایک پردہ لٹک جاتا ہے جو عام نگاہوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔یہ قرآن پیش کرنے والوں اور اس سے انکار کرنے والوں اس کی مخالفت کرنے والوں ان دونوں کے درمیان ایک پردہ لٹکتا ہے اور قرآن کا اعجاز ہے کہ یہ پردہ حجاب ہے: **حِجَابًا مَّسْتُوْرًا** (17:45)۔حجاب تو خود دوسرے کو پردے میں لے آتا ہے۔یہاں کہا ہے کہ یہ **حِجَابًا مَّسْتُوْرًا** (17:45) ہے۔وہ پردہ جو خود مستور ہے چھپا ہوا ہے۔پردے نے تو کسی اور کو چھپانا ہے وہ تو چھپاتا ہے مگر تمہاری نگاہوں سے خود پردہ چھپا ہوا ہے تو اب انسانوں کے درمیان دو دلوں کے درمیان دو ذہنوں کے درمیان جو پردہ لٹکتا ہے وہ پردہ تو ہوتا ہے لیکن وہ حجابِ مستور ہوتا ہے ایک چھپا ہوا پردہ۔یہ ہے ذہنیتوں کا فرق جسے آپ نہ ماننے کی ایک پہلے سے ہی طے شدہ بات کہتے ہیں: **حِجَابًا مَّسْتُوْرًا** (17:45)۔اس میں یہی حجابِ مستور ہے جو Under ground Current آپ کے ہاں چلتی ہے ہمیں وہ نظر ہی نہیں آتی لیکن جس طرح آپس میں کبھی وہ دو پانی نہیں ملتے وہ کہتا ہے کہ اس طرح سے ذرا انسان کو دیکھو تم ان کے سامنے قرآن پیش کرتے ہو۔وہ تمہارے جیسے بظاہر شکل و شباہت کے اعتبار سے انسان ہی نظر آتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے اور وہ پردہ خود نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

---

❶ جب تو ان کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے۔

چودہ سو سال پیشتر قرآنِ حکیم کے پیش کردہ حقائق

یہ ٹھیک ہے کہ طبعی طور پر یہ سارے جتنے بھی انسان ہیں **وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا** [1] (25:54)۔تمام انسانوں کی تخلیق' جیسے خدا تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کہا ہے' کہ ہر زندہ چیز کی ابتدا ہم نے پانی سے کی ہے۔ پانی حقیقت میں زندگی کی بنیاد ہے۔ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ جہاں بھی یہ سائنسدان جاتے ہیں' کہیں وہ چاند پہ جائیں' مریخ پہ جائیں' جہاں بھی وہ جا رہے ہیں' وہاں سب سے پہلے وہ مٹی لیتے ہیں اور مٹی میں دیکھتے ہیں کہ نم ہے یا نہیں۔ اگر اس میں نم ہو تو سمجھتے ہیں کہ یہاں لائف کا' زندگی کا امکان ہے اور اگر مٹی میں نم نہ نکلے تو وہ کہتے ہیں کہ یہاں آبادی یعنی زندگی Life in any form (کسی بھی شکل میں زندگی) نہیں ہو سکتی۔ چودہ سو سال پیشتر قرآن نے عرب جیسے مقام میں جہاں جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ان کا جو مرکزی شہر' بین الاقوامی شہرت کا شہر مکہ تھا' اس سارے شہر میں سترہ آدمی تھے جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ تعلیم تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے' اس دور میں اس ملک میں ایک ان پڑھ (Unlettered) شخص' جسے امی کہا گیا ہے' وہ یہ بات بتا رہا ہے کہ زندگی کی بنیاد پانی ہے' خود انسان کی ابتدا ایک ایسے جرثومے سے ہوئی ہے جو پانی اور مٹی کے ملنے سے نمود میں آیا تھا۔ قرآن یہ کچھ چودہ سو سال پہلے بتا رہا ہے' پھر یہ Evolution (ارتقا) کی Stages (مراحل) طے کرتا ہوا پیکرِ بشریت تک آیا۔ آج بیسویں صدی میں جا کے کہیں یہ معرکہ آراء سائنس کا انکشاف بتایا جاتا ہے' وہ ایک امی چودہ سو سال پیشتر عرب کے علاقے کے اندر بیٹھا ہوا یہ بات کہہ رہا ہے۔ کیا اس زمانے میں کسی انسان سے یہ ممکن تھا؟ کیا اس کی فکر میں یہ بات آ سکتی ہے کہ وہ یہ کہے کہ **هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا** (25:54) خدا نے اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق' انسان کی پیدائش قطرۂ آب سے کی ہے۔

انسانوں کا اصل سوال طبعی طور پر یا قبائلی طور پر تقسیم ہونے کا نہیں

جہاں تک انسانوں کی طبعی زندگی کا تعلق ہے تو یہ ٹھیک ہے کہ ان میں ایک قدر مشترک ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان سب کی نمود اسی سے ہوئی ہے' اسی طرح سے یہ سارے بشر بن گئے ہیں' پھر یہ تمہارے ہاں جو قبیلوں کے اندر' تم نے ایک دوسرے کو بانٹ لیا ہے' نسلوں میں بانٹ لیا ہے' اس نے کہا کہ یہ تمہاری تمدنی زندگی ہے جس کی بنا پہ تم نے آپس میں ایک دوسرے کو مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ یہ بھی کوئی صحیح تقسیم نہیں ہے۔ وہ بات یہ لا رہا ہے کہ تقسیم تو وہی کفر اور ایمان کی ہے۔ یہ تمہاری تمدنی زندگی کے تقاضے تھے' جن کی وجہ سے تم نے اپنے آپ کو پہلے قبائل میں بانٹ لیا' خاندانوں میں بانٹ لیا' وہ یہ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ خاندان بڑھتا

---

[1] خدا نے اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق' انسان کی پیدائش قطرۂ آب سے کی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔827)۔

کس طرح سے ہے۔لڑکے کا اپنا خاندان تو ہوتا ہے جو آباؤ اجداد تک اوپر جاتا ہے ''داد کے جنوں کیندے نیں'' [1] جن کو ددھیال کہتے ہیں وہ یہی ہوتا ہے۔ جب شادی ہوتی ہے' ایک دوسرا خاندان ہوتا ہے۔ اس خاندان کا اس خاندان کے ساتھ ارتباط ہوتا ہے۔ اب یہ دو خاندان ملتے ہیں۔ یہ خاندان ملنے کے بعد ذرا پھیلتے ہیں تو ان کے ہاں یہ قبیلہ بنتا تھا۔ معلوم نہیں یہ پنجابی زبان والے کمبخت' ان عربوں سے بھی پیچھے (Backward) تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگلے ہمارے بچے تو پنجابی بھی نہیں جانتے۔ ہمارے ہاں پنجابی میں ''بیوی نوں کیندے ای قبیلہ سن: آ میرا قبیلہ اے۔'' [2] آپ یہ سن کے حیران ہونگے ''بیوی نوں قبیلہ کیندے سن'' [3] قبیلہ بنتا ہی بیوی کے ساتھ ہے۔ خاندان ملتا تھا تو یہ اس سے بنتا تھا۔ پھر آگے پھیلتا تھا ورنہ یہ ایک ددھیال والے ہی جو تھے وہ تو اتنے سمٹے ہوئے ہوتے تھے مثلاً چار بیٹے ہوں اور ان چار کی مختلف جگہ شادیاں کی جائیں۔ ''چار قبیلے اوناں دے اون۔'' [4] تو آپ دیکھتے ہیں کہ قبیلہ کتنا بڑا بنتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تمہاری تمدنی زندگی ہے۔ انسانوں کی طبعی زندگی کی بھی بنیاد ایک تھی لیکن اب تم نے آپس میں یوں قبیلے بنا بنا کے اور الگ الگ ہوئے۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں۔

بات تو' عزیزانِ من! قرآنِ کریم یوں کر رہا ہے کہ تم نے اپنی تقسیم اس طرح سے کی۔ بات ہی بات میں کتنی بڑی بات کہہ جاتا ہے۔ **فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهۡرًا** (25:54)۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے' عزیزانِ من! کہا کہ پھر ہم نے تمہارے دو رشتے بنائے: نسب کا بھی اور صھر کا بھی۔ نسب آباؤ اجداد کا رشتہ ہوتا ہے اور صھر [5] سسرال کا رشتہ ہوتا ہے۔ قرآن نے دونوں رشتوں کو یکساں اہمیت دی ہے۔ یہ جو صھر ہے' میں پھر کہتا ہوں کہ ان پنجابیوں نے کچھ عربوں سے یہ ایسا لیا ''پنجابی اچ صھرا کیندے نے'' [6] وہ یہی ہے جو صھر کا لفظ ہے۔ یہ سسر والی جو بات تھی یہ تو ایرانیوں کے ہاں سے آئی۔ اصل میں وہ صھر جو ہے وہ ''صھر اای ہے' جیہڑا پنجابی اچ ہونداا ے'' [7]

---

1. جسے ددھیال کہتے ہیں۔
2. بیوی کو کہتے ہی قبیلہ تھے: یہ میرا قبیلہ ہے۔
3. بیوی کو قبیلہ کہتے تھے۔
4. چار قبیلے ان کے آئیں۔
5. تاج العروس' محیط المحیط اور المفردات فی غریب القرآن کے مطابق ''اَلصِّھۡرُ'' قرابت کے معنی میں ہے۔ ان لغات میں اس کے متعین مفہوم کے لیے بہت سے اقوال آئے ہیں لیکن اکثریت کا خیال اس طرف گیا ہے کہ بیوی کے خاندان والے اَصۡھَارٌ کہلاتے ہیں اور شوہر کے خاندان والے اَخۡتَانٌ۔ اس لیے صِھۡرٌ سے مراد وہ رشتہ داری ہے جو شادی کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔ اس لفظ کے مزید اور دیگر مفاہیم کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (1961)۔ لغات القرآن (جلد سوم)' لاہور: ادارہ طلوع اسلام' ص۔ 1051۔
6. (اس رشتے کو) پنجابی میں صھرا کہتے ہیں۔
7. وہ صھر اہی ہے جو پنجابی میں آتا ہے۔

قرآن بات تو یونہی طبعی تقسیم کی کر رہا ہے لیکن وہ تو جاتے جاتے ہی بات اتنی بلند کہہ جاتا ہے۔ اس نے دونوں رشتوں کو برابر کا واجب التعظیم بتایا ہے۔ اس میں دونوں رشتوں کا یکساں تعلق ان کے ساتھ بتایا' عزیزانِ من! قرآن کی اتنی سی بات کی سمجھ آ جائے تو ہمارے گھریلو تنازعوں میں تو آپ دیکھیے نوے فیصد تنازع ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اگر اس لڑکے کے ذہن میں اپنے ہاں کے رشتے اور بیوی کے رشتے یکساں واجب التکریم ہو جائیں۔

ہر دو طرف سے سسرال کا باہمی احترام جنتی زندگی کی نوید ہے

یاد رکھیے' بات میں سے بات نکلتی ہے۔ گھر کی زندگی کو اگر آپ جنت بنانا چاہتے ہیں تو ایک پہلا اصول یہ یاد رکھیے! بیوی کے جو ماں باپ اور اس کے رشتے دار ہیں ان کی کبھی مذمت نہ کیجیے' برائی نہ کیجیے' تحقیر نہ کیجیے' ان کے خلاف نفرت نہ لے آئیے۔ یاد رکھیے جتنی محبت آپ کے دل میں اپنے ماں باپ کی ہے اتنی ہی محبت اس کے دل میں اپنے ماں باپ کی بھی ہے۔ جب آپ اپنے ماں باپ کے خلاف کوئی برائی کا لفظ برداشت نہیں کر سکتے' وہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ فرق اتنا ہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مجبور و محکوم و محتاج سمجھتی ہے' وہ خاموش رہتی ہے' تم بالا دست ہوتے ہو' اس لیے برملا کہتے ہو: ''توں میری ماں نوں ایہہ کہیا سی اج' یعنی توں اوہدی ماں نوں' اوہدے پیو نوں' اوہدے دادیاں تکر نوں کیہا سی۔ کہندا رہندا اے روز۔ تے اے تے کوئی گل نہ ہوئی' تیرا تے حق اے نا کہ' مینوں وی گالاں دے لیں' تے میرے وڈیاں نوں وی دے لیں۔''[1] لیکن اس نے اگر تمہارے باپ کی جوتی کو جتڑی کہہ دیا ہے تو پھر یہ بخشی نہیں جا سکتی ''بڑی بے عزتی خراب کر دتی نا ایہدے پیو دی اینے۔''[2] بنیاد یاد رکھیے' عزیزانِ من! ان کی بھی ایسی تعظیم کیجیے جیسے آپ اپنے ماں باپ کی تعظیم کر رہے ہیں۔ اگر اس کے دل میں اپنی عزت بنانا چاہتے ہیں تو اس کی عزت کیجیے' ان کی بھی عزت کیجیے۔ ان کی محبت اس کے دل کے اندر ہے۔ کیا اتنے سے ہی کل چار کلمے پڑھے' وہ وہاں تمہارے ساتھ آ گئی تو وہ سارے اس کے اپنے ماں باپ' بہن بھائی عزیز رشتے دار سارے آج جتنے بھی تھے وہ غیر اور دشمن ہو گئے' جس کا جی چاہے ان کو گالیاں دیتا پھرے' اور یہ کچھ سن کر بھی وہ دل میں برا بھی نہ منائے؟ تم ان سے کتنی بڑی Exploitation (لوٹ کھسوٹ) کرتے ہو' کتنا ظلم کر رہے ہو تم اس کے اوپر! اور پھر کہتے ہو کہ گھر کے اندر ہمارے تعلق جنتی زندگی کے رہنے چاہئیں۔ کبھی دنیا میں ایسے شخص کی زندگی آپ سوچیے۔ آپ سوچیے کہ کسی ایک شخص نے کبھی آپ کے باپ کو

---

[1] تم نے میری ماں کو یہ کہہ دیا تھا یعنی تم نے اس کی ماں' اس کے باپ اور آباؤ اجداد تک کو یہ کچھ کہہ دیا تھا۔ یہ کچھ روزانہ رہتا ہے۔ پھر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تمہارا تو یہ حق ہے کہ مجھے بھی گالیاں دے لے اور میرے بڑوں کو بھی۔

[2] اس نے تو اس کے باپ کی ''بے عزتی'' خراب کر دی۔

گالی دی ہو' آپ اسے ساری عمر نہیں بھولتے' مرتے وقت اپنی اولاد کو کہتے ہیں کہ ''ایہدے کولوں بدلا ضرور لینا ہیگا اے پتر' اپنے تیرے دادے نوں گالیاں کڈیاں سن۔'' ❶ اور تم اس بیچاری کے ماں باپ کو روز گالیاں دیتے ہو اور اس کے بعد توقع یہ کرتے ہو کہ یہ تمہیں بھی پوجے تو تمہارے ماں باپ کو بھی پوجے۔ عزیزانِ من! بات میں سے بات نکلتی ہے۔ قرآن نسبًا و صھرًا کو ایک سطح کے اوپر رکھ کے تمہیں دے رہا ہے: **فجعلہ**۔ میں کہہ رہا تھا کہ بات تو اس نے اتنی سی کہنی تھی کہ ایک خاندان پھیل کے پھر قبیلہ کیسے بنتا ہے۔ تم ایسے کیسے بتاتے ہو۔

ہمارے ہاں بیوی کا بھائی شادی سے پہلے بھائی جان اور بعد میں سالا

قرآنِ حکیم جاتے جاتے ہی ایک بات کہہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے ہر دو کو ایک سطح کے اوپر رکھا ہے: اپنے آباؤ اجداد کے' والدین کے رشتوں کو اور بیوی کے ماں باپ کے رشتوں کو۔ اس نے نسب اور صہر دونوں یکساں رکھے ہیں لیکن اس معاشرے کا کیا علاج!! پتہ نہیں یہ کم بختیاں ہمارے حصہ میں کہاں سے آئیں۔ معاف رکھیے گا اگر میں اس سطح پہ اتر آؤں۔ اس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بیوی کے بھائی کو سالا کہتے ہیں۔ سالا تو ہمارے ہاں گالی ہے۔ اندازہ لگایئے' آپ روز یہ لفظ سنتے ہیں: اوسالے' یعنی معاشرے میں ہمارے ہاں پھر یہ چیز ایسی عام ہو جاتی ہے' کبھی ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں' کیا کر رہے ہیں؟ یہ تو خیر آپ سمجھیں گے نہیں' جو ہم نے بچپن ہی سے سنی ہیں: ''اوئے آ صہری دا ہووے۔'' ❷ آپ کو معلوم ہے کہ وہ یہ کیا کہہ گیا ہے یعنی ساس کا بیٹا ہو۔ یہ صہری سس ہوندی اے: صہرا سسر' تے صہری ساس۔ ❸ صہری دا ہووے۔ یعنی میرا سالا لگے۔ ❹ یہ گالی ہے' سالا اور پتہ نہیں کہ یہ کمبخت سارے علاقوں میں یہی کچھ ہے۔ ادھر ہم نے سارے یوپی میں بھی یہی سنا' ویسے تو وہ سسر وسسر کہتے ہیں' وہ بھی وہی کچھ کہتے ہیں یعنی اندازہ لگایئے اس معاشرے کا جس میں جس کو آج یہ بیاہ کے لائے ہیں' اسی دن اس رشتے سے پہلے تو وہ جو بھائی صاحب تھے' بھائی جان تھے' ابھی رشتہ ہونا تھا' ''جتیاں گھس جاندیاں ایہدیاں جدوں اے رشتہ لین جاندے'' ❺ یعنی اس وقت تک وہ بھائی جان تھے' خاطر تواضع ہوتی تھی' کہتے تھے کہ ہم نے ان کی بڑے شریف خاندان میں شادی کی ہے' جونہی اس نے چار کلمے پڑھائے اور وہ بیوی ہو کر گھر میں آئی تو ساتھ ہی اس کا وہی بھائی سالا ہو گیا: اوسالے' عزیزانِ من! ہم تو یہاں پہنچے ہوئے ہیں' کبھی سوچا نہیں

---

❶ بیٹا! اس سے بدلہ ضرور لینا۔ اس نے تیرے دادا کو گالیاں بکی تھیں۔

❷ اے کم بخت! یہ تو صہری کی طرف کا ہے۔

❸ یہ صہری ساس ہوتی ہے۔ صہرا سسر اور صہری ساس۔

❹ صہری کا بیٹا ہو یعنی میرا سالا لگے۔

❺ ان کا رشتہ لینے کے لیے چل چل کر ان کے جوتے گھس جاتے۔

ہے۔ پھر گھروں کی زندگی کو کہتے ہیں جنت کیوں نہیں بنتی۔

میں کہتا ہوں' عزیزانِ من! یہ چھوٹے چھوٹے سے نکتے ہیں' میں تو ان نکتوں کے اوپر آنے کے بعد' قرآن پہ نئے سرے سے ایمان لایا ہوں۔ بات وہ کر گیا ہے: **نَسَبًا وَّ صِهْرًا** (25:54) کی۔ یہ کہہ کے آپ کے ہاں کی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی جو ایک بنیادی چیز تھی' اس نے دو لفظوں میں وہ سارا راز کہہ دیا کہ جو نسب و صہر ہیں یہ برابر کے رشتے ہیں' یاد رکھو اور پھر کہا کہ **وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا** (25:54) یہ خدا کے مقرر کیے ہوئے پیمانے ہیں' اندازے ہیں' رشتے ہیں' ان کی بنا پر دو خاندان ایک خاندان بنتے ہیں مگر تم نے ان کو قبیلے بنا دیا ہے تو ان کی اس حیثیت میں انسانیت تقسیم ہو جاتی ہے۔ تقسیم کا معیار وہی شریف اور بدمعاش کا ہے۔ وہی معیار بلند سطح کے اوپر ہے جس میں آپ جب مومن اور کافر یعنی Members اور Non-members میں' صداقتوں کو ماننے والے اور ان کو جھٹلانے والے بنتے ہیں۔ اس طرح دو ہی کیٹگریز دنیا میں باقی رہتی ہیں' عزیزانِ من! یہاں کہا کہ کیٹگریز دو ہی ہیں' باقی یہ ساری تمدنی زندگی کی تمہاری ضرورتیں ہیں جن کے مطابق تم آپس میں ایک ہو جاتے ہو اور اس کے بعد وہ دوسری کیٹگری ہے کہ **وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ** (25:55) اس کیٹیگری میں ان کی کیفیت یہ ہے کہ جنہیں ہم نے کافر کہہ کر پکارا ہے جو صداقتوں کو نہیں تسلیم کرتے ''وہ خدا کے عالمگیر ضابطہ حیات کو چھوڑ کر' اپنے اپنے قبیلے کے بتوں کی پرستش' اور اکابر کی اطاعت کرتے ہیں' جو ان کے لیے کسی نفع یا نقصان کا اقتدار نہیں رکھتے۔''

انسان کو انسان پرستی سے نجات قرآنِ حکیم کی بنیادی تعلیم ہے

میں یہاں ایک بات عرض کر دوں' آپ اسے ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ قرآن نے آ کر کیا بنیادی تعلیم دی' نبی اکرم ﷺ نے دنیا میں کیا چیز پیش کی جو انقلاب آفریں تھی؟ وہ ایک ہی چیز ہے جس میں انسانوں کو انسان پرستی سے چھڑا دیا۔ یہ ہے باطل کی لم یعنی ایک انسان کا دوسرے انسان پر حکم چلانا۔ یہ وہی ہے جسے ہم پرستش کہتے ہیں مگر وہ پرستش ہی کی بات نہیں یہ یعبدون کی بات ہے' یہ محکومیت اختیار کرنا ہے۔ یہ انسان کی دوسرے انسان سے محکومیت اختیار نہیں کرنا ہے' یہ تو اس کا عبد ہو جانا ہے' اس کے لیے چونکہ ہمارے ہاں لفظ پرستش آ گیا اسی لیے اسے شخصیت پرستی کہتے ہیں۔ جو قرآنِ حکیم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

ختم نبوت کی حقیقت نے انسان کو مکمل طور پر آزادی کے تصور سے روشناس کر دیا ہے

حضور ﷺ سے پہلے انبیائے کرام علیہم السلام آتے تھے۔ وہ بہر حال انسان ہوتے تھے' ان کی صداقت پر ایمان بھی لانا پڑتا تھا' اس کے اندر ایک انسان کو اس مقام کے اوپر سمجھنے کا کچھ شائبہ تھا۔ ختمِ نبوت نے اس چیز کو بھی ختم کر دیا۔ عزیزانِ من! اس کے بعد اب نبی بھی نہیں

آئے گا' انسان کے سامنے اس نے انسان کی حیثیت ختم کردی' اسی لیے اس نے کہا تھا کہ **وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ** [1] (3:143)۔ اندازہ لگائیے محمد ﷺ یعنی حضور ﷺ کا مقام ہمارے دلوں کے اندر کتنا زیادہ ہے! کہا کہ وہ خدا کا ایک پیغامبر تھا' آیا اپنا مشن پورا کر کے چلا گیا۔ اس سے پہلے بھی بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلتے گئے۔ لہٰذا اگر **اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ** (3:144) کل کو وہ مر جائے' قتل ہو جائے تم میں نہ رہے تو بس تم یہ کہو گے کہ وہ بات اس کے ساتھ تھی وہ چلا گیا' معاملہ ختم ہو گیا۔ کہنے لگے کہ یہ بات قطعاً غلط ہے' یہ حق تو محمد ﷺ کو بھی حاصل نہیں تھا۔ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ**(3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ خدا اسے ضابطہ قوانین دے' حق حکومت دے' نبوت بھی کیوں نہ دے کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ' خدا کے نہیں' سو اس طرح انسان کو شخصیت پرستی سے چھڑا دیا' انسانوں کو انسان پرستی سے چھڑا دیا' انسان کے سامنے جھکنے سے چھڑا دیا' اس لحاظ سے انسان یا جو شخصیتیں ہیں' وہ ختم ہو گئیں' یعنی وہ شخصیت پرستی نہ رہی۔

آج ہمارا انگ انگ شخصیت پرستی میں جکڑا ہوا ہے

آج آپ کو پتہ ہے کہ ہم کس مقام پہ ہیں؟ وہ تو ایک نبی یا نبوت ختم قرآن کی تھی۔ ہم نے اس کے بعد قدم قدم پر ایسی شخصیتیں کھڑی کر رکھی ہیں کہ تصور میں بھی ان کی خدائی ہمارے ذہنوں پر مسلط ہے' مثلاً جب آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں امام نے یہ فرمایا ہے تو آپ کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب نہ آپ سوچ سکتے ہیں' نہ سمجھ سکتے ہیں' نہ اپنی کوئی رائے پیش کر سکتے ہیں' نہ اس کو پرکھ سکتے ہیں' نہ تنقید کر سکتے ہیں' نہ تبصرہ کر سکتے ہیں۔ جو مقامِ نبوت تھا ہم نے انہیں وہ مقام دیا ہوا ہے: یہ تو فلاں مفسر کی کتاب ہے' فلاں امام نے یہ بات کہی ہے' فلاں محدث نے یہ بات کہہ دی تھی' حضرت صاحب نے فرمایا ہے' مولوی صاحب یہ کہہ رہے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک قدم قدم کے اوپر آپ نے یہ بت کھڑے کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح آج ہمارا انگ انگ شخصیت پرستی میں جکڑا ہوا ہے۔

تیرا دل تو ہے صنم آشنا' تجھے کیا ملے گا نماز میں؟

یاد رکھیے کہ جب تک آپ انسان اور بندے کے درمیان یہ انسانی بت نہیں توڑیں گے خدا تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہمارے سامنے بت وہی ہیں جو ہندو ورگا ماتا کا یا اندر دیوتا کا بت پوجا کرتے ہیں۔ وہ بت تو شے ہی کچھ نہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے؟ وہ تو

---

[1] محمد ﷺ جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے اسی طرح بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔156)۔

یوں ہٹائے جاسکتے ہیں مگر یہ بت جو انسانوں کے بت ہیں' وہ تو آپ کے قلب و دماغ کے اوپر مسلط ہوئے ہیں۔ آپ کا ایک بات یا ایک لفظ بھی ان کے خلاف زبان سے نکالنا تو ایک طرف رہا' دل کی گہرائیوں میں بھی اگر ان کے خلاف یہ بات گزر جائے تو آپ کانپتے ہیں' ڈرتے ہیں' گڑگڑاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا یا حضرت! مجھے معاف کر دیجیے گا' بندہ بشر تھا' بھول گیا تھا۔ آپ کفارے ادا کرتے ہیں' منتیں مانگتے ہیں' جا جا کر سجدے کرتے ہیں۔ انسان انسان کے سامنے' جسے ختم کرنے کے لیے قرآن آیا تھا' جس کے لیے اس نے آپ کے ہاں کی جو سب سے بڑی عظیم پیغمبری کی' نبوت کی' Institution تھی' وہ ختم کر دی۔ اب نبی بھی نہیں آئے گا' قطعاً نہیں۔ قرآن نے کتنی بڑی آزادی عطا کی ہے۔ اس نے آکر شخصیت پرستی کے ہر طلسم کو توڑ دیا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ نبی تو پھر بھی ایک آیا کرتا تھا۔ ہم نے تو قدم قدم پر یہ پھیلا رکھے ہیں' یوں ہزار برس سے پیچھے کی طرف آپ دیکھیے تو یہاں سے وہاں تک' آپ کے ہاں یہ انسان ہی انسان کھڑے ہیں۔ آپ اپنے دور کے اندر دیکھیے تو قدم قدم کے اوپر انسان ہیں' کوئی شخص آپ کے سامنے نہ خدا کی کتاب کی سند پیش کرتا ہے' اور نہ عقل و فکر کی ہی کوئی سند پیش کرتا ہے۔ یعنی عقل و فکر سے ہی کوئی بات کہو تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ نہیں' ''آپ'' نے یہ فرما دیا ہے' وہ سارے اسے مان رہے ہیں۔ کس حد تک مان رہے ہیں اس کے لیے وہ بات یاد آ گئی ہے جس کا ذکر پچھلے ہی طلوع اسلام میں آیا تھا۔ اسے پھر ذرا آپ کے سامنے دہرا دوں' معلوم ہو جائے کہ ہمارے ذہنوں کے اوپر' یہ جو خدا ہیں' یہ کتنے سوار ہو چکے ہیں۔

مُردہ لڑکی کا درخت کے ساتھ نکاح

آپ کو معلوم ہے کہ اس میں لکھا ہے کہ یہیں سیالکوٹ کے ضلع میں وہ گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں ایک شخص کی لڑکی فوت ہو گئی۔ لڑکی جوان تھی' شادی ہوئی نہیں تھی۔ جنازہ قبرستان تک لے آئے۔ مولوی صاحب نے فرما دیا کہ صاحب! اسلام میں غیر شادی شدہ جوان عورت کا جنازہ جائز نہیں ہے۔ میں یہ جنازہ نہیں پڑھاؤں گا۔ اب کیا کیا جائے؟ جنازے کے بغیر دفن نہیں کی جا سکتی۔ اب جس کا اس نے نکاح کرنا تھا وہ مر گئی۔ وہ تو میت ہے۔ کسی نے ان سے نہیں پوچھا کہ میاں صاحب! یہ تو آپ دوسروں کے فرمانے کی بات کر رہے ہیں' کہیے آپ کیا کہتے ہیں؟ اب اس مسئلے کا تو حل کوئی نہیں' وہ فوت ہو چکی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ جائز نہیں ہے۔ وہ بتاتے ہیں' نہ کوئی پوچھتا ہے کہ صاحب! اسلام میں کیوں جائز نہیں ہے؟ مگر وہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ کوئی حضرت صاحب کہیں تشریف رکھتے ہیں جن سے آپ پوچھ کے آ گئے ہیں۔ یہ کون صاحب ہیں جنہوں نے یہ فرمایا ہے؟ اس کے لیے کوئی سند نہیں' کوئی حوالہ نہیں۔ بس یہ ہے کہ اسلام نے یہ فرما دیا۔ اب انہوں نے یہ کہا ہے اور سب کے سر جھکے ہوئے ہیں۔ اب قبرستان میں جنازہ سامنے

لیے ہوئے کھڑے ہیں کہ اب کریں کیا؟ وہ تو کہتے ہیں جنازہ ہی نہیں ہوتا۔ جی! آپ فرمائیے کہ پھر اسلام نے اس کا کوئی حل بھی بتایا ہے؟ کہنے لگے: ہاں حل بتایا ہے' میں ابھی انتظام کردیتا ہوں' قبرستان میں ایک شیشم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب نے شیشم کے درخت کے ساتھ اس میت کا نکاح پڑھایا۔ شیشم تے اردو چ کیندے نیں' ساڈے تے ٹاہلی کیندے نیں۔ تے ٹاہلی مؤنث ہوندی اے۔ اوتوں شہتوت دے درخت نال پڑھا۔ ❶ ان سے کہو کہ صاحب! اب بھی نکاح نہیں ہوا: او کسے ٹاہلے نال پڑھاندے۔ ❷ عزیزانِ من! آپ کو دنیا کیا کہے گی؟ اپنی طرف سے وہ کہے تو ہم ہیں کہ صاحب! یہ جہالت ہے' بیوقوفی ہے' کہہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اب وہ نکاح تو پڑھا دیا' مگر نکاح تو ایسے نہیں ہوجاتا' وہ تو اس کی گرہ پختہ ہونی چاہیے۔ پختہ گرہ کے لیے اس نے کہا کہ صاحب! چاولوں کی دیگ پکاؤ۔ لوآ جے ساری لم ایہدی۔ ❸ اس میں یہ ہے کہ وہاں پھر وہ چاول پکائے گئے' تقسیم کیے گئے' پھر نکاح پڑھا گیا' پھر اس کے بعد جنازہ پڑھا' پھر دفن کیا گیا۔ مجھے اس قصے سے کوئی تعلق نہیں ہے' ٹھیک ہے یہ حماقتیں ہر جگہ ہوتی رہتی ہیں' بات یہ ہے کہ اسلام میں یہ چیز نہیں ہے مگر اسلام کی رو سے یہ ایسا کچھ ہو رہا ہے اور کوئی شخص اس کے خلاف نہیں ہے۔ یاللعجب!!

قرآنِ حکیم کی بجائے پکی روٹی اور کچی روٹی کی امامت کا نتیجہ

میں عرض کررہا ہوں کہ وہاں تو بہرحال گاؤں کے لوگ بیچارے ہوں گے۔ ''ٹھیک ہے ملاجی نے کیا ہیگا تے اوناں کہہ دتا۔'' ❹ میں اس کے بعد انتظار کررہا ہوں۔ اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ کیا ان حضراتِ علمائے کرام میں سے کسی شخص نے بھی اس کے خلاف کچھ کہا ہے؟ کسی نے اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا اور یہ بات تو میں نے ایک Extreme (انتہائی) سی مثال دے دی جو کل ہوا ہے ویسے تو روز ہمارے ہاں یہ قصہ ہوتا ہے' کبھی کوئی صاحب اس سے پوچھتے ہی نہیں ہیں۔ میں بتایا کرتا ہوں کہ بچہ پیدا ہوا ہے' بیٹا ہے' صحت مند ہے' ماں کا دودھ' شیر مادر' حلالِ طیب ہے۔ حلال طیب کے لیے پہلی مثال ہم دیا کرتے ہیں کہ شیر مادر کی طرح حلال وطیب جو دودھ ہے اس کے چشمے جاری ہیں' بچہ بھوک سے رو رہا ہے' وہ دودھ اس کے منہ میں نہیں دیا جاسکتا' جب تک مولوی صاحب آ کے بچے کے کان میں اذان نہ دیں۔ ٹھیک ہے خدا کا کوئی حکم لائیے' ہم اس پہ ایمان لائے ہوئے ہیں' ہم اس کو ماننے کے لیے مکلّف ہیں' مگر وہاں یہ چیز

---

❶ شیشم تو اردو میں کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اسے ''ٹاہلی'' کہتے ہیں۔ ''ٹاہلی'' مؤنث ہوتی ہے (ارے تو!) شہتوت کے درخت سے (نکاح) پڑھا۔

❷ ارے! کسی ''ٹاہلے'' سے (نکاح) پڑھاتے۔

❸ لو بھئی! یہ ہے اس کی ساری لم' وجہ جواز!

❹ ٹھیک ہے ملاجی نے یہ کہہ دیا تو انہوں نے بھی کہہ دیا۔

نہیں ہے۔ اگر آپ کو کوئی بات ملتی ہے عقل وفکر کی رو سے بھی بات کہی ہے‘ اس کے لیے بڑی سے بڑی سند ہوگی مگر وہ کہیں گے کہ ’’جی پکی روٹی وچ لکھیا ہویا ہیگا جی اے۔‘‘ ❶ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں ہوگا کہ یہ پکی روٹی کیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ مسائل کی پہلی کتاب ہے‘ اوہدا ناں اے پکی روٹی‘ تے گل تے مک گئی۔‘‘ ❷ پکی پکائی روٹی اس کتاب کا نام ہے۔ ہماری تعلیم انہی راستوں سے ہوئی تھی۔ مثلاً یہ مسئلہ کہ ’’جے کوئی تینوں پوچھے تیرا ایمان کھلوتا ہے کہ بیٹھا ہویا تو آکھ: جی‘ او بیٹھا ہویا اے‘ کھلوتا تے نٹھ جائے گا نا۔‘‘ ❸ یہ ہے وہ ’’پکی روٹی‘‘ اور یہ ہیں اس قسم کے اس کے اندر سارے مسائل اور وہ سند ہوتی ہے۔ آپ سوچیے کہ انسانوں کی عقل وفکر کو ماؤف کرنا ان کے قلب اور دماغ کے اوپر ان چیزوں کو ایسے مسلط کرنا کیا ہے؟ آپ سوچیے کہ اس باپ پہ کیا گزر رہی ہوگی جس بیچاری لڑکی کی وہ میت تھی‘ اس وقت جب یہ کہا ہوگا کہ یہ دفن نہیں کی جاسکتی‘ اس کا جنازہ جائز نہیں ہے۔

برادرانِ عزیز! خدا نے یہ انقلاب آفریں کتاب (قرآن) بھیجی تھی کہ انسان پرستی نہ رہے‘ انسان دوسرے انسان کے فیصلے کے سامنے نہ جھکے۔ انسان پوچھے کہ آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں‘ اُس کی سند کیا ہے‘ اس کی دلیل کیا ہے‘ زیادہ سے زیادہ آپ کہیں گے تو وہ فرما دیں گے کہ فلاں کتاب میں لکھا ہے‘ فلاں صاحب نے فرمایا ہے‘ میں نے فلاں مولوی صاحب سے سنا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ❹ (25:55)۔ کہنے لگے کہ ان کفار کی یہ ایک عجیب بات ہے‘ آپس میں یہ روز لڑتے رہتے ہیں‘ جھگڑتے رہتے ہیں۔ اُن کفار کو تو چھوڑیئے ان مولوی صاحبان کے جتنے آپس میں مناظرے ہوا کرتے تھے‘ مباحثے ہوا کرتے تھے‘ وہ اب اس شکل میں نہیں ہوتے‘ اب پولیٹیکل پارٹی کی شکل میں ہوتے ہیں مگر ہو وہی کچھ رہا ہے:

---

❶ جی! یہ ’’پکی روٹی‘‘ میں لکھا ہوا ہے۔

❷ اس کا نام ’’پکی روٹی‘‘ ہے۔ اب بات تو ختم ہوگئی۔

❸ اگر تمہیں کوئی یہ پوچھے کہ تمہارا ایمان کھڑا ہے یا بیٹھا؟ تم کہو کہ جی‘ بیٹھا ہوا ہے۔ اگر کھڑا ہوگا تو بھاگ جائے گا۔

❹ یہ لوگ خدا کے عالمگیر ضابطہ حیات کو چھوڑ کر‘ اپنے اپنے قبیلے کے بتوں کی پرستش اور اکابر کی اطاعت کرتے ہیں‘ جو ان کے لیے کسی نفع یا نقصان کا اقتدار نہیں رکھتے (لیکن سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ لوگ زندگی کے ہر معاملہ میں قبائلی عصبیت پر بڑا زور دیتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ لیکن) جہاں خدا کی مخالفت کا سوال آتا ہے تمام قبیلے ایک دوسرے کے مددگار بن جاتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔827)۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں

مولانا احمد شاہ نورانی مرحوم کا ایک بیان

عزیزانِ من! ان کی آپس میں جو دشمنیاں ہیں، وہ آپ کو معلوم ہیں۔ اس حد تک ان کی آپس میں عداوتیں ہیں کہ آپ نے مولانا شاہ احمد نورانی کا وہ بیان دیکھا ہوگا جو اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ وہ طلوعِ اسلام میں بھی شائع ہوا ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم شاتم رسول کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ شاتم کے معنی ہوتا ہے: گالی دینے والا۔ کون ہے شاتمِ رسول؟ ان کے اپنے فرقے کے سوا، باقی سارے جتنے بھی ہیں، وہ شاتمِ رسول ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم کعبے کے اندر جہاں یہ نجدی ہیں، یہ جو سعودی عربیہ والے موجودہ حکمران ہیں، یہ حنبلی یا نجدی کہلاتے ہیں (اہل حدیث فرقہ)۔ یہ جو بریلوی لوگ ہیں یہ انہیں بھی شاتم رسول کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس بیان میں کہا ہے کہ ہم تو مکے میں ان نجدی علماء کے پیچھے بھی نماز پڑھنے کو تیار نہیں۔ یعنی آپس میں ایک دوسرے کی یہ کیفیت ہے۔ قرآن عجیب بات کہتا ہے کہ آپس میں تو ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے لیکن جب آپ خدائے واحد کی طرف آواز دیں تو یہ سارے مخالفت کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ عجیب چیز ہے۔ وہاں یہی بات تھی۔ عربوں کے اتنے قبائل تھے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ سو سو سال یہ قبائل ایک دوسرے کے ساتھ جنگ لڑا کرتے تھے۔ خود وہاں کے مذہب پرست طبقہ عیسائی اور یہودی اور مجوسی، یہ سارے ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار رہا کرتے تھے، اتنی مخالفت ایک دوسرے کی تھی لیکن حضور ﷺ نے جب خدائے واحد کی طرف دعوت دینے کی، قرآن کی یہ انقلابی آواز بلند کی ہے، یہ سارے ان کے خلاف متحد ہو گئے تھے اور ہر دور میں یہی ہوتا ہے۔

شب و روز، عمر بھر، پرویزؒ کی مخالفت کی وجہ جواز

عزیزانِ من! آپ کو تعجب تو ہوتا ہوگا کہ میں کبھی کبھی درمیان میں 'میں' لاتا ہوں۔ وہ مجھے اس نسبت سے لانا پڑتی ہے کہ پرویز صاحب کی مخالفت آپ دیکھ رہے ہوں گے۔ تمام فرقے، یہ تمام پارٹیاں، ان کے ہاں کے تمام جتھے گروہ، ان کو مخالفت کے لیے یہ ایک ہی شخص مل گیا ہے۔ ان کے آپس میں اتنے اختلافات ہیں لیکن اُسے گالی دینے میں یہ ہر مسجد استعمال کرتے ہیں۔ اِس میں یہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے یہ گالی دیتے ہیں؟ کیونکہ یہ خدائے واحد کی طرف دعوت دیتا ہے، یہ قرآن کی دعوت دیتا ہے، اس کا اور کوئی جرم نہیں ہے۔ عزیزانِ من! عمر کے اس آخری حصے میں بھی عرض کرتا ہوں کہ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے، چالیس سال سے یہ میری مخالفت کر رہے ہیں، میری ذات کے متعلق، اس کے فضل و کرم سے، ایک لفظ بھی آج تک نہیں کہہ سکے، صرف یہی کہتے چلے جا رہے ہیں کہ صاحب! یہ تو قرآن کو **حسبنا کتاب اللہ** کہتا ہے کہ یہ کتاب انسانوں کے لیے کافی ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ ہے جرم کہ یہ قرآن کی بات کہتا ہے۔

وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا (25:55) خدا کی مخالفت کے اندر یہ سب ایک دوسرے کے ساتھی ہو جاتے ہیں۔ کہا کہ تم یہ پرواہ نہ کرو' یہ مخالف کے قبائل ہیں' یہ مختلف مذاہب ہیں' یہ ان کے ہاں کے مختلف خاندان ہیں' قبیلے ہیں' یہ کچھ نہیں ہیں۔ **وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا** (25:56) تمہیں تو ہم نے یہ ایک مشن دے کر بھیجا ہے کہ ان سے کہو کہ تمہاری موجودہ غلط روش کے نتائج بڑے تباہ کن ہوں گے' اچھے راستے پہ چل پڑو گے تو بڑی خوشگوار زندگی بسر کرو گے۔ بس تم یہ کہے جاؤ' مقابل میں کوئی ہو' مخالفت میں کوئی ہو' تمہیں اس سے واسطہ نہیں ہے۔ یہ لوگ قبائلی عصبیت کا شکار ہوں تو ہوا کریں' تمہارا فریضہ یہی ہے کہ تم یہ بات کہے جاؤ اور اس کے ساتھ ایک بات اور میں کہوں کہ **اُعْبُدُوا اللّٰهَ** (23:23) تم صرف قوانین و احکامِ خداوندی کی اطاعت کرو۔

عقل و فکر کی دعوت عمر بھر نبی کی زندگی کا خاصہ ہوتی ہے

قرآن میں' عزیزانِ من! حضرتِ نوح علیہ السلام سے لے کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک' ہر نبی کا جہاں ذکر آیا ہے' اس نے یہ کہا ہے کہ میں تمہیں ایک دعوت دیتا ہوں اور وہ دعوت یہ ہے کہ **اُعْبُدُوا اللّٰهَ** (23:23) محکومیت صرف خدا کے قوانین کی اختیار کرو اور اسی سانس میں یہ ہر نبی نے کہا ہے کہ **مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ** (25:57) میں اس دعوت کے معاوضے میں تم سے کچھ نہیں مانگ رہا ہوں' اس دعوت میں میری کوئی ذاتی غرض پنہاں نہیں ہے۔ صاحب! یہ عجیب چیز ہے۔ یعنی یہ اتنی بڑی اہم بات ہوئی کہ پہلے نبی سے آخری نبی تک' ہر نبی کے ذکر کی دعوت کا پہلا فقرہ دہرایا گیا اور حقیقت میں وہی دعوت ہے کہ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو' اور اسی سانس میں فل سٹاپ بھی نہیں ہے' ساتھ یہ ہے کہ میں اس کے بدلے میں تم سے کچھ نہیں مانگ رہا' گویا یہ اتنی بڑی اہم چیز ہے۔ وہی چیز اثر انداز ہو سکتی ہے جس میں آپ کا کوئی ذاتی مفاد نہ ہو' جب کوئی آپ کا ذاتی مفاد کچھ نہ کچھ اس کے اندر آیا' تھوڑا بہت پر تو اس کا آ جائے گا' اور جب آپ یہ کہہ دیں گے کہ میں اس کے بدلے میں تم سے کچھ نہیں چاہتا تو پھر وہ اس کا ذاتی مفاد اس کے اندر قطعاً نہیں رہے گا۔ دیکھیے جو مفاد کہا ہے' وہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ **مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا** [1] (25:57)۔ یہ نہیں ہے کہ میں تم سے کچھ اور مفاد نہیں چاہتا۔ یہ چاہتا ہوں۔ الا کے یہ معنی نہیں کہ میں چاہتا ہی نہیں' تم سے کچھ مانگتا ہی نہیں' کوئی معاوضہ ہی نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے اختیار و ارادہ' دل کی رضامندی سے جو یہ چاہے **اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا** (25:57) وہ اس راستے پہ چل پڑے جو

---

[1] میں جو تمہیں صحیح راستے کی طرف دعوت دیتا ہوں تو اس میں میری کوئی ذاتی غرض پنہاں نہیں۔ میں تم سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ تم میں سے جو چاہے' اپنی مرضی سے' خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے۔ بس یہی میرا اجر رسالت ہے (34:47; 42:13) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 827)۔

اسے خدا کی طرف لے جائے گا' بس' میں اس کے سوا تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ اس کے لیے دوسرے مقام پہ جو کہا ہے' وہ اس سے بھی بڑے خوبصورت الفاظ ہیں کہ تمہارے خیال میں یہ تو آتا ہی ہوگا کہ بھئی! بہر حال یہ دعوت دے رہا ہے' پیغام پہنچا رہا ہے' تو اس کے بعد ان کے الفاظ میں ایک پارٹی بنا رہا ہے' ایک جماعت بنا رہا ہے۔ اس زمانے میں تو اس سے بڑا صلہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ پارٹی کے زیادہ سے زیادہ ممبر بنیں یا اس کے ساتھ متفق بنیں اس لیے کہ انتخاب سامنے ہوتا ہے۔ وہ جو ہر پارٹی کا ممبر بنتا ہے اصل میں وہ ایک ووٹ لیتا ہے۔ ایک روز ایک مولوی صاحب سے کسی نے کہا تھا کہ صاحب! اس شخص کے پاس اتنی دولت ہے' اتنے روپے ہیں۔ تو مولوی کہنے لگا کہ ہمارے پاس بھی بہت روپے ہیں۔ پوچھا کہ وہ کون سے روپے ہیں۔ کہنے لگا: یہ جتنے انسان پھر رہے ہیں ''اے سارے میرے روپئے پھردے پئے ہوئے ہے گے۔ او کہن لگا: او تیرے روپئے کس طراں نال؟ کیندا: جنے جدوں مرنا اے' تے جنازہ پڑھان دا روپیہ دینا اے' اتے کھڑے پیر پھرن ڈے ہیگے نیں' بس میں اڈیکناں ای ایں' جنے بندے پھردے پئے نیں۔ ❶ یہ پارٹی میں جتنے لوگ آتے ہیں وہ اصل میں ان کا ووٹ ہوتا ہے تو کم از کم یہی سہی۔

بے لوث عمل قرآنِ حکیم کا بہترین اصول ہے

عزیزانِ من! کیا بات ہے قرآن کی! اس نے کہا کہ **قُلْ** (25:57) ان سے کہہ دو کہ **مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ** (25:57) میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ جو تمہارے ذہن میں کچھ آ رہا ہے کہ صاحب! یہ پارٹی بنا رہا ہے' اس میں بھی کچھ اپنے لیے مانگ رہا ہوگا۔ نہیں' ایسا نہیں ہے بلکہ **مِنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ** (34:47) تمہارے ذہن میں جو کچھ آ بھی سکتا ہے وہ تمہارے ہی لیے ہے' میرے لیے نہیں ہے۔ اگر ایک مضبوط امت اور جماعت بنا لو گے تو تمہارے فائدے کی بات ہے' میں نے الیکشن نہیں لڑنا' مجھے ووٹ نہیں چاہئیں۔ کیا انداز ہے! کہا کہ **مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ** ❷ (34:47) اور یہ چیز نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہی متعلق نہیں کہی' عزیزانِ من! قرآن نے ایک اصول دیا ہے اسے ذہن میں رکھیے گا اور وہ ہے بے لوث ہونے کا اصول۔

---

❶ یہ تمام میرے روپے چل پھر رہے ہیں۔ وہ کہنے لگا: ارے بھائی! وہ تیرے روپے کس طرح بنے؟ اس نے جواب دیا: جس نے جب مرنا ہے تو جنازہ پڑھانے کا اس نے روپیہ ادا کرنا ہے۔ یہ تو بس تیاری کے انداز میں ہی چل پھر رہے ہیں اور میں ہوں کہ بس ان سب چلنے پھرنے والے افراد کے انتظار میں تیار بیٹھا ہوں۔

❷ (وہ یہ سب کچھ محض تمہاری خیر خواہی کے لیے کر رہا ہے۔ اس میں اس کا اپنا کوئی مقصد پنہاں نہیں ہے) وہ اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگتا۔ وہ معاوضہ تمہارے اپنے ہی لیے ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1001)۔

کسی لیڈر یا راہنما کے انتخاب کا بہترین اصول لیڈر کا بے لوث ہونا ہے

اسی ضمن میں ایک اور بات سامنے آ گئی اگر آپ وہ ذہن نشین کر لیں تو آپ کی جو بیشمار موجودہ الجھنیں ہیں وہ حل ہو جائیں گی' بیشمار مسائل حل ہو جائیں گے۔ قرآن نے کہا یہ ہے۔ سوال ہوا کہ ہم کس کے Followers (متبعین) بنیں' کس کے ساتھ چلیں' کسے Follow کریں' کس کی پارٹی میں شریک ہوں؟ یہ چیزیں ہوتی ہیں' Follower بننا ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے اتباع کا لفظ ہوتا ہے۔ کہا کہ **اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا یَسۡـَٔلُکُمۡ اَجۡرًا وَّ ہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ** (36:21) اس کے لیے کہا کہ دو Qualification (صفات) دیکھ لیا کرو۔ ایک تو یہ دیکھا کرو بلکہ دُور سے یہ دیکھا کرو کہ **مَنۡ لَّا یَسۡـَٔلُکُمۡ اَجۡرًا** (36:21) تم سے کوئی اس کا معاوضہ تو نہیں مانگ رہا۔ کہا کہ **اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا یَسۡـَٔلُکُمۡ اَجۡرًا** (36:21) دیانتدار بلانے والے کی نشانی یہ ہے: خود وہ صحیح راستے کے اوپر ہو' پہلی بات تو یہ ٹھیک ہے اور دوسری بات' وہ بھی میں نے اسی سانس میں کہا' یہ دوسری چیز قرآن نے کہی ہے۔ کتنی اہم چیز ہے جو اس نے کہی ہے کہ اس کے ساتھ چلو' اس کو Follow کرو: خود صحیح راستے پہ ہو اور تم سے کسی قسم کے کسی معاوضے مطالبے یا صلے کا متوقع نہ ہو۔ یہ ہیں دو خصوصیات۔ جس کے اندر یہ ہوں' اسے سمجھو کہ وہ لیڈر ہے۔ لیڈر کے معنی ہی ہیں جس کے پیچھے چلا جائے' اسے لیڈر سمجھو' اس کو Follow کرو' تو گویا یہ چیز جہاں ہر رسول نے اپنے متعلق یہ کہی' خدا نے ان کی زبان سے کہلوائی' قیامت تک کے لیے ہمارے لیے بھی یہ ایک نقطہ ہدایت دیدیا کہ کسے Follow کیا جائے' کس کا ساتھ دیا جائے؟ جو قرآن کی ہدایت کے اوپر ہو اور اس کے ساتھ یہ کہ اپنے لیے کسی قسم کے صلے اور معاوضے کا متوقع نہ ہو' طلبگار نہ ہو اور معاوضے کی شکل تو میں نے کہا ہے کہ یہ روپیہ پیسہ ہی نہیں ہے' روپیہ پیسہ کچھ شے نہیں ہے' یہ تو لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں اور پھر آپ لوگوں سے کچھ معاوضہ لیتے ہیں۔

زندگی آرزو کے آبِ حیات سے ہی قائم و دائم ہے

اصول آپ نے سمجھ لیا جو قرآن نے بتایا۔ کہ **قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ** (25:57)۔ عزیزانِ من! دل بے مدعا ہونا بڑی چیز ہے لیکن یہ بھی میں نے غلط کہہ دیا ہے دلِ بے مدعا ہو ہی نہیں سکتا' مدعا ہوتا ہے۔ فرق مدعا اور مدعا میں ہے۔ قرآن نے یہ بات بھی بتا دی۔ معاف رکھیے گا وہ رہ ہی گئی تھی ورنہ اس چیز نے پھر ذہن میں خلش پیدا کر دی: **مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ** (25:57) میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ بات تو یہ تھی کہ میں تم سے معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ نہیں ہے کہ میں اس کا معاوضہ ہی نہیں چاہتا۔ بات یہ ہے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ **اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ** [1] (34:47) اس سے مانگتا ہوں جس کا یہ کام ہے۔ اب دلِ بے مدعا بھی نہ رہا

---

[1] اس کا معاوضہ' اُسے اُس کے خدا کے ہاں سے ملے گا۔

اور اگر کوئی آرزو دل کے اندر نہیں رہتی تو وہ کمبخت دل تو مردہ ہوتا ہے' زندگی تو آرزو ہی کا نام ہے۔ تو یہ چیز کہ میں کسی معاوضے کا' کسی صلے کا' طلبگار ہی نہیں تو یہ بات تو غلط ہو جاتی۔ کتنا دیانتدار ہے یہ داعی کہ اتنی سی جو بات تھی اس کو بھی چھپا کے نہیں رکھا ہے ورنہ کہنا یہی تھا کہ جسے ہم Selflessness (بے لوث) کہتے ہیں کہ میں بالکل Selfish (خود غرض) نہیں ہوں' بالکل کچھ نہیں مانگتا' میں کوئی طلبگار نہیں ہوں۔ کہا کہ نہیں **مَآ اَسْـئَلُكُمْ عَلَيْهِ** (25:57) تم سے کچھ نہیں مانگتا **اِنْ اَجْـرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ** (34:47) اس کا اجر خدا سے مانگتا ہوں۔ وہ کون سا خدا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِیْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ** [1] (25:58)۔

انسانوں کے مرتب کردہ اصولوں کے مقابلے میں خدا کی طرف سے ملنے والے اصول ہمیشہ ابدی ہوتے ہیں

قرآنی قوانین اور عام نظامِ حکومت میں فرق کیا ہے؟ قرآن کے قوانین کے متعلق تو یہ ہے کہ وہ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (6:34) یہ Unchangeable (غیر متبدل) ہیں۔ یہاں بھی آپ نے دیکھا کہ اس نے انسانیت پرستی کو درمیان سے نکال دیا ہے۔ دنیاوی احکام میں کیا ہوتا ہے؟ دنیاوی قوانین ہوتے ہیں کہ ایک حاکم بدلا' ایک حکومت بدلی اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ قبلہ نما کی طرح سرکنا شروع کر دیا کہ جو نیا حاکم آیا ہے پتہ نہیں کس قسم کے وہ قانون بنائے گا' پتہ نہیں کیسے احکام جاری ہونگے کہ جی' انہوں نے تو یہ اتنے پرمٹ جاری کر دیئے تھے' لائسنس دیدیئے تھے' یہ پتہ نہیں ہے کہ بیک جنبش قلم وہ سارے ہی کینسل ہو جائیں گے۔ ہر حکومت کے بدلنے کے بعد آپ دیکھتے ہیں یہ چیز ہوتی ہے۔ چھوٹے سے پیمانے پہ تو علاقے کا ایک تھانیدار بدل جائے تو اس وقت بھی یہ ہوتا ہے کہ ''جی کیہو جیا بندا اے جیہڑا ہن آیا ہیگا اے''۔ [2] یعنی انسان کے بدلنے پر یہ سارے پیمانے بدل جاتے ہیں' حکومت کے بدلنے پہ پیمانے بدل جاتے ہیں' حکمران کے بدلنے پہ پیمانے بدل جاتے ہیں۔ ہم لوگوں کا تو پوچھو ہی نہیں کہ اس کے بدلنے سے کہاں کیا بدلتا ہے۔ امریکا کا الیکشن ہونے لگ جاتا ہے' یہاں کاروبار ٹھپ ہو کے رہ جاتا ہے' انتظار کرتے ہیں' روز یوں سن سن کے کونسی پارٹی برسرِ اقتدار آئی ہے' اب وہ وہاں کا کونسا صدر بنا ہے' یعنی وہاں کی جو تبدیلی ہوتی ہے وہ جس طرح سے زلزلہ کہتے ہیں سات ہزار میل کہیں ہوا اور یہاں آ کے ہمارے مکان گر گئے' وہ وہاں کے انتخاب کے اوپر یہاں زلزلے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں کسی کو بھی اطمینان میسر ہو سکتا ہے کہ یہ احکام اچھے ہیں' یہ قانون ٹھیک ہیں' کیا پتہ ہے کل ہی یہ مر جائے' کل ہی Change (تبدیل) ہو جائے' دوسرا آ جائے' اس

---

[1] اور تم اُس خدا (کے اٹل قوانین کے غیر متبدل نتائج) پر کامل بھروسہ رکھو جو ہمیشہ زندہ ہے' کبھی مرنے والا نہیں (اس یقین محکم کے ساتھ' اسی نظام کے قیام کے لیے سرگرمِ عمل رہو' تا آنکہ' ہر شخص' اس کے درخشندہ نتائج دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ وہ خدا جس کا نظام اس قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے' فی الواقعہ ہر قسم کی حمد و ستائش کا مستحق ہے (1:1) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 827 تا 828)۔

[1] کہ جی! یہ بندہ جو' اب آیا ہے' کیسا ہے۔

کے بعد پتہ نہیں کیا ہو؟ ہر وقت یہ دھڑکن لگی رہتی ہے۔ انسان کی بادشاہت کے اندر تو وہ بادشاہ مرے تو دوسرا بادشاہ۔ یعنی ہر وقت یہ چیز رہتی ہے۔ جہاں بھی انسانوں کے بس میں کوئی چیز ہو' کسی کا قانون بنانا' کوئی احکام نافذ کرنا' تو اس میں ہر وقت دھڑکا رہتا ہے۔

ہماری تباہی و بربادی کا باعث ''توکل'' کا غلط مفہوم ہے

دنیاوی حکومت میں آپ کسی پہ ہمیشہ کے لیے اعتماد اور بھروسہ نہیں کر سکتے۔ پارٹی بدلی اور اس کے بعد پتہ نہیں پھر کیا ہو۔ یہاں توکل آیا ہے۔ پھر وہی بات آ گئی کہ ان لفظوں کے معنوں نے تو ہمیں تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ **تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ** (33:48) ''جی اسی کرنے آں یعنی جنوں کجھ نہ کرنا ہووے بیٹھے ہوئے توکل علی اللہ کرن ڈئے ہوئے ہیگے۔''[1] توکل کے تو معنی ہوتے ہیں ''جس انداز میں کسی جہاز سے' ایک پیراشوٹ والا' اپنی چھتری لے کے چھلانگ لگا دیتا ہے' وہ جو اس کا اطمینان ہوتا ہے' اسے عربی زبان میں توکل کہتے ہیں''۔ کتنا بڑا یقین محکم' کامل بھروسہ ہوتا ہے' اپنی اس چھتری کی محکمیت کے اوپر کہ آدھے آسمان سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ یوں بھروسہ رکھ' ڈر نہیں۔ کہا کہ صاحب! کیسے بھروسہ رکھوں ہمیں تو روز تجربہ یہ ہے کہ ذرا سی وہ کوئی حکومت چینج ہوئی' کوئی مرا' اور اس کے بعد معاملہ ختم۔ کہتا ہے کہ **تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ** (25:58) اس کے قوانین کے اوپر بھروسہ رکھ جو ہمیشہ زندہ رہے گا' جو کبھی نہیں مرے گا۔

خداوند تعالیٰ کے قوانین پر مکمل بھروسے کا نام توکل ہے

عزیزانِ من! بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ خدا نے اپنی دو صفتیں بتائی ہیں: الحی' لا یموت۔ صاحب! تو مجھے کیا کہ تو ہمیشہ زندہ رہے گا' نہیں مرے گا' مجھے کیا ہے؟ ''مینوں تے توں مار دینا اے اک دن۔''[2] آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں بظاہر اس چیز سے' خدا کی ان صفتوں سے' کوئی تعلق نظر نہیں آتا: وہ ہمیشہ زندہ رہے گا' وہ نہیں مرے گا۔ جب ''توکل'' کہا ہے تو اس کے قانون پہ بھروسہ کر۔ اب اس سے ہمارا تعلق آ گیا۔ اگر کہیں کوئی انصاف والی پارٹی' کوئی برسر اقتدار حکمران ایسا ہو جو واقعی انصاف عدل احسان والا ہو اور اس کے متعلق یقین ہو جائے کہ اس نے بدلنا نہیں ہے' آپ نے دیکھا کتنا بڑا بھروسہ اور توکل اور اعتماد حاصل ہو جائے گا۔ یہاں تو اتنا سا بھروسہ ہوتا ہے کہ صاحب! کم از کم پانچ سال کے لیے تو یہ ہو گیا۔ یہ جو الیکشن ہے اتنے میں ہی کسی حد تک ایک بھروسہ ہوتا ہے اور اگر وہ ایسا ہو کہ **عَلَى**

---

1. جی ہم (توکل علی اللہ) کرتے ہیں یعنی جسے کچھ بھی نہ کرنا ہو' وہ بیٹھے توکل علی اللہ کر رہے ہیں۔
2. مجھے تو تُو نے ایک دن مار ہی دینا ہے۔

اَلْحَيِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ (25:58)اس کے قوانین قابل اعتماد اور بھروسے کے قابل ہیں' اس کے اوپر بھروسہ کرو اور اس کے لیے کام کیا کرو **وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ** (25:58)ان قوانین کی رو سے ایسا نظام قائم کرو: **وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ** (25:58)۔ میں نے کہا ہے کہ بس وہ روائتی (Traditional) ترجمہ آپ کیجیے تو پھر آپ قرآن سے گئے۔ یہاں ہے کہ **وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ** (25:58) یعنی بقول ان کے خدا کی حمد وستائش کی تسبیح پھیرتے رہا کرو۔ بس اے کم کردے رہیا کروتسی۔ تے جے نہ پھیریئے چھڈ دیئے وچ؟ کہنے لگا ہے تہانوں پتہ اے **الحی الذی لا یموت**' اسی مرنئیں گے' اسی جیوندے ہیگے آں۔ دیکھنا کہ اونے کیا کہ اسی جیونے آں۔ چھڈ کے ویکھ توں۔ مرنئیں گے۔ ❶

لفظ سبح کا قرآنی مفہوم

سبح بحمده کا مطلب عربوں سے پوچھیے' محاورہ عرب سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتے تھے۔ میں نے کہا ہے کہ سبح کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے پوری توانائیوں سے سرگرمِ عمل رہنا۔ میں نے کہا ہے کہ عرب گھوڑے کی وہ چال جس میں وہ دونوں پاؤں پورے پھیلا کے مارتا ہے۔ ''اسی تے اک واری گھوڑا دیکھیا سی ساری عمر' دوبارہ نئیں چڑھے۔ اک واری چڑھن نال جو کچھ ہویا پوچھونہ'' ❷ ۔ وہ عرب اس چال کو کہتے تھے جس میں وہ اپنے دونوں پاؤں پورے پھیلا کے مارتا ہے'' تے کوئی گھوڑے والا بولے تو سہی پئی کی ہوندی اے او چال'' ❸ ۔ اس موٹر سائیکل کے زمانے میں اب گھوڑے کی چالوں کو کون جانے صاحب! وہ عرب اس کو سبح کہتے تھے یا یہ جو تیرنا ہوتا ہے جس میں تیراک پورے بازو سے یوں تیرتے ہیں۔ وہ اسے تسبیح کہتے تھے۔ کہا کہ یہ کرو۔ وہ جو قرآنِ کریم میں حضرتِ یونس علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ اگر وہ ''سبح'' نہ ہوتا تو وہ وہاں ڈوب جاتا اور قیامت تک وہیں رہتا' تو ان کے بقول اس میں یہ آیا ہے کہ اگر وہ یہ تسبیح نہ پڑھتا کہ **لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ** (21:87) تو پھر وہ قیامت تک وہیں رہتا۔ اس نے یہ تسبیح پڑھ لی تو وہ بچ گیا۔ اس لحاظ سے اب یہاں جب بھی کسی پہ کوئی بڑی مصیبت آتی ہے تو وہ اس آیت (21:87) کی تسبیح پڑھتا ہے جیسے مثلاً عام طور پہ امتحاناں دے پہلاں تسی دیکھدے ہونا او چادراں وچھ جاندیاں ہیگیاں نہیں۔ سارا سال نہ استانیاں کچھ پڑھایا ہوندا' نہ ایناں کچھ پڑھیا ہویا ہوندا ہیگا۔ او جس ویلے پھر اوندا امتحان' تے نظر اوندا پئی آئی مچھی' تے لگی نگلن' تے او وچھا دیندیاں استانیاں۔

---

❶ بس تم یہ کام کرتے رہا کرو۔ اگر یہ تسبیح نہ پھیریں' اسے درمیان میں ہی ترک کر دیں تو؟ کہنے لگا کہ آپ کو معلوم یہ (الحیّ الذی لا یموت) ہے۔ ہم مر نہیں گئے' ہم زندہ ہیں۔ دیکھنا کہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ چھوڑ کر ذرا دیکھو تو! ہم مرنہیں گئے۔

❷ ہم نے تو ساری عمر گھوڑا ایک ہی بار دیکھا' دوبارا اس پہ سوار نہیں ہوئے۔ ایک ہی بار سوار ہونے پہ جو بیتی' اس کا پوچھو ہی نہیں۔

❸ وہ تو کوئی گھوڑے والا ہی بتائے کہ وہ چال کیا ہوتی ہے۔

اور وہ منگاتی ہیں کھجوروں کی گٹکیں ❶ ۔ یہ ایک بڑا کاروبار ہے آپ کو معلوم نہیں۔ آپ کو اگر کچھ اور کام نہیں ہے تو یہ کام کیجیے۔ یہ کرائے پہ ملتی ہیں یہ کھجوروں کی گٹھلیاں، وہ بچھ جاتی ہیں پھر چادریں اور پھر وہ لڑکیاں بیٹھ جاتی ہیں اور پھر استانیاں بھی بیٹھ جاتی ہیں۔ خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس دن وہ سر پہ دوپٹہ لے لیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ حضرتِ یونس علیہ السلام یہی تسبیح پڑھا کرتے تھے اور وہ یہی تسبیح پڑھاتی ہیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ ۖ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ❷ (21:87)۔ وہ جناب، یہ آیہ کریمہ جو ہے، اس کا ورد ہوتا ہے:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

عزیزانِ من! جن درسگاہوں میں کیفیت یہ ہو کہ امتحان میں محنت سے پاس ہونا نہیں ہے، اس کے دو ہی طریقے ہیں: کچھ ان کو رشوت دو جو امتحان لینے والے ہیں، کچھ اس کو دو جس کے ہاتھ میں آخری نتیجہ ہے۔ یہ آیہ کریمہ کے اور یہ اس آیت سبحنک کے ورد کرانے شروع کر دیئے جائیں، گٹکیں ❸ پڑھوانی شروع کر دیں۔ یہ جو بچیاں اور بچے ہیں یہ یہاں سے ذہن میں اس کے علاوہ کیا لے کر نکلیں گے؟ کچھ بھی نہیں۔

لفظ حمد کا مفہوم

یہاں آیا ہے: سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ (25:58)۔ عزیزانِ من! قرآن اپنے اس نظام کو 'حمد' کے معنی میں لیتا ہے۔ یہ عربوں کے ہاں کا ترجمہ ہے۔ پتہ نہیں یہ قوم کیا بلا تھی۔ حمد کے معنی ہوتا ہے "کسی بہت بڑے آرٹسٹ کا ایسا ماسٹر پیس، ایسا لاجواب شاہکار، جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے بنایا گیا ہو اور وہ ایسا ہو کہ جسے دیکھ کر ہر ایک کی زبان پر بلاساختہ "آہاہا" آ جائے، اسے وہ حمد ❹ کہتے تھے"۔ اب

---

❶ امتحانات سے قبل آپ دیکھتے ہیں کہ چادریں بچھ جاتی ہیں۔ سارا سال نہ استانیوں نے کچھ پڑھایا ہوتا ہے، نہ ان کی طالبات نے کچھ پڑھا ہوتا ہے۔ پھر جب امتحان آتا ہے تو نظر آتا ہے کہ اب مچھلی آئی اور گلی نکلنے تو استانیاں چادریں بچھا دیتی ہیں۔ اور کھجوروں کی گٹھلیاں منگوا لیتی ہیں۔

❷ تیرے سوا اور کسی کو اس کا اقتدار و اختیار نہیں (کہ وہ مجھے ان مشکلات سے نجات دلا سکے۔) میں نے جو اس فیصلے میں عجلت کی اور تیرے حکم کا انتظار نہ کیا تو یہ میری زیادتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا فیصلہ ہی ایسا ہوتا ہے جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہوتا ہے۔ (37:139;68:48) (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 744)۔

❸ کھجوروں کی گٹھلیاں۔

❹ اس کی مکمل تشریح اور مفہوم کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحہ، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2007، ص ص۔ 78 تا 93)۔

ہم نے اس کا ترجمہ تعریف کیا ہے۔اس کا ترجمہ تعریف نہیں ہے کیونکہ تعریف کے لیے تو ان کے ہاں لفظ ''مدح'' بھی تھا ''ثنا'' بھی تھا۔ ''مدح'' کا لفظ قرآن میں خدا کے لیے کہیں نہیں آیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مدح بادشاہوں کی ہوتی ہے' اس میں خوشامد کا پہلو ہوتا ہے' اسے خوش کرنا ہوتا ہے۔ یہاں نہ کسی کی مدح ہوتی ہے' نہ کسی کو خوش کرنا ہوتا ہے' نہ کسی کی خوشامد ہوتی ہے' اس میں تو یہ ہوتا ہے کہ ایک شاہکار آپ کے سامنے آتا ہے' آپ کو معلوم بھی نہ ہو کہ یہ شاہکار کس کا ہے' اسے دیکھ کر بے ساختہ زبان پہ ''آہاہا'' آجائے تو اسے وہ حمد کہتے ہیں' آپ کو معلوم نہ ہو کہ مونا لیزا[1] کا پینٹر کون تھا' اگر نگاہوں کے سامنے وہ تصویر آئے تو بے ساختہ زبان سے تحسین و آفریں نکلے۔ تو عرب اس کو حمد کہتے تھے۔ کہا کہ اس کے قوانین جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی' اس قسم کے محسوس نظام کی شکل کے اندر متشکل ہوں جو **مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ** (13:17) ہوں یعنی نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہوں کہ جو اس نظام کو دیکھے' بے ساختہ کہہ دے کہ سبحان اللہ کیا بات ہے اس نظام کی صاحب! یہ ہے **سبح بحمدہ**۔

ذنوب کے غلط ترجمے نے قرآنِ حکیم کی ساری تعلیم کو ہی بدل دیا

اب آگے دو الفاظ آتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ اس میں دو چار سخت مقام آتے ہیں' ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ **وَ کَفٰی بِہٖ بِذُنُوۡبِ عِبَادِہٖ خَبِیۡرًا** (25:58)۔ یہ بڑا ہی اہم مقام ہے۔ اس کا ترجمہ کہا جاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کے گناہوں سے خوب واقف ہے۔ بات تو یہ ہو رہی تھی کہ اس کے نظام کو ایسا موجبِ حمد بنا دیجیے کہ دنیا یہ سب کچھ پکار اٹھے' اور یہاں ترجمہ کر دیا کہ خدا اپنے بندوں کے گناہوں کو خوب جانتا ہے۔ ذنب کی جمع ذنوب ہے۔ اس کا ترجمہ گناہ کر دیا: خدا بندوں کے گناہ سے واقف ہے۔ گناہ ہی نہیں' وہ تو ہمارا ایمان ہے کہ خدا کہتا ہے کہ ہم تو تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہیں' تمہاری نگاہ کی خیانتوں تک سے واقف ہیں۔ ٹھیک ہے وہ تو واقف ہوا۔ یہاں یہ جو ''ذنوب'' ہوا تو یہاں کوئی ایسی اہم چیز بھی نہیں ہے۔ اہمیت اس کی اور جگہ آتی ہے۔ وہ سورۃ الفتح میں ہے۔ وہ ابتدائی مشہور آیات ہیں کہ **اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۙ لِّیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ** (48:1-2)۔ ہزار برس سے' عزیزانِ من! یہ آیت ہمارے ہاں' مذہبی حلقوں کے اندر' بحث و تمحیص کا محور رہی۔ اس کا ترجمہ یہ کہا جاتا ہے کہ اے رسول! ہم نے تمہیں ایک فتح' فتح مبین عطا فرمائی ہے' بہت بڑی فتح عطا فرمائی ہے تاکہ خدا تمہارے وہ گناہ بخش دے جو تم اس سے پہلے کر چکے ہو' اور وہ گناہ جو اس کے بعد ابھی تم نے کرنے ہیں۔ آپ غور فرمائیے کوئی تاویل نہیں۔

---

[1] مونا لیزا کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحۃ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص 79۔ (فٹ نوٹ 1)۔

اس آیت کے اندر لک آیا ہے۔ یہ واحد مخاطب کا صیغہ ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے' ترجمہ یہ بتایا' ترجمہ ہی نہیں بلکہ اس کے متعلق تفسیریں چلی ہوئی ہیں' اب اس کے بعد گروہ بنے۔ وہ گروہ جس نے کہا کہ انبیائے کرام تو معصوم ہوتے ہیں' ان سے تو گناہ سرزد نہیں ہوتے اور اب اس آیت کے بعد وہ کیا کریں۔ اب چلے جناب! وہ اس کی تاویل میں۔ کتابوں پہ کتابیں لکھی چلی جا رہی ہیں مگر یہ تاویل بنتی کچھ نہیں ہے۔ مقابلے میں جو دوسرے لوگ ہیں' جو کہتے ہیں کہ نہیں' یہ نہیں ہے۔ وہ سب کچھ کہتے ہیں: سوسنار کی' ایک لوہار کی۔ وہ اس ایک آیت کو پیش کر دیتے ہیں۔ آیت میں آپ غور کیجیے گا کہ جو گناہ آپ ﷺ پہلے کر چکے ہیں ان کو بھی بخش دے اور جو اس کے بعد کریں گے ان کو بھی پہلے ہی بخش دے' یعنی کرن توں پہلے ای۔ ❶ اندازہ لگائیے کہ آپ کے ہاں اس رسول ﷺ کا معاذ اللہ کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور اس خدا کا بھی (معاذ اللہ' معاذ اللہ)۔

اس سلسلہ میں مودودیؒ کا تفسیری بیان جو قابلِ صد افسوس بھی ہے اور عجیب بھی

ہمارے دور میں ذرا ایک دلچسپ سی تفسیر آتی ہے۔ مجھے بڑا ہی افسوس ہے کہ مجھے درس میں یہ نام لانا پڑتا ہے۔ اس دور میں ہمارے ہاں کے مفسر مودودی ❷ صاحب ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں کبھی بھی درس میں کوئی نام نہیں لیتا۔ خاص طور پہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ اس دور میں ہماری نئی جنریشن کے اوپر' کم از کم ان کے ذہنوں کے اوپر' ان کے خیالات کا' ان کی تفسیر کا' بڑا اثر ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اگر زندگی کے کچھ دن دیئے ہیں' توفیق دی ہے' میں کوشش کرتا رہتا ہوں' کہ کم از کم ان نوجوانوں کے ذہنوں سے' میں وہ غلط تاثرات کسی حد تک مٹا دوں' جو قرآن کے خلاف' دین کے خلاف' ان کی طرف سے پیدا کیے جا رہے ہیں۔ مجھے اس لیے نام لے کر یہ بات کہنا پڑتی ہے' ورنہ میں کبھی بھی یہ نہیں کرتا۔ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے؟ ان کے ہاں کی صورت یہ ہے' ان کا انداز ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ گاندھی جی بھی خوش رہیں' راضی رہے سرکار بھی یعنی وہ طبقہ جو کہتا ہے کہ گناہ کر سکتے تھے ان کی بھی رعایت ہو اور دوسرے وہ کہ جو کہتے ہیں کہ نہیں کر سکتے تھے ان کی رعایت بھی ساتھ رہے۔ یہ رعایت کیسے رکھی جا سکتی تھی؟ ان کی یہ کتاب ہے: رسائل و مسائل حصہ چہارم۔ ان سے کسی نے سوال پوچھا ہے کہ کیا انبیائے کرام ﷺ سے لغزش ہو جاتی تھی؟ کہا: جی نہیں' نہیں ہوتی تھی' میرا خیال یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں کام کرتے تھے' تو اس بنا پہ ان سے لغزش کا صدور نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلی بات تو یوں دیکھ لیجیے کہ خدا کی نگرانی میں کام کرتے تھے' ہر وقت وہ نگرانی کرتا رہتا تھا کہ وہ کوئی غلط قدم اٹھائیں ہی نہیں۔ خدا کی نگرانی کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ پہلے تو یہی دیکھیے کہ

---

❶ کرنے سے قبل ہی۔

❷ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)۔

اپنی طرف سے انبیا کو جو بہت بڑا کریڈٹ دیا جا رہا ہے وہ یہ دیا جا رہا ہے کہ وہ خدا کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ آپ کا بچہ آپ کی نگرانی میں اگر اِدھر اُدھر چلتا ہے اور وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھاتا تو اس میں اس کی کیا کاریگری ہے، وہ تو آپ کی نگرانی میں یہ کچھ کر رہا ہے، تو چونکہ وہ خدا کی نگرانی میں یہ کرتے تھے اس واسطے ٹھیک ہے کہ ان سے لغزش نہیں ہوتی تھی، خدا ان سے لغزش ہی سرزد نہیں ہونے دیتا تھا۔ اب وہ جو دوسرے ہیں جو کہتے ہیں کہ گناہ کرتے ہیں کہ صاحب! ان کے عقیدے کے مطابق یہ لغزش لغزش ہے۔ اب وہ سامنے آئے کہ ان کے متعلق کیا کہا جائے۔ کہتا ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں، ہیں لکھا ہے، تھے لکھنا چاہیے تھا، اس لیے ان سے لغزش کا صدور اس بنا پر نہیں ہوا، صدور تو ہوا ہے اس بنا پر نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کسی وقت ان سے غافل ہو گیا تھا، یہ ہوا کہ لغزش صادر ہوئی تو یہی آیا کہ وہ تو خدا کی نگرانی میں کام کرتے تھے تو پھر یہ بچہ جو گر پڑا ہے، بچہ گرتا ہے تو اندر سے آواز دیتا ہے: تو کتھے گئی ہوئی سیں، اندھی ہیں، دیکھدی نئیں بچہ گر گیا۔ او کہن لگی: میں تو ہانڈی اچ ڈوئی پھیرن لگی ساں، میں اینوں کی کراں؟[1] اس لیے نہیں لغزش سرزد ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان سے کسی وقت غافل ہو گیا تھا بلکہ اس بنا پر ہوا، بڑی توجہ سے سنیئے، عزیزانِ من! اور کانپ جایئے۔ اس بنا پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ لغزش ان سے صادر ہو جانے دی: کوئی گل نئیں جی کرن دیو۔[2]

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اللہ نے ان سے وہ لغزش ہو جانے دی تاکہ دنیا پر یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں، خدائی صفات کے حامل نہیں ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے خدا نے ان سے یہ لغزشیں ہو جانے دیں۔ عام طور پہ تو وہ روک لیتا تھا کہ یہ نہ ہو اور کبھی کبھی ہو بھی جانے دیتا تھا اور اس میں کہتے ہیں کہ بہت بڑی حکمت تھی تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ انسان ہی ہے، بشر ہے، خدائی صفات نہیں ہیں، اس میں خدائی صفات ہوتیں تو کوئی لغزش ہی نہ ہوتی۔

عزیزانِ من! آپ نے اس سے غور فرمایا کہ کیا کہا ہے کہ لغزش نہیں ہوتی تھی تو یہ اس وجہ سے تھی کہ خدا نگرانی کر رہا ہے، وہ بھی حضور ﷺ کے اپنے کیریکٹر کی بنا پہ نہیں تھی (معاذ اللہ)۔ جو کسی کی نگرانی کی وجہ سے صحیح کام کرتا رہتا ہے، وہ مزدور جس کے سر پہ آپ کو دن بھر کھڑا رہنا پڑے کہ وہ کام کرتا رہے، تو کیا وہ دیانتدار مزدور کہلاتا ہے؟ نگرانی کی بنا پہ اگر کسی سے لغزش نہ ہو، تو کیا اس کو اس کا کریڈٹ جاتا ہے؟ کیا یہ کیریکٹر کہیں گے؟ اور اس کے بعد پھر خدا کی حکمت عالیہ بھی کہ کبھی کبھی وہ ان سے یہ لغزش ہو جانے دیتا تھا، یہ نہیں

---

[1] تو کہاں تھی؟ کیا اندھی ہو؟ کیا دیکھتی نہیں ہو کہ بچہ گر گیا ہے؟ وہ کہنے لگی: میں ہنڈیا میں ڈوئی چلا رہی تھی۔ میں اسے کیا کروں؟

[2] کوئی بات نہیں، جی! کرنے دو۔

ہے کہ وہ اس سے بے احتیاط ہو جاتا تھا یا غافل ہو گیا تھا' نہیں' یہ لغزش ہو جانے دیتا تھا' اب جب نہیں ہوتی تھی تو اس کا کریڈٹ ان کو نہیں جاتا' جب یہ ان سے لغزش ہوئی ہے تو خدا کی اس حکمت بالغہ کے اوپر بقول ان کے کہ لوگ کہیں کہ یہ انسان ہی ہے لوگوں کو کیسے یہ پتہ چلے کہ خدا نے ہو جانے دی ہے' اس نے خود نہیں کی' اور یہ اس کو کیسے Explain (واضح) کریں کہ صاحب! یہ میں نے نہیں کی اس نے ہو جانے دی ہے' سارے تو اسی کی طرف منسوب کریں گے' جبھی کہیں گے کہ یہ انسان ہے۔ معلوم ہے یہ کون انسان ہے' کون رسول ہے؟ اسے غور سے سنیے۔

آپ حضور ﷺ کی چالیس سالہ زندگی آخر کس چیز کی شہادت تھی؟

عزیزانِ من! حضور ﷺ کی چالیس سال کی عمر اس سے پہلے بھی گزری تھی۔ نبوت تو اس کے بعد آئی ہے' وحی تو اس کے بعد آئی ہے' اسلام تو اس کے بعد آیا ہے' اس کی پہلی زندگی تو اس طرح اسلام کی نہیں ہے۔ جب دشمن پوچھتے ہیں کہ آپ کے پاس اس دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا ہے کہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں؟ وہ رسول اپنی اس پہلی زندگی کے متعلق کہتا ہے کہ **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (10:16) میں نے تو یہ پورا چالیس سال کا عرصہ تمہارے اندر گزارا ہے' میری اس زندگی سے تم پہچان نہیں سکتے کہ یہ سچے کی زندگی ایسی ہوتی ہے یا جھوٹے کی۔ اللہ اکبر! وہ نبوت سے پہلی زندگی کو اپنے دعوے کی صداقت کے ثبوت میں پیش کر رہا ہے اور ان دشمنوں میں سے کوئی ایک بھی یہ کہنے کے لیے انگلی نہیں اٹھاتا کہ ہاں' تمہاری زندگی میں یہ یہ چیزیں ہم نے ایسی دیکھی ہیں۔ آپ ﷺ کی اتنی پاکباز زندگی تھی۔ بعد کی زندگی کے متعلق جب آپ ﷺ نبی ہو گئے ہیں تو بقول ان کے اگر وہ کوئی لغزش نہیں کرتے تو وہ خدا کی نگرانی کی وجہ سے ہے۔ اور پھر لغزشیں ہو رہی ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ ان سے لغزش ہونے دو تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ انسان ہی ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے' خود خدا نے بتایا ہے۔ تمہارے انسان ہونے کا ثبوت ان کو کیسے مل رہا ہے: یہ خود کہہ رہے ہیں کہ یہ انسان کیسا ہے؟ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' ہماری طرح کھاتا پیتا ہے' اس کے بال بچے بھی ہیں' سودا سلف خریدتا پھرتا ہے' یہ کس قسم کا انسان ہے؟ اور اس کے جواب میں حضور ﷺ وحی کی زبان میں فرماتے ہیں' خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ تم مجھے سپر نیچرل' سپر ہیومن' کیوں سمجھتے ہو' میں تمہارے جیسا انسان ہوں۔ رسول کے بشر ہونے کے دعوے کے ثبوت میں خدا نے یہ دلیل دی ہے تو ان کے نزدیک یہ دلیل کافی نہیں تھی۔ اصل میں ثبوت اور دلیل یہ تھی کہ ان سے کبھی کبھی گناہ ہو جاتا تھا اور پھر لوگ سمجھتے تو اتنا ہی سمجھتے کہ یہ ایک انسان ہے (معاذ اللہ)۔ پھر لوگ اس کو کس قسم کا انسان سمجھتے؟

عزیزانِ من! یہ ہے وہ اسلام' یہ ہے وہ سیرت رسول اللہ ﷺ کی' جو ہمارے ان نئے نوجوانوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس معاملے میں معاف رکھے' آپ سوچ لیجیے اس کے باوجود بہت سے دوست کہا کرتے ہیں کہ صاحب! تم تو ان کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہو۔ بتایئے کہ یہ کچھ دیکھنے کے بعد بھی کیا یہ ناموسِ پیغمبر ﷺ کا تقاضا نہیں ہوتا ہے کہ اس کی تردید میں کہا جائے۔

ذنب کا مفہوم قرآنِ حکیم کی روشنی میں

عزیزانِ من! میں یہ باتیں ناموسِ پیغمبر ﷺ کے لیے زبان پہ لاؤں' یہ بہت ضروری ہے۔ آخر میں کس طرح یہ سب کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے بعد' خاموش رہوں! بات پھر یہ ہوئی کہ پھر خدا نے یہ کیا کہا ہے: **مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ**(48:2)۔ یہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں تاکہ بخشے جائیں پہلے بھی گناہ سے اور آنے والے بھی گناہ سے۔ عزیزانِ من! ذنب کا ترجمہ پوچھو عربوں سے کہ بات وہ کیا ہے' ترجمہ وہ کیا کرتے تھے۔ ذنب کے لفظ کے بنیادی معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ یہ جسے آپ مویشی کی دم کہیں گے وہ دم پیچھے لگی ہوئی' چپکی ہوئی ہے' الگ ہی نہیں ہوتی۔ ہر وہ بات جو کسی کے پیچھے اس طرح چپک جائے کہ وہ جہاں جائے' اس کے ساتھ ساتھ جائے' یہ ذنب ہے۔ یہ قوم بلا تھی' اسے وہ بنیادی طور پہ ذنب کہتے تھے اور اس کے بعد کہتے تھے کہ کسی کے خلاف الزامات اتہامات تہمتیں بہتان جو تراش کے چپکا دیئے جائیں اور ایسے طور پہ پروپیگنڈہ کیا جائے کہ وہ بیچارہ جہاں جائے' وہ اس کے پیچھے چلتا رہے' جیسے مویشی کی دم چپکی رہتی ہے۔ وہ اسے ذنب کہا کرتے تھے۔ جس کی جمع ذنوب ہے' سارا قرآن بھرا پڑا ہے کہ یہ تیرے متعلق کیا کچھ کہتے ہیں: ساحر ہے' جادوگر ہے' مسحور ہے' کسی نے جادو کر دیا ہے' کاہن ہے' یہ کچھ کرتا پھرتا ہے' اپنا کچھ مقصد ہے' شاعر ہے' اور پھر شاعری کے متعلق بھی ان کا اپنا ایک تصور تھا حالانکہ شاعروں کو وہ اتنا اونچا سمجھتے تھے۔ شاعروں کے متعلق کہتے تھے کہ **نَتَرَبَّصُ بِہٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ** (52:30) فکر کی کوئی بات نہیں ہے' شاعری کی طرح یہ چند دن گرمجوشیاں پیدا کرے گا' زمانے کی گردشیں اسے خود مٹا دیں گی' کیوں فکر کرتے ہو۔ یہ سارے اتہامات جو لگائے جاتے تھے' یہ سارے الزامات تھے جو چپکائے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں لفظ بھی چپکانا ہے' ان کے متعلق ساری عمر یہ کہا۔ اب بات سمجھ میں آئی۔ کہا کہ یہ کچھ کہتے تھے کہ یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی' یہ شاعری ہے' مذہبی پیشوائیت ہے' کہانت ہے' محض نظر بندی ہے۔ یہ لوگ یہ کچھ کہتے تھے۔ خدا نے کہا کہ **اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا**(48:1) یہ ایسی عظیم فتح تمہیں حاصل ہوئی ہے کہ **لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ**(48:2) جتنے الزامات اس سے پہلے لگاتے تھے وہ بھی اس نے دھو دیئے۔ اس کے بعد بھی جو لگائیں گے' وہ بھی ڈھل جائیں گے۔ اس کی وجہ سے' فتح عظیم تو دیکھ۔ Nothing succeeds like success [1] یہ صلح حدیبیہ کا وقت ہے۔

---

[1] کامیابی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔

عزیزانِ من! فتح کے معنی ہیں دروازے کھول دینا۔ یہ لفظ فتح بھی یہاں عجیب ہے جو قرآن نے کہا ہے اگرچہ اس خاص حدیبیہ کے مقام پہ' جسے ہم یہ میدانِ جنگ میں فتح کہتے ہیں' وہ نصیب نہیں ہوئی تھی بلکہ صلح حدیبیہ کے اندر آنے والی فتوحات کے دروازے کھول دیئے تھے۔قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تمہارے لیے فتوحات کے ایسے دروازے کھولے ہیں کہ اس کے بعد' اور اس سے پہلے' تیرے خلاف یہ جتنے بھی پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے' الزامات واتہامات چپکایا کرتے تھے' یہ وہ بھی دھلا دے گی۔اس کے بعد بھی یہ جو کچھ الزام لگائیں گے' وہ سب بھی دھل جائیں گے۔کہا کہ **اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًاۙ لِّیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ یُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکَ** (48:1-2) ہم نے (اے رسول!) تیرے لیے کامیابی وکامرانی کی واضح راہ کشادہ کردی ہے اور ایک فیصلہ کن انقلاب عنقریب آنے والا ہے۔اس سے مقصد یہ ہے کہ یہ مخالفین تیرے خلاف جس قدر الزامات تراشتے' بہتان باندھتے اور غلط باتیں تیری طرف منسوب کرتے ہیں یا اس کے بعد کریں گے اُن کے مضر اثرات سے تیری حفاظت کا سامان ہوجائے۔یہ کامیابیاں تیرے دعوے کی صداقت کی زندہ شہادت بن جائیں گی اور اس طرح ان کے سامنے ان تمام باتوں کا حتمی جواب آ جائے گا جو یہ اس وقت تیرے خلاف کرتے ہیں۔ [1] اور یوں اللہ اپنی نعمتوں کا اتمام تیرے اوپر کردے گا۔ **وَ یَہۡدِیَکَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًاۙ وَّ یَنۡصُرَکَ اللّٰہُ نَصۡرًا عَزِیۡزًا** [2] (48:2-3)۔کیا بات ہے آیتوں کی! تم دیکھو گے کہ کس طرح خدا کی فتح نصرت تمہارے ساتھ ساتھ چلتی ہے' کس قدر کامیابیوں پہ کامیابیاں تمہیں نصیب ہوجاتی ہیں۔ان اتہامات والزامات کا جواب دینے کا طریقہ یہ تھا' ہم نے جو تمہیں روک رکھا تھا کہ اپنا وقت اور توانائی مت ضائع کرو' ان کو کرنے دو' وہ اس لیے تھا کہ حقیقت میں اس کی Rebuttal یعنی تردید یوں ہونی ہے۔یہ ہے **وَ کَفٰی بِہٖ بِذُنُوۡبِ عِبَادِہٖ خَبِیۡرَا** [3] (25:58) کا ترجمہ۔

سورۃ الفرقان کی آیت 58 تک ہم آ گئے' 59 ویں سے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

---

[1] اس سے مراد وہ چھوٹی چھوٹی نادانستہ کوتاہیاں بھی ہوسکتی ہیں جو نظام خداوندی کے متشکل کرنے کے سلسلے میں سرزد ہوں (حوالہ: پرویزؒ: مفہوم القرآن: طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' ص۔1194۔فٹ نوٹ 1)۔

[2] اور یوں تو اپنے قافلے سمیت' زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ پر گامزن رہے گا۔یعنی خدا تجھے بڑا زبردست غلبہ عطا کردے گا (اور اس طرح یہ سب دیکھ لیں گے کہ بالآخر حق غالب آتا ہے اور باطل مغلوب ہوجاتا ہے (مفہوم القرآن' ص۔1194)۔

[3] اور اس کے بعد تم اس کی بھی پرواہ مت کرو کہ یہ لوگ تمہارے خلاف کیا کیا تہمتیں تراشتے اور الزامات لگاتے ہیں۔خدا خوب جانتا ہے کہ اس کے بندوں میں سے کون کیا کرتا ہے اور اُس کے خلاف کیا کیا تہمتیں لگتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔828)۔

تیرھواں باب: سورۃ الفرقان (آیات 59 تا 62)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ۚ اَلرَّحۡمٰنُ
فَسۡـَٔلۡ بِہٖ خَبِیۡرًا ﴿۵۹﴾ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ قَالُوۡا وَ مَا الرَّحۡمٰنُ ٭ اَنَسۡجُدُ لِمَا تَاۡمُرُنَا
وَ زَادَہُمۡ نُفُوۡرًا ﴿۶۰﴾ تَبٰرَکَ الَّذِیۡ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ جَعَلَ فِیۡہَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیۡرًا ﴿۶۱﴾
وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ خِلۡفَۃً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّذَّکَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُکُوۡرًا ﴿۶۲﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1978ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 59 سے ہو رہا ہے:

(25:59)۔

سابقہ آیت میں قوانینِ خداوندی کے کامل طور پر قابل اعتماد ہونے کے متعلق کہا گیا تھا کہ **وَ تَوَکَّلۡ عَلَی الۡحَیِّ الَّذِیۡ لَا یَمُوۡتُ** ❶ (25:58) قوانین اس کے دیئے ہوئے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہے گا' اسے موت نہیں آئے گی۔ اگر صاحبِ اقتدار ہمیشہ زندہ رہے تو پھر کوئی اس کے قوانین کو بدلنے والا نہیں آتا' اسی لیے قوانین خداوندی کے متعلق اس نے خود کہا کہ **لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ** (6:34) کوئی اس کے قوانین کو بدل نہیں سکتا۔ ایک بادشاہ کے مرنے کے بعد تو دوسرا بادشاہ آتا ہے' ایک صاحبِ اقتدار کے جانے کے بعد دوسرا آتا ہے۔ جو دوسرا آتا ہے' اسے اس کا اقتدار اور اختیار ہوتا ہے کہ وہ سابقہ قوانین میں ردوبدل کر سکے لیکن جس کے اقتدار میں انقطاع ہی نہ ہو' وہ مسلسل جاری رہے تو اس میں سوال ہی نہیں کہ اس کے بعد کوئی اس کا جانشین اس کے بنائے ہوئے قوانین میں ردوبدل کرے۔ یہ بڑی عجیب دلیل ہے جو قرآن نے دی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اس لیے آپ پورے بھروسے سے اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

---

❶ اور اس کے بعد تم اس خدا (کے اٹل قوانین کے غیر متبدل نتائج) پر کامل بھروسہ رکھو' جو ہمیشہ زندہ ہے' کبھی مرنے والا نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 828-827)۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک ارض وسما کی کیفیت

اسی سلسلے میں اب اگلی آیت میں ہے کہ **اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۛ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا** (25:59)۔اس خارجی کائنات کوارض اور سماوات کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے' پستیاں اور بلندیاں کہتا ہے۔کہنے کو تو اس نے سما اور ارض کہا ہے' بلندی اور پستی خود ہی کہا ہے۔دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ کائنات میں یہ جو کرّے تمہیں نظر آتے ہیں' یا جو کائنات کے اندر موجود ہیں انہیں تو ہم نے بلند اور پست کہا ہے۔بظاہر تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ بلند بلند ہے اور پست پست ہے۔لیکن یہ بڑی عجیب چیز ہے۔اس میں کہا کہ یہ بلند اور پست ایک Relative Term (اضافی چیز) ہے۔ہر بلندی کی ایک پستی ہوتی ہے اور وہ پستی اپنے سے نیچے والے کی بلندی ہوتی ہے۔ہر سما کی ایک ارض ہوتی ہے' قرآن نے کہا ہوا ہے۔تو یہ جو کرّے اس طرح سے خلا کی پہنائیوں میں تیر رہے ہیں' ان کی صورت یہ ہے کہ اگر ایک اونچا ہے اور دوسرا اس سے نیچے ہے تو وہ اس کی ارض بن جاتا ہے اور یہی ارض جو ہے اپنے نیچے والے کی سما ہو جاتا ہے۔اس لیے بھی اس نے ان کو ہر سما کے لیے ایک ارض کہا ہے' ہر ارض کے لیے ایک سما کہا ہے۔ارض وسماوات کے متعلق تو اس نے یہ کہا ہے۔

کائنات کی ابتدا کے سلسلے میں انسانی عقل وشعور جواب دینے سے عاجز ہے

جہاں تک اس کائنات کی تخلیق کی ابتدا کا سوال ہے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی تو یہ وہ سوال ہے جہاں فکرِ انسانی کے لیے حیرت کے سوا کچھ نہیں۔سائنس آج بھی اتنی ترقی کر گئی ہے' ٹھیک ہے' اس سے آگے بھی جتنا جی چاہے' ترقی کرے' یہ چیز سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی کہ ابتداءً اس کا وجود کیسے عمل میں آ گیا۔جسے Nothingness کہتے ہیں' جسے عدم کہتے ہیں' یعنی کچھ موجود نہیں' اس سے ایک شے وجود میں کیسے آ گئی' اس لیے کہ سائنس تو یہی کہتی ہے کہ کچھ موجود ہو' اس میں کوئی تبدیلیاں پیدا کر کے کوئی نئی چیز بن سکتی ہے۔یہ خلق ہوتا ہے۔اس کے معنی ہی یہ ہوتا ہے کہ مناسب Propotion (تناسب) سے مختلف چیزوں کو ملا کے' ایک نئی چیز بنا لینا۔سائنس یہیں تک ہی ہے' خواہ ابتدا کے لیے یہ انرجی (Energy) تک کیوں نہ پہنچ جائے لیکن انرجی کو بھی ان کو موجود ماننا پڑتا ہے۔سوال تو یہ ہے کہ یہ انرجی کہاں سے آ گئی۔چلے جایئے پیچھے' جتنا جی چاہے پیچھے چلے جایئے' کوئی مقام تو ایسا آئے گا کہ جس کے پیچھے آپ کو ماننا پڑے گا کہ کچھ نہیں تھا اور یہ وجود میں آ گئی۔یہ ہے وہ مقام جہاں سب سے بڑا سائنسدان یہی کہتا ہے کہ ہم اس مقام پہ وہیں ہیں جہاں پہلے دور کا جاہل انسان تھا کہ یہ جو ابتدائی وجود ہے وہ نیست سے' عدم سے' کیسے پیدا ہو گیا' کیسے وہ وجود میں آ گیا اور یہ ہے جہاں قرآن نے **بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (2:117) کہا ہے' جہاں **فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (12:101) کہا ہے یعنی عدم سے وجود میں لانے والا۔آگے خالق

آ تا ہے اور وہاں یہ کہا ہے کہ وہاں تم اتنا ہی سمجھ سکتے ہو کہ **اَمْـرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ** (19:35) وہ اس کا عالم امر ہے' وہ ایک ارادہ ہوتا ہے اور اس ارادے کے ساتھ ہی وہ شے اپنی ابتدائی شکل کے اندر وجود میں آ جاتی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہر بڑے سے بڑے سائنٹسٹ کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ ابتداءً کوئی شے عدم سے وجود میں آ جاتی ہے' ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس طرح آ جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس شے کو وجود میں لانے والے کو تسلیم کرنا پڑتا ہے' ماننا پڑتا ہے۔ خدا پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ یہ خود بخود یعنی By chance (اتفاقیہ) تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ جو اس میں ابتدائی چیز ہے آپ دیکھیے کہ وہ ایک شے عدم سے وجود میں آتی ہے' پہلے سے موجود جو اشیاء ہیں ان میں کوئی دوسری شے نہیں بنتی۔ آگے چل کے پھر یہ جو سلسلہ ہے وہ جاری ہو جاتا ہے اور پھر جاری رہتا ہے۔ وہ جو پہلی چیز ہے اس کے لیے اس نے یہ کہا ہے کہ وہ جو کائنات کو وجود میں لایا' ابتدا تو اس کی یہ ہے کہ عدم سے وجود کے اندر وہ پہلا ابتدائی ہیولا (ہیولیٰ) جسے آپ کہہ لیجیے' انرجی کہہ لیجیے' وہ تو وجود میں آ گئی۔ آج کی سائنس بھی یہ بتاتی ہے کہ پھر آہستہ آہستہ مختلف Stages (مراحل) سے گزرتی ہوئی' مختلف منازل سے گزرتی ہوئی' اس نے یہ مختلف شکلیں اختیار کیں۔

کائنات کی ابتدا ایک ہیولیٰ سے ہوئی

یہ جو ہماری موجودہ کائنات ہے' یہ پہلے ہی ''کن'' (19:35) سے اسی قسم کی نہیں بن گئی تھی بلکہ پہلے اس کا ابتدائی ہیولیٰ وجود میں آیا اور پھر وہ مختلف منازل میں سے بتدریج گزرتی ہوئی' پہلو بدلتی ہوئی جسے تبدل وتحول کہتے ہیں' اس طرح سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی' آہستہ آہستہ اس نے یہ شکل اختیار کی۔ یہ ہے وہ چیز۔ قرآن میں جسے سِتَّة ایام کہا گیا ہے تو اس میں ایام کے معنی یہ چوبیس گھنٹے کا دن ہی نہیں ہے۔ اس سے مراد عربی زبان کے اندر منزل' پیریڈ' Era' زمانہ' عہد ہے۔ ان میں سے ہر چیز کے لیے ان عربوں کے ہاں یوم کا لفظ آتا ہے۔ جہاں بھی آپ ٹائم کا کوئی بھی Concept (تصور) لیں گے' ان کے ہاں اس کے لیے یوم کا لفظ آئے گا۔ قرآن نے بتایا یہ ہے کہ یہ کائنات پہلے ہی دن اس شکل میں وجود میں نہیں آ گئی تھی' ابتدائی ہیولیٰ سے' آہستہ آہستہ' منزل بمنزل' بتدریج' ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی یہ اس شکل کے اندر آئی۔

موجودہ کائنات لحہ بہ لحہ پھیل بھی رہی ہے اور سنورتی بھی جا رہی ہے

یہ کائنات اب بھی مکمل نہیں ہوئی بلکہ اس میں اب بھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں' اب بھی یہ اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ آگے چل کر ابھی اس نے کیا ہو جانا ہے۔ قرآن میں یہ ہے کہ وہ اس میں اضافہ بھی کرتا رہتا ہے اور اسے سنوارتا بھی رہتا ہے۔ اس طرح سے یہ مختلف مراحل ومنازل سے گزرتی ہوئی اور آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ متعدد ایام یا ادوار سِتَّةِ اَيَّـامٍ کہلاتے ہیں۔ اس کے

فوراً بعد کہا کہ **ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ** (25:59)۔اس آیت کے عام ترجمے کے اعتبار سے تو اپنے ہاں آپ پھر دیکھیں گے کہ ''پھر وہ خدا عرش پہ بیٹھ گیا'' یعنی اس نے یہ کچھ بنالیا اور بنانے کے بعد پھر وہ فارغ ہوگیا اور عرش پہ بیٹھ گیا۔اب وہ عرش پہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہ کائنات نیچے جارہی ہے۔کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہم عربوں سے **اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ** کے معنی پوچھ لیتے۔میں نے کہا ہے کہ یہ ساری الجھنیں ان ترجموں نے پیدا کردی ہیں۔

ہمارے ہاں کے مفسرین کے نزدیک ''عرش'' کی کیفیت

بقول ہمارے ہاں کے مفسرین کے عرش تخت کو کہتے ہیں۔تخت اس طرح سے بنا ہوا ہوتا ہے۔عام تخت چھوٹے ہوتے ہیں' خدا کا تخت بہت بڑا ہوتا ہے۔فرشتے اس کو اٹھائے ہوئے ہیں اور اگر وہ روایات میں لیں تو پھر تو پوچھو ہی نہیں کہ پھر وہ تخت کہاں بناتے ہیں' کیسے بناتے ہیں۔آپ کو پتہ ہے کہ یہ ترمذی کی حدیث ہے کہ عرش کے متعلق پوچھا گیا کہ یہ کیا ہے۔نظر آرہا ہے کہ یہ حدیث حضور ﷺ کی تو نہیں ہوسکتی۔یہ ہمارے ہاں کے مفسر آسمان کو شیشے کا ڈل کہتے ہیں۔اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے کہا کہ یہ ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے پھر اس کے بعد دوسرے آسمان اور تیسرے میں ہے' اس طرح سے چھ آسمان ہیں' ان کے اوپر ایک سمندر ہے' اُس سمندر کی گہرائی بھی پانچ سو سال کے فاصلے کی ہے۔اس سمندر کے اندر چھ پہاڑی بکرے کھڑے ہیں۔وہ اتنے اتنے بڑے ہیں کہ سمندر کے اندر' یہ سمندر جو پانچ سو سال کی گہرائی کا ہے' اس کا پانی ان کے گھٹنوں تک آتا ہے تو اس کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ٹکا ہوا ہے۔

عرش کے معنی کائنات کا مرکزی کنٹرول ہے

آپ فرمایئے کہ اب آپ کے ہاں کی یہ روایات میں ہیں۔آپ تو ہنس لیتے ہیں۔پوچھیے دنیا کے سامنے جب ہم یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں' کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو آپ غور کیجیے کہ دنیا اس کے متعلق کیا کہتی ہے اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ نہیں صاحب! وہ حضور ﷺ عالم الناس' علم کی اتنی بلندیوں کے اوپر تھے' وہ تو یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے' تو ایسا کہنے والے کو ملحد اور بے دین اور کافر اور نامعلوم کیا کیا بنایا جاتا ہے۔بہرحال میں **ثم استویٰ علی العرش** کہہ رہا تھا۔جب ہم بھی کہتے ہیں کہ وہ تخت نشین ہوگیا' اس کا تختہ الٹ گیا' تو وہ سچ مچ اس قسم کا کوئی تخت پوش نہیں ہوتا کہ جو یوں الٹ جاتا ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں ''اقتدار چھن گیا۔'' عرب اسے صاحبِ اقتدار کہتے ہیں' وہ بھی اقتدار کے لیے عرش کا لفظ استعمال کرتے تھے۔وہ صاحبِ اقتدار کہتے تھے۔**ثم استویٰ علی العرش** کے معنی کسی تخت کے اوپر بیٹھ جانے کے نہیں ہیں' بلکہ یہ ہے کہ کائنات کا مرکزی کنٹرول اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔اب یہ کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے۔یہ کارگہ کائنات اس قدر محیر العقول ہے کہ یہ کسی کے ذہن میں ہی نہیں آسکتا اور جس نظم وضبط کے ساتھ یہ چل رہا ہے

وہ بھی بڑا محیر العقول ہے۔ بڑے بڑے سائنٹسٹ اس کا ایک حصہ بھی نہیں پا سکے۔ نیوٹن [1] کہتا ہے کہ ''ہم علم کے سمندر کے کنارے پہ بچوں کی طرح کوڑیاں چن رہے ہیں''۔ اتنا بڑا سائنٹسٹ ہے اس کی کیفیت یہ ہے۔ یہ کارگہ کائنات اس نظم وضبط کے ساتھ جو چل رہا ہے تو اس کے پیچھے ایک قوت ہے' اقتدار ہے' جو اس کو اس طرح سے چلا آرہا ہے۔ ذرا سا اس کنٹرول کے اندر Relaxation (نرمی و تخفیف) ہو جائے' ڈھیل پیدا ہو جائے' تو پوچھو نہیں کہ یہ سارا کائنات کا سلسلہ آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

اس قدر محیر العقول سلسلہ کائنات پر کنٹرول کا مالک ہونے کے باوجود وہ الرحمٰن ہے

یہ **استویٰ علی العرش** کیا چیز ہے' جس کا کنٹرول اس نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا ہے؟ وہ کون ہے جس نے یہ لیا؟ وہ ہے الرحمٰن۔ اب یہ لفظ یہاں (25:59) میں عجیب چیز ہے۔ اب یہی چیز ہے کہ الرحمٰن ہے کیا؟ ہے کون؟ یہاں خاص طور پہ الرحمٰن کیوں کہا گیا؟ بات تو اس نے کہی کہ **فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا** (25:59) اس کی بابت اس سے پوچھ' جسے اس کا علم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ علم تو وحی کے ذریعے سے ہی مل سکتا تھا' تو یہی کہا گیا ہے کہ یہ جو صاحب وحی ہے اس سے پوچھ یعنی وحی خداوندی سے ہی پوچھ' خود خدا سے ہی پوچھ۔ جب وہی جو خداوندی کا محور ہے' اس سے پوچھا جائے گا تو وہ تو وحی سے ہی پوچھنے کی بات ہوگی' **فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا** (25:59) جس کو اس کی خبر ہے اس سے پوچھ کہ الرحمٰن کیا ہے اور پھر وہ خبر والی بات جو میں نے عرض کیا ہے وہ تو وحی کے ذریعے ہے' وحی کو خود بتانا ہوگا کہ یہ الرحمٰن کیا ہے اور وحی نے واقعی بتایا ہے کہ الرحمٰن کیا ہے۔ سوال تو یہی ہے کہ اس نے وحی کو سمجھنے کا جو طریق بتایا ہے' اس سے سمجھا جائے تو بات سمجھ میں آئے گی کہ الرحمٰن کیا ہے۔ کہا ہے کہ اس سے پوچھ جس کو اس کی خبر ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) تو پوچھنے کے لیے اور ہی کچھ کہتا ہے:

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

(بالِ جبریل)

''پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی'' یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ فطرت کی ہر شے صاحب منزل ہوتی ہے' صحیح راستے پہ جاتی ہے اس لیے اس سے پوچھ۔ وہ کہتا ہے کہ **فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا** (25:59)۔ پوچھ اس سے [2]۔ بات غور طلب ہوگئی جس میں وہ خود کہتا ہے کہ پوچھ اس سے کہ جس کو اس کی خبر ہے۔ وحی سے پوچھ' صاحبِ وحی سے پوچھ۔ لفظ رحمٰن یوں تو ہر سورۃ [3] کی ابتدا میں جسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہیں'

---

[1] Newton, Sir Isaac(1642-1727)

[2] جو وحیِ خداوندی کی روشنی میں' عقل وبصیرت سے کام لیتے ہوئے اسرار و رموزِ کائنات سے باخبر ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔828)۔

[3] سوائے سورۃ التوبہ۔

آیا ہے' سورۃ فاتحہ کی ابتدا بھی اس سے ہوتی ہے: **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** (1:1-2) اس میں رحمٰن اور رحیم ❶ دونوں آتے ہیں۔ آپ ترجمہ دیکھیے: رحیم مہربان' رحمٰن بڑا مہربان۔ اس سے کیا بات سمجھ میں آئی؟ بات کچھ ایسی تھی جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ **الرَّحْمٰنِ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا** ❷ (25:59) اس الرحمٰن سے پوچھ' پھر بات سمجھ میں آئے گی۔ یہاں بات سمجھ میں یہ آئی کہ وہ رحم کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کا ذکرِ خیر اور ان کی خدمات

عزیزانِ من! میں ہر بار کہا کرتا ہوں کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا حضرتِ اسماعیل علیہ السلام تھا۔ اس سے چھوٹے اسحٰق علیہ السلام تھے۔ مشیّت کے پروگرام کے مطابق' شام اور فلسطین کے سبزہ زار' اور وہاں کی عظیم الشان مملکت' تو اس چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے سپرد کر دی گئی اور حضرتِ اسماعیل علیہ السلام' جو بڑے بیٹے تھے' انہیں اس وادی غیر ذی زرع میں بسا دیا کہ جہاں سبزی کا بھی نام نہ تھا' روئیدگی کا بھی نام نہیں تھا' کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا۔ یہاں بسا دیا اور اس سارے دوران میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ بنی اسرائیل تھے' جو حضرتِ اسحٰق علیہ السلام کے بعد آئے' حضرتِ یعقوب علیہ السلام کی اولاد کہلائے۔ بنی اسرائیل میں تو شوکت داؤدی اور سطوت سلیمانی جیسی چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ وہ قوم بڑی بلندیوں پر پہنچی۔ یہ جو عرب میں قومِ اسماعیل علیہ السلام ہے' یہاں جو مکے کے اردگرد بس گئی' ان کی ویسے کوئی تاریخ ہی نہیں ملتی۔ نہ ان میں حکومت آئی' نہ کوئی مملکت ملی۔

عربی زبان کی وسعت و کیفیت کا تذکرہ

عجیب چیز ہوئی کہ انہیں یعنی قوم اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسا دیا۔ پھر کیا ہوا؟ یہ کہ اس سارے دوران میں' جو دو ہزار سال سے بھی زیادہ کا عرصہ گزرا ہے' یہ یہاں کیا کرتے رہے؟ ایک ہی چیز نظر آتی ہے کہ یہ ایسی زبان بناتے رہے جو قرآن کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اس زبان کے متعلق آپ یورپ کے مستشرقین سے پوچھیے' جنہوں نے علم الالسنہ پر تحقیق کی ہے۔ اُن میں ایک رچرڈ مورس بک (Richard Maurice Bucke) بھی ہے۔ وہ اس کے متعلق لکھتا ہے۔ ان لوگوں نے جتنی تحقیقات کی ہیں' ہم نے اتنی تحقیق نہیں کی ہے۔ اس نے اس دور کی دنیا بھر کی ہم عصر زبانوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ اس کے ہزارویں کیا دس ہزارویں حصے کے برابر دنیا

---

❶ رحمٰن اور رحیم کی مکمل تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الفاتحۃ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔ 74 تا 77' 104 تا 116)

❷ اگر تُو خدائے رحمٰن کے نظامِ ربوبیت کے متعلق فی الواقعہ کچھ جاننا چاہتا ہے تو کسی ایسے شخص سے پوچھ جو (وحی خداوندی کی روشنی میں' عقل و بصیرت سے کام لیتے ہوئے' اسرار و رموزِ کائنات سے) باخبر رہتا ہے۔ نیز جو کچھ تجھے مانگنا ہے' اس خدائے رحمٰن سے مانگ جو جانتا ہے کہ کس شے کو اپنی نشوونما کے لیے کس کس سامان کی ضرورت ہے (55:29)۔ (تمہاری ہر مانگ اس کے نظام کی طرف سے پوری ہوتی۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 828)۔

کی کوئی زبان نہیں پہنچ سکتی جو عربوں کی زبان ہے۔ وہ تو تحقیق ہی عجیب وغریب قسم سے کرتے ہیں۔ وہ تو زبانوں سے قوموں کی تہذیب' تمدن' تخیلات اور تصورات' ان تمام کو' گنا دیتے ہیں۔ ❶ انہوں نے اس سے یہ کیا ہے لیکن میں تو صرف زبان کی بات کہہ رہا تھا کہ عربوں نے اس سارے دوران میں اپنی زبان کو اس قدر جلا دی کہ وہ اپنے آپ کو بجا طور پر' عرب (یعنی فصیح البیان) اور دوسروں کو عجم (یعنی گونگے) کہا کرتے تھے یعنی یہ ایک زبان بنانے کے لیے لگے رہے۔ اصل میں اس قرآنِ کریم کو دنیا میں نازل کرنے کی' دنیا کو دینے کی' تیاریاں ہو رہی تھیں اور یہ تو بہرحال زبان میں ہی دیا جانا تھا تو گویا زبان اس کے لیے ایسے چاہیے تھی ❷ اور وہ ❸ مستشرق کہتا ہے کہ کوئی دوسری زبان اس کے ہم پایہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

اس زمانے میں ایک تو عربوں کی زبان کی وسعت ❹ بہت زیادہ تھی جیسے وہ کہتے ہیں کہ اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ ہیں' یہ مرادفات نہیں تھے: اونٹ کہہ لیا تو کیا ہے' شتر کہہ لیا تو کیا ہے۔ بالکل نہیں' عربی زبان میں مرادفات ہوتے ہی نہیں ہیں کہ ایک ہی معنی کے لیے دو لفظ ہوں وہ کہتے ہیں کہ یہ تو زبان کا نقص ہے۔ ہر لفظ میں دوسرے لفظ کے ساتھ کوئی شیڈ کا فرق ہوتا تھا' یہ الفاظ ہم معنی نہیں ہوتے تھے۔ عزیزانِ من! جب تک یہ نہ پڑھا جائے وہ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ بالآخر یہ اونٹ کے لیے اتنے ہزار لفظ کے کیا معنی ہیں اور پھر ایک لفظ کا معنی دوسرے سے نہیں مل رہا تو اس کی ہر ادا' ہر انداز کے لیے کچھ الگ الگ چیزیں ہوں گی۔ وہ تو

---

❶ ماہرین علم الالسنہ کے پیش کردہ نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر تاریخ کے کسی خاص دور میں کسی قوم کی ذہنی سطح کا اندازہ لگانا ہو تو دیکھنا یہ چاہیے کہ اس دور میں اس قوم کی زبان میں کتنے الفاظ ایسے تھے جو تصورات (Concepts) کے مظہر تھے۔

❷ جو ایک طرف ایسی سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے مستفید ہو سکیں اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُرمعنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔ (حوالہ: جیولین ہکسلے: نیویارک ٹائمز 22 اگست 1952)

❸ یہ اشارہ Julian Huxley(1887-1975) کی طرف ہے۔

❹ اس ضمن میں ایک تحقیق یہ بھی ہے۔ ہندی' یورپی (Indo-European) زبانوں میں جس قدر الفاظ مروّج ہیں ان کے تصوراتی مشتقاق (Root- Concepts) کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک سو اکیس (121) تک پہنچتی ہے اور تو اور جس زمانے میں سنسکرت ایک زندہ زبان تھی' اور سورج اور آگ کو دیوتا مانا جاتا تھا اُس زمانے میں اس زبان میں سورج کے لیے کل سینتیس (37) الفاظ تھے اور آگ کے لیے پینتیس (35)۔ اس کے برعکس عربوں کو دیکھیے تو ان کے ہاں شہد کے لیے اسی (80) الفاظ' سانپ کے لیے دو سو (200)' شیر کے لیے پانچ سو (500)' تلوار کے لیے ایک ہزار (1000) اور اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ موجود تھے (حوالہ: پرویزؒ (1960)۔ لغات القرآن جلد اول۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص۔ 5)۔

بڑی وسیع چیز ہے' یہ ایسی Scientific Language (سائنسی زبان) ہے کہ ساری زبان میں جو Roots ہیں جنہیں مادہ [1] کہا جاتا ہے' وہ ہر لفظ کی جڑ ہے۔ یہ مادے عام طور پر بڑے تین حرفی ہوتے ہیں' تین سے زیادہ حروف والے مادے نسبتاً کم استعمال ہوتے ہیں اور پھر آگے چلتے ہیں۔ اس مادے سے الفاظ بنتے ہیں۔ الفاظ بھی یہ نہیں ہیں کہ انہوں نے کچھ بڑھا دیا اور ہم نے دیکھ لیا۔ دراصل یہ الفاظ Scientific (سائنسی) طریقے سے بنتے ہیں۔ اسے وہ اوزان' وزن یا ابواب [2] کہتے ہیں۔ وزن ان کے ہاں خاص ہوتے ہیں۔ اب یہ کیا چیز ہے؟ ایک ہی مادے سے' ایک وزن کے اوپر جتنے لفظ آئیں گے' ان کے اور معنی ہوں گے اور اسی مادے سے دوسرے وزن کے اوپر' اگر کوئی لفظ بنے گا' تو اس کے اور معنی ہوں گے لیکن شیڈ وہی رہے گا جو اس مادے (Root) کے اندر موجود ہے۔ بہرحال چند لفظوں میں یہ سمجھانا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

لغت کے انداز میں رب العلمین' الرحمٰن اور الرحیم کا مفہوم

میں یہاں رحمٰن کے متعلق بتا رہا ہوں رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (1:1-2)۔ اس میں رحمٰن اور رحیم کے الفاظ آئے ہیں۔ ان دونوں کا مادہ تو ''ر ح م'' ہے۔ یہ وہی ہے جہاں سے رحم آیا۔ وہی ہے جس کے معنی ہیں ''اس قسم کی پرورش جو عام اسباب وغیرہ سے الگ ہو'' رحم مادر کے اندر بچے کی پرورش' وہی بچہ جب چند مہینوں کے بعد اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی پرورش کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس سے جو انداز اس کا رحمِ مادر کے اندر ہوتا ہے فوراً بدل جاتا ہے۔ مادہ دونوں کا ایک ہے۔ اب لیجیے ان کی زبان۔ ان کی زبان میں ایک وزن ہے یا مادہ ہے۔ فَعِيْلٌ کے وزن کے اوپر کسی مادے سے جو لفظ بھی بنے گا اس کے معنی ہوں گے ''بتدریج وہ کام ہونا' رفتہ رفتہ ہونا' التزاماً ہونا' اور پھر ہوتے چلے جانا۔'' فَعِيْلٌ کے وزن کے اوپر علیم اور کریم اور یہ جتنے ایسے آئیں گے اس میں یہ چیز پائی جائے گی۔

---

1. عربی زبان میں ہر فعل (Verb) مادّہ (Root) سے بنتا ہے۔ مادّہ (Root) ان اصلی حروف کو کہتے ہیں جن کے بغیر فعل (Verb) کی پہلی شکل وجود میں نہ آ سکے۔ فعل کا مادہ کبھی تین حروف کا ہوتا ہے اور کبھی چار کا۔ اسماء کے مادّہ میں پانچ اور چھ حروف بھی ہوتے ہیں۔ تین حرفی مادّہ کو ثلاثی کہتے ہیں۔ یہ ثلاثۃ سے بنا ہے جس کے معنی ''تین'' ہیں۔ عربی زبان میں زیادہ تر ثلاثی افعال ہیں۔ چار حرفی مادّہ کو رباعی کہتے ہیں۔ یہ اربعۃ سے بنا ہے جس کے معنی ''چار'' ہیں۔ عربی زبان میں رباعی افعال کم استعمال ہوتے ہیں (پرویزؒ: لغات القرآن' جلد اوّل' 1960ء' ص۔ 46)۔

2. ہر نئی شکل جو فعل ماضی اور اس کے فعل مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں (زبر' زیر' پیش) سے مل کر بنے' ایک ''باب'' کہلاتی ہے۔ ماضی اور مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں کے اعتبار سے ثلاثی مجرد کے چھ ابواب مستعمل ہیں۔ ثلاثی مجرد کے علاوہ ایسے افعال جن میں اصلی حروف تو تین ہی ہوں' لیکن ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں ثلاثی مزید فیہ کہلاتے ہیں۔ ان کے مختلف ابواب مختلف اوزان پر آتے ہیں جن میں بیشتر استعمال ہونے والے ابواب قرآنِ مجید میں بارہ ہیں۔ مثلاً باب تَفْعِيْلٌ ہے۔ اس باب سے مصدر تَفْعِيْلٌ کے وزن پر آئے۔ جیسے تَكْرِيْمٌ' تَنْزِيْلٌ (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' جلد اوّل' 1960ء' ص۔ 48-46)۔

اس آیت کے اندر رحیم آیا۔ رحیم کے معنی ہوئے ''بتدریج' مسلسل' التزاماً' درجہ بدرجہ' پرورش بہم پہنچانے والا۔'' یعنی ایک سلسلے میں بتدریج۔ رحمِ مادر کے اندر ایک انداز سے پرورش ہوتی ہے' اس میں اس بچے کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ ''ر ح م'' کا وزن ہے اور اس سے فعلان کا وزن ہے۔ اس فعلان وزن پہ جو لفظ بنے گا' اسی مادے سے اس کے معنی ہوں گے ''وہی کام ہنگامی طور پر' یکلخت ہو جانا۔'' رحمٰن جو ہے فعلان کے وزن پہ ہے' رحیم فَعِیلٌ کے وزن پہ ہے' دونوں میں جو پرورش کے معنی ہیں وہ بنیادی ہیں' وہ موجود ہیں: رحیم اس طرح کی پرورش' جو مسلسل ہوتی چلی جائے' ایک انداز سے التزاماً ہوتی چلی جائے' اور رحمٰن پرورش کا وہ انداز جو پچھلے انداز سے بدلا ہوا ہو اور ہنگامی طور پر یکلخت وجود میں آ جائے۔ عزیزانِ من! رحم مادر کے اندر جو بچے کی پرورش ہوتی ہے ایک مسلسل انداز سے ہوتی ہے' جونہی وہ بچہ پیدائش کے بعد اس دنیا میں آیا اسی وقت جو پہلا سارا انداز ہے یہ بدل جاتا ہے۔ وہاں رحیم تھا' یہاں یہ رحمٰن آ گیا۔ غور فرمایا یہ زبان کیا ہے!

دنیا کی کوئی زبان قرآنِ حکیم کے الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکتی

غور فرمایا کہ پھر اس زبان میں قرآن کیوں اترا اور غور فرمایا کہ اس زبان سے پھر الفاظ کا جو انتخاب کیا ہے وہ خدا نے انتخاب کیا ہے۔ ان کی بنائی ہوئی زبان' انتخاب خدا کا! وہ قرآن نہ بنتا تو پھر کیوں نہ بنتا! اس سے پہلے تو یہ چیزیں یونہی ذہنی سی ہی ذہن میں آتی تھیں کہ ہاں اچھا رحیم یہ ہوتا ہے' رحمٰن وہ ہوتا ہے۔ یہ جو میں بار بار کہتا ہوں کہ ترجموں نے جو بات کی ہے تو یہ ان ترجمے کرنے والوں کا نقص نہیں ہے بلکہ ہماری زبان کا نقص ہے۔ ہماری زبان میں الفاظ ہی نہیں ہیں اور ہماری ہی کیا' دنیا کی کسی زبان میں الفاظ نہیں ہیں جو قرآن کے الفاظ کے Exact (بو بہو) معنی دے دیں' مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اب آپ نے سمجھا کہ میں نے قرآنِ کریم کا ترجمہ کیوں نہیں کیا۔ میں نے ''مفہوم القرآن'' لکھا ہے کیونکہ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا اور پھر جو قرآن نے کہا کہ جوں جوں کائناتی حقائق اور انسان کا علم وسیع ہوتا چلا جائے گا' قرآن کی اصطلاحوں کے مفہوم سمجھ میں آتے چلے جائیں گے' حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے: سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ (41:53) ہماری یہ آیات' یہ نشانیاں جو انفس و آفاق میں ہیں' جوں جوں چشم بینا دیکھتی جائے گی' قرآن کے حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ رحمٰن و رحیم کا فرق اس سے پیشتر ہمارے سامنے صرف لفظی فرق تھا' اس دور میں آ کر ان دونوں کے معنی یوں متمیز ہوئے ہیں' عزیزانِ من! کہ انسان وجد میں آ جاتا ہے۔

سلسلۂ کائنات کی تحقیق اور خدا کی رحمیت

سلسلہ کائنات کے متعلق اس دور کے سائنٹسٹ کی تحقیق یہ ہے کہ ابتداءً ایک جرثومے سے کوئی چیز شروع ہوتی ہے' جیسے زندگی ایک لائف سیل سے شروع ہوتی ہے۔ پھر وہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی' آہستہ آہستہ' منزل بمنزل' آگے بڑھتی ہوئی' شکلیں بدلتی ہوئی'

خاصیتیں بدلتی ہوئی' نئے نئے پیکر اختیار کرتی ہے۔ جیسے یہ پہلا جرثومہ' لائف سیل' آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے' انسانی پیکر میں آ گیا۔ یہ سارا سلسلہ التزاماً ہوتا ہے' مسلسل ہوتا ہے۔ اسے Progressive Evolution (تدریجی ارتقا) کہتے ہیں۔ ان سائنسدانوں کے ہاں ارتقا کے لیے Evolution کا لفظ ہے۔ یہ کسی چیز کا منزل بمنزل اوپر چلتے جانا ہے۔ اسے انگریزی میں Evolution (ارتقا) کہتے ہیں۔ ڈارون [1] نے اس کا تصور دیا تھا۔ پہلے ایک ہی قسم کی Evolution (ارتقا) سمجھی جاتی تھی' ہمارے اس دور میں آ کر یہ آیا کہ نہیں' یہ ایک ہی قسم کی نہیں ہے۔ اس میں ایک قسم تو یہ ہے کہ کوئی چیز Progressively (منزل بمنزل) آگے بڑھتی چلی جاتی ہے' بتدریج ہوتی جاتی ہے' Gradually ہوتی ہے' کڑی سے کڑی ملتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ یہ جو اس طرح سے Gradually, Progressively ہوتی چلی جاتی ہے تو یہ خدا کی رجیمیت ہے' وہ اس طرح سے اس کی نشو ونما کرتا چلا جاتا ہے لیکن ارتقا کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے۔ ایک دوسری بھی ہے۔

لائیڈ مارگن کی تحقیق: فجائی ارتقا

اب اس دور میں آگے چل کر ایک نئی تحقیق ہوئی۔ [2] اس کا امام لائیڈ مارگن (1852-1936)(C.Lloyd Morgan) ہے۔

---

[1] Darwin, Charles Robert (1809-82)۔ اس موضوع پر اس کی کتاب On The Origin of Species بڑی اہم سمجھی جاتی ہے۔ ڈارون نے کہا ہے کہ زندگی نے اپنی ابتدائی نمود نہایت پست سطح سے مختلف انواع (Species) کے ذریعہ کی۔ اس کے بعد ان تمام انواع میں ارتقا کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ارتقا خالصۃً میکانکی قوانین کی رو سے ظہور پذیر ہوا۔ ان قوانین میں طبعی انتخاب (Natural Selection) ماحول کے ساتھ توافق (Adaptibility to Environment) اور بقائے للاصلح (Survival of the Fittest) نمایاں خصوصیت کے حامل ہیں۔ یاد رہے Survival of the Fittest ڈارون کی اصطلاح نہیں ہے بلکہ ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کی ہے۔

[2] انواع (Species) میں بعض اوقات اس طرح تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں کہ ''مطابقت بہ ماحول'' (Adaptation to Environment) کا اصول ان کی کوئی توجیہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی بنیادی تبدیلیوں کو جدید ارتقا کی اصطلاح میں Mutation کہا جاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے علم نباتات میں Sports کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی ایک ہی قسم کے بیجوں سے بعض اوقات بالکل مختلف قسم کے پھول پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس انکشاف کا سہرا پروفیسر لائیڈ مارگن (1852-1936) (Prof.Lloyd Morgan) کے سر ہے جس کے نظریہ فجائی ارتقا (Emergent Evolution) نے ارتقائی سائنس میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نظریہ کی رو سے بعض اوقات' ایک نوع' علت و معلول (Cause and Effect) کی کئی کڑیاں پھاند کر دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ارتقا کا میکانکی قانون منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر مارگن لکھتا ہے: ''اگر یہ پوچھا جائے کہ تم جس چیز کو فجائی (Emergent) کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اس قدر ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے بنے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہے کہ ان کی خصوصیات سے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کبھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ (Emergent Evolution)'' (حوالہ پرویزؒ (2002)۔ انسان نے کیا سوچا؟ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ۔ ص ص 109 تا 110)۔

اس نے کہا کہ ایک Emergent Evolution (فجائی ارتقا) ہوتا ہے' وہ ہنگامی ارتقا ہوتا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ارتقا میں کڑی سے کڑی ملتی ہوئی چلی آتی ہے مگر ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ درمیان کی کڑیاں گم ہیں اور اس میں سے ایک نئی چیز برآمد ہوگئی' یعنی ان کی تحقیق ہی نہیں ہوسکتی کہ وہ درمیان کی کڑیاں گم ہوگئیں اور جو نئی کڑی ہے' وہ کیسے آ گئی۔ وہ تو کڑی سے کڑی ملے تو پتہ چلے۔ یہ اس کے متعلق تحقیق کرتے رہتے ہیں کہ یہ چینج (تبدّل) ہوا اور اس میں سے یہ نئی چیز پیدا ہوئی لیکن جب یہ درمیان کی کڑیاں ہی گم ہوجائیں اور دوسری نئی چیز جو ہو' وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو' تو وہ کہتے ہیں کہ یہ چیز ہوتی ہے مگر ہماری سمجھ میں تو نہیں آتی کہ یہ کیسے ہوتی ہے لیکن Evolution (ارتقا) میں یہ چیز ہورہی ہے اور اس کا نام انہوں نے Emergent Evolution (فجائی ارتقا) رکھا ہے۔ یہ ارتقا کی دوسری قسم ہے۔

سورۃ رحمٰن میں لفظ الرحمٰن کی وضاحت

قرآن نے وہ جو Progressive یا Gradual Evolution یعنی مسلسل چلا آنے والا ارتقا تھا' اس کے لیے تو رحیم کا لفظ استعمال کیا ہے اور جہاں Emergent Evolution (فجائی ارتقا) آتا ہے' وہاں الرحمٰن آجاتا ہے۔ سورۃ رحمٰن جہاں سے شروع ہوتی ہے وہ اس کی بڑی بیّن مثال ہے۔ یہ علمِ انسانی بھی By Evolution (ارتقا سے) آگے بڑھ رہا ہے لیکن اس میں ایک قاعدہ مقرر ہے' ایک سلسلہ مقرر ہے۔ مشاہدہ تجربہ مطالعہ درس وتدریس یہی علم کا سلسلہ ہے۔ انسانی علم اپنی فکر سے' غور وتدبر سے' اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے' کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے' پھر اس کے بعد تجربہ کرتا ہے' پھر اس کے بعد جو اپنا تجربہ ہوتا ہے' اس کا ماحصل آگے منتقل کرتا ہے' نسل بعد نسل یہ چیز ہوتی چلی آتی ہے۔ علم انسانی یہ ارتقائی منازل طے کرتا کرتا آگے آتا ہے۔ علمِ انسانی کا یہی سلسلہ ہے لیکن ایک علم خدا کی طرف سے نبی کو ملتا ہے۔ وہ اس سلسلے کا پیداہ کردہ علم نہیں ہوتا' وہ اس سے یکلخت مختلف ہوتا ہے' اس میں اس کی فکر تجربے مشاہدے مطالعے کو کوئی دخل نہیں ہوتا' یہ ہنگامی طور پہ یعنی Emergent ہوتا ہے' یہ یونہی یک لخت' اچانک اس کو مل جاتا ہے۔ یہ ہے وحی کا سلسلہ۔ یہ وحی کا علم ہے اور کہا گیا ہے کہ **اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ** (55:1-2)۔

قرآنِ حکیم کی فصاحت و بلاغت تو قدم قدم پر غور وفکر کی متقاضی ہے

عزیزانِ من! کیا عرض کروں' پوچھیے نہیں' میں تو پاگل ہوجاتا ہوں' یہ خدا کی صفات ہیں۔ یہاں ہے **اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ** (55:1-2)۔ آپ دیکھ رہے ہیں خدا کا الفاظ کا جو انتخاب ہے وہ خود معجزہ ہے۔ جیسا قرآن نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر سوچا کرو' یونہی نہ آگے بڑھ جایا کرو۔ ہمارے ہاں چونکہ سورۃ رحمٰن کے اندر خاص طور پہ ایک موسیقیت آتی ہے تو وہ پوچھو نہیں کہ قاری کس طرح اسے جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں: کوئی گھروں میں اور کوئی ترنم میں' ہم تو اتنا ہی جانتے تھے۔ پہلے لفظ کے اندر آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن

نے کیا کردیا ہے! کیا بتا دیا ہے! قرآن نے عام علمِ انسانی میں اور وحی کی رو سے جو علم ملتا ہے اس میں ایک لفظ الرحمٰن کہہ کے امتیاز کرکے دکھا دیا۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ **اَلرَّحۡمٰنُ o عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ** (55:1-2) اور **اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡـَٔلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا** (25:59)۔ کہا کہ رحمٰن کیا ہے؟ **فَسۡـَٔلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا** (25:59) پوچھ اس سے جو اس کا واقف ہے' جو اس کا علم رکھتا ہے' جو اس کی خبر رکھتا ہے۔ وہ خدا ہے اس لیے خدا ہی سے پوچھ: **فَسۡـَٔلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا** (25:59)۔

اِس **فَسۡـَٔلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا** (25:59) کے متعلق ایک اور آیت بھی ہے۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ بات میں سے بات ہی خواہ نکلے' تو جی نہیں چاہتا ہے کہ وہ سامنے آجائے اور اسے چھوڑ کر میں آگے بڑھ جاؤں۔ بہرحال ''میر جمع ہیں احباب' حالِ دل کہہ لے'' زندگی کا کیا پتہ ہے' جو ذہن میں ہے' کہہ ہی دینا چاہیے۔ یہ اسی سورۃ الرحمٰن میں ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک بوڑھے ہوتے تھے۔ ان کو سورۃ عبدالرحمٰن کہا کرتے تھے۔ سورۃ الرحمٰن میں 29ویں آیت بڑی اہم آیت ہے: **يَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ‌ؕ كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ** (55:29)۔ ہمارے ہاں اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''سماوات اور ارض میں جو کوئی بھی ہے وہ خدا سے سوال کرتا ہے'' اور **كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ** (55:29) کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''اور خدا ہر آن میں ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔''

ہمارے ہاں کل یوم ھو فی شان کا کیا جانے والا ترجمہ

كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ (55:29) کا عام طور پہ یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''خدا ہر آن میں ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔'' یہ تو خدا کے متعلق تصور صحیح نہیں ہے۔ خدا تو ایسی مکمل ذات ہے' Personality (شخصیت) ہے' اگر اسے آپ Self (ذات) کہنا چاہیں تو وہ Perfection (اکملیت) پہ پہنچا ہوا Self (ذات) ہے۔ بہرحال اس کا وہ وجود' اس کی وہ ذات' مکمل ترین ذات ہے۔ یہ جو Human Personality (انسانی ذات) ہے جو انسان میں ذات ہے' اس ذات کے متعلق سائیکولوجی کی تحقیق اور Definition (تعریف) میں یہ کہتے ہیں کہ Personality is changelessness in change [1] کہ شخصیت کائناتی تغیرات کے اندر ایک

---

[1] ''انسانی ذات' تغیرات کے ہجوم میں عدمِ تغیر کا نام ہے۔'' یہ نکولاس باردیو (Nicholas Bardyaev) کے الفاظ ہیں۔ انسانی ذات اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور کسی کل کا جزو نہیں ہوتی۔ اس باب میں باردیو لکھتا ہے: ''ایک ذات کا تعلق دوسری ذات سے' خواہ وہ ذات' ذاتِ خداوندی ہی کیوں نہ ہو' جزو اور کل کا تعلق نہیں ہوتا۔ ہر ذات اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور کسی دوسری ذات میں مدغم نہیں ہو سکتی...... انسانی ذات کی انفرادیت خود اس فرد سے بلند درجے کی ہوتی ہے...... موت انسان کا خاتمہ نہیں کرتی' وہ صرف خارجی دنیا کے وجود کا خاتمہ کرتی ہے۔ (1)The Divine and the Human (2)Destiny of Man۔ انسانی ذات کی خصوصیت کے بارے میں برگسان کے الفاظ یہ ہیں: We Change without Ceasing یعنی ہم میں تغیر آتا ہے معدوم ہوئے بغیر (ماخوذ از پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ طلوعِ اسلام ٹرسٹ' 2002' ص ص 104 تا 105)۔

ایسی شے ہے جوان سے اثر پذیر نہیں ہوتی' ہمیشہ غیر متغیر رہتی ہے۔Selfیا ذات کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی نہیں آتی۔

''عالمِ تغیرات میں تغیر نا آشنا انسانی ذات'' کی کیفیت

پچاس برس پہلے بھی میں نے کسی سے جو کچھ کہا تھا آج بھی میں یہ کہتا ہوں کہ ''ہاں' میں نے کہا تھا'' حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے فزیکل جسم کے متعلق پہلے تحقیق یہ تھی کہ ہر تیسرے سال اس جسم کا کوئی ذرہ بھی جو پہلا ہے باقی نہیں رہتا' بالکل نیا ہو جاتا ہے' اور اب تو یہ کہتے ہیں کہ یہ دنوں میں بدل جاتا ہے' جسم کا کوئی پہلا ذرہ باقی نہیں رہتا۔ جب پہلا باقی نہیں رہتا تو جو آپ کہتے ہیں کہ ''میں نے یہ کہا تھا' میں نے یہ اقرار کیا تھا' میں اس کا ذمہ دار ہوں'' تو وہ جو آپ کا جسم تھا' وہ تو اس دوران میں' پچاس دفعہ بدل گیا ہوا ہے' کم از کم دس بیس دفعہ تو ضرور بدل گیا ہوا ہے' بیس برس کے بعد ہم کہتے ہیں ''تم نے مجھے گالی دی تھی'' اور آپ کو اس کا وہی احساس ہوتا ہے جو اس وقت گالی کا احساس ہوا تھا۔ اس کا احساس بھی نہیں بدلتا۔ حافظہ بدل جائے لیکن جب بھی وہ چیز آپ کے سامنے آئے گی اس کا احساس بھی آئے گا۔ کسی نے اچھی بات کہی تھی تو اس کا خوش کن احساس ہوگا' غصے والی بات ہوگی تو اس وقت بھی ناراضگی کا احساس ہوگا۔ وہ ''میں'' ہے جس کے احساسات عمر کے بدل جانے سے' زمانے کے بدل جانے سے' جسم کے بدل جانے سے بھی نہیں بدلتے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے؟ وہی کہتے ہیں کہ یہ Changlesness in change [1] ہے۔ اس عالمِ تغیرات میں ایسی شے جو تغیر پذیر نہیں ہوتی۔ اسے ذات کہتے ہیں۔ جب انسانی ذات یا سیلف یا Personality کی یہ کیفیت ہے تو خدا کی ذات جو ہے اس کے متعلق یہ چیز سمجھنا کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (55:29) وہ ہر آن میں ایک نئی شان میں ہوتی ہے' یہ تو بڑا ہی غلط تصور ہے۔ خدا ہر آن میں ایک نئی شان میں نہیں ہوتا۔ اس کی تو وحی ہے' اس کے قانون غیر متبدل ہیں' وہ خود تغیر پذیر کیوں ہوگا۔ یہ بات نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم کے لفظ یسئلہ کا قرآنی مفہوم: احتیاج اور ضرورت

یسئلہ کا ترجمہ بھی سوال کرنا نہیں ہوتا۔ عربی زبان میں ''سوال'' کے معنی ہی احتیاج ہوتا ہے' ضرورت ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی سوال کرتا ہے' ہمارے ہاں بھی یہ معنی ایک سوال کے ہیں۔ ایک تو سوال وہ ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے کچھ پوچھتے ہیں۔ ایک سوالی آتا ہے اصل میں جو آپ بھی پوچھتے ہیں تو آپ کو بھی علم کی احتیاج ہوتی ہے' جو آپ مجھ سے کچھ پوچھتے ہیں تو سوال کے معنی بنیادی طور پر احتیاج کے ہوتے ہیں۔ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (55:29) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو شے بھی ہے' وہ اپنی نشوونما کے لیے خدا کی پرورش کی محتاج ہے۔ یسئلہ ہے یعنی اس کی محتاج ہے۔ اب کائنات کی اشیا کی اگر یہ صورت ہو کہ ہر ایک کی ایک

---

[1] عالمِ تغیرات میں تغیر نا آشنا۔

ہی ضرورت ہو اور مستقل طور پہ وہی ضرورت رہے تو اس کا پورا کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ایک ہی حالت میں اس نے رہنا ہے' ایک ہی اس کی ضرورت رہنی ہے لیکن یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آن میں وہ چیز جو ہے اس کی احتیاج' اس کی ضرورت بدلتی ہے۔رحم کے اندر جنین کی ضرورتیں اور ہیں اور پیدا ہونے کے فوری بعد اس کی ضرورت بدلتی ہے۔وہ اب دودھ کو دودھ کی شکل میں پینا چاہتا ہے۔اس نے یہ سرچشمے دودھ کے موجود کر دیئے۔ بچہ ذرا اور بڑا ہوتا ہے تو کچھ دانت نکلتے ہیں۔دانت کے ساتھ وہ دودھ والی چیز بھی ختم کرنا پڑتی ہے' کھانے والی چیز دینی پڑتی ہے۔معدہ نرم ہے اور نرم معدے کے لیے نرم غذا دینی پڑتی ہے۔یہ جو معدے اور دودھ میں تعلق ہے کیا کبھی آپ نے اس پہ غور نہیں کیا؟ ماں کا شروع میں جو دودھ ہے جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے اندر جو غذائیت ہے وہ شاید پانچ پرسنٹ بھی نہیں ہوتی' باقی پانی ہوتا ہے۔اس کا معدہ اس سے زیادہ ہضم نہیں کرسکتا۔جوں جوں وہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے' عزیزانِ من! اس کے اندر کی مشینری خود بخود پانی کم کرتی چلی جاتی ہے' غذائیت بڑھاتی جاتی ہے۔''آ جیہڑا تسی کیندے او نا پئی ذرا کھانگڑ میںھ دا دودھ دئیں میاں' او ہوندا کی اے؟ وہ تو گوالا آپ کا لے آتا ہے۔او جیہدے وچ تے اوہ نلکے والی پائی ہوندی ہیگی اے۔او پروہنے آ گئے گھر تے ماں نے کیا' پئی چا بنا کے لے آ۔او آ کے کہن لگی نو ح: دودھ تے ہے نئیں۔او کہن لگی: اوکوئی گل نئیں' او دیگچی لے آ' تے اوہدے اچ نلکے والی چوہ لے' تھوڑا جیا پانی پاتے' دودھ بنا لے۔'' ❶ اندر ایک مشینری ہے۔اس مشینری کے اندر' عزیزانِ من! ہوتا کیا ہے؟ آپ تو قدم قدم پہ سوچیے۔جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے' اس میں غذائیت ہضم کرنے کی صلاحیت زیادہ آتی جاتی ہے اور خود بخود اس دودھ میں پانی کم ہوتا جاتا ہے' غذائیت بڑھتی چلی جاتی ہے' دودھ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے' خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔یہ جواب ہم Artificial (مصنوعی) دودھ دیتے ہیں' ڈبوں کا دودھ دیتے ہیں' آپ کو پتہ ہے کہ ڈبوں کے دودھ کے اوپر ایک چارٹ ہوتا ہے: تین مہینے کے بچے کے لیے اس کا ایک چمچہ اور چار چمچے پانی کے' چھ مہینے والے کے لیے اس کے دو چمچے اور دو چمچے پانی کے' تو گویا وہ دودھ کے چمچے بڑھتے جاتے ہیں' پانی کم ہوتا چلا جاتا ہے۔دو سال کے لیے یہ چارٹ بنا ہوا ہوتا ہے۔

کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہ چارٹ انہوں نے کہاں سے بنایا ہے؟ ماں کے دودھ کو Examine (جانچ) کر کے انہوں نے یہ چارٹ بنایا ہے۔جس رفتار سے ماں کے دودھ میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے اسی رفتار سے یہ اپنے دودھ کا چارٹ بناتے ہیں کہ بچہ دودھ کو یوں ہضم کرے گا۔انہوں نے تو اس کو دیکھ کے بنالیا ہے' ماں کے دودھ میں یہ تبدیلیاں کس نے پیدا کر دیں؟ دیکھتے ہیں یہ اس کی رحیمیت اور رحمانیت کیا کام کرتی ہے' اور جب وہ بچہ اناج ہضم کرنے کے' کھانے پینے کے' قابل ہو جاتا ہے' دودھ کے چشمے ہی سوکھ جاتے ہیں۔

---

❶ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ بھئی! ذرا کھانگڑ بھینس کا دودھ لانا' یہ ہوتا کیا ہے؟ وہ تو آپ کا گوالا لے آتا ہے۔یہ وہ ہے جس میں نلکے کی ٹونٹی ڈالی ہوتی ہے۔گھر میں مہمان آ گئے تو ماں نے کہا کہ چائے بنالاؤ۔بہو کہنے لگی: (اماں) دودھ نہیں ہے۔اماں نے کہا: کوئی بات نہیں' وہ دیگچی لو اور اس میں نلکے والی دودھ لو۔تھوڑا سا پانی ڈال لو اور دودھ بنالو۔

ہر آن قدم قدم پر بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ہر چیز کی نشو ونما کرنے والی ذاتِ خداوندی

یہ ہے ایک مثال کہ ہر شے کی نشو ونما کا ذمہ تو خدا نے لیا اور اشیا کی صورت یہ ہے کہ ہر آن میں ان کی ضرورتیں بدلتی جاتی ہیں اور وہ ان کی بدلی ہوئی ضرورت کے مطابق دیتا ہے، جو کچھ بھی وہ سامانِ نشو ونما دیتا ہے۔ بات سمجھ میں آ گئی کہ **یَسْـئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (55:29) کائنات میں جو شے بھی ہے، وہ اپنی نشو ونما کے لیے خدا کی محتاج ہے اور ان اشیائے کائنات کی یہ کیفیت ہے کہ **كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ** (55:29) ہر شے ہر آن میں مختلف احتیاج رکھتی ہے اور وہ مختلف ضرورتیں پوری کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے: **كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ** (55:29)۔ اس میں ''ھوَ'' خدا کے لیے نہیں ہے بلکہ کائنات کی چیزوں کے لیے ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ بس انہوں نے ایک دفعہ وہاں سیٹ (Set) کر دیا کہ بس ساری عمر یہی ملتا چلا جائے گا۔ بچے کو اسی قسم کا دودھ اگر ملتا چلا جائے تو بچہ چھ مہینے کے بعد مر جائے۔ یسئله کے معنی، میں نے کہا ہے، ضرورت پوری کرنا ہے، اپنی احتیاج بتانا ہے۔

اب سورہ الفرقان کی اگلی آیت ہے: **وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ ۚ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ** (25:60) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اطاعت کرنی ہے، جھکنا ہے تو رحمٰن کے سامنے جھکیے، اس کی اطاعت کیجیے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے اور کون ہے؟ ان لوگوں کی طرف سے اعتراضات تو یہی ہوتے تھے۔ یہ جو عرب ہیں، ان کے ہاں اللہ کا یا الٰہ کا لفظ موجود تھا۔ یہ الٰہ پھر اپنے بتوں کو بھی کہتے تھے۔ یہ چیزیں تو ان کے ہاں موجود تھیں۔ یہ جو صفات تھیں، یہ ان کا تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، آ ہی نہیں سکتا تھا، اس لیے ان کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ رحمٰن نے کیا کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ **اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا** (25:60) نہیں صاحب! ہم تو اپنے ہی الٰہ کی پرستش کریں گے، تمہارے بتائے ہوئے رحمٰن کی نہیں کریں گے۔ دوسری جگہ قرآن نے کہا ہے کہ ان سے کہو کہ بات ان الفاظ کی نہیں ہے، اسے تم اللہ کہہ کے پکارو، اسے رحمٰن کہہ کے پکارو، اگر ذہن میں تمہارا تصور صحیح ہے تو ان الفاظ سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ اس کے لیے پوچھتے تھے کہ بتاؤ، یہ رحمٰن کون ہے اور وہ یہ تھی چیز کہ قرآن نے کیوں رحیم اور رحمٰن الگ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ رحمٰن ان صفات کا حامل ہے۔ تو کہا کہ لفظ کے ہی تغیر سے ان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر ان کے ہاں جو مروّج لفظ ہے، وہ بول دیجیے تو اس کو تو یہ برداشت کر لیتے ہیں اور اسی خدا کا وہ تصور یا وہ صفت جو تم پیش کر رہے ہو، اس سے ان کی نفرت بڑھ جاتی ہے۔ یہ ہے **وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا** (25:60) اس سے ان کی نفرت اور بڑھ جاتی ہے۔

انسانوں کی دنیا میں حرمتِ الفاظ کا مقامِ بلند اور ان کی اہمیت

کہا کہ اندازہ لگائیے ان کی حماقت کا کہ بات اصل میں خدا کی نہیں کر رہے، ان الفاظ کی بات کر رہے ہیں اور جھگڑا سارا اس پہ آ رہا

ہے۔ سارے جھگڑے، آپ دیکھیں گے، عزیزانِ من! کہ الفاظ کی بنا پہ پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ **اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ** (12:40) چند الفاظ ہیں، چند اصطلاحیں ہیں، کچھ تمہارے بڑے بوڑھوں نے وضع کر لیں، کچھ تم نے وضع کر لیں۔ سارے جھگڑے ان اسما کے اوپر تم کرتے چلے جا رہے ہو۔ الفاظ کو چھوڑو، حقیقت کی طرف آؤ۔ ٹھیک ہے، رحمٰن نہیں کہتے، اللہ ہی کہو لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا تصور آتا ہے۔ بات میں فرق یہاں سے پڑتا ہے۔ کہا کہ رحمٰن وہ ہے: **تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا** (25:61) رحمٰن پوچھتے ہو۔ یہ کہا: کائنات کی پہنائیوں میں پھیلے ہوئے جو اتنے عظیم الجثہ کرّے ہیں، کس نے ان کو بنا دیا اور پھر وہ کون ہے جو انہیں اپنے کنٹرول میں رکھے ہوئے ہے؟ کیا یہ بت جن کو تم اپنے اللہ بنا رہے ہو، یہ ان کے بنائے ہوئے ہیں جو خود تمہارے کنٹرول میں ہیں؟ یہ بت پرستوں کے متعلق بڑی عجیب چیز ہے۔ بت پہلے موجود نہیں تھا، تم نے اپنے ہاتھ سے گھڑ کر اس کو وجود میں لایا اور یہ تو اپنے وجود کے لیے تمہارا احتاج ہے۔ جس قسم کی شکل تم نے اسے دی، اس قسم کی اس کی شکل ہوگئی۔ تو کیا خدا کو بھی تم اپنے تصور میں ڈھالنا چاہتے ہو؟

مذہب کی دنیا میں خدا کا تصور اپنا اپنا ہوتا ہے

مذہب میں، عزیزانِ من! ہوتا ہی یہ ہے کہ خدا کو انسان اپنے تصور میں ڈھالتا ہے، اسی لیے ہر مذہب کا خدا الگ الگ ہوتا ہے۔ وحی کی رو سے خدا خود اپنے متعلق بتاتا ہے کہ میں کیسا ہوں۔ جن الٰہوں کو اپنے تصور کے مطابق بنائیں، وہ بت ہوتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ مٹی اور پتھر کے ہی بت ہوں۔ بت پرستی میں ایک بڑا فائدہ ہوتا ہے اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ لوگ پھر یہ بتوں کو کیوں پوجتے جا رہے ہیں۔ بت سے آپ جو جی میں آئے کہتے چلے جائیں، وہ سامنے سے تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ انسان کو اس قسم کا خدا بہت خوش آتا ہے جو خود اس سے کچھ نہ کہے، بلکہ بت بن کے چپکے سے سنتا رہے۔ اپنے ذہن میں آپ نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے اس کو خوش کر دیا، یہ ہم سے راضی ہو گیا ہے اور چلے آئے۔ وہ سامنے سے کچھ نہ کہے، اپنے ذہن میں ہی اس کی تعظیم پیدا کر لی، اپنے ذہن میں اس کا ڈر پیدا کر لیا اور اس کے بعد گئے تو وہ تم سے کچھ نہیں کہتا اور وہ خدا جو قدم قدم کے اوپر تمہیں کہے کہ یہ کرو، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، وہ کرو، تو یہ خدا کس کو پسند آتا ہے۔ مذہب والا، بت کی قسم کا جو خدا ہے، اسے پسند کرتا ہے تو انہوں نے پھر وہ ہزار برس سے بت بنا رکھے ہوتے ہیں: فلاں امام صاحب، فلاں مفسر، فلاں محدث، فلاں قطب، فلاں صوفی، فلاں اولیاء، فلاں ولی۔ وہ تو اب ہیں ہی نہیں۔ ان سے کچھ نہیں کہتے۔ اپنے ذہن میں ایک بت بنا رکھا ہوا ہے، اس کی پرستش کرتے رہتے ہیں، اس کے حضور نذر نیاز دے دیتے ہیں، خوش ہو جاتے ہیں کہ حضرت صاحب بڑے راضی ہو گئے اور حضرت صاحب ان سے کچھ نہیں کہتے۔ ہر مُردہ کی یہ پرستش کرتے ہیں، زندہ کو کبھی نہیں مانتے کیونکہ زندہ تو فوراً پکڑ لیتا ہے،

شخصیت پرستی دراصل مُردہ پرستی ہے۔

ان بتوں کی بے کسی کی حالتِ زار

عزیزانِ من! یہ سب کی سب بت پرستی ہے۔ وہ آگے سے کچھ نہیں کہتے۔ جو مر گئے ہوئے ہوتے ہیں' وہ تو بیچارے یہ بھی نہیں کہتے کہ او بابا! میں نے تو یہ نہیں کہا تھا جو تم میری طرف منسوب کر رہے ہو کیونکہ وہ بیچارہ بت ہے' ہر مردہ بت ہوتا ہے۔ اب میں پھر اُس آیت یعنی (25:61) کی طرف آ گیا۔ کہا کہ بتاؤ کائنات کے عظیم الجثہ کرّے کس کے کنٹرول میں ہیں؟ کس کے اقتدار سے یہ کچھ ہو رہا ہے؟ تمہارے یہ جو الٰہ ہیں' یہ جو بت ہیں' جن کو اپنے آپ پہ اختیار و اقتدار نہیں ہے' انہیں تم نے بنایا' جس شکل میں ڈھالا ڈھل گئے' جہاں تم نے ان کو گاڑ کے رکھا وہاں گڑ گئے' وہاں سے اٹھا کے دوسری جگہ رکھو وہاں جا کے گڑ جائیں گے' سردی ہو' گرمی ہو بیچارے اتنے بھی نہیں کہتے کہ "ہائے ٹھنڈ لگدی اے پئی ساڈے تے کپڑا دیو۔"❶ ایک یہ ہے الٰہ تمہارا۔ ایک وہ الٰہ ہے کہ اس قدر عظیم الجثہ کرّے بھی اس کے کنٹرول میں ہیں۔ کہا کہ ذرا دونوں میں فرق کر کے تو دکھاؤ۔ اب اور آگے بڑھو۔ کہا کہ **وَ جَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا** (25:61)۔ پھر یہ یونہی "جنوں مٹی دے تھم کیندے نیں"❷ اس قسم کے کرّے نہیں ہیں۔ دیکھو تو سہی یہ تمہارے لیے روشنی کا سامان ہیں۔ یوں تو یہ کرّے ہی ہیں۔ ان کرّوں میں سورج بھی کرّہ ہے۔ دیکھو تو سہی' سارا کرّہ ارض جو ہے' پتہ نہیں کتنے اور کرّے اس کی روشنی کے محتاج ہیں۔ اگر اس کو بھی اندھا کرّہ بنا دیا جاتا تو زمین روشنی سے محروم ہو جاتی' باقیوں کو تو چھوڑ دیجیے' کوئی روشنی ہمارے ہاں نہ آتی۔ کرّہ بنایا ہے ایک' جس کا تعلق براہِ راست زمین سے ہے اور وہ ایسا چمکنے والا کرّہ ہے۔ سراجا کے معنی ہی ہوتا ہے "چمکنے والا کرّہ" جسے چراغ کہتے ہیں' روشنی دینے والا۔ کہا کہ کرّے بنائے اور ان میں وہ بھی کرّہ ہے جو روشنی دیتا ہے اور قمر بھی بنایا۔

چودہ سو سال قبل سورج کی روشنی کے لیے ضیاء اور چاند کے لیے نور کا لفظ استعمال کیا گیا

اب پھر ایک نئی بات آ گئی۔ ٹھیک ہے' آنے دیجیے۔ شمس کے معنی سورج اور قمر کے معنی چاند ہیں۔ خدا نے چاند بھی بنایا اور سورج بھی بنایا۔ ٹھیک ہے لیکن خدا سے پوچھنا چاہیے کہ یہ دو الفاظ کیوں استعمال کیے؟ **هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا** (10:5)۔ روشنی تو دونوں میں ہوتی ہے' سورج میں بھی ہوتی ہے' چاند میں بھی ہوتی ہے۔ ایک ہی آیت میں ایک ہی جگہ' شمس اور قمر آیا ہے' روشنی دینے والا ان کو بتایا ہے۔ ایک کے لیے ضیاء کا لفظ ہے' دوسرے کے لیے نور کا لفظ ہے۔ یہ کیا ہے؟ ہم تو کہیں گے کہ شاعری

---

❶ اُف' سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں' ہمارے اوپر کپڑا ہی ڈال دو۔

❷ جنہیں مٹی کے ستون کہا جاتا ہے۔

ہے اور اس نے اسی لیے کہا تھا کہ یاد رکھو' یہ شاعری نہیں' ہم نے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ رسول کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ شاعری کرے۔ شاعری میں وزنِ بیت کے لیے ایک لفظ زیادہ لکھا جاتا ہے یا وزن کے لیے دو الفاظ الگ الگ رکھے جاتے ہیں۔ کہیں شہد کا لفظ رکھا جاتا ہے اور کہیں انگبیں کا لفظ رکھا جاتا ہے' دونوں میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے یہ شاعری تو ہے نہیں کہ **الشمس ضیاء و القمر نوراً** ہو۔ چودہ سو سال پیشتر' عزیزانِ من! عرب کے صحرا میں' تاریک ترین دور میں' ایک امی کی زبان سے' یہ الفاظ نکل رہے ہیں اور آج کے دور کے ماہرین علم الافلاک سے پوچھیے کہ وہ ان دو لفظوں کے متعلق عربی زبان میں کیا کہتا ہے۔ ضیاء کہتے ہیں وہ روشنی جو کسی کی اپنی روشنی ہو اور نور کہتے ہیں وہ روشنی جو اس نے کسی دوسرے سے مانگ کر لی ہوئی ہو۔ اور آج یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ سورج کی روشنی تو اپنی ہوتی ہے اور چاند سورج کی روشنی کے عکس سے روشن ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے اِس کو نور کہا ہے' اُس کو ضیاء کہا ہے۔ اتنا ہی نہیں' بات اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ قرآنِ کریم نے شمس کو ضیاء اور قمر کو نور کہا ہے۔ یہ بنیادی فرق ہے ان دونوں کے معنوں میں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے جو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔

سورج کے لیے ضیاء اور چاند کے لیے نور کے الفاظ کا استعمال کیوں؟

ہم تو اپنی زبان میں اِن دونوں کو ایک ہی معنی میں یعنی روشنی کے معنوں میں استعمال کر لیتے ہیں لیکن جب قرآن دونوں میں الگ الگ لفظ استعمال کرتا ہے تو ہمیں کھڑے ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔ اب اس نے کہا ہے کہ یہ قمر کی روشنی اس کی اپنی نہیں ہوتی' یہ اس نے دوسرے سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک لفظ اور ہے' کیسا دلچسپ لفظ ہے۔ سورۃ الشّمس میں کہا کہ **وَ الشَّمۡسِ وَ ضُحٰهَا ۝ وَ الۡقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا** (91:1-2)۔ جھوم جائیے' عزیزانِ من! شمس یعنی سورج اور اس کی چمک' اس کی تابانیاں' اس کی درخشندگی' اس کی Brightness' یہ اس کی اپنی ہوتی ہیں۔ آگے ہے **وَ الۡقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا** (91:2) کہتے ہیں ''کوئی شخص جو کسی کے پیچھے پیچھے بھیک مانگنے کے لیے چلا جا رہا ہے۔'' سورج کی اپنی تابندگی ہے اور چاند ہے کہ یہ اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے' بھیک مانگتا ہوا کہ ''مجھے روشنی دے دے' مجھے روشنی دے دے۔'' چودہ سو سال پہلے ایک شخص یہ کہہ رہا ہے' عزیزانِ من! عربوں کی سرزمین میں' اس زمانے میں تو یہ جو' ان کے ذہن میں بھی ابھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی' سورج سے مانگی ہوئی ہوتی ہے اور اس مانگنے کے لیے اگلی چیز یہ ہے کہ وہ چاند اپنی اس رفتار سے سورج کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ اندازہ لگائیے' اس میں ادبی خوبصورتی بھی کتنی ہے کہ وہ تو اپنی روشنی' اپنی جھولی میں لیے آگے آگے جاتا ہے' وہ تو مجسم نور ہے' اور یہ ہے کہ جس کے پاس اپنی روشنی نہیں' اس کے پیچھے بھیک مانگتا ہوا چلا جاتا ہے کہ دیجا بابا' تھوڑی سی مجھے دیجا۔ یہ ہے **وَ الۡقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا** (91:1-2)۔

آپ نے دیکھا ہے کہ شمس کو ضیاء اور قمر کو نور کیوں کہا گیا ہے اور پھر قمر اپنی نورانیت یا روشنی لیتا کس طرح سے ہے؟ سورج سے، پیچھے پیچھے جاتا ہے، کٹورہ خالی لیے ہوئے بھیک مانگتا ہوا اس کی روشنی کی۔ **سراجا وقمرا منیرا** یعنی اس کے معنی تو چاند کے ہی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ جس کو ''قمار بازی'' کہتے ہیں، اس میں ''مقامر'' جواری کو کہتے ہیں اس کے بنیادی معنی دھوکا ہوتا ہے، فریب ہوتا ہے، اس کے معنی جنون کے ہوتے ہیں، پاگل پن کے ہوتے ہیں، دیوانگی کے ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ابتداءً یہ بات کہاں سے چلی تھی، انگریزی زبان میں بھی یہ جو Lunar (چاند) ہے، اسی سے لفظ Lunatic پاگل پن کو، جنون کو کہتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ Lunatic ہے۔ اس کے علاج کے لیے مینٹل ہاسپٹل ہے۔ ابتداء سے، کہیں سے، یہ چیز ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ خواہ شاعری میں آپ دیکھیں یا اگر آپ کو فطرت نے ذوقِ لطیف عطا کیا ہے تو آپ دیکھیں واقعی جو بھرپور چاندنی ہے، بڑی جنون افزا ہوتی ہے۔ سورج کی روشنی میں تو وہ روشنی ہوتی ہے مگر چاند کی روشنی کے اندر عجیب قسم کی رعنائی اور کشش ہوتی ہے۔ شاعروں نے اسی Lunar سے ابتدا میں Lunatic بنا کے تو دیوانگی کہا۔ عربوں کے ہاں بھی یہی چیز تھی۔ وہ بھی اس کو جنون یا دھوکے کے معنی میں لیتے تھے لیکن وہ جو دھوکا کے معنی میں استعمال کر کے، عربوں نے جوئے کے لیے لفظ ''قمار'' دیا ہے وہ ''قمر'' سے ہے۔ یہ تھی یہ بلا قوم۔ اور اب تو ہمارے سامنے ساری بات آ گئی جو ہم چاند سے دھوکا اور فریب کھا رہے تھے۔ اب جو چاند پہ جانے کے بعد اس کے چہرہ زیبا سے، پردہ اٹھایا ہے تو وہ ایک جلا ہوا کھنڈر نظر آیا۔ یہ سارا دھوکا ہی دھوکا تھا جو وہ ہمیں دے رہا تھا۔ اب پتہ چلا کہ قمر کا یہ لفظ انہوں نے دھوکے کے لیے کیوں رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کیوں رکھنا تھا، جس نے رکھا ہوا تھا، سوچیے تو سہی کہ کتنا بڑا دھوکا ہے جو دنیا اس سے کھائے چلی جا رہی تھی لیکن عزیزانِ من! بہت سے دھوکے ایسے ہوتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ انسان دھوکے کھاتا ہی جائے، بڑے پر لطف دھوکے ہوتے ہیں، اس پر سے پردہ نہ ہی اٹھے تو اچھا ہوتا ہے۔ اب یہ چاند جو ہے، اس کی وہ جو کھنڈرات کی تصویریں آئی ہیں، کہاں وہ چاند، جو واقعی انسان میں ایک دیوانگی کی کیفیت پیدا کر دیتا تھا، اور وہ جو اس کا اصل روپ سامنے آ گیا ہے، وہ تو ٹی وی پہ بھی دکھا رہے ہیں۔ یہ چاند، یا میرے اللہ! جی چاہتا یہی ہے کہ یہ پردہ نہ ہی اٹھتا تو اچھا تھا۔ ہمارا جو وہی چاند ہے، وہ بڑا محبوب چاند تھا۔ یہ دھوکے بڑے پُر فریب ہوتے ہیں:

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا

(غالبؔ)

پھر جی چاہتا ہے کہ آدمی آنکھ بند کر لے لیکن پھر آنکھ بند کرنے سے تو وہ فریب ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ اب ہمیں کوئی لاکھ کہے کہ ان کھنڈرات کو دیکھنے کے بعد چاند کا وہ پہلا تصور ذہن میں لائیں تو وہ تو پھر نہیں آتا، وہ تو جو فریب مسلسل ہے، اسی میں ایک لطف ہوتا ہے۔ ''جب آنکھ

کھل گئی' نہ زیاں تھا نہ سود تھا''۔خواب میں ایک مراثی نے دیکھا کہ اس کے پاس بکری ہے اور ایک خریدار آ گیا ہے۔ یہ سو روپیہ مانگتا تھا' وہ پچاس دیتا تھا۔ سودے بازی شروع ہوئی۔ یہ نوے پہ آیا وہ ساٹھ پہ آیا۔ کچھ فیصلہ ہو نہیں رہا تھا کہ اتنے میں یوں اس نے کروٹ لی' جھٹکا ہوا' آنکھ کھل گئی' تو آنکھ بند کر کے کہتا ہے کہ ''لیا سٹ پنجاہ ای سٹ''۔ ❶ آنکھ بند کرنے سے پھر وہ فریب نہیں کھایا جا سکتا۔ جب ایک دفعہ بھی' کسی کی آنکھ کھل جائے' تو پھر وہ فریب نہیں کھاتا۔

ثواب کے فریب میں مذہبی پیشوائیت کا کردار

عزیزانِ من! انسان فریب کھاتا ہی اس وقت تک ہے جب تک آنکھ بند رہتی ہے اور فریب دینے والوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی آنکھ نہ کھل جائے' کسی طرح سے ہمیشہ کے لیے بند رہے۔ مذہب اور اس کی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ آنکھیں بند کیے رکھو' ان کی آنکھیں نہ کھلنے پائیں۔ ایک دفعہ آنکھ کھل گئی تو یہ دوبارہ فریب نہیں کھائیں گے۔ یہ جو مذہب میں آنکھیں بند کرا کے ثواب کا فریب دے کے ایک Concept (تصور) دیا جاتا ہے اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ یہ کرتے رہو' یہ ہمیں دیتے جاؤ' یہ ختم دلاؤ' یہ پیسے دو۔ کی ہووے گا ایدے بعد؟ اوتھانوں ثواب ہووے گا۔ ❷ پتہ ہی نہیں کہ ہوگا کیا لیکن اگر آنکھ کھل جائے پھر پتہ چل جاتا ہے۔ جو مذہب زدہ ہے' وہ آنکھ کھولنا نہیں چاہتا۔ بہتیرا جھنجھوڑو' بیدار کرو' جگاؤ' اور بکری ویچن دی فکر اچ ہوندا اے' فیر اکھیں میچ لیندا اے او۔ ❸ یہ ہمارا دور آیا تھا جس میں زمانے کے تقاضوں نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے مسلمان کو بیدار کرنا چاہا تھا کہ کسی طرح یہ قرآن کی طرف آ جائے لیکن ان کی سحر آفرینیاں ایسی تھیں کہ

پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری ❹

سلائے چلے جا رہے ہیں' سلائے چلے جا رہے ہیں۔ یہ بھی فریب کھاتا چلا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس فریب میں ایک بڑی لذت ہوتی ہے۔ خواب کے اندر جو سودا ہو جائے نہ کچھ سرمایہ لگانا' نہ کچھ کرنا' نہ کرانا یعنی مفت میں ہی بکری کے سو روپے مل جائیں' وہ بڑی لذت ہوتی ہے۔ انسان یہ نہیں چاہتا کہ یہ لذت چلی جائے۔ کیا بات ہے پھر یاد آ گیا! غالب ❺ ہی اپنے انداز میں یہ بات کہہ سکتا ہے:

---

❶ لاؤ' پھینکو۔ پچاس ہی پھینکو۔

❷ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس کا آپ کو ثواب ہوگا۔

❸ وہ بکری بیچنے کی فکر میں ہوتا ہے پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

❹ خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری — (اقبالؒ: بانگ درا)

❺ مرزا اسد اللہ خان غالب (1797-1869)

بس ہجومِ نا امیدی' خاک میں مل جائے گی
یہ جو اِک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

مذہب کے تند و تیز نشہ سے انسان خود بھی نکلنا نہیں چاہتا

عزیزانِ من! مذہب میں سعی بے حاصل ہوتی ہے' اس میں ایک لذت ہوتی ہے۔ اس لذت کو یہ افیونی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ ناامیدی کی انتہا سے یہ ہوسکتا تھا کہ یہ طلسم ٹوٹ جاتا مگر وہ خود اسے نہیں توڑنا چاہتا۔ قرآن کسی کو فریب میں نہیں رہنے دینا چاہتا' عزیزانِ من! خدا کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبانی مومن کی کہانی

حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45AD) کے الفاظ میں' کیا بات تھی اس شخص کی بھی! کہ ایک شخص نے ان کے سامنے یہ کہا تھا کہ مومن وہ ہے جو کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فقرہ مکمل کرو' آدھا فقرہ کیوں کہتے ہو۔ کہنے لگا: جی' کیسے مکمل کروں؟ کہا: مومن وہ ہے جو نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے' نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔ مزید کہا کہ یہ خدا کی صفت ہے: وہ نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے' نہ دھوکا کھاتا ہے۔ مومن میں اگر خدا کی یہ صفت ہے تو دونوں ہی چیزیں اس کے اندر لاؤ۔ دھوکا نہیں ہوتا' یہ باقی ساری جتنی بھی مذہب کی سحر آفرینیاں ہیں' یہ سب دھوکا ہے' یہ دھوکا دیتے بھی ہیں' دھوکا کھاتے بھی ہیں۔ دھوکے میں سعی بے حاصل کے اندر ایک لذت ہوتی ہے۔ ہم اسے نہیں چھوڑنا چاہتے' یہ کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ خواب کے اندر وہ سودے ہورہے ہوتے ہیں۔

قمراً منیراً سے تو بات چلی تھی اور کہا تھا کہ اب انہیں کون بتائے کہ جس خدا نے طبعی کائنات میں' روشنی کے لیے' فضا میں اجرامِ فلکی اس طرح پھیلا دیئے کہ وہ کہیں ستاروں کی قندیلیں بن کر جگمگاتے ہیں' کہیں سورج کی شمع فروزاں کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور کہیں چاند کے ساغرِ سیمیں کی صورت میں وجہ تابانیِ عالم ہوتے ہیں۔ اس نے انسانی عقل وبصیرت کی راہ نمائی کے لیے وحی کی روشنی عطا کردی ہے۔ وہ بات کررہا ہے کہ وَ هُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ الَّيۡلَ وَ النَّهَارَ خِلۡفَةً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ يَّذَّكَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُكُوۡرًا [1] (25:62)۔ تم مایوسیوں اور ناامیدیوں سے نکلنے کا راستہ تلاش کررہے ہو۔ وہ کائنات کے آسمانی کرّوں کی' سورج کی' چاند کی' دن اور رات کی' بات اس انداز سے کررہا ہے کہ وہ جو پھروہی پنجابی میں اماں جی مرحومہ کی بتائی ہوئی یہ مثالیں ہیں یاد آتی ہیں' کہ اے نی کڑیئے! گل سن' اے

---

[1] اور جس خدا نے خارجی کائنات میں ایسا انتظام کررکھا ہے کہ رات اور دن' ایک دوسرے کے بعد آتے رہیں تاکہ تاریکی کے بعد روشنی کی نمود ہوتی رہے (اس نے انسانی دنیا میں بھی اس کا انتظام کردیا ہے کہ کوئی قوم ہمیشہ تاریکی میں نہ رہے۔ اس تک وحی کی روشنی پہنچ جائے) تاکہ جو چاہے' اس کے ذریعے صحیح راستے کو اپنے سامنے لے آئے اور اس طرح اپنی سعی وعمل کو بھرپور نتائج کا حامل بنالے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔829)۔

نوئیں! توں کن کر۔گل تیجےنوں سناندی پئی۔اے تے دراصل نوں دے کن اچ گل پانی ہوندی اے اونے۔ ❶ یہاں کچھ یہ انداز ہے۔ باتیں آسمانوں کی کر رہا ہے' سنا رہا ہے زمین والوں کو۔کہا یہ ہے کہ ان مایوسیوں میں تم سمجھتے ہو کہ بڑی تاریکیاں ہیں' اندوہ ناکیاں ہیں' ناامیدیاں ہیں' کیا ہماری یہ حالت کسی طرح سے بدل جائے گی؟ کیا یہاں بھی تاریکی روشنی میں بدلے گی؟ کہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہر روز نہیں دیکھتے کہ رات کی تاریکی کے بعد کس طرح سے سحر کی نمود ہوتی ہے۔کیا بات ہے!

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش

اورظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

(اقبالؒ)

افسردہ ستاروں کا ہجوم خورشید کے نکلنے تک ہی ہوتا ہے

قرآن کیسی عجیب مثال دیتا ہے: او مایوس ہونے کی کون سی بات ہے' کتنی تاریکیاں کیوں نہ ہوں' تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہر رات کی تاریکی کے بعد' صبح کی نورانیت آتی ہے۔تم مایوس کیوں ہوتے ہو' کیا آج ہمارا جو چاند سورج ہے' وہ کہیں اور چلا گیا ہے' ڈوب چکا ہے' نہیں نکلے گا؟ نکلے گا کیوں نہیں؟ ضرور نکلے گا۔یہ ہے تو غزل کا ہی شعر لیکن ہے بڑا کچوکا دے کر چبھتا ہوا:

رہ گئی بات کٹ گئی شبِ ہجر

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

لیکن جس پہ مایوسی طاری ہوتی ہے' وہ اسی کو کچھ اور انداز میں کہتا ہے۔وہ کہتا یہ ہے کہ

شبِ ہجراں کے جاگنے والو

کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی

مذہب کی تاریک دنیا میں نورِ سحر کی نوید ہوتی ہی نہیں

مذہب میں کبھی رات کی تاریکیاں سحر سے نہیں بدلتیں' عزیزانِ من! دین میں اگر کسی وقت بھی ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی تاریکیاں چھا جاتی ہیں تو یقین وہ ہے کہ اس کے بعد سحر ہو کے رہے گی: آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی۔تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی؟ سحر تو ہوتی ہے: **وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً** (25:62)۔اب یہاں پھر ایک اور لفظ آ گیا۔اختلاف لیل ونہار بھی تو ہے۔

---

❶ اے بیٹی! بات سن۔اے بہو! کان دھر۔بات وہ تیسرے کو سنا رہی ہے۔یہ تو دراصل اس نے بہو کے کان میں بات ڈالنی ہوتی ہے۔

گلشنِ زندگی کی اس خزاں میں بہارِنو کا سماں اور حیاتِ تازہ کی نوید

یہ خلفۃ کیا ہے؟ اس قسم کی مایوسی اور اس کے بعد کس قسم کی امید؟ یہ بالکل وہی کیفیت ہے جو خزاں میں درخت کی ہو جاتی ہے۔ اس میں زندگی کی نمود کی کہیں کوئی علامت اور نشانی تک نہیں ہوتی، کہیں سبزہ اور روئیدگی کا نشان تک نہیں ہوتا، شاخیں خشک ہوتی ہیں لیکن جب بہار آتی ہے تو انہی شاخوں سے زندگی مسکراتی، قہقہے لگاتی، نمود میں آ جاتی ہے، انہی خشک شاخوں کے اندر سے کونپلیں پھوٹتی ہیں، شاخیں سرسبز ہوتی ہیں، غنچے چٹکتے ہیں، پھول کھلکھلاتے ہیں۔ یہ جو خزاں کی خشک شاخوں کے بعد اس میں سے ان غنچوں کی، ان کونپلوں کی، جو نمود ہوتی ہے وہ نئی زندگی کی بشارتیں دیتی ہے، انہیں عرب ''خلفۃ'' کہتے تھے اور یہیں سے پھر ''خلافت'' کا لفظ سمجھ لیجیے کہ کیا معنی رکھتا ہے۔ ملوکیت کی تاریک کی ہوئی خزائیں، اس استبداد کی تاریکیاں یعنی خزاؤں کو لے لیجیے جن میں زندگی کی کوئی نمود یا آثار نظر نہیں آتا تھا، اس کے اندر انسانیت بے برگ و بار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک نیا نظام آتا ہے۔ اندازہ لگائیے قرآنِ کریم نے اس کو ''استخلاف'' کہا ہے، اس کے بعد بہارِ نو کہا ہے، جو خزاں کے بعد آتی ہے۔ ملوکیت کے استبداد کے بعد اگر کہیں یہ دین خداوندی آتا ہے تو کہا کہ یہ خزاں کے بعد بہار ہے جو آئی اور اس کے بعد کہا کہ ہم باہر سے نہیں لائے، ان شاخوں کے اندر اس کی صلاحیت موجود تھی۔ وہ صلاحیت ہی نمود سے باہر آئی ہے۔ حقیقت میں، اگر کسی شاخ میں اس کی صلاحیت نہ ہو، وہ مردہ ہو چکی ہو، تو وہ کبھی بھی بہار کے موسم میں ہری نہیں ہوتی، عزیزانِ من! اسی لیے اقبالؒ (1877-1938) نے یہ کہا ہے کہ ٹھیک ہے ملت پہ ادبار اور ذلت چھا چکی ہے، اس کا شجرِ طیب بالکل خزاں دیدہ ہو چکا ہے لیکن اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

اور ساری نظم [1] میں یہ کہتا ہوا آخر میں یہ کہتا ہے کہ

ملت کے ساتھ رابطہ اُستوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ

(بانگِ درا)

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔ عزیزانِ من! خِلْفَۃً یہ ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں لفظ! رات کی تاریکیوں کے بعد صبح کی نورانیاں، وہ کہتا ہے، اسی

---

[1] پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ (بانگِ درا)

طرح آتی ہیں جیسے خزاں کے بعد بہار کی حیاتِ تازہ کی نمود ہوتی ہے۔ یہ خِلْفَةً کا لفظ اس لیے آیا ہے۔ کہا کہ کیوں گھبراتے ہو: جَعَلَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً (25:62) [1] لیکن یہ کس کے لیے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

یہ سب کچھ ہوگا لیکن ایک شرط کے ساتھ

ابھی میں نے اس شاخ کے لیے کہا ہے جس میں حیاتِ تازہ کی برومندی کی صلاحیت موجود ہے، مضمر ہے Potential حالت میں ہے۔ اس کو صرف باہر کے حالات ذرا سازگار ملنے چاہئیں، تو وہ یوں چہکتے ہوئے باہر آ جاتی ہے بشرطیکہ اس میں یہ چیز موجود ہو۔ لیکن یہ خِلْفَةً اس کے لیے ہے جو خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (25:62)۔ یہ خود ارادہ کرے کہ میری کوششیں بھرپور نتائج برآمد کریں۔ جو سورج چڑھنے کے بعد سوتا ہی رہے، اور سمجھے کہ سوتا ہی رہنا چاہیے، اس کے لیے ایک ہی بات ہے کہ سورج چڑھے یا نہ چڑھے۔ جس درخت کی شاخیں مُردہ ہو چکی ہوں، تو مردہ کے متعلق میں مثال دیا کرتا ہوں کہ درخت کے ساتھ لگی ہوئی شاخ خشک ہو جاتی ہے، مگر جو شاخ ٹوٹ کے نیچے پانی میں گر جاتی ہے، وہ گل جاتی ہے۔ خشک شاخ میں تو نمودِ حیات کا امکان ہوتا ہے لیکن گلی ہوئی شاخ میں کبھی نہیں ہوتا۔ مذہب میں یہ شاخیں گل سڑ جاتی ہیں، عزیزانِ من! اور ان میں نمود نہیں ہو سکتی۔ اب پتہ لگا کہ یہ خِلْفَةً ادھر کیوں کہا تھا۔ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (25:62)۔ یہ اس کے لیے خِلْفَةً بنے گا، جو خود ارادہ کرے کہ میری سعی و عمل نتائج پیدا کرے ورنہ رات کے بعد دن تو ہر ایک کے لیے چڑھتا ہے۔ یہ اس کے لیے خِلْفَةً بنے گا جو ارادہ کرے کہ خزاں کے بعد اس کے درخت پہ بہار آئے گی۔ مَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (25:62) جو اس کا خود ارادہ کرے کہ اس کی نمود ہو، اس کو شرف ملے، اس کو عزت ملے۔ ذکر کے معنی شرف و عزت کے ہوتے ہیں۔

شکر کا قرآنی مفہوم

اب یہاں اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (25:62) ہے اور شکور کا میں نے آپ کو بتایا تھا۔ شکر کے معنی کے لیے وہ بات ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ محاورۂ عرب سے پوچھو کہ شکر کے معنی کیا ہیں تب قرآن سمجھ میں آئے گا۔ ساڈے تے ہوندا اے یا اللہ! تیرا شکر، الحمد للہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ [2] بس شکر ہو گیا۔ صبر شکر فیر اگے معنی آئے ایہدے۔ [3] بس جہاں کچھ نہیں ہو سکتا، وہاں صبر شکر کرو۔

---

[1] خدا نے خارجی کائنات میں ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ دن اور رات، ایک دوسرے کے بعد آتے جاتے رہیں تا کہ تاریکی کے بعد روشنی کی نمود ہوتی رہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 829)۔

[2] اے اللہ! تیرا شکر ہے الحمد للہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

[3] پھر اس کے بعد اس کے اگلے معنی صبر شکر کے آئے۔

برادرانِ عزیز! بکری کے ایسے تھن' جو دودھ سے اتنے بھرے ہوئے ہوں کہ اُن میں سے دودھ کے قطرے خود ٹپک رہے ہوں' اس قسم کے کسی کے جو بھرپور نتائج ہوتے ہیں جو خود اپنی نمود کر رہے ہوں' ٹپک رہے ہوں' عرب اسے شکر کہا کرتے تھے۔ جو شرف و مجد لینا چاہتا ہے' جو چاہتا ہے کہ اس کی کوششیں بھرپور نتائج برآمد کریں' اس کے لیے یہ رات کے بعد دن کا آنا خِلْفَةً ہو سکتا ہے۔

یہ تھی رحمٰن کی بات اور آگے اس میں جتنی آیات ہیں' عزیزانِ من! ان کا آغاز اس سے ہے کہ **وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا** (25:63)۔ اور اس سے آگے جو آیات آ رہی ہیں وہ مسلسل چلنی چاہئیں' یہ بڑی عظیم آیات ہے۔ ان میں عباد الرحمٰن کی خصوصیات بتائی ہیں اور رحمٰن اسی لیے کہا ہے کہ جب حالت یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اس کے اندر جو تغیر واقع ہوگا وہ واقعی ایک ایمرجنسی کے طور پر واقع ہوگا' اس میں ایک انقلاب واقع ہوگا' تسلسل کے ماتحت تو یہ اِدبار اور زبوں حالی مسلسل آگے چلے گی۔ اگر اسے عظمت میں' بلندی میں' ثروت میں' بدلنا ہے تو یہ ہنگامی ارتقا ہوگا۔ اس لیے عباد الرحمٰن کہا ہے اور ان کی خصوصیات قرآن نے آگے بتائی ہیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الفرقان کی آیت 62 تک آ گئے' 63 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

❀......❀......❀

چودھواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 63 تا 70)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝۶۳
وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝۶۴ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ
اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝۶۵ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝۶۶ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا
وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝۶۷ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝۶۸ يُّضٰعَفْ لَهُ
الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝۶۹ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ
يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۷۰

عزیزانِ من! آج مارچ 1978ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 63 سے ہو رہا ہے:
(25:63)۔

عبادت کا مفہوم

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں خدا کی صفتِ رحمانیت کے متعلق کچھ تشریح کی گئی تھی۔ اسی ضمن میں اب یہ بتایا گیا ہے کہ عباد الرحمن کی خصوصیات کیا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عبد کے معنی تو محکوم، اطاعت گزار، فرماں پذیر، قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے والے کے ہیں۔ اس کا مفہوم پرستش نہیں ہے، یہ تو مذہب میں آ کر پرستش ہو جاتا ہے۔ دین میں اس کے معنی محکومیت اور اطاعت گزاری کے ہی ہوتے ہیں تو عباد الرحمن وہ ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، جو اس کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرتے

ہیں۔ان کی نمایاں خصوصیات بتائی گئی ہیں اور یہ سلسلہ اس سورۃ کے آخر تک چلے گا۔

علی الارض ھونا کا قرآنی مفہوم

پہلی چیز اس آیت میں یہ بتائی گئی کہ **وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا** (25:63)۔یہ عباد الرحمٰن کی ایک صفت ہے جو بتائی گئی ہے۔اس کا عام ترجمہ تو یہی کیا جائے گا کہ جب وہ چلتے ہیں تو بہت عجز اور انکسار سے' جھکے ہوئے' چلتے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ رفتار' گفتار اور کردار ہی کی علامتیں بن جاتی ہیں۔انسان کے اندرونی جذبات کا اظہار اس کی محسوس جسمانی حرکات سے ہوتا ہے۔اکڑنا کچھ اچھی بات نہیں ہے' اوچھے پن کی علامت ہوتی ہے۔یوں بھی یہ بات ہوسکتی ہے لیکن اس میں اس سے ذرا گہرا پن ہے۔ میں ذرا اور آگے چل کر بھی عرض کروں گا کہ صرف اتنے معنی سے تو ہمارے ہاں کا جو تصوف ہے' فقیری و درویشی ہے' وہ اسی قسم کی آیات سے سہارے لے کر ایک خاص ٹائپ پیش کرتی ہے: خدا کے بندوں کا جھکے ہوئے' عاجز' ناتواں ہونا' ان کے اندر اتنا انکسار ہونا کہ اگر کوئی چار گالیاں بھی دی جائیں تو خاموشی سے سن لے' ایک گال پہ طمانچہ مارے تو دوسرا گال سامنے کر دے۔وہ خدا کے بندوں کا کچھ اس قسم کا نقشہ کھینچتے ہیں۔توانائی' قوت' غلبہ اور اقتدار' یہ چیزیں ان کے دین میں ہوتی ہی نہیں ہیں' اس کا نام تو تکبر ہوتا ہے اور تکبر کے متعلق جو پہلی چیز ہے وہ سوچتے نہیں کہ خود خدا نے اپنی ایک صفت ''المتکبر'' بھی کہی ہے۔یہ جو کبریائی ہے' یہ ان کے ہاں' ان کے تصور میں بھی نہیں ہوتی۔یہ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں ''ہو جا ککھ مسیت دا'' ❶ سب سے بڑی صفت ہوتی ہے یعنی ایسا تنکا کہ ''رڑ کے ای نہ پیراں وچ کسے دے'' ❷ اور وہ تو شاید آپ کو یاد ہو گا' پہلے بھی آیا ہے' وہ ہمیں سنایا کرتے تھے کہ وہ پٹھانوں کے علاقہ میں تھے۔وہ بھی اس طرح سے تصوف میں آ گئے تھے تو ان کا یہ سلسلہ تھا کہ

تھے ہم پوت پٹھان کے دَل کے دَل دیں موڑ
شرن پڑے رگناتھ کے' سکیں نہ تنکا توڑ ❸
(وحید خاں)

---

❶ مسجد کا تنکا بن جا' سوکھا ہوا' لاغر' بے کار جس کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔

❷ جس کسی کے پاؤں کے نیچے آئے اُسے معلوم تک نہ ہو۔

❸ ''یعنی میں پٹھان تھا اور فوجوں کے منہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگناتھ جی کے قدم پکڑے ہیں یا بالفاظِ دیگر یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود جاری و ساری ہے' میں ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دکھ پہنچنے کا احتمال ہے۔یہ شعر وحید خاں کا ہے جو کہ ایک پنجابی شاعر تھا اور کسی ہندو جوگی کا مرید ہو کر فلسفۂ ویدانت (ویدانت اور وحدت الوجود ایک ہی چیز ہے) کا قائل ہو گیا تھا۔اس تبدیلیٔ خیال و عقیدہ نے اس پہ یہ اثر کیا۔کاش وحید خاں کو یہ معلوم ہوتا کہ زندگی نام ہی دکھ اٹھانے اور دُکھ پہنچانے کی قوت رکھنے کا ہے۔زندگی کا مقصد زندگی ہے نہ موت۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کیا بات ہے صاحب! ان کے ہاں جب یہ اس قسم کی چیزیں آتی ہیں یا ان کے ہاں کا جو خدا کے بندوں کا تصور ہوتا ہے اس کے لیے اس قسم کی چیزیں پیش کرتے ہیں کہ وہ چلتے ہیں تو جھکے ہوئے انکساری سے۔ یہ ٹھیک ہے' بپھرنا اچھی چیز نہیں ہے' اکڑنا اچھی بات نہیں ہے لیکن یہاں یہی بات نہیں ہے۔ یہ صرف چلنے کے معنی نہیں ہو سکتے۔

جھکو لیکن وقار کے ساتھ

عبادالرحمٰن کا **یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ** (25:63) ہونا آیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہاں **ھونا** کا لفظ آیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس مادے [1] کے معنی میں کہ جھکاؤ ہوتا ہے۔ اصل میں اس کے معنی ہوتا ہے ''سکون اطمینان' بپھرے ہوئے نہ ہونا' اوچھا پن نہ پیدا ہو جانا' نہایت باوقار طریقے سے ہونا'' اور یہاں یہ **یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ** (25:63) آیا ہے۔ یہاں ایک اور بھی نکتہ ہے۔ عام طور پہ قرآنِ کریم میں ''فی الارض'' ہی آیا ہے۔ جہاں تک میری نگاہ کام کر رہی ہے۔ یہ چار مقامات ہیں [2] جہاں ''علی الارض'' آیا ہے۔ یہ ''علی اور فی'' میں ایک ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ علیٰ کے معنی ہوتا ہے بالاتریں' اور ارض کے معنی زمین ہی نہیں ہوتا بلکہ ملک بھی اس کے معنی ہوتا ہے تو یہ جو چیز ہے کہ جب بالاتریں ملک حاصل ہو جائے تو اس میں وہ اکڑتے نہیں ہیں' ان کے اندر تفاخر نہیں آتا' بپھرتے نہیں ہیں' ان کے اندر اوچھا پن نہیں پیدا ہو جاتا اور ان کے اندر استبداد نہیں آ جاتا بلکہ وہ شاخِ ثمر بار کی طرح جھک جاتے ہیں لیکن جھکنا ہے کبریائی حاصل ہونے کے بعد' یہ فقیری اور درویشی کا جھکنا نہیں ہے۔ اس کے متعلق تو سعدی [3] بہت پہلے سے کہہ گیا کہ

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) زندگی تسلسل (Continuity) کا نام ہے جہاں اس میں انقطاع واقع ہوا' زندگی ختم ہو گئی۔ جو قومیں اپنی جدوجہد کو مسلسل قائم نہیں رکھتیں' وہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔ جو کچھ کسی قوم نے ماضی میں کیا' اس کے نتائج اس کے زمانہ حال میں اس کے سامنے آتے ہیں۔ جو کچھ وہ حال میں کرتی ہے۔ اس سے اس کا مستقبل مرتب ہوتا ہے۔ ماضی' حال اور مستقبل ایک دوسرے سے الگ زمانے نہیں ہیں۔ ماضی آگے بڑھتا ہے تو حال بن جاتا ہے اور حال سے مستقبل پیدا ہوتا ہے یا یوں سمجھیے کہ جسے حال کہا جاتا ہے وہ ماضی کا مستقبل اور مستقبل کا ماضی ہے اس لیے زندہ قوم ماضی' حال اور مستقبل کے تسلسل کو قائم رکھتی ہے۔

(نوٹ: وحید خاں کا یہ شعر مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ الکہف وسورۃ مریم میں ص۔ 351 پر سہواً یوں لکھا گیا ہے:

ہم تھے پت پٹھان کے' دل کے دَل دیں موڑ — شرم لگے رگھوویت کے جائے نہ تنکا موڑ

اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں)۔

1. ھون اس لفظ کا مادہ ہے۔
2. (18:7;22:65;25:63;71:26)
3. سعدی شیرازی (1184-1291)

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گداگر تواضع کند خوئے اوست

ملاّ کی اذان اور مجاہد کی اذان میں بڑا فرق ہوتا ہے

تواضع اور جھکنا اسی کو زیب دیتا ہے' اسی کے لیے محمود ہے' اُسی کا جھکنا قابل تعریف ہے' جس میں کھڑے ہونے کی' کبریائی کی قوت حاصل ہو' جسے اقتدار حاصل ہو' جو کھڑا ہو جانا جانتا ہو۔ وہ جھکے تو یہ خوبی کی بات ہے اور اگر یہ فقیر آ کے جھکتا ہے' سلام کرتا ہے' تو وہ اس کی عادت ہوتی ہے' عادت ہی نہیں بلکہ اس کے تو مفاد میں ہی یہ ہوتا ہے۔ فقیر اکڑ کر مانگے تو اسے کون دے گا' تو یہ درویشی اور فقیری کا جھکنا نہیں ہے۔ حق کو چھوڑ کر' دنیا میں کبریائی اور اقتدار حاصل کرنے کو قرآنِ حکیم نے ''استکبار بغیر الحق'' کہا ہے' اس کو معیوب کہا ہے۔ جو مومن ہے وہ تو خدا کی صفت المتکبر کا مظہر ہوتا ہے' حدودِ بشریت کے اندر کبریائی اس کو حاصل ہوتی ہے۔ قرآن تو مومن کو **اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ** (3:139) کہتا ہے: ساری دنیا میں' تمام انسانوں کے اوپر غالب آیا ہوا۔ وہ تو ان کے اس دین کو' اس نظام کو **لِیُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّیۡنِ کُلِّهٖ** (48:28) کہتا ہے کہ ''یہ دنیا کے ہر نظام کے اوپر غالب آیا ہو۔'' مومن تو ہوتا ہی اس وقت ہے کہ جب بالائے ہر بالا ترے ہو۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں

مومنِ بالائے ہر بالا ترے

جتنا بھی اونچا کوئی دنیا میں ہے یہ مومن اس سے بھی زیادہ اونچا ہوتا ہے کیونکہ قرآن نے اعلون کہا ہے۔ یہ Superlative ڈگری ہے' دوسروں کے ساتھ مقابلے میں Comparative بھی نہیں ہے' اس لیے یہ کہتا ہے کہ

مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے ❶

اس کی غیرت تو اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی دوسرا اس کا ہمدوش چلے' ساتھ ساتھ چلے۔ لہٰذا یہ جھکنا اُس کا جھکنا ہے جس کو یہ برتری حاصل ہو' غلبہ حاصل ہو' اقتدار حاصل ہو' کبریائی حاصل ہو اور پھر وہ جھکے۔ یہ **یَمۡشُوۡنَ عَلَى الۡاَرۡضِ هَوۡنًا** (25:63)۔ میں وہ چیز کہی ہے۔

لفظ ھونا صفت محمود کا قرآنی مفہوم

میں نے کہا ہے کہ ھونا کے معنی بھی جھکنا ہی نہیں ہوتا۔ عجیب بات ہے' میں نے بار بار کہا ہے اور ہر دفعہ آپ دیکھیں گے کہ میں عربوں کی زبان کے اوپر آتا ہوں۔ زبان پہ تو آنا ہوگا۔ یہ تو خدا نے خود کہا ہے کہ **بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ** (26:195) اس قرآن کو سمجھنا

---

❶ دنیا میں کوئی انسان کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو' مومن کا مقام اس سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ مومن کی غیرت گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی اور انسان اس کا ہمدوش ہو جائے۔

ہو تو لسان عربی مبین کو سمجھو، پھر قرآن سمجھ میں آئے گا۔ ان عربوں کے ہاں یہی جو هَوْنًا کی صفت تھی وہ خود اسے اپنے ہاں ان معنی میں استعمال کرتے تھے کہ ''اگر کوئی اپنے ارادے، رضامندی سے، خودگردن فرازی کی قوت رکھتے ہوئے، جھکتا تھا تو اس کو وہ صفتِ محمود کہتے تھے اور اگر کوئی دوسرا اس کو جھکاتا تھا تو اس کو وہ ذلت کہتے تھے''۔ یہ عجیب قوم تھی۔ جھکنا تو دونوں ہی جگہ ہوتا ہے۔ ایک جھکنا وہ ہے کہ اقتدار رکھتے ہوئے پھر اپنی مرضی سے، اپنے ارادے سے، جھکے اور دوسرا جھکنا یہ ہے کہ دوسرے کے استبداد سے جھکایا جائے۔ وہ لفظ تو ایک ہی استعمال کرتے تھے، ایک صفت ان کے ہاں محمود ہوتی تھی، خود جھکنے کی، اور دوسری نہایت مذموم ہوتی تھی، اسے وہ ذلت کہتے تھے۔ تو یہ جو **وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا**(25:63) ہے تو میں نے کہا ہے کہ اس میں ایک تو یہ **علی الارض** بڑی غور طلب بات ہے۔ میں نے عرض کیا ہوا ہے کہ قرآن کے کسی لفظ سے ایسے نہیں آگے جانا چاہیے۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ جہاں تک میری نگاہ نے کام کیا ہے، قرآنِ کریم میں **علی الارض** اسی مقام کے علاوہ صرف تین اور مقامات ❶ پہ آیا ہے، ورنہ قرآن زیادہ تر **فی الارض** کہتا رہا ہے۔ ''علیٰ'' کے اندر ایک بالادستی کی قوت بھی ہوتی ہے، تو یہاں یہ هَوْنًا کے معنی وہ جھکاؤ والی بات نہیں ہے بلکہ سکون ہے، سکینت ہے، اطمینان ہے، وقار ہے، اس کے اندر اوچھا پن نہیں ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ جب ملک میں ان کو بالادستی حاصل ہو جاتی ہے تو ان میں وہ اکڑ نہیں ہوتی۔ یہ الفاظ تو میں نے کئی جگہ استعمال کیے، یہاں اوچھا پن بھی کہا، اکڑفوں بھی کہا لیکن وہ پنجابی کا لفظ جو اس کے معنی بیان کرتا ہے وہ تو بڑا ہی جامع ہے: اے بھوتر نئیں جاندے۔ یہ ہے اس کا صحیح ترجمہ کہ قوت ہتھ اوندی اے، تے بھوتر نئیں جاندے۔ ❷ **عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا**(25:63)۔ میں اس کے متعلق مزید تفصیل اگلی آیت میں جا کر کروں گا، قرآن نے خود اس کی یہ تفسیر وہاں کر دی ہے، یہاں اتنا ہی کہہ کر آگے گزر جاتا ہوں۔ اور آگے ہے کہ **وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا** (25:63)۔ اس کا عام ترجمہ یا مفہوم لیا جاتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب کوئی جاہل ان کے سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ او بابا سلام، جا گلوں ہٹ، اے ست سلام ساڈے ❸۔ یہ ایک مشہور محاورہ ہے اور اردو میں ہے۔ سات سلام ہوتے ہیں یعنی جس کو دفع کرنا ہو یہ اس کے لیے ہے۔ اس لیے وہ جو جاہل ہیں، ان کو وہ پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ او جا بابا، سلام۔ ❹

---

❶ (18:7;22:65;71:26)

❷ یہ ''شوخی'' میں نہیں آجاتے۔ یہ ہے اس کا صحیح ترجمہ کہ قوت ہاتھ آتی ہے تو ''شوخی'' میں نہیں آجاتے۔

❸ بابا! معاف کرو، بخشو، جاؤ، جان چھوڑو، ہمارے یہ سات سلام۔

❹ بابا! معاف کرو، بخشو۔

یہاں تو جاہل سے بھی حسنِ سلوک سے پیش آنے کا سبق دیا گیا ہے

جب پہلے سے ہی اس کے ساتھ بات کرنے کا عالم ہے تو یہ بات کیا ہوئی!! تم نے تو انہیں علم سکھانا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ** ❶ (2:129)۔ یہ تو تمہارے پیغمبر کی صفت بتائی گئی ہے کہ یہ جو تعلیم دینا ہے تو انہی کو ہی دینا ہے جن کو علم حاصل نہیں ہے اور انہیں اس کی غرض وغایت بتانا ہے جنہیں اس کا علم حاصل نہیں ہے، وہ تو جاہل ہیں مگر یہ ہیں جو ان کے متعلق کہتے ہیں کہ جا اوئے جا' اپنا کم کر۔ اسی تے عالماں نوں سمجھانے ہونے آں۔ ❷ یہ ٹھیک بات ہے کہ آج کا لفظ عالم جاہل کا ہی مرادف ہے لیکن یہ بات قرآن کے اندر کی تو نہیں ہے' قرآن کی تعلیم کی تو نہیں ہے۔

قرآن نے جھلون کہا ہے' جاہلیت اور اسلام دو دَور گنائے ہیں۔ اسلام سے پہلے جو عرب تھا اسے عربِ جاہلیہ کہتے ہیں' اسے دورِ جاہلیہ کہتے ہیں۔ وہ ہے تو جہل ہی لیکن وہ ایک مخصوص Term (اصطلاح) بن گئی ہے۔ اسی کی خاص خاص خصوصیات ہوتی تھیں مثلاً تعصب' اکڑ پن' انتقام' وحشی سا ہونا' درندگی۔ یہ تھیں ان کے ہاں کی یہ خوبیاں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ساتھ ان لوگوں کا ہر روز' ہر وقت' معاملہ پڑتا تھا جنہیں آپ جماعت مومنین کہتے ہیں۔ یہ وہی لوگ تھے جن کو انہوں نے تعلیم و تربیت دے کر اس سانچے میں ڈھالنا تھا۔ تو اس قسم کے لوگ اگر سامنے آئیں' ان سے واسطہ پڑے' تو انسان ان کو دھتکار دیتا ہے یا ان کی مخالفت پہ اتر آتا ہے۔ یہاں کہا کہ یہ جو جاہلیت کے لوگ ہیں' یہی تو یہاں کی آبادی ہے' جب جاہلیت کے لوگوں سے تمہارا معاملہ پڑے تو ان کو بھی تم سلامتی کی دعا دیا کرو' ''آؤ میاں! ہمارے ہاں سے تمہارے لیے بھی سلامتی ہے۔'' ان کو دھتکارو نہیں بلکہ قریب لاؤ۔ یہ عبادالرحمٰن کی کیفیت ہے اور اگلی چیز یہ ہے' یہاں سے وہ معنی واضح ہوتے ہیں جو میں نے ابھی عرض کیے تھے جس میں جھکاؤ پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ کیسے ہیں؟

اس جھکاؤ کا وہ مفہوم جو ہمارے ہاں پیش کیا جاتا ہے

قرآن نے کیا بات کہی ہے؟ کہا ہے کہ **وَ الَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا** (25:64)۔ چلیے صاحب! انہوں نے تو اس کا یہ ترجمہ کیا کہ ''یہ لوگ ہیں جو ساری رات کبھی سجدے میں رہتے ہیں' کبھی قیام میں رہتے ہیں۔'' یہ کام کرتے ہیں' اس کا نام یہ ہے کہ عبادت کرتے ہیں صاحب! اور عبادت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ کھڑے رہتے ہیں یا وہ نفل پڑھنے میں یہ چیز ہو جائے گی۔ یا وہ کھڑے رہتے ہیں یا وہ سجدے میں ہوتے ہیں۔ یبیتون کے معنی کرتے ہیں ''وہ ساری رات اس طرح سے گزارتے ہیں۔'' سوچیے کہ یہ

---

❶ انہیں اس ضابطہ (کتاب) کی تعلیم بھی دے اور یہ بھی بتائے کہ ان قوانین کی غرض وغایت کیا ہے اور ان پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے (2:231; 17:39; 33:34) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 47)۔

❷ جاؤ رے بابا! جاؤ' اپنی راہ لو۔ ہم تو عالموں کو سمجھاتے ہیں۔

قوم جس کی یہ کیفیت ہو وہ دنیا میں کسی کام کرنے کے قابل نہیں رہے گی۔

تصوف کی دنیا کا پیش کردہ اسلام

عزیزانِ من! میں پھر کہوں گا کہ جب آپ کے ہاں تصوف آیا ہے تو اس میں یہ بات Fit-in کرتی ہے، موزوں بیٹھتی ہے۔ انہوں نے تو دنیا اور دنیا کی آلائش کو ترک کر دیا، انہوں نے تو کہہ دیا کہ یہ دنیا کفار کے لیے ہے، مومن کے لیے نہیں ہے، ان کے لیے اگلی دنیا ہے، تو یہ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ اب دنیا کے معاملات کو ترک کیا۔ یہ ہو گئے قابل نفرت تو پھر دنیاوی معاملات کا تو اس میں سوال ہی نہیں رہتا۔ پھر معاملات کیا باقی رہ گئے؟ یہی ہے کہ پھر نمازیں پڑھ چھوڑیئے، ورد وظیفہ کر چھوڑیئے، تسبیحاں پھریں۔ یہی چیز باقی رہ جاتی ہے۔ جب دنیا کے آلائش سے الگ ہو جائے تو پھر یہی چیز باقی رہ جاتی ہے، تو جب انہوں نے دین کا ماحصل اپنے ہاں یہ لیا: ترکِ دنیا، ترکِ آلائش، تو اس کے بعد پھر باقی، یہ پرستش کی چیزیں رہ گئیں، عبادت کے معنی یہ رہ گئے۔ اسی لیے پھر جو تصور نبی اکرم ﷺ کا بھی ہمارے سامنے پیش کیا وہ یہی تھا کہ حضور ﷺ ساری رات کھڑے رہتے تھے، پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔

سورۃ مدثر میں پیش کردہ سیرتِ رسول ﷺ

آپ کو یاد ہوگا میں نے چند دروس پہلے سورۃ مزمل [1] کی پہلی آیات پیش کی تھیں۔ یہ سورۃ مدثر اور سورۃ مزمل دو سورتیں ہیں۔ ان میں نظر آتا ہے کہ یہ ابتدائی دور کی سورتیں ہیں۔ یہ بڑی عظیم چیزیں ہیں جو اس کے اندر حضور نبی اکرم ﷺ کے متعلق آئیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سورۃ المدثر کے اندر میں نے یہ کہا ہے کہ المدثر کے معنی اے کملی والے اور کملی میں لپٹنے والے کیے جاتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اسے پھر دہرادوں کہ مدثر کے معنی ہوتا ہے ''شاخِ خزاں دیدہ یہ جب زندگی کی کوئی نمود نہ رہے تو اس کے بعد بہار کے موسم میں جو نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں، یہ ہوتی ہے تدثیر۔'' مدثر کے معنی ہیں کہ یہ جو نظامِ عالم آج خزاں دیدہ ہو چکا ہے، جس میں زندگی کی شادابی کی کوئی کسی قسم کی علامت نہیں ہے، اے کہ اس کو بہارِ نو میں تبدیل کرنے والے! **قُمْ فَاَنْذِرْ** (74:2) اٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ یہ عظیم چیز ہے صاحب! آپ کسی Historian (مورخ) سے پوچھیے خاص طور سے ہمارے ہاں تو اس دور کی کوئی تاریخ ہے نہیں، اس دور کی جو تاریخ لکھنے والے ہیں، ان سے پوچھیے۔ وہ بتاتے ہیں کہ عالمگیر انسانیت میں زندگی اور نمود کی کہیں کسی قسم کی کوئی علامت باقی نہیں رہی تھی، جب نبی اکرم ﷺ کا ظہور ہوا ہے۔ مدثر کے معنی تب سمجھ میں آتے ہیں۔ بہر حال یہ کر:

---

[1] سورۃ مزمل اور مدثر کی تفہیم کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2006، ص ص۔ 280 تا 397۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:3) اور خدا کے نظام کی کبریائی کو قائم کر۔ اس لیے اٹھ۔ یہ قُمْ بڑی چیز ہے تو یہ تو قُمْ ہے' یہ اس کے سامنے بڑا عظیم پروگرام تھا' یہ اس قسم کی دنیا میں ایک نیا نظام' نیا انقلاب برپا کرنا ہے۔ سوچیے' عزیزانِ من! یہ انقلاب کتنا بڑا پروگرام چاہے گا۔ یہ اس کے لیے دن رات کوششیں کریں گے۔ ہوتا یہی تھا کہ دن کو' اس پروگرام کو Execute (نافذ) کرتے تھے اور راتوں کو جب ادھر سے فرصت ملتی تھی' فارغ ہوتے تھے' پھر اس کے متعلق پلاننگ کرتے تھے' سوچتے تھے کہ آج جو کچھ کیا ہے اس میں کیا کمی رہ گئی ہے' کل جو کرنا ہے اس میں کیا کچھ ہمارے سامنے ہوگا۔ سوچتے تھے' بیٹھتے تھے' مشورے کرتے تھے' پلانز بناتے تھے' اسکیمیں اپنے سامنے رکھتے تھے اور چونکہ یہ جذبہ بڑا شوق واشتیاق کا تھا' اس لیے کہ پوری کی پوری سرگرمی' عمل سے یہ پروگرام تکمیل تک پہنچ جائے' تو راتوں کو بھی' کافی رات گئے تک' مشوروں کے لیے' اتنا زیادہ جاگتے رہتے تھے کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑا کہ **يَآاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ o قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلاً** (73:1-2) ٹھیک ہے راتوں کو بھی یہ کچھ کرنا ہوتا ہے' یہ بھی اس پروگرام کا حصہ ہے لیکن تھوڑا وقت لیا کرو اس لیے کہ **اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلاً** (73:7) دن میں جو پروگرام تمہارا ہے وہ بڑا لمبا پروگرام ہے' اسے بھی تو تم نے ہی سرانجام دینا ہے' اس لیے رات کو بہت تھوڑے سے وقت کے لیے جاگو۔ اور پھر اس کے بعد اسی سورۃ میں ہے کہ یہ تمہارے جو ساتھی ہیں' ان کا بھی خیال رکھو' ان میں کمزور بھی ہیں' بیمار بھی ہیں' انہوں نے روزی بھی کمانی ہے' اور کام کاج بھی تم لوگوں نے کرنے ہیں' تو اس لیے اس کا خیال رکھو: **اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلاً** (73:7) دن میں اتنا لمبا پروگرام تم لوگوں کے لیے ہوتا ہے' راتوں کو مشوروں کے لیے جاگنا ہے' تھوڑے سے وقت کے لیے جاگا کرو۔ اب آپ نے دیکھا کہ یہ درویشی' فقیری اور تصوف کا تو پروگرام ہی نہیں ہے۔

اہلِ تصوف کی مصروفیات

دنیا سے قطع تعلق کرنا اب ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب یہ نہیں ہے کہ ویلے نیں۔ ہن کم کی ہووے۔ [1] یا یہی ہے کہ تسبیحاں پھیریں۔ یہ جتنے بھی بڑے بڑے صوفیا یا اولیائے کرام ہیں' ان کی زندگیاں جا کر دیکھیے "صاحب! وہ دن' رات میں ایک ہزار نفل پڑھا کرتے تھے' یہ لکھ دیا' کبھی ماپ کے دیکھا ہی نہیں کہ ایک نفل کی جو پوری رکعت ہے' اس میں وقت کتنا لگتا ہے اور ہزار نفل پڑھنے میں وقت کتنا لگتا ہے۔ کبھی کسی نے یہ سوچا ہی نہیں اور لکھتے چلے گئے: نو لکھ ہزاری صاحب! کیا بات ہے! "نو لاکھ مرتبہ روزانہ قرآنِ شریف ختم کیا کرتے تھے۔" تو ایک بات ظاہر ہے کہ پھر آدمی کام تو اور کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ نو لاکھ نہ سہی' نو ہزار سہی' یا نو سو ہی سہی' تو یہ جو چیز تھی

---

[1] وہ لمحاتِ فرصت میں ہیں انہیں اب کوئی کام نہیں۔

کہ یہ دنیا ان کفار کے حوالے کرو اور آپ پھر اللہ والے یہ کچھ کرنے کے لیے بنو۔ اس کی رو سے یہ سارے ترجمے اور یہ مفہوم ہوتے تھے کہ **وَ الَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا** (25:64)۔ ان کے ترجمہ کی رو سے کہ راتوں کو یہ لوگ پھر یا یہ نفل پڑھتے ہوئے کھڑے رہتے ہیں یا سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ سجدے میں چلے جاتے ہیں' پھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ساری رات اس طرح سے گزار دیتے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ جو یبیتون ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں ''رات کے سکون میں' مشوروں کے لیے جمع ہونا۔'' تو پورا پروگرام سورۃ مزمل کا سامنے آ گیا: مشوروں کے لیے جمع ہونا۔ یہ جو آگے انہوں نے بات کہی ہے کہ **سُجَّدًا وَّ قِیَامًا** (25:64)۔ ان کے ترجمہ کی رو سے اس کے معنی یہ کرتے ہیں کہ کبھی سجدے میں ہوئے' کبھی کھڑے ہوئے۔

ان لفظوں کے معنی قرآن سے پوچھیے' انہیں مجاز کے معنوں میں لیجیے جن میں قرآن استعمال کرتا ہے۔ ان کا پروگرام ہے۔ اس پروگرام کے اندر دونوں چیزیں آتی ہیں: کہیں اس پروگرام میں جھکنا ہوتا ہے' سپر اندازی ہوتی ہے' اور کہیں ڈٹ کے کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ ایک جرنیل کے' ایک انقلابی پروگرام والے کے سامنے دونوں چیزیں سوچنی پڑتی ہیں کہ کہاں مجھے کھڑے ہو جانا ہے' کہاں مجھے سپر انداز ہو جانا ہے' کہاں مجھے ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ اب دیکھیے کہ ایک شعر میں اقبالؒ (1877-1938) کیسے اس مفہوم کو واضح کر گیا ہے۔ بات صاف کہہ جاتا تھا یہ شخص:

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

یہ ہے ''سجدا و قیاما''. دیکھتے ہیں آپ' یہ شخص سمجھا ہوا تھا۔ یہ سجدہ اور قیام دونوں چیزیں مومن کا شعار ہیں: **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ** [1] (48:29)۔ یہ ہیں عباد الرحمٰن۔ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں رضی اللہ عنہم کی کیفیت یہ ہے کہ مخالفین اور سرکشوں کے مقابلے میں آتے ہیں تو وہاں ڈٹ کے کھڑے ہو جاتے ہیں' یہ **اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ** (48:29) ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت محبت اور پیار سے' جھکاؤ سے' ملتے ہیں۔ یہ ہے

---

[1] محمد رسول اللہ ﷺ اور اس کے رفقائے کار کی جماعت حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں' لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد ہیں (5:54) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1202)۔

رحمآء بینھم (48:29) یہ ہے سجدا و قیاما۔ اس کے اندر دونوں چیزیں آ جاتی ہیں بلکہ دوسرے مقام پہ تو اَذِلَّۃٍ [1] (5:54) کا لفظ بھی آیا ہے۔ (5:54) بڑی عظیم آیت ہے: یٰۤـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗۤ (5:54) اے ایمان والو! اگر تم دین سے پھر جاؤ گے تو پھر خدا تمہاری جگہ اور قوم لے آئے گا۔ ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ خدا کے ہوں گے اور خدا ان کا ہوگا۔ ان کی یہ صفت بتائی ہے کہ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (5:54) مخالفین کے مقابلے میں اعزۃ یعنی غلبہ اور اقتدار رکھتے ہوئے اور آپس میں مومنین کی جماعت اذلۃ [1] یعنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جھکتے ہوئے یہ جو اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (5:54) ہے اس کا ترجمہ کیا ہے: یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (5:54) خدا کے راستے میں جہاد کرنے والے اور لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ (5:54) کسی ملامت کرنے والی کی ملامت سے قطعاً نہیں ڈرتے۔ یہ ہے ان کے ہاں کا قیام اور یہ ہے سجود، یہ جو اشدآء علی الکفار ہے یہ ہے ان کا قیام اور یہ جو رحماء بینھم ہے، یہ جو اذلۃ علی المؤمنین ہے، یہ ہیں سجدے ان کے، یہ ہے آپس میں جھکنا ان کا ایک دوسرے کے ساتھ، دوستوں کی محفل میں، مگر سرکشوں اور مخالفین کے مقابلے میں یہ اشدآء ان کا قیام ہے یعنی وہ ڈٹ کے کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ ہیں مومن کی صفات کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

(بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

یہ ہیں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (48:29) کے معنی۔ یہ ہیں جو راتوں کو یہ مشورہ کرتے ہیں۔

---

[1] ابن لاعرابی نے کہا ہے کہ یہاں (5:54) میں اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ...... رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (48:29) ہیں یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مشفق و ہمدرد۔ اور مخالفین کے مقابلے میں سخت۔ جناح الذل (17:24) نرمی تواضع اور مہربانی کے لیے آیا ہے (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1960، ص ص۔ 701 تا 703)

متصوفانہ نظریاتی زندگی کا نتیجہ

میں نے عرض کیا ہے کہ جب ہمارے ہاں کے تصوف اور مذہب میں' دنیا سے نفرت' دنیا سے قطع تعلق یعنی یہ کہ یہ سب کچھ چھوڑ دیا جائے' آیا تو پھر اس میں غور' تدبر اور فکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہاں کسی مقام پہ تفکر اور تدبر آتا ہی نہیں ہے۔ تفکر تو وہ کرے گا جس کے سامنے کچھ Problems (مسائل) ہوں گے۔ جن کے سامنے کچھ مسائلِ حیات ہوں گے وہ سوچیں گے کہ ان کو حل کیسے کرنا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک غور وفکر کی اہمیت

مومن کی صفت جو قرآن نے بتائی ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ نے بھی یہ کہا ہے اور وہ ایسی آیت ہے کہ جسے ہر درودیوار پہ لکھنا چاہیے کہ **قُلْ** اے رسول! تم ان سے کہو کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بحث نہیں کرنا چاہتا' نہ ہی کوئی طول طویل لیکچر دینا چاہتا ہوں۔ **اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ** (34:44) میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اب کہنے کا یہ انداز ہی دیکھیے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کہنا چاہتا بلکہ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں' وہ سننے کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔ کہا کہ میں تمہارے چلتے چلتے وہ بات نہیں کہنا چاہتا۔ کہا کہ **اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى** (34:46) تم سارے نہیں تو ایک ایک' دو دو' چار چار' جتنے بھی ہو' کھڑے ہو جاؤ' بات ایسی اہم ہے۔ ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ ایسی اہم بات ہے کہ کھڑے ہو کر میری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں' سنو۔ تو سائیکولوجیکلی (نفسیاتی طور پر) پہلے تو ان کو سوچنے پہ آدھا تیار کر لیا' چلتے چلتے جو بات کہی جائے تو وہ ایسی اثر انداز نہیں ہوتی۔ کہا کہ پہلے کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ فرمایئے! کہا کہ ایک بات کہوں گا۔ کہیے کیا کہتے ہیں؟ کہا کہ **تَتَفَكَّرُوْا** (34:46) سوچا کرو۔

عزیزانِ من! بس ایک بات کہی تھی۔ وہ بات بھی نہیں' وہ تو صرف ایک لفظ ہی کہا ہے: **تَتَفَكَّرُوْا** (34:46) سوچا کرو۔ تو غور وتفکر تو وہ کرے گا جس کے سامنے کوئی مشکلات آئیں گی' کوئی حل طلب مسائل آئیں گے۔ مسائل تو وہ آنے تھے کہ خود نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جو مملکت قائم ہوئی ہے وہ دس لاکھ مربع میل پر ان لوگوں کی پھیلی ہوئی مملکت تھی۔ جن کو مکے سے گھروں سے نکال دیا تھا' وہ اتنی بڑی مملکت کے مسائل اور پھر قیصر وکسریٰ سے ٹکراؤ' وہ تو واقعی ان کو دن کو' میدانِ جنگ میں جانا پڑتا ہوگا' راتوں کو بیٹھ کے اگلے دن کے لیے مسائل حل کرنے پڑتے ہوں گے' اور ان کی کیفیت پھر مسائل حل کرنے کی ہوگی (3:190) کہا کہ **اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلٰفِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ** (3:190) ارض وسما کی تخلیق میں دن اور رات کے اختلاف میں صاحبانِ عقل وفکر کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نمایاں علامتیں ہیں' نشانیاں ہیں۔ یہاں **اولی الالباب** کہا ہے۔ ایک تو عقل

ہوتی ہے۔ایک یہ لفظ لب لباب آپ کے ہاں بھی ہے' جنوں تت کڈیا ہویا کیندے نیں۔ ❶ عقل مندوں میں سے بھی جو اولی الالباب ہیں' ان کے لیے بہت بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ ہیں کون لوگ؟ ان کے لیے کہا کہ **اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ** (3:191) یہ وہ صاحبانِ عقل وبصیرت اورارباب فکرونظر ہیں' جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے' بیٹھے' لیٹے قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے برعکس آج ہمارے ہاں ذکر کا پایا جانے والا مفہوم

عزیزانِ من! اب ہمارے ہاں تو آپ کو''ذکر'' کا پتہ ہی ہے کہ جن معنی میں ہمارے ہاں یہ آج کل ہوتا ہے۔عشاء کی نماز کے بعد تو ان مسجدوں کے اندر سے' پھر آدھی رات تک' وہ''ذکر جلی'' کی آوازیں آتی ہیں' جس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ قلب چلتا ہے۔ کہتے کیا ہیں' پوچھیے اس ❷ سے جس نے یہ کچھ کیا ہوا ہے۔ کیسے چلا ہوا تھا قلب' آج تک سنبھل ہی نہیں رہا۔ یہاں کہا ہے کہ **یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ** (3:191) وہ کہتے ہیں جی خدا کا ذکر کرتے ہیں: **یذکرون الله**۔کون ہیں یہ؟ یہ اولی الالباب ہیں' صاحبانِ عقل وفکر ہیں' غور وفکر والے ہیں' خدا کا ذکر کرتے ہیں' اس کے معنی یہ ہیں۔ یہ تو عقل مندوں کی بات ہے اور ہمارے ہاں تو یہ جو **اھل الجنة** ہیں' جنت میں جو لوگ جائیں گے ان کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ بیوقوف لوگ ہوں گے۔تو ترجمہ اس کا''بھولے بھالے'' کر دیتے ہیں۔گل تے اکوای ہیگی اے۔ ❸ مگر یہاں کہا ہے کہ **اُولِی الۡاَلۡبَابِ o الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ** (3:190-191)۔ یہ اولی الالباب کھڑے بیٹھے لیٹے ذکر اللہ کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! ذکر کے معنی ہوتا ہے''سامنے رکھنا' کسی چیز کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔'' کیا چیز ہے جو وہ کھڑے بیٹھے لیٹے کرتے ہیں؟ اس کے لیے کہا کہ **یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (3:191) وہ تخلیق ارض وسماوات کے اندر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔تو اولی الالباب کے معنی آ گئے: صاحبانِ عقل وفکر' صاحبانِ فکر۔ یہاں کہا کہ **یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (3:191) انتہائی غور وفکر کے بعد کھڑے بیٹھے لیٹے اس بات کو سامنے رکھتے ہیں' غور وفکر کے جو محل ہیں ان کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا** (3:191) اے ہمارے نشوونما

---

❶ جسے بات کا نچوڑ نکالا ہوا کہتے ہیں۔

❷ یہ اشارہ جی۔اے۔پرویزؒ (1903-1985ء) کا اپنی ہی طرف ہے۔

❸ تو یہ بات تو ایک ہی ہے۔

دینے والے! تو نے اس سلسلہ کارگہ کائنات کو تخریبی نتائج کے لیے پیدا نہیں کیا ہے' باطل پیدا نہیں کیا ہے اور اسی وقت دعا ہوتی ہے کہ **سُبۡحٰنَکَ** (3:191) تو اس سے بہت بلند ہے کہ اتنا بڑا کارگہ کائنات ہو اور تو اس کو باطل پیدا کر دے اس لیے **فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ** (3:191) جو ایسا سمجھتے ہیں' وہ جہنمی ہیں' ہمیں جہنم میں تم نہ پہنچا دینا۔ یہ تو صاحبانِ عقل و بصیرت کے لیے کہا گیا ہے کہ **یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (3:191) یہ ہے **الَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا** (25:64)۔ یہ لوگ راتوں کو مشورے کے لیے بیٹھتے ہیں اور پھر وہاں ان کے موضوع یہ ہوتے ہیں کہ کہاں جھکنا ہے' کہاں ڈٹ کے کھڑے ہونا ہے۔ **یَتَفَکَّرُوۡنَ** (3:191) وہاں غور و تفکر کرتے ہیں' ان معاملات کو اس طرح سے سلجھاتے ہیں۔ یہ ہے ان کا سجدہ' اور یہ ہے ان کا قیام' یہ ہیں **عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ** (25:63)۔ اس تمام تگ و تاز میں ان لوگوں کی **وَ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ جَہَنَّمَ ٭ۖ اِنَّ عَذَابَہَا کَانَ غَرَامًا** (25:65) یہ آرزو ہر وقت دل میں رہتی ہے اور پھر دعا بن کے لب تک آتی ہے کہ وہ باطل کے نظام کے تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں جو ہر غلط رو انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ ابھی ابھی یہاں یہ آیا تھا کہ جو ارض و سماوات میں فکر نہ کرنے والے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کچھ یونہی باطل پیدا کر دیا' اس سے اور بھاگو۔ یہ تو آلائشوں والی چیز ہے' دلدل ہے' کیچڑ ہے۔ یہ چیز **ما خلقنا باطل** ہے' اس کا نتیجہ بتایا گیا ہے کہ جہنم ہے۔ یہ دنیا' یہ کارگہ کائنات پر غور و فکر نہ کرنے والے' اسے قابلِ نفرت کہنے والے' اس سے دور بھاگنے والے' دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل اور خوار اور کمزور اور ناتواں اور محتاج اور بے کس قوم ہوتی ہے۔ یہی تو جہنم ہے۔

قرآنِ حکیم انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹتا ہے

یاد رکھیے' قرآن نے تین گروہوں میں انسانوں کو بانٹا ہے۔ ایک تو وہ ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ **سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ** (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جتنی قوتیں ہیں تمہارے لیے تابع تسخیر کی ہوئی ہیں۔ ان کو مسخر (Harness) کرو۔ مسخر کرنے کے بعد کہا کہ ان کو بالحق استعمال کرو' ان قوتوں کا استعمال تم قوانینِ خداوندی کے مطابق کرو۔ اب ایک گروہ وہ ہو گیا جو کائنات کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے اور ان قوتوں کو خدا کے قانون کے مطابق نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لیے صرف کرتا ہے۔ انہیں قرآن جماعت مومنین کہتا ہے۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو کائنات کی قوتوں کو مسخر تو کرتا ہے لیکن ان کا استعمال اپنی مرضی' اپنے مفاد' اپنے قوانین' کے تابع کرتا ہے' دوسروں کی تخریب کے لیے' خود موٹا ہونے کے لیے' کرتا ہے۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ لوگ بھی ہیں جن کا کہنا صرف یہ ہوتا ہے کہ **رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا** (2:200) بس اس دنیا کے اندر ہمیں سب کچھ ملتے چلے جانا چاہیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان کو دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے تو یہ

دنیا اور اس کا مفاد تو حاصل ہوجاتا ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ **مَا لَـهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ** (2:200) مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ تو یہ وہ ہوگئے جنہیں آج اس دور کے Materialists (مادیئین) مادہ پرست، سیکولر، مغرب کی قوتیں، جو جی میں آئے کہہ لیجیے۔ اب بہرحال انسانوں کا پہلا گروہ تو وہ ہے جن کو دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں، دوسرا گروہ وہ ہے، جن کو اس دنیا کی خوشگواریاں تو حاصل ہوجاتی ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ **مَا لَـهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ** (2:200) اس کے بعد کی زندگی کے اندر ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ تیسرے وہ ہوتے ہیں کہ جو اس دنیا اور فطرت کی قوتوں کو، سب کو، قابلِ نفرت قرار دیتے ہیں اور ترک کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے لیے قرآن کہتا ہے ان کے لیے نہ دنیا میں کوئی حصہ ہوتا ہے نہ آخرت میں: **خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ** (2:85) اس دنیا میں بھی ذلت کی زندگی، قیامت میں بھی ان کے ہاں عذاب کی زندگی۔ یہ تیسرا گروہ ہے جس میں ہم شامل ہیں۔ اس کے بعد یہ خود فریبی ہے کہ نہیں صاحب! ہم تو تسبیح پھیرتے ہیں، ورد وظیفے کرتے ہیں، نفل پڑھتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں۔ وہ پوچھتا یہ ہے کہ اب دنیا کے ثواب کے اندر تمہارا کتنا حصہ ہے اور اگر یہاں ذلت وخواری ہے تو وہ کہتا ہے کہ **وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى** (17:72) جو یہاں کا اندھا ہے، وہ وہاں کا بھی اندھا ہی ہوگا۔ ہو نہیں سکتا کہ یہ دنیا میں ذلیل وخوار ہو، اور جو عاقبت ہے وہاں وہ معزز اور سرفراز ہو۔ زندگی تو ایک غیر منقطع عمل (Continous Process) ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ یہ پودا اگتے ہی مرجھا گیا ہو اور اس کے بعد اس کے اندر بڑے شاندار پھل لگیں؟ جو ابتدا میں ہی مرجھا گیا وہ آخر تک مرجھایا ہوا رہتا ہے۔ یہ پہلا انسانوں کا گروہ ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بارِ خدایا! جہنم کی ذلت اور خواری کی زندگی سے ہم کو محفوظ رکھ۔

نتائج کی دنیا انسانی اعمال کی ہی پیداوار ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ **اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا** (25:65) جہنم کا عذاب غراماً ہے۔ یہ غراماً [1] عجیب لفظ ہے، انسان جو کوئی عمل کرتا ہے، وہ تو کام کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اور اس کا جو نتیجہ یا خمیازہ یا Consequence ہے وہ اس کے پیچھے چلتا ہے کہ چل کہاں جاتا ہے۔ اس نتیجے کے ظاہر ہونے تک کے لیے تھوڑا سا مہلت کا وقفہ ہوتا ہے، جس کے بعد اس نتیجہ نے اسے پکڑنا ہوتا ہے۔ یہ بھی اس کی بڑی رحمت ہے جو اس نے مہلت کا وقفہ رکھا کہ اگر غلط قدم اٹھ گیا ہے تو کسی وقت احساس ہوجائے تو واپس لوٹ سکتا ہے۔ اس

---

[1] اس کا مادہ "غ ر م" ہے۔ تاج العروس اور محیط المحیط کے مطابق "غرام" وہ مصیبت ہے جو انسان کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہوجائے، ایسی مصیبت جس سے چھٹکارہ نہ ہو، جو ہر وقت پیچھے لگی رہے، جس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہو (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن، ص 1225)

لیے یہ جو اس کا نتیجہ ہے، وہ اس کے پیچھے لگا رہتا ہے لیکن یہ خدا کا قانونِ مکافات اسے اسی وقت نہیں پکڑ لیتا۔ اگر یہ اصلاح کے لیے لوٹتا نہیں ہے، اپنی اصلاح نہیں کرتا تو اس کے بعد پھر یہ اس کو جھپٹ لیتا ہے۔ یہ ہے **اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا** (25:65) اس کا عذاب جو ہر وقت پیچھے پیچھے لگا رہتا ہے جس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہے۔

عذاب سے بچنے کا طریق

آگے قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس سے بچنے کی کیا صورت ہے۔ کہا کہ **اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا** (25:66) جہنم تو وہ عذاب ہے کہ اس کے اندر مستقل طور پہ رہنا تو ایک طرف رہا، یونہی تھوڑے وقت کے لیے بھی اس میں جو قرار ہے، وہ بھی بڑا عذاب ہے۔ کچھ وقت کے لیے یہ مستقر اور مقام ہے۔ کیا بات قرآن کہہ گیا ہے! ابتدا میں جو قومیں جہنم میں گرفتار ہوتی ہیں، تو وہ مستقر ہی ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر سے پھر وہ نکل جائیں لیکن اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر وہ مقام ہی ان کا ہو جاتا ہے۔ وہ بہرحال نہایت بری قیام گاہ ہے۔ ان کی یہ دعائیں ہوتی ہیں **وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا** (25:67) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے، خواہ آپ اس کو انفرادی طور پہ لے لیں یا اس نظام میں لے لیں، ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس زندگی کا جو بھی سامان ہوتا ہے، اسے مال و دولت کہیے، کچھ بھی کہیے، آپ اسے سامانِ زیست کہتے ہیں، متاعِ حیات کہتے ہیں، بہرحال ان کی کیفیت یہ ہے کہ نہ تو وہ اسے اس طرح سے کھلا رکھتے ہیں کہ کسی کی ضرورت سے زیادہ خرچ ہو جائے اور نہ ہی اس طرح کہ کسی کی ضرورت رکی رہے۔ وہ افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

اسراف کا قرآنی مفہوم

''اسراف'' کا لفظ عربوں کے ہاں بڑے عجیب معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ کنویں کے پانی کی نالیوں میں سے پانی کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے جاتا ہے۔ یہ آج کل ہمارے ہاں بھی انکوائری کمیٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اصل میں تو یہ یو این او (UNO) والوں نے اس لیے بنائی ہوئی ہیں کہ یہ جو اس طرح اریگیشن (آب پاشی) ہوتی ہے اُس سے ذرا یہ پتہ چلے کہ پانیوں کے لیے اس کا نتیجہ کیسے نکلتا ہے۔ یعنی یہ دیکھیں کہ کتنے فی صد پانی ضائع ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ جس طریق سے اے جیہڑ یاں آڈاں بنایاں ہویاں ہوندیاں،[1] یہ ان کو نالیاں ہی کہتے ہیں، جن سے پانی گزر کر جاتا ہے، ان سے کتنے فی صد پانی ضائع ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا یہ ہے کہ کم از کم کوئی

---

[1] یہ جو نالیاں بنائی ہوتی ہیں۔

اڑتالیس فیصد پانی راستے میں ضائع ہو جاتا ہے' اِدھر اُدھر سے لیک (Leak) کرتا رہتا ہے تو وہ وہاں نہیں پہنچتا۔ آپ نے زمیندار کو دیکھا ہوگا' جب کھیتوں کو پانی لگایا ہوا ہوتا ہے' وہ ساری رات اپنی کہی موڈے تے رکھ کے آڈاں دے اردگرد پھردا رہندا اے: ایتھوں بند کرا وتھوں بند کر۔ ❶ یہ جو راستے میں ہی پانی کا اِدھر اُدھر نکل جاتا ہے' اسے وہ عرب اسراف کہتے تھے۔ بڑی عجیب قوم تھی صاحب! اسراف کا یہ لفظ'' کھلے رکھنے کے معنی میں تھا۔''

اب ایک تو یہ ہے کہ اس کو یہاں سے کھولا جائے اور وہ کھیت میں پہنچ جائے۔ وہ تو صحیح بات ہوئی اور اگر راستے میں ہی اِدھر اُدھر وہ بہتا چلا جائے تو آپ دیکھیں کہ یہ وہی ہے جسے آپ ضائع ہو جانا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس مال و دولت' سامانِ زیست آتا ہے تو وہ اسے اس طرح سے صرف نہیں کرتے کہ وہ راستے میں ہی ضائع ہو جائے۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اُسے جس مقام پہ پہنچنا ہے' وہ وہاں ہی جا کے پہنچے اور راستے میں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے اور نہ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ڈیم کے اندر جمع ہوا ہے تو ڈیم کے آگے سے منہ ہی نہ کھولیں' جمع ہونے دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ صحیح صورت یہ ہے کہ اس کو بہتے پانی کی طرح رواں رہنا چاہیے۔ اس کے برعکس یہ نہ ہو کہ وہ اُسے کھولیں ہی نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ یہ ہے کہ **يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ** (107:7) رزق کے سرچشموں کو بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات کے لیے کھلا رہنا چاہیے' ان کے آگے بند لگا کر ان پر اپنا قبضہ نہیں جما لینا چاہیے۔

عزیزانِ من! سورۃ الماعون میں ہے کہ **وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ** (107:4)۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کون ہیں جن کے لیے تباہی ہے: **الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ** (107:5) یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کے مقصد کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں **الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ** (107:6) سمجھتے یہ ہیں کہ یہ جو نقل و حرکت دوسروں کو نظر آ جاتی ہے' یہ نماز ہے حالانکہ **وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ** (107:7) رزق کے ان چشموں کو جو بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی پیاس بجھانے کے لیے جانا چاہیے تھا' اس کے آگے بند لگا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے۔

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام تو آبِ حیات کے بہتے ہوئے چشمے کی مانند ہے

ایک تو ہے کہ **وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ** (107:7) جس رزق کو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تھا' وہ اسے روکتے ہیں اور اس طرح ضرورت مندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں۔ قرآن نے جنت کے ایک چشمے کو سلسبیل کہا ہے۔ تو یہ ہے رزق کا سرچشمہ جو بہتا ہوا چلا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیسے چلا جائے' کبھی کبھار آپ نے دیکھا ہوگا کہ مٹی کا تیل بیچنے والے آتے تھے' باہر آواز دیا کرتے

---

❶ اپنی کسی کندھے پر رکھے' ان نالیوں کے اردگرد چلتا پھرتا رہتا ہے۔ (کام کیا ہے؟ یہ کہ) کبھی اِدھر سے (نالی) بند کرے' اور کبھی اُدھر سے۔

تھے کہ بی بی جی! مٹی دا تیل لے لؤ پھر آ گے گئے۔ سلسبیل ایسا ہی آبِ حیات کا چشمہ ہے جو جاتا ہوا راستے میں آوازیں دیتا جائے کہ پانی لے لو۔ رزق کے چشموں کو روکے نہیں' کھلا رکھے۔ اسراف نہ ہو کہ بے جا مقامات کے اوپر وہ صرف ہونا شروع ہو جائے۔ عبادالرحمٰن کی یہ چیزیں آتی ہیں۔

خلافت وملوکیت میں فرق

حضرتِ عمرؓ(581-644/45AD) سے پوچھا گیا تھا کہ خلافت کسے کہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں تو کوئی لمبا چوڑا افلاسفر نہیں ہوں' یہ بات تو نہیں' میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ خلافت یہ ہے کہ پوچھا جائے گا کہ ''تم نے کہاں سے مال لیا اور کہاں خرچ کیا'' بس اتنی سی بات میں جانتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کہنے کی بات کیا رہ جاتی ہے! ''کیسے لیا اور کہاں خرچ کیا؟'' اس میں ساری بات آ جاتی ہے۔ اگر اس کا جواب دے دیا تو خلافت ہے' ورنہ ملوکیت۔ ''کیسے لیا اور پھر صرف کیسے کیا؟'' اپنے لیے روک لینا تو ایک طرف رہا' قرآن تو یہ کہتا ہے کہ جس کو آپ کہتے ہیں بے جا صرف کر دینا کہ اس کھیت تک نہ پہنچے جہاں اس کو پہنچنا چاہیے تھا' اور وہ صحیح مقامات کے اندر صرف نہیں کرتا تو وہ کہتا ہے کہ یہ عبادالرحمٰن کی صفت نہیں ہے۔ کہا کہ **بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا**(25:67) مومن وہ ہیں جو اس کے بین بین اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں: قواما کہ جس سے زندگی قائم رہتی ہے' ضائع ہو جائے جب بھی قائم نہیں رہتی اور اگر اس کو روک لیا جائے تو جب بھی قائم نہیں رہتی۔ یہ ہے قواما۔ پھر کہا کہ **وَ الَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ** (25:68) ان کی کیفیت یہ ہے کہ لا الٰہ کہنے کے بعد صرف الا اللہ ایک خدا کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی اور کو آواز نہیں دیتے۔ یہ ہے توحید۔ الا اللہ کے معنی ہیں ایک خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرو لیکن انسان یہ کر نہیں سکتا جب تک پہلے لا الٰہ نہ کہے یعنی یہ کہے کہ ''کوئی صاحب اقتدار نہیں' اللہ کے سوا میں ہر ایک سے انکار کرتا ہوں۔'' یہ بہت بڑا نعرہ انقلاب ہے۔

موچی گیٹ لاہور کے باہر اقبالؒ کا لا الٰہ کہنا

عزیزانِ من! اقبالؒ (1877-1938ء) نے اُس وقت ٹھیک کہا تھا جب ہم لڑکھڑا کر گرنے والے ہو گئے تھے۔ انہوں نے موچی دروازے کے باہر یہ شعر پڑھا:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم

جب میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کہ

دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

مجھے لا الٰہ کی مشکلات کا پتہ ہے' میں کیسے کہہ دوں کہ میں مسلم ہوں۔ لا الٰہ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ ہر اقتدار کی نفی' ہر ایک سے انکار' ہر ایک

سے بغاوت ہے۔ ابھی یہ پہلا مرحلہ ہے' ابھی وہ اِلا کا مثبت نہیں آیا' وہ ایک اللہ کا اقرار تو بعد میں آنا ہے۔ پہلا مرحلہ تو ہر ایک سے انکار کا ہے۔ عزیزانِ من! آپ کسی ایک نصب العین کی طرف اپنا رخ نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ باقی ہر طرف سے اپنا رخ نہ پھیر لیں۔

اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام یہ تھا' مقامِ ابراہیمی یہ تھا

عزیزانِ من! یہ چیز تھی' جو اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام نے ہمیں بتائی تھی کہ **اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ** (6:80) ❶۔ یہاں کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ مشرک کون نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہے جو یہ اعلان کرتا ہے کہ میں دنیا کی ہر جاذبیت اور کشش سے منہ موڑ کر صرف تیری طرف دیکھ رہا ہوں۔ کہا کہ یوں انسان شرک سے پاک ہو کر (موّحد) ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر سمت سے منہ موڑ کر اُس ایک طرف رخ کرنا ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے وہ کتنی عظیم چیز تھی' مگر ہمارے ہاں وہ کتنی سہل ہو گئی!

ہر نماز سے پہلے کی جانے والی نیت کا اصل مقصد

آپ کو معلوم ہے کہ جسے ہر نماز کی نیت کہتے ہیں وہ نماز کی نیت یہ ہوتی ہے: **اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا** (6:79) تے اگے ہونداا ے پئی کتھے اللہ اکبر کہہ کے اے رکوع اچ نہ چلا جائے' پہلی رکعات جیہڑی اے میری او ماری جائے گی۔ ❷ اس آیت (6:80) میں لفظ حنیفا آیا ہے۔ حنیف ہوتا ہے: ناک کی سیدھ اس طرح جانا کہ اِدھر اُدھر دیکھے ہی نہیں' تکے ہی نہیں۔ یہ ہے اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام کہ میں اپنی تمام توجہات کا مرکز اس بے مثال ذات کو سمجھتا ہوں جو ارض و سما کو عدم سے وجود میں لائی۔ انہی طرح کے لوگوں کے بارے میں کہا کہ **لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ** (25:68) ❸۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن عبادالرحمٰن کی یہ خصوصیات بیان کر رہا ہے اور اگلی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ **وَ لَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ** (25:68) ❹۔ ہر انسانی جان کو خدا نے واجب التحریم بنایا ہے۔ یاد رکھو' ہر انسان واجب التکریم ہے' ہر زندگی' ہر جان کا ضائع کرنا

---

❶ میں اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو اس تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے (اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اس سے نہ ستاروں کو مفر ہے اور نہ چاند اور سورج کو مجالِ سرتابی) اس لیے میں اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ میرا دوٹوک فیصلہ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 305)۔

❷ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ کہیں اللہ اکبر کہہ کر یہ رکوع میں نہ چلا جائے۔ اس سے جو میری پہلی رکعت ہے وہ ماری جائے گی۔

❸ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے قانون واقتدار کے ساتھ کسی اور کا قانون واقتدار تسلیم نہیں کرتے۔ کسی کی اطاعت و محکومیت اختیار نہیں کرتے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 830)۔

❹ اور (یہ وہ لوگ ہیں جو) انسانی زندگی کو' جسے خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے' کبھی تلف نہیں کرتے' بجز اس کے کہ انہیں حق و انصاف کی خاطر ایسا کرنا پڑ جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 830)۔

خدا نے حرام قرار دیا ہے لیکن **الا بالحق** حق کی خاطر یہ کیا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کی قدر و منزلت

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اگر کسی کو جرمِ قتل کی سزا میں قتل کیا جاتا ہے' جان تو وہ بھی لینی ہوتی ہے لیکن وہ جان بالحق لی جاتی ہے' حق کے مطابق لی جاسکتی ہے' اس کے بغیر نہیں اور الحق قانونِ خداوندی ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ مومنین کسی جان کو تلف نہیں کرتے۔ قرآن کے نزدیک جان کی گراں قدر قیمت ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ جس کسی نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا' یوں سمجھو کہ اس نے تمام نوعِ انسانی کی جان ماردی۔ اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا جس نے ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا' اور جس نے کسی ایک زندگی کو بھی بچا لیا یوں سمجھو جیسے اس نے پوری انسانیت کو بچا لیا۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کی اتنی قیمت ہے لیکن بالحق اس زندگی کو تلف کیا جاسکتا ہے اور یہ ہے بھی ضروری کہ جس انگلی کا ناسورا تنا زہر آلود ہو جائے کہ وہ زہر باقی حصہ جسم کو بھی تلف کرنے کا موجب بنتا ہو' انگلی کے اتنے حصے کو کاٹ دینا ہی ضروری ہوتا ہے۔ یہ بات اور جگہ آئے گی تو میں عرض کروں گا کہ قرآن نے اس انسانی زندگی کو تلف کرنا یا قتل کرنا کہاں جائز قرار دیا ہے۔ یہاں اس نے **الا بالحق** کہا ہے۔ اس کے علاوہ عبادالرحمٰن کی اور خصوصیات کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کہا کہ **وَ لَایَزْنُوْنَ** (25:68)۔ اس کا عام ترجمہ صرف یہی ہے کہ وہ زنا کے مرتکب نہیں ہوتے۔

جنسیاتی بے راہ روی قوموں کو مضمحل کر دیتی ہے

عزیز برادران! یہ اگلی بات ایسی کہی ہے جس کا اقوام کے عروج و زوال کے ساتھ بڑا ہی گہرا تعلق ہے۔ آج دنیا میں جو تحقیق ہو رہی ہے' وہ بتاتی ہے کہ چودہ سو سال پیشتر یہ کچھ کہنے والا کوئی انسانی ذہن نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق یہاں کہا ہے کہ **وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا** (25:68) زنا کے مرتکب فرد ہوں' یا کوئی قوم ہو' اس کا نتیجہ اثام ہوتا ہے۔ یہ لفظ اثاما ہے' اثم سے ہے اور ہمارے ہاں اثم کے معنی گناہ کے کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ جتنے معصیت' عدوان' جرائم' اثم کے الفاظ قرآن میں آتے ہیں گناہ ہی ان کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے: گناہ ہوندا اے جی۔ [1] قرآن نے یہ الگ الگ جو لفظ استعمال کیے ہیں تو جیسا میں نے عرض کیا تھا یہ شاعری نہیں ہے۔ ہر لفظ اپنے مقام پہ ہمالیہ کی طرح محکم ہے۔

یہ اثاما کیا چیز ہے؟ عربوں کے ہاں کارواں کے اندر یہ جتنے بھی اونٹ وغیرہ ساتھ چلتے تھے' برابر کے قوی ہوتے تھے۔ اگر وہ اونٹ طاقتور ہوتا تھا تو وہ کارواں کے باقی اونٹوں کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ جس اونٹ یا اونٹنی کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ کمزور ہو جائے' مضمحل

---

[1] یہ گناہ ہوتا ہے' جی!

ہو جائے، ناتواں ہو جائے، اور کارواں کے ساتھ نہ چل سکے، پیچھے رہ جائے، اسے وہ ناقہ آثمہ کہتے تھے اور یہ جو اضمحلال پیدا ہو جاتا تھا، جو باقی سب کے ساتھ نہ چل سکے، باقی اقوام کے ساتھ نہ چل سکے، پیچھے رہ جائے، وہ تھا جس کو وہ اثم کہتے تھے۔ یہاں کہا کہ یہ زنا کیا چیز ہے؟ یہ انسان کے جنسی جذبے کی تسکین ہے، جسے آپ اختلاطِ جنسی کہتے ہیں۔ میری بیٹیاں بہنیں معاف رکھیں، یہ الفاظ کہنے پڑتے ہیں۔ جنسی جذبے کی تسکین، یہ ایک چیز ہے جو انسان کے اندر ہے۔ اب اس کے لیے اس نے حدود مقرر کر دی ہیں اور کہا ہے کہ ان حدود کے اندر رہ کر اس جذبے کی تسکین کی جائے۔ اسے اس نے جائز قرار دیا۔ اس کا نتیجہ اثم نہیں بتایا۔ اگر اس کے اندر حدود فراموشی ہو جائے تو اس کا نام زنا رکھا جاتا ہے۔ یہ جنسی جذبے پہ کنٹرول نہ ہونا، ایک بڑی گہری سی چیز ہے، حدود فراموشی وہ چیز ہے جو آج ہمارے ہاں مغرب میں عام ہے، تاریخ انسانیت میں بھی یہ دور گزرے ہیں جہاں اس کے اوپر کوئی خاص پابندیاں عائد نہیں کی جاتی تھیں۔

جنسیات پر ڈاکٹر انون کی تحقیق

آپ کو یاد ہے میں اکثر ایک کتاب کا حوالہ دیا کرتا ہوں۔ انون ❶ کی وہ کتاب ہے: Sex and Culture (جنسیات اور کلچر)۔ یہ ہمارے دور کا ایک بہت بڑا محقق ہے۔ اس نے سیکس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا لیا تھا، دنیا کے جو اسی (80) قبائل ہیں، جو ابھی تک تہذیب کے زمانے سے پہلے کی زندگی بسر کر رہے ہیں، انہی اسی (80) قبائل کے اندر رہ کر اس نے ان کی زندگی کی ریسرچ کی اور سولہ (16) مہذب اقوام کے اندر وہ رہا، اس نے ان کی زندگی پہ ریسرچ کی اور اس کے بعد اپنے ریسرچ کا، جو اس کی تحقیق کا ماحصل تھا، وہ اس نے اس کتاب کے اندر دیا ہے۔ خود تحقیق کر کے اس نے یہ چیز کہی ہے کہ میری پوری ریسرچ نے اور تاریخی شواہد نے یہ بات بتائی کہ جس قوم نے بھی جنسی جذبے کی تسکین کے لیے حدود اور پابندیاں مقرر کی ہیں اور اِن میں سب سے بڑی پابندی یہ ہے کہ وہ ازدواجی زندگی شادی سے قبل عصمت کے اوپر زور دیتی ہے کہ اس کی عصمت شادی سے پہلے برقرار رہے، جس قوم نے بھی اس چیز کو ملحوظ رکھا ہے، وہ دنیا میں سرفرازی، سربلندی، تہذیب کے بلند ترین مقام پہ پہنچی ہے، اور جس قوم نے جتنی جتنی اس میں ڈھیل دی ہے اتنی ہی وہ زوال پذیر ہوتی ہے اور اس نے لکھا ہے کہ کوئی قوم اگر یہ حدود توڑ ہی دے تو تاریخ بتاتی ہے کہ سو سال سے زیادہ وہ قوم زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ اس مسئلے کو یہ اتنی بڑی اہمیت ہے۔

اب وہ جو کہتا ہے کہ یہ جو حدود توڑنے کے بعد، اس جنسی جذبے کی تسکین ہے، وہ قومیں دوسری قوموں کے ساتھ چلنے کے قابل ہی

---

❶ اس کتاب کا حوالہ یہ ہے:

Unwin, J.D, M.C, Ph.D (Cantab) (1934). Sex and Culture. London: Oxford University Press, Humphrey Milford.

نہیں رہتیں' ان میں اضمحلال آ جاتا ہے' کمزوری آ جاتی ہے' ضعف آ جاتا ہے' وہ اپنے کارواں سے پیچھے رہ جاتی ہیں اور قرآن نے اس کو اثم کہا ہے' وہ ناقہ آثمہ ہے جو کارواں سے' پیچھے رہ جاتی ہے۔ انون آج لکھتا ہے' یہ اس کے الفاظ ہیں کہ وہ قوم دنیا کی زندہ قوموں کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں رہتی جس کے اندر جنسی جذبے کی تسکین کے لیے اس قسم کی پابندیاں نہ عائد کی گئی ہوں۔ وہ قوم زندہ قوموں کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا**(25:68) جو ان پابندیوں کو توڑتا ہے' یاد رکھو! جو قوم ایسا کرتی ہے' اس میں ایسا اضمحلال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کارواں کے ساتھ چلنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔ اس کے قوائے عملیہ مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہے۔ یہی کیفیت افراد کی ہوتی ہے۔ یہ کیا بات ہے؟ کیوں ایسا ہوتا ہے؟ اس نے تو تاریخی شواہد ہی دیئے ہیں۔ ہوتا کیوں ہے؟ انسان کے اندر ایک خواہش بیدار ہوتی ہے' وہ اسے پورا کرنا چاہتا ہے۔ اگر تو اس کے سامنے کوئی پابندی نہیں ہے تو پھر کنٹرول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' خواہش پیدا ہوئی اسے پورا کیا۔ اگر سامنے کوئی پابندی ہے' وہ جو خواہش ہے یا جو جذبہ ہے' وہ بیدار ہو رہا ہے' وہ کچھ تقاضا کر رہا ہے' اس کے سامنے پابندی ہے کہ یہ یہاں یوں نہیں ہے تو یوں اس کی تسکین ہو سکتی ہے۔

انسانی جذبات کو کنٹرول کرنے کا طریق ارادے کی مضبوطی میں مضمر ہے

آج کے سائیکولوجسٹ اس چیز کے اوپر پہنچے ہیں کہ اس کنٹرول کے لیے بڑے Strong Nerves (مضبوط اعصاب) کی ضرورت ہوتی ہے' نروس سسٹم (اعصابی نظام) بڑا طاقتور ہونا چاہیے۔ یاد رہے کہ اس کنٹرول کے لیے یہ بڑی گہری چیز ہے۔ انسان کا وہ جذبہ تو اندر سے ایک تقاضا کرتا ہے لیکن سامنے وہاں رکنے کے لیے ایک پابندی ہے یہ جو کشمکش ہوتی ہے یعنی جذبہ اپنی تسکین چاہتا ہے جبکہ پابندی روکنا چاہتی ہے' تو اس حالت میں اُسے کون روک سکتا ہے؟ وہ کہ صرف جس کے اعصاب بڑے مضبوط ہوں اور اعصاب تو ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتے ہیں۔ یاد رکھو! جسے ارادہ کہتے ہیں' یعنی بڑا مضبوط ہونا' وہ اعصاب کی مضبوطی ہوتی ہے۔ اگر وہاں وہ ڈھیل دے دیتا ہے' پابندی کے اوپر رکتا نہیں ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ اعصاب کمزور ہو گئے اور اگر بار بار ایسا کرتا ہے' بار بار اعصاب کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جنسی تقاضے اور طبعی تقاضے میں بنیادی فرق ہے

آپ کو معلوم ہے کہ جو جنسی امراض میں گرفتار ہوتے ہیں' ان کا علاج سب سے پہلے کیا جاتا ہے: ان کے اعصاب کو' نروس سسٹم کو' مضبوط کیا جاتا ہے۔ یہ کنٹرول کوئی آسان چیز نہیں ہے اور یہ جو انسانی جذبات کا شدید تریں تقاضا ہے جنسی تقاضا ہوتا ہے۔ انسان اس کے اندر پاگل ہو جاتا ہے' یہ فوری بیدار ہوتا ہے اور اس میں اتنی شدت ہوتی ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس جنسی جذبے کے بعد وہ اس

قدر گھناؤنے جرائم کر دیتے ہیں' یہ اس کی شدت کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! ایک چیز تو ہوتی ہے طبعی تقاضا مثلاً پیاس لگنا۔ یہ جذباتی تقاضا نہیں ہے' بھوک لگنا جذباتی نہیں ہے۔ یہ انسان کی جو فزیکل لائف (جسمانی زندگی) ہے' یہ اس کا تقاضا ہے۔ دیکھا قرآنِ کریم کی عظمت! یہ کھانے پینے کا جو مسئلہ ہے اس میں تو اس نے یہ کہا ہے کہ یہ یہ چیزیں حرام ہیں' پابندی ہے' ان کے قریب نہ جانا' لیکن کہا یہ کہ جہاں تم دیکھو کہ تمہاری جان پہ بن آئی ہے' اس کے بغیر چارہ نہیں ہے' موت ہو جائے گی' تو تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ جان کو بچانے کے لیے یہ حرام چیز کھا لو۔ یہ طبعی تقاضا ہے لیکن جو جذباتی تقاضا ہے' یہ جنسی تقاضا جذباتی ہوتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر آپ اس کا خیال نہ کریں تو یہ از خود بیدار ہی نہیں ہوتا۔ بھوک پیاس کی یہ کیفیت نہیں ہے کہ آپ چاہیں تو پیاس لگے اور آپ نہ چاہیں تو پیاس نہ لگے۔ آپ چاہیں' نہ چاہیں' بڑے سے بڑے کسی کام میں مستغرق ہوں' غرق ہوئے ہوئے ہوں' پیاس لگتی ہے' تو وہ تو اندر سے خود لگتی ہے' لگتی چلی جاتی ہے' بڑھتی چلی جاتی ہے' بھڑکتی چلی جاتی ہے' تا آنکہ آپ کو وہ تنگ کر دیتی ہے کہ اٹھ کے پانی پیو۔ جنسی جذبے کی یہ کیفیت نہیں ہے یہ تو انسان خود اس کو بیدار کرتا ہے:

عشق پر زور نہیں' ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اس کی کیفیت ہی یہ ہے کہ اس آگ کو خود بنانا پڑتا ہے۔ جب لگ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے: بجھائے نہ بنے۔ انسان کی' فرد کی یا کسی قوم کی قوت ارادی یا نروس سسٹم کی وہ پختگی جو اس جذبے کے اندر ہے' یہ تو اس کا ایک ٹیسٹ ہوتا ہے اور جو قوم اس جذبے کی تسکین کے لیے کنٹرول یعنی پابندیاں عائد نہیں کرتی' بے باک ہونے دیتی ہے' آپ دیکھیں گے کہ وہ ان کی پوری نسل زندگی کے ہر شعبے میں بے باک اور سرکش ہوتی ہے۔

مغربی معاشرے میں نوجوانوں کی حالتِ زار

مغرب میں ہوا کیا ہے؟ وہاں کا نوجوان کسی کے کنٹرول میں ہی نہیں۔ وہ رسے تڑا کے بھاگ گیا ہے' وہ سنبھالے سنبھلتا ہی نہیں ہے۔ اس کو اپنے آپ پہ کنٹرول نہیں رہا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ اگر دروازے بند کر دیتے ہیں تو روشندان میں سے منہ نکال لیتا ہے' انہوں نے شراب بند کی چرس پینی شروع کر دی' راکٹ پینے شروع کر دیئے' یعنی کیفیت ان کی یہ ہوگئی ہوئی ہے۔ اپنے آپ پہ کنٹرول ہی نہیں ہے۔ جس پوری قوم کی یہ صورت ہو جائے تو اسکے افراد کو اپنے جذبات پہ کنٹرول ہی نہ رہے تو وہ قوم دنیا میں کیا کر سکتی ہے۔

اس زوال کے اسباب معلوم کرنے کے لیے کمیٹیوں کی تشکیل کی ضرورت نہیں

آپ اپنے زوال کے اسباب گنانے کے لیے بھی قومی کمیٹیاں بٹھاتے ہیں۔ کمیٹیاں بٹھانے کی ضرورت کیا ہے؟ اس ایک چیز کو لیجیے۔ قرآن نے کہا تھا کہ اگر جنسی جذبات کے اوپر کنٹرول نہ رکھا جائے' پابندیاں نہ رکھی جائیں' تو قوم کی قوتیں مضمحل (اثاماً) ہو جاتی ہیں' وہ دوسری زندہ قوموں کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ ہم نے اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ نہیں جی' ہم تو ادھر نہیں جاتے۔ بہت اچھا جی' نہیں جاتے۔ آپ کیا کرتے ہیں؟ چار چار تو بیویاں ہیں' لیکن اس میں بھی ایک بڑی دلچسپ چیز ہے۔ برفو [1] نے ایک کتاب لکھی ہے: The Mothers۔ اس کے اندر اس نے ایک چیز لکھی ہے۔ وہ بھی تحقیق کرتا پھرتا تھا۔ کہنے لگا: میں آپ کو بتاتا ہوں یہ جو Monogamy (وحدتِ زوج) ہے' یعنی ایک وقت میں ایک بیوی کا رکھنا' تو اس میں کیا تماشا ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے ایک کرد کو دیکھا۔ اس کرد نے کہا کہ یہ میری اکتالیسویں بیوی ہے۔ میں نے کہا کہ اکتالیس بیویاں ایک وقت میں؟ کہنے لگا: جی لاحول ولا' صاحب! میں نے نکاح میں تو ایک وقت میں ایک ہی بیوی رکھی ہے۔ جس طرح سے ہم سال کے بعد کیلنڈر بدل دیتے ہیں' یہ ریلوے ٹائم ٹیبل ہر چھٹے مہینے کے بعد بدل دیتے ہیں' اسی طرح وہ ہر دوسرے تیسرے چوتھے مہینے پہلی بیوی کو ایک دو تین کرتا تھا' نئی بیوی لے آیا۔ آپ کے ہاں بالکل شرعاً جائز ہے' چار تو بیک وقت جائز ہیں اور اس کو' جب جی چاہے' میاں نے ایک دو تین کیا اور وہ بیچاری اپنے ان سارے بچوں کو لیتے ہوئے روتی دھوتی ہوئی کہاں جا سکتی ہے۔ پیکے ای جانا ہونداا ے نافیر' [2] اور یہاں نئی نویلی ایک اور لے آئے۔ جب جی چاہے اس کو نکال دیجیے' پھر ایک اور لے آئیے۔

ہمارے ہاں چار چار بیویوں کے علاوہ ان گنت لونڈیوں کی اجازت

اس پہ ہی بس نہیں کیا۔ لونڈیوں کی اجازت آ گئی' بلا تعداد' بلا نکاح' تین تین ہزار آپ کے ہاں موجود ہیں۔ یہ جو ہارون رشید وغیرہ خلفاء کہے جاتے ہیں' ذہن میں ان کا نقشہ بڑا مقدس نظر آتا ہے۔ سلاطین کے ہاں تین تین ہزار' ایک ایک کے حرم کے اندر لونڈیاں تھیں۔ اس وقت تک یہ کیفیت آپ کے ہاں چلی آ رہی ہے۔ آج بھی آپ کے ہاں' یہ جو نئے مفسر ہیں' یہ مودودی صاحب [3] کی تفسیر

---

[1] Briffault R: The Mothers۔ اس کتاب کا حوالہ بھی ڈاکٹر انون نے اپنی مشہور زمانہ کتاب Sex and Culture (جنسیات اور کلچر) کے ص (438) پر دیا ہے۔ یہ جنسیات کے متعلق ایک بڑی وقیع اور ضخیم کتاب ہے: The Mothers۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب کا حوالہ یہ ہے:

Briffault, Robert. (1919). The Making of Humanity (First Edition). London: George Allen & Unwin Ltd.

[2] پھر تو اسے اپنے ماں باپ کے ہاں ہی جانا ہوتا ہے۔

[3] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1803-1979ء)

اٹھالیجیے۔لکھا ہوا ہے کہ جنگ کے اندر جو دشمنوں کی عورتیں گرفتار ہو کر قیدیوں کی حیثیت سے آئیں گی وہ سپاہیوں میں تقسیم کر دی جائیں گی (معاذ اللہ' معاذ اللہ)۔ یہاں لفظ ہے"استعمال کے لیے۔" پھر ان لونڈیوں کے متعلق یہ ہے کہ جب جی چاہے آپ ان کو فروخت کر سکتے ہیں' دوسروں کو تحفتاً دے سکتا ہے' تعداد کوئی نہیں' نکاح کی ضرورت نہیں' لیکن اسے زنا نہیں کہا جا سکتا۔

یہ سور نہیں بکرا ہے

عزیزانِ من! زنا' نہ کہنے سے کیا یہ چیز بدل جائے گی؟ سورنوں بکرا کہو گے تے حلال ہو جائے گا؟ [1] یہ کیا چیز ہے؟ یہ کیا چیز تھی جسے قرآن نے زنا کہا تھا؟ یہ جنسی جذبے کی تسکین کے لیے ایک حد مقرر کی ہوئی ہے' پابندی عائد کی ہوئی ہے' عزیزانِ من! اقوام کی پابندی کی ایک تو یہی چیز تھی کہ اس کے لیے سوائے سلسلہ نکاح کے' ازدواجی زندگی کے' کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ازدواجی زندگی کے اندر باہمی انتخاب سے ایک بیوی ہو' اور طلاق یہ چیز نہیں ہے کہ ایک دو تین کیا اور چل ختم کیا یہ نیلام گھر۔

اصل پردہ تو نگاہوں کو بیباک ہونے سے روکنے کا ہے

قرآن میں دیکھیے زنا پر کتنی پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں۔کہا ہے کہ شادی سے پہلے کسی عورت کی طرف بھی غلط نگاہ سے نہیں دیکھنا۔ وہ جو اس نے کہا تھا کہ باہر نکلو' تو نگاہوں کو نیچا کر کے نکلو' وہ بات یوں نہیں تھی کہ یوں نگاہوں کو نیچا کر کے نکلو۔اس کے معنی یہ ہیں کہ نگاہوں کو بیباک مت ہونے دو۔شادی سے پیشتر دنیا کی ہر لڑکی' ہر عورت' اس کے نزدیک واجب الاحترام ہے۔شادی کے بعد صرف ایک بیوی ہے جس کا اس کے ساتھ' آپس میں یہ تعلق ہے۔شادی ہوئی تو جن سے اس سے پہلے نکاح ہو سکتا تھا وہ بھی اس دوران میں اس کے لیے واجب الاحترام' اس کی طرف بھی یہ نگاہ نہیں اٹھا کے دیکھ سکتا' یوں زندگی گزارنی ہے۔یہ تھی جو اس نے پابندی عائد کی تھی۔تو جس قوم پہ یہ پابندی عائد ہوئی ہو اور وہ پھر بطیبِ خاطر یہ جو چیز ہے اس کے اوپر کار بند رہے۔آپ سوچیے کہ اس کی قوتِ ارادی اور اس کا نروس سسٹم کیسا مضبوط ہو گا' یہ بلائیں نہیں تھیں۔

نبی اکرم ﷺ کی تعلیم وتربیت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نفسیات کو بدل کر رکھ دیا

یہ عرب وہ تھے' جنہوں نے قیصر و کسریٰ [2] کی سلطنتوں کا مقابلہ کر کے ان دونوں قوموں کی بساط لپیٹ کر رکھ دی تھی۔سوال یہ ہے کہ

---

[1] سور کو بکرا کہو گے تو کیا وہ حلال ہو جائے گا؟

[2] قیصر' شاہِ روم (Roman Empire) کا لقب تھا اور کسریٰ' شاہانِ ایران کے ہر بادشاہ کا لقب تھا۔

روم اور ایران کی اقوام میں کیا کمی تھی۔ اُن کے اندر یہی کمی تھی کہ انہوں نے جنسی جذبے کے اوپر اتنی پابندیاں نہیں عائد کی تھیں' نہ ایران میں تھیں نہ ان رومنز کے اندر تھیں اور یہ عرب وہ قوم تھی جو تیار کی گئی تھی اور معلوم نہیں کہ اس قوم نے وہ جو ایمان لائی ہے' اور یہ جو تعلیم وتربیت نبوی ﷺ تھی اس نے ان کے اندر کیا قلبِ ماہیت کر دی تھی' کس طرح سے ان کی نفسیات کو بدل دیا تھا۔ یہ وہ قوم تھی جس کے ہاں بیک وقت اتنی بیویاں بھی ان کے ہاں ہوتی تھیں' لونڈیاں بھی ان کے ہوتی تھیں انہی کی یعنی اگلی جنریشن بھی نہیں' انہی کی' پھر انہوں نے یہ کیفیت پیدا کی کہ نگاہ کو کہیں بیباک نہیں ہونے دیا' کسی دوسری طرف نگاہ نہیں اٹھنے دی۔

دورِ نبوت ﷺ کی پہلی نسل کا کردار

جب حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی فوج اندر گئی ہے تو عیسائیوں نے' شہر کے اندر' دو کانوں پر نہایت نوخیز خوبصورت لڑکیاں [1] بٹھا دیں۔ یہ Sale Girls تھیں۔ ان کے ہاں تو پردہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ تو انہوں نے دوکانوں پر وہ بٹھا دیں۔ یہ جو فاتح سپاہی تھے' معاف رکھیے گا' جن کو تلنگے کہتے ہیں' ان کو اس شہر میں سے گزرنا تھا' یہ شہر سے گزر کر باہر آ گئے۔ جب شام ہوئی تو ان میں سے کوئی دیکھنے کے لیے آئے کہ جو جال ہم نے پھینکا تھا اس کا کیا اثر ہوا۔ ان کا کوئی اثر وغیرہ کچھ بھی نہ ہوا۔ ان میں سے ایک سپاہی نے کہا کہ تمہارے ہاں شہر کے اندر' یہ کیا کیا چیزیں ہیں جو عام طور پہ بکتی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ تم شہر کے بازار سے گزر کر آئے ہو' کیا تمہیں معلوم نہیں ہے؟ کہنے لگے: نہیں' جب ہم گزر کر آئے تھے تو پہلے یہ آواز دے دی گئی تھی کہ نگاہوں کو نیچے رکھ کے جانا ہے' تو ہم نے نگاہ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ یعنی اگلی جنریشن نہیں' عزیزانِ من! یہ تھی تعلیم وتربیت نبوی ﷺ۔ یہ وہی قوم تھی۔ جرنیل نے' کمانڈر نے' بھانپ لیا ہو گا کہ یہ کیا جال بچھایا گیا ہے۔ اس نے قرآن کی جو آیت تھی' اس کے چار لفظ دہرا دیئے اور ان کی یہ کیفیت ہو گئی ہو گی کہ انہوں نے پھر دوکان پہ چیزیں دیکھنے کے لیے بھی نگاہ اوپر نہیں اٹھائی۔ چلے گئے اور پھر ان سے آ کر پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں ہے۔ یہ ہے وہ چیز۔ یہ قرآنِ حکیم کی کوئی چھوٹی سی بات نہیں کہ جس فرد یا قوم نے جنسی جذبے کی تسکین کو بے باک کر دیا' وہ تباہ ہو گئی: **یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا** [2] (25:68)۔ یاد رکھیے! انفرادی طور پہ بھی آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ بھی اس جنسی جذبے کے اندر بیباک ہوئے ہوتے ہیں' ان کی حالت ہمیشہ ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں آپ دیکھیں گے کتنی اور برائیاں ان کے اندر ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے نروس (اعصاب) پر کنٹرول نہیں رہتا۔ یہ ہے اثاماً۔

---

[1] یہ مصر کا ایک مشہور شہر ''فرما'' تھا۔ جب بلبیس کے معرکہ (18ھ) میں مقوقس نے ایک وفد حضرت عمر بن عاص ؓ کی خدمت میں تاثرات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تو واپسی پر رئیس وفد نے کہا کہ ''......ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے دنیا کی کوئی دلکشی اپنی طرف کھینچ سکتی ہو......'' (ماخوذ از پرویزؒ: (1987ء)۔ شاہکارِ رسالت لاہور: ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ۔ ص۔ 212)۔

[2] اس کے قوائے عملیہ مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 830)۔

جس کسی نے بھی جنسی جذبے کو بیباک کیا وہ تباہ ہوگیا' دیکھیے برطانیہ کی مثال

جنسی جذبے کو بیباک کرنے سے قوم میں قوتِ ارادی نہیں رہتی' ضبط نہیں رہتا' ضبط کا لفظ تک نہیں رہتا' یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔کل ہی اس برطانیہ کی مملکت پہ سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ یہ کوئی ہزار سال کی بات نہیں ہے' ہمارے دیکھنے کی بات ہے۔ بچپن میں ہم یہ پڑھا کرتے تھے کہ اس کی سلطنت میں سورج نہیں غروب ہوتا تھا۔ وہ قوم آج دنیا میں چوتھی پانچویں بھی نہیں' پتہ نہیں کتنی پیچھے رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ جنسی جذبے کے اوپر جو کنٹرول تھا اس کو اٹھالیا۔ یہ ابھی کل کی بات تھی۔ ان کے ہاں' ملکہ وکٹوریا (1819-1901AD) کے زمانے (1837-1901ء) میں جس چیز کے اوپر Leg (ٹانگ) کا لفظ آتا تھا وہ اس کو ننگا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کے ہاں میز کی جو ٹانگ ہوتی تھی' Leg of the table تھی وہ اس کو بھی اس طرح سے کپڑا اوڑھا کے رکھتے تھے اور آج تو بات بہرحال کہنے کی ہے ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ساری دنیا میں پٹی ہوئی قومیں ہیں۔ ہم تو صدیوں پہلے پٹے تھے وہ بہرحال اب ان کے ہاں پٹے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس جنسی جذبے میں یہاں تک بڑھ گئے ہیں' حیوانات سے بھی آگے چلے گئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں انگلینڈ میں Homo-sexuality (ہم جنسی) کو قانوناً جائز قرار دے دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ڈوب تو رہے ہی ہیں ''جتھے ستیاناس او تھے سوا ستیاناس''۔[1] یہ ہے ثلق اثاماً یعنی اضمحلال کا محسوس طور پر سامنے آجانا۔ **يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا** (25:69)[2]۔ اب یہاں وہ لفظ آیا ہے جس کے عذاب میں یہ قوم گرفتار ہوجائے گی' دنیا میں ذلیل وخوار ہوجائے گی' اس کی یہ کیفیت ہوگی۔

جنسی بے راہ روی کے اس جذبے کے باوجود راہِ راست پر آنے کی گنجائش ہے

اس کیفیت پر یہاں پھر وہ رکتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ابدی جہنم نہیں **اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (25:70)[3]۔ قرآن ابدی طور پہ Condemn (مطرور) نہیں

---

[1] جہاں پہلے ہی بربادی ہے وہاں اور سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے!

[2] ان کی یہ حالت اس دنیا میں ہوجاتی ہے اور اُخروی زندگی میں' ان کی تباہیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اور وہ نہایت ذلت وخواری کی زندگی بسر کرتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔830)۔

[3] جو (فرد یا قوم) اس روش کو چھوڑ کر' (تحفظ عفت کی صحیح روش اختیار کرلے) اور پھر ایسے کام کرے جس سے اس کی صلاحیتوں میں نشو ونما ہوتی جائے' تو خدا کا قانونِ مکافات ان کی غلط روش کی پیدا کردہ ناہمواریوں کو' خوشگواریوں سے بدل دیتا ہے۔ خدا کے قانون میں اس کی گنجائش ہے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کو ان کی غلط روش کے نقصان رساں نتائج سے محفوظ بھی رکھے اور ان کی نشو ونما کا سامان بھی کردے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔830)۔

کرتا۔ کہتا ہے کہ اگر ان میں زندہ رہنے کی کچھ تھوڑی سی بھی رمق باقی ہے اور یہ محسوس کرلیں کہ ہم نے غلط قدم اٹھایا تھا' پھر اپنی اس غلطی کا احساس کرکے اس پہ نادم ہوں' پھر لوٹ کے وہیں آ جائیں' جہاں سے غلط قدم اٹھا تھا پھر امنــا کریں یعنی اس حقیقت پہ ایمان لائیں کہ کنٹرول بڑا ضروری تھا' پھر اس کے بعد ایسے کام کریں جو اس کے ہاں کی جو کمیاں واقع ہوئی ہیں' وہ پوری ہوتی چلی جائیں' جو Deficiency (کمی) ہوگئی ہے' اس کو Good (پورا) کیا جائے۔ یہ ہے جس کو عمل صالح کہتے ہیں تو پھر قرآن کہتا ہے کہ **يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ** (25:70) پھر ان کی یہ تباہیاں' ہوسکتا ہے' کہ خوشگواریوں کے اندر بدل جائیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اصلاح کا طریق بڑا غور طلب ہے

یاد رکھیے! قرآنِ کریم نے' معاشرے کے اندر جو برائیاں وغیرہ پیدا ہو جاتی ہیں' ان کو دور کرنے کے لیے کہا ہے کہ اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اسی لائن کے اندر اور سختیاں کرتے چلے جاؤ' اس کا پروگرام اور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے' ہوسکتا ہے یہ پیدا ہو جائیں لیکن یاد رکھو! اگر ناہمواریاں کسی معاشرے کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں' اگر اس کے اندر یہ خرابیاں آ جاتی ہیں' تو اس کے پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ **اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ** (11:114) جتنی تخریبی باتیں وہاں ہوئی ہیں' اس سے زیادہ اس معاشرے کے اندر تعمیری کام کرو' پھر تخریبی کاموں کے جو نقصان ہیں' ان کی تلافی ہوسکے گی۔ یہ ہے طریقہ' یہ ہے وہ عملی پروگرام: حسنات زیادہ بڑھاتے چلے جاؤ' اس طرح وہ پڑے ہوئے جو کھڈے اور گڑھے ہیں' وہ پورے کرتے چلے جاؤ' تبھی سڑک لیول (ہموار) ہوگی۔ یہ تعمیری کام کرتے چلے جاؤ۔ یہ تعمیری کام' جو حسنات ہیں' یہ سیّاٰت کو لے جائیں گی: **يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (25:70) خدا کا قانونِ مکافات تمہاری غلط روش کی پیدا کردہ ناہمواریوں کو خوشگواریوں میں بدل دے گا اور تمہاری پھر حفاظت بھی کرے گا' پھر سامانِ نشوونما بھی دے گا۔

سورۃ الفرقان کی آیت 70 تک ہم آ گئے۔ اس کے بعد ایک آیت آتی ہے اور میں سمجھتا تھا کہ شاید یہ پورا درس لے جائے۔ وہ میرے نزدیک بڑی اہم آیت ہے لیکن اس سے پہلے ہی وقت ختم ہوگیا۔ اس آیت کو ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

❀......❀......❀

پندرھواں باب: **سورۃ الفرقان** (آیات 71 تا اختتام)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ ۙ وَإِذَا
مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا
وَعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا
لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿۷۴﴾ أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴿۷۵﴾ خَالِدِينَ
فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۖ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ
فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1978ء کی 31 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 71 سے ہو رہا ہے: (25:71)۔

سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ عباد الرحمن کی خصوصیات بتائی جا رہی تھیں کہ وہ لوگ جو خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہیں' ان کے اندر کس کس قسم کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ دو لفظوں میں یہی تھا کہ جن کو قرآن نے معروف کہا ہے وہ ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں' جن چیزوں سے قرآن نے منع کیا ہے' وہ ان سے رکتے ہیں اور وہ ان میں سے چند ایک کی تفصیل دیتا چلا آ رہا تھا کہ ان سے بھی رکتے ہیں' ان سے بھی رکتے ہیں۔ درمیان میں ایک بات کہی کہ اگر کبھی کبھار ان سے سہو' غلطی' لغزش ہو جاتی ہے تو اس کا احساس ہونے کے بعد فوراً وہ پلٹتے ہیں: تاب یعنی جس دوراہے سے ان کا غلط قدم اٹھا تھا' پھر واپس وہیں آتے ہیں' اور وہاں آنے کے بعد یہ نہیں کہ بس وہاں آ گئے تو یہ توبہ قبول ہو گئی۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ انہوں نے تو ایک صحیح راستے پر جانا تھا' کسی منزل تک پہنچنا تھا' دوراہے پہ آ کے غلط قدم اٹھا' غلط راستے پہ چل پڑے' کچھ دور جا کر احساس ہوا کہ راستہ منزل تک پہنچنے کے لیے صحیح نہیں ہے' وہاں واپس آنا ضروری ہے جہاں سے غلط

قدم اُٹھاتھا۔ یہ پہلا قدم (Step) ہے' جوان کو لینا پڑے گا اور اسی دوراہے پہ آ کر تو پھر اگلا قدم یہ ہے کہ جو صحیح راستہ ہے اس کے اوپر چلنا ہوگا۔ محض واپس آ جانے سے بات نہیں بن جاتی۔

تلافی کے لیے تخریبی کام کے مقابلے میں صرف تعمیری کام کرنا ہوگا

جہاں بھی قرآن نے تاب کہا ہے' اس کے بعد اس کے ساتھ اصلح ہے۔ عمل صالحا ساتھ ہے کہ پھر صحیح راستے پہ چلے تو پھر اس نے وہ کہا ہے کہ وَ مَنۡ تَابَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوۡبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا [1] (25:71)۔ یہ ہے جو غلط راستے سے پلٹ کر' اس صحیح منزل تک پہنچ جائے گا جو خدا نے اس کے لیے تجویز کی ہے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اس صحیح راستے پہ چلنا شروع کرے۔ یہ ہے اصل بنیاد۔ اور اس کے لیے بھی قرآنِ کریم نے جو معیار بتایا ہے' پچھلی دفعہ بھی میں نے عرض کیا ہے' اب پھر اس کو دہرادوں' کہ وہ معیار ہے کہ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) اور دوسرے مقامات پہ بھی اس کو دہرایا گیا ہے کہ ''اگر کسی معاشرے میں کسی فرد سے' کسی قوم سے' کسی نظام سے' کسی مملکت سے' کہیں کوئی تخریبی کام ہو جاتے ہیں' تو اُن کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ اس سے زیادہ تعمیری کام کیے جائیں یعنی اس نقصان کی تلافی کی صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس سے زیادہ اچھے کام کہہ لیجیے' تعمیری کام کہہ لیجیے: قرآن نے اسے حسنٰت کہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جو سیّــــاٰت ہوگئی ہیں' ان کے نقصان کی تلافی کی شکل ایک ہی ہے کہ اس سے زیادہ تعمیری کام کیے جائیں۔ وہاں تو خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ [2] (101:8) اور ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ [3] (101:6) کے پلڑے ہیں۔ وہاں تو پلڑے کا جھکاؤ ہے۔ اگر وہ ناہمواریوں یعنی تخریبی کاموں کا پلڑا جھک گیا ہے فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (101:9) وہ ذلت کی پستیوں میں گر جائے گا' جہاں اس کی یہ حالت ہوگی کہ اس کا دل و دماغ کچھ کام نہیں دے گا اور وہ پریشان حال مارا مارا پھرے گا۔ یہ تو ہم روز دیکھتے ہیں' ترازو سے کوئی چیز تولنی ہوتی ہے تو اگر وہ باٹ والا پلڑا جھکا ہوا ہے اور جنس والا پلڑا اٹھا ہوا ہے' تو اس میں اور جنس ڈالیں گے' تب یہ جھکے گا۔ تو یہ جو دوسری چیز ہے کہ اس میں اس سے زیادہ تعمیری کام کریں گے' تب آپ کے تخریبی کاموں سے پیدا ہونے والے نقصانات کی تلافی ہو سکے گی۔ اسی پہ اگر اور شدید عمل اختیار کرتے چلے جائیں گے' تو ناہمواریاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ توبہ کے معنی ہی یہ ہیں اور اسی لیے جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ہر تــــاب کے ساتھ عــــمــــل صــــالــــح ہے اور اس میں تو ایک اور لفظ بھی آیا ہے۔ جب میں اگلی

---

[1] جو شخص بھی غلط روش کو چھوڑ دیتا ہے' اور اس کے بعد' صلاحیت بخش کام کرتا ہے' اس کا ہر قدم قانونِ خداوندی کی طرف اٹھتا ہے۔ (اور قانونِ خداوندی اسے بہترین نتائج سے بہرہ ور کرتا ہے۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 830)۔

[2] جس کا (تعمیری کاموں کا) پلڑا ہلکا ہوگا۔

[3] جس کا (تعمیری کاموں کا) پلڑا بھاری ہوگا۔

آیت پر آؤں گا تو وہاں جا کر اس کے متعلق بیان کروں گا کہ اس میں وہ کتنی اہمیت ہے **اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا** (25:70)۔لیکن یہ بات اگلی آیت کے ساتھ آئے گی۔

وہ اگلی آیت تو آج ایسی آ رہی ہے کہ پوچھیے نہیں' کس قدر غور طلب ہے' کس قدر اس کے اندر اہمیت ہے' پھر آگے بتایا کہ ان کی خصوصیات کیا ہیں۔ان خصوصیات میں ایک چیز یہ بتائی کہ **وَ الَّذِیۡنَ لَا یَشۡهَدُوۡنَ الزُّوۡرَ** (25:72)۔''زور'' عام طور پہ فریب کاری کو کہتے ہیں' جھوٹ کو کہتے ہیں' کسی ایک طرف جھک جانے کو کہتے ہیں۔اصل میں عرب کسی کو کن اکھیوں سے' ٹیڑھی آنکھ سے' دیکھنے کو کہتے تھے۔صحیح آنکھ سے نہ دیکھنا' بظاہر کسی آنکھ کا کسی اور طرف ہونا' دیکھنا کسی اور طرف۔یہ اصل میں بڑا غیر محسوس سا فریب ہے۔تو یہ جو تھا اس میں **لا یشھدون** ہے یہ شہادت کا لفظ اگر گواہی کے معنوں میں بھی لیا جائے اور قرآن میں یہ آیا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''وہ کبھی فریب کارانہ' غلط' جھوٹی' منافقانہ قسم کی شہادت نہیں دیتے' لیکن یہ اتنی ہی بات نہیں ہے۔یہ جو یشھدون ہے تو یہ کسی مقام پہ کسی کا حاضر ہونا ہے۔یاد رکھیے! جسے شہادت کہتے ہیں اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص عینی شاہد ہو' خود اس نے اس چیز کو دیکھا ہو۔اسی لیے اس لفظ شاہد سے مشاہدہ ہے۔یہ ''شاہد'' عربی زبان میں ''غاب'' کے مقابلے میں آتا ہے۔اگر وہ وہاں خود موجود نہیں ہے' وہ اس کی شہادت نہیں ہے۔اسلامی قوانین کی رو سے شہادت صرف اس کی ہے جو خود اس واقعہ کا عینی شاہد ہو۔شاہد کے تو معنی ہی ہوتا ہے اس جگہ موجود ہونا۔جب شاہد کے معنی موجود ہونا ہو' تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ جس جگہ بھی کوئی فریب کارانہ کام ہو رہا ہو' اس قسم کی مکارانہ سازشیں ہو رہی ہوں' کوئی اس قسم کی تدبیریں ہو رہی ہوں' وہ وہاں کھڑا بھی نہیں ہوگا' اس مجلس میں نہیں بیٹھے گا' ان کا ساتھ نہیں دے گا' بلکہ ان کو دیکھے گا تک نہیں۔اگر اس کے لغوی معنی لیے جائیں تو وہ ان چیزوں سے اتنا مجتنب رہے گا اور اگر کہیں بات کہنے کی ضرورت پیش آئے گی تو وہ جو کچھ اس نے دیکھا ہوگا' وہ صحیح صحیح بیان کرے گا' شہادت کبھی ایسی نہیں دے گا کہ جس میں فریب کا ذرا سا شائبہ بھی پایا جائے۔مومن یہ ہوگا اور شہادت کے متعلق تو جب اس موضوع پہ بات آئے گی میں عرض کروں گا۔قرآن نے جو معیار مقرر کیا ہے' پوچھیے نہیں کہ وہ عدل کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہے۔عدل کا دارومدار شہادت پہ ہوتا ہے۔عزیزانِ من! یہ جسے ہم عدالتی عدل کہتے ہیں اس میں شہادت کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ مومن شہادت دیتا ہے: **عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ** [1] (4:135) خواہ وہ شہادت

---

[1] **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۚ اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰی بِهِمَا** (4:135) اے جماعت مومنین! تم دنیا میں عدل وانصاف کے محافظ ونگران بن کر رہو (5:8)۔عدل کے لیے ایک بنیادی عنصر سچی شہادت ہے تم شہادت نہ مدعی کی طرف سے دو' نہ مدعیہ علیہ کی طرف سے۔تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ اور ہمیشہ عدل وانصاف کو مدنظر رکھ کر سچی سچی شہادت دو' خواہ یہ شہادت (اور تو اور) خود تمہارے اپنے خلاف جائے یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔اس باب میں امیر اور غریب میں کوئی امتیاز نہ کرو (حتیٰ کہ دشمن سے بھی عدل کرو 5:8) تم جادۂ حق وصداقت سے ہٹ کر' ان کے خیر خواہ مت بنو۔خدا کو ان کی خیر خواہی کی زیادہ فکر ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔222)۔

اس کی اپنی ذات کے خلاف کیوں نہ جائے پھر بھی سچی شہادت دیتا ہے۔اس سے بڑی چیز اور کیا ہوگی! اگر کہیں بات اپنی ہی ذات کے خلاف بھی جائے تو پھر بھی وہ سچی شہادت دیتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم زندگی کے ایک ایک لمحہ کو محفوظ کرنا چاہتی ہے

عزیزانِ من! اب یہاں کہا ہے کہ **وَ اِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا کِرَامًا** (25:72)۔اب یہاں لغو کا لفظ آیا ہے۔ہمارے ہاں تو لغویات بھی ان معنوں میں آتا ہے۔ یہ لوگ ہر معیوب بات ہی کو لغو نہیں کہتے تھے‘ وہ تو ہر بے معنی بات‘ بے مطلب بات‘ بے کار بات‘ کو بھی لغو کہتے تھے۔قرآن کہتا ہے کہ جہاں کہیں لغویات ہوں‘ تو نہ ہی یہ خود کبھی فریب کارانہ شہادت دیتا ہے اور بالفرض اگر **مَرُّوۡا کِرَامًا** (25:72) کہیں یہ کچھ ہو رہا ہو اور یہ کہیں اس کے پاس سے گزرے تو وہ اس سے **مَرُّوۡا کِرَامًا** (25:72) نہایت شریفانہ انداز سے اپنا دامن بچاتے ہوئے غلاظت کے ڈھیر سے یوں بچ کر گزر جاتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ اگر کہیں اس قسم کی بیہودہ یا بے معنی باتیں بھی ہو رہی ہوں‘ آپ دیکھیے کہ وہ انسانی زندگی کو کتنا قیمتی قرار دیتا ہے‘ کہ یہی نہیں کہ معیوب باتیں بے معنی باتیں ہو رہی ہوں‘ وہ وہاں سے یوں گزرے گا‘ وقت تو ضائع ہو رہا ہے‘ توانائی تو ضائع ہو رہی ہے‘ اور زندگی کا تو ایک ایک سانس قیمتی ہے اس لیے وہ بے کار اور بے معنی باتیں بھی اگر کہیں ہو رہی ہیں تو وہاں بھی نہیں کھڑا ہوگا۔اپنے آپ کو بچاتے ہوئے‘ ان سے الجھے بغیر وہاں سے آگے گزر جائے گا‘ اس کی یہ کیفیت ہوگی۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک نہ بھولنے والا واقعہ

عزیزانِ من! اب آگے وہ آیت آتی ہے‘ آپ یقین مانیے کہ اب تک قرآن فہمی کے سلسلے میں جو واقعات مجھ پہ گزرے ہیں ان میں سے کئی ایسے ہیں کہ جو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا‘ ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔میں جب اس آیت پہ پہنچا تو نظر بظاہر بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔یوں نظر آیا کہ جیسے کہیں اس کے اندر کوئی طباعت کی غلطی ہے۔قرآن کے کئی نسخے Consult کیے‘ دیکھ لیے‘ ان تمام میں آیت اسی طرح سے تھی‘ آپ بھی دیکھیے‘ اور مجھ پہ جو گزری تھی‘ نظر بظاہر دیکھیے کہ آپ پہ بھی وہی گزرے گی۔

وہ آیت یہ ہے **وَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمۡ لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡهَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا** (25:73)۔ہم تو ایمان کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

(اقبالؒ)

ایمان میں عقل وفکر اور غور وتدبر کا کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ ایمان تو ایمان ہے اور پھر جب ایمان بالغیب کہہ دیا جائے تو پھر تو پوچھو ہی نہیں کہ کہاں چلا جاتا ہے۔ آیت یہ ہے کہ مومن وہ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں' تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں جھک پڑتے۔ وہ جو میں نے کہا کہ مجھ پہ کیا بات گزری تھی۔ بات یہ ہے کہ میں پرانے انداز سے قرآن سمجھتا چلا آ رہا تھا۔ ذہن میں یہ آیا کہ ہم تو ایمان کو یہ سمجھتے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ مومن وہ ہے کہ جب اس کے سامنے خدا کی آیت آ جائے تو اس وقت سوال ہی نہیں ہے کہ وہ کچھ اور سوچے سمجھے فکر کرے' غور کرے۔ نہیں صاحب! وہ تو اسی وقت اس کے اوپر جھک جائے گا' فوراً جھک جائے گا' تو ذہن میں آیا کہ یہ جو لم یخروا ہے' کہ نہیں جھکے گا' شاید یہاں طباعت کی غلطی ہے۔ ہمارے اپنے تصور کے مطابق ہونا یوں چاہیے کہ مومن وہ ہے کہ جب خدا کی آیات اس کے سامنے آئیں' تو وہ آنکھ بند کیے ہوئے ان کے سامنے جھک پڑے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے' اور یہی تھا دل کے اندر وہ پختہ یقین جس کی بنا پہ پہلا ردّعمل یہ ہوا کہ یہاں کچھ کتابت کی غلطی ہوگئی۔ کئی نسخے قرآن کے دیکھے' وہاں ہر نسخے میں یہی لکھا ہوا تھا' تو کھڑے ہو کر سوچنا پڑا کہ یہ تو بات بڑی اونچی ہے۔ یہاں تو ایمان کا معیار ہی کچھ اور بتایا جا رہا ہے اور وہ ہے احکامِ خداوندی کو تسلیم کرنے سے پہلے ان پر غور وفکر لازم ہے۔

ایمان کا معیار وہ ہے جسے قرآن تسلیم کرے

عزیزانِ من! ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ احباب ہر درس بڑی توجہ سے سنتے ہیں' قرآن کی ہر آیت آپ کے لیے وجہ کشش ہوتی ہے لیکن اس آیت کے ضمن میں جو کچھ میں عرض کروں گا' اس کے لیے خاص طور پر میں یہ گزارش کروں گا کہ بڑی ہی توجہ سے اسے سنیے گا' خیال کو ایک لمحہ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہ جانے دیجیے۔ بڑی اہم بات ہے اور بڑی بنیادی بات ہے۔ قرآن کی رو سے یا اسلام کی رو سے یہ جنہیں ہم ذاتیں گوتیں کہتے ہیں' یہ تو کچھ شے نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پہ میں سمجھاتا ہوں کہ مثلاً ایک شخص ہے اس کی ذات اعوان ہے اور وہ ڈاکٹر بھی ہے۔ اس کا بیٹا پیدائشی اعوان ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ذات اور گوت میں تو ہوتا ہی یہ ہے کہ اس میں وہ ذات (Caste) پیدائشی ہوتی ہے۔ اعوان ڈاکٹر کا بیٹا پیدائشی اعوان ہوگا لیکن وہ پیدائشی ڈاکٹر نہیں ہوگا' اسے ڈاکٹر بننا پڑے گا۔ یہ بات صاف ہے ہم جو مسلمان قوم سے متعلق ہیں' تو یہ ٹھیک ہے کہ مسلمان قوم کا بیٹا یا کوئی فرد قومی اعتبار سے مسلمان ہی ہوگا۔ اعوان کا بیٹا اعوان ہوگا۔ جو اپنی قوم مسلمان لکھاتا ہے' اس کا بیٹا قومی اعتبار سے مسلمان ہے لیکن جیسے اسے ڈاکٹر بننے کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے' تو ڈاکٹر بنتا ہے' ڈاکٹر کا بیٹا ہونے کی جہت سے وہ ڈاکٹر نہیں ہوتا۔ آپ حیران ہوں گے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ اس شخص کو بھی ایمان لانا پڑے گا جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوگیا ہے' یہ پیدائش کے اعتبار سے مومن نہیں ہیں' قرآنِ کریم میں جسے ہم ایمان کہتے ہیں' اس کے لیے الفاظ ہیں: اٰمنوا

یـؤمنون ۔ یہ الفاظ Verb (فعل) آئے ہیں یعنی وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں' مومن وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں' تو اس کے لیے تو کچھ کرنا پڑے گا جیسے وہ جو ڈاکٹر بنتا ہے' جو ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرتا ہے' وہ ڈاکٹر ہوتا ہے' ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم کی رو سے ہر انسانی بچے کو خواہ وہ قومی اعتبار سے مسلمانوں کے گھر میں بھی کیوں نہ پیدا ہوا ہو' اسے ایمان اختیار کرنا پڑتا ہے' لانا پڑتا ہے' یہ ایمان لانا پڑتا ہے اور اس کا معیار یہ ہے جسے قرآن تسلیم کرے۔

قرآنِ حکیم کی صداقتوں اور حقیقتوں کو غور فکر کے بغیر تسلیم کرنے سے انسان مسلمان تو ہوسکتا ہے مومن نہیں بن سکتا

یہ کیا ہے؟ یہ کیا بات ہے؟ یہ کچھ صداقتیں ہیں' کچھ حقیقتیں ہیں' کچھ اصول ہیں' کچھ اقدار ہیں۔ ان کے متعلق اسے یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ واقعی صداقت ہے' یہ حقیقت ہے' یہ غیر متبدل Value (قدر) ہے۔ یہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ کیسے کرنا پڑتا ہے؟ یہ جو آیت یعنی (25:73) میں نے ابھی پیش کی ہے کہ یہ نہیں ہے کہ اس کے سامنے یہ چیزیں آئیں اور اس نے آنکھیں بند کیں' کان بند کیے' اندھے اور بہرے کی طرح اس کے سامنے جھک گیا کہ جی' ٹھیک ہے وہ یہ کہتا ہے۔ کہا کہ قطعاً یہ نہیں ہے۔ یہ تو **لَمْ یَخِرُّوْا** (25:73) ہے۔

یہ بڑی عظیم چیز ہے کہ وہ اس طرح نہیں جھکتے۔ وہ تو ان صداقتوں کو' آنکھیں کھول کے' کان کھول کے' دل اور دماغ کے پورے اطمینان سے' عقل وفراست کی رو سے' غور وتدبر کی رو سے' فہم وبصیرت کی رو سے' جسے آپ ذہنی طور پر' پورے شعور سے کہتے ہیں ان صداقتوں کے متعلق یقین حاصل کرنا ہے کہ یہ واقعی ابدی صداقت ہے۔ پھر سن لیجیے کہ یہ غور وتدبر کی رو سے ماننا ہے' اندھے بہرے بن کے نہیں' یونہی نہیں مان لینا۔ یہ ہر فرد اس طرح سے کرے گا۔ جو فرد اس طرح سے قرآن کی حقیقتوں پر یقین رکھے گا کہ یہ واقعی سچی بات ہے' اسے کہیں گے یہ ایمان لایا ہے۔ اس کے لیے قرآن مـن یـؤمـن کہتا ہے۔ یعنی جو ایمان لایا۔ اب یہ مومنین کے حلقے کے اندر داخل ہوا۔ اعوان ڈاکٹر کے گھر میں پیدا ہونے والا پیدائشی اعتبار سے اعوان تو ہو گیا اور وہ جو ڈاکٹروں کی Association (انجمن) ہے' اس کا ممبر بننا اس وقت ہے جب اس نے ڈاکٹری کا علم حاصل کیا ہو' اور وہ سرٹیفیکیٹ حاصل کیا ہو۔ جب یہ ہوا تو پھر وہ ڈاکٹروں کی انجمن میڈیکل ایسوسی ایشن کا ممبر بنا پھر اسے ایک سرٹیفیکیٹ ملا' پریکٹیشنر ہونے کا بھی۔ اس کے لیے یہ کچھ اس نے کیا ہے' تو یہ جو چیز ہے' جسے ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والا کہتے ہیں اس کے لیے بھی ہر بچے کو یہ کرنا پڑے گا' ہر فرد کو یہ کرنا پڑے گا' ڈاکٹر کے بیٹے کو ڈاکٹر بننا پڑے گا۔ اگر وہ نہیں بنتا تو وہ تو اس Association (انجمن) کا ممبر نہیں ہوسکتا۔ یہ کفر اور ایمان کے معنی بھی یہ ہیں۔ مومن یا ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو مومنین کی Association (انجمن) ہے وہ اس کا ممبر اس صورت میں بن سکتا ہے جب اس طرح سے ایمان لائے

اور جو اس طرح سے ایمان نہیں لاتا' وہ ان کا ممبر نہیں بنتا' وہ کفر کے اندر ہے کہ وہ Non-member (غیر ممبر) ہے۔ کافر کے معنی Non-member (غیر ممبر) ہوتے ہیں' یہ گالی نہیں ہے' یہ ایک Factual Statement (واقعاتی بیان) ہے' واقعاتی چیز ہے کہ ایک ممبر ہوں' اس Association کے' ایک Non-members ہوں۔ تو اس کا ممبر بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ کچھ کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ٹھیک ہے قومی اعتبار سے تو آپ اسے مسلمان کہہ سکتے ہیں' ایمان تو وہ نہیں لایا' مومن تو وہ نہیں ہوا۔ اس کی تو پہلی شرط ہی یہ ہے۔ اب یہ بات سمجھ میں آئی کہ مومن وہ ہیں جو آیاتِ خداوندی کے سامنے بھی اندھے بہرے بن کے نہیں جھکتے' غور و تدبر کے بعد ان صداقتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

ایمان لانے کا مطالبہ ایمان والوں سے کیا جارہا ہے

اب یہ دیکھیے کہ جب یہ بات آئی تو اس چیز کے لیے میں نے پھر قرآن میں تلاش کیا کہ بات تو یہ بڑی اہم ہے۔ میرا خیال ہے آپ نے بھی شاید پہلی دفعہ ہی سنا ہوگا کہ قرآن اس کی ایک مقام پہ نہیں' متعدد مقامات پہ وضاحت کرتا ہے۔ یہ حوالے بڑے اہم ہیں اے کاش! آپ میری بات مانتے اور قرآن کے نسخے آپ کے ہاتھ میں ہوتے' پھر وہ بات زیادہ خوبصورتی سے سمجھ میں آتی' وضاحت سے سمجھ میں آتی (4:136) میں مخاطب کن کو کیا جارہا ہے؟ کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136)۔ کہیں ترجمہ دیکھ لیجیے۔ کہا کہ اے ایمان والو! اس کا یہ ترجمہ بڑا آسان ہے' یہ کچھ مشکل الفاظ نہیں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136) اے وہ لوگو! امنوا' ایمان والو! ترجمہ میں تو یہ بات آگئی: امنوا' وہ جو ایمان لائے ہو' اس کا ترجمہ ہو جائے گا۔ اب پتہ ہے آگے کیا ہے؟ کہا کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (4:136) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ' اللہ پر' اس کے رسول پر' اور اس کی کتاب پر۔ سن رہے ہیں آپ! میں کہہ رہا ہوں کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136)۔ عزیزانِ من! يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136) قرآن خود کہہ رہا ہے۔ وہ تو سیدھی بات کہی جارہی ہے کہ جب آپ خود کہہ رہے ہیں: اے وہ امنوا' جس کو ہم آپ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ ہیں جو ایمان لے آئے ہو۔ پھر آگے اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) کہا ہے۔ یہ کیا ہے؟ پہلے آپ نے خود ان کو یہ کہہ کے پکارا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136)۔ تو وہ مخاطب کرتا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136)۔ اے گریجویٹو! بی اے پاس کیا کرو۔ ارے! کیا کہہ رہے ہو آپ؟ اے گریجویٹو! پہلے کہہ رہے ہیں' پھر کہہ رہے ہیں: بی اے (B.A) کیا کرو۔ عزیزانِ من! قرآن کے یہ وہ مقامات ہیں جہاں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اور میں کیا عرض کروں مہینوں نہیں' برسوں کھڑا ہونا پڑتا ہے' کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ نظر آیا کہ یہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136) تو وہ ہے جس معنی میں ہم آپ سارے مسلمان ہیں۔ مسلمان کا لفظ تو قرآن میں ہے

نہیں' عربی زبان کا یہ لفظ ہی اس Construction (ترکیب) میں نہیں ہے۔ مسلم تو ہے' مسلمان تو عربی زبان میں آتا نہیں۔ اس زبان میں یہی لفظ ہے۔ ترجمہ اس کا یوں ہونا چاہیے کہ اے وہ جو مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے ہو! اب بات صاف ہو گئی' اب **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ** (4:136) الجھن نہ رہی۔

اب آپ آیئے اس کے اوپر کہ اے وہ جو اعوان باپ کے گھر میں پیدا ہونے سے اعوان کہلاتے ہو! تلوار زنی بھی سیکھو۔ بات یوں ہو گی۔ یہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ** (4:136) حکم ہے۔ پہلا وہ ہے کہ جو تم خود اپنے آپ کو کہتے ہو' **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا** (4:136) تو وہ یوں کہہ دیا کہ جیسا تم کہتے ہو ہم بھی تمہیں وہی کہہ کے پکارتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بھی تو تم نام رکھتے ہو' ہم بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد پوچھتے ہیں کہ ہو تم رحمٰن کے ہی عبد' اسی کے غلام ہو' اسی کے محکوم ہو' تو یوں ہوگا کہ اے عبدالرحمٰن! الرحمٰن کی عبودیت اختیار کر۔ بات یوں ہو گی: **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ** (4:136)۔ یہاں **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا** (4:136) کہنے کے بعد وہ سارے جو اجزائے ایمان ہیں بتائے گئے ہیں' اس کے بعد قرآن حکم دے رہا ہے کہ **اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ** (4:136)۔ ایک اور حوالہ بھی لکھ لیجیے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔ وہ حوالہ ہے (57:28) کا۔ یہاں پہلے قرآن نے کہا کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** (57:28)۔ پھر وہی بات آئی کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ** (57:28) اے وہ جو اپنے آپ کو مومن کہتے ہو! اتقوااللہ: خدا کا تقویٰ اختیار کرو۔ یہ بات دوسری جگہ آئے گی کہ یہ تقویٰ اختیار کرو لیکن خیر' کہہ سکتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ تقویٰ پہ زور دیا ہوا ہے: **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ** (57:28)

قرآنِ حکیم انسان کو علیٰ وجہ البصیرت ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے

عزیزانِ من! اس کے آگے ہے کہ **وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ** (57:28) رسول پر ایمان لاؤ۔ یہ وہی بات ہے: وہاں وہ تمام اجزاء تھے' یہاں رسول پہ ایمان ہے' تو ہم جو اپنے آپ کو اس زمرے میں شمار کرتے ہیں یعنی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' قرآن کے الفاظ میں جنہیں خدا **یایھا الذین اٰمنوا** کہہ کر پکارتا ہے' ہمیں حکم دے رہا ہے کہ ایمان لاؤ' یہ نہیں کہہ رہا کہ ذرا سوچو' ایمان لائے ہو یا نہیں' بلکہ حکم دے رہا ہے کہ ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو خدا کا حکم ہے' کیا ہم نے کبھی اس حکم کی بھی پیروی' اطاعت اور پابندی کی ہے' کیا ساری عمر کبھی سوچا بھی ہے کہ یہ بھی ایک حکم ہے؟ حالانکہ یہ تو بنیادی حکم ہے۔ اتنا ہی نہیں ہے قرآن تو دنیا بھر کے ان لوگوں کو جنہیں ہم آپ بھی مسلمان نہیں سمجھتے' ہم اپنے آپ کو' تو بہر حال مسلمان کہتے ہیں' یہ حکم دیتا ہے اور کون کون لوگ' یہودی عیسائی' مجوسی ہیں' جنہیں کہتا ہے کہ **اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیْنَ** (2:62)۔ یہ پھر وہی لفظ ہیں۔ عام ترجمہ آپ کو بتا دیا جائے گا کہ وہ

لوگ ہیں، جو ایمان لے آئے یعنی مومن تو پہلی چیز ان الـذیـن امـنـو اہوا، وہ لوگ جو ایمان لے آتے ہیں اور یہودی اور نصرانی اور مجوسی یا صابئین ستارہ پرست وغیرہ تو یہودی نصرانی مجوسی وغیرہ ہو گئے کہ وہ یاایھا الذین اٰمنوا میں نہیں آتے۔ یہاں پہلے کہا ہے کہ ان الذین امـنـوا وہ لوگ جو یہودی اور نصاریٰ ہیں اور اس کے بعد ہے کہ **مَنْ اٰمَـنَ بِـاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** (2:62) ان پہ خوف وحزن نہیں ہوگا۔ ان میں سے جو بھی ایمان لائے گا، وہ تو باقیوں کی طرح آپ کو اس زمرے میں شامل کررہا ہے۔ یاد رکھیے، اگر یہ تصور کریں کہ ان الـذیـن امـنـوا کے معنی یہ ہوگئے، وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ وہ ہیں جو ایمان لے آئے ہوئے ہیں، پھر اس کا یہ کہنا کہ اٰمنوا یا مـن اٰمن کیا ہوا؟ آپ سوچیے بات کہاں جاتی ہے۔ خدا کی طرف سے منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ باقیوں کے ساتھ اس قسم کی بات کہے گا۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح سے اور لوگ، کوئی عیسائیوں کے گھر میں پیدا ہوا، کوئی یہودیوں کے پیدا ہوا، کوئی پارسیوں کے گھر میں پیدا ہوا، ان سے ہم سب آپ ان سے کہتے ہیں کہ ایمان لاؤ۔ ان میں سے کوئی ایمان لاتا ہے تو ہم کہتے ہیں آج مسلمان ہوا، الحمدللہ ہم اسے مسلمان کرتے ہیں۔ وہ مسلمان ہوتا ہے۔ ہم تو ساری عمر ایسا نہیں کرتے جبکہ وہ ہمیں بھی کہتا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** ...... **مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ** (2:62) جو بھی ان میں سے ایمان لائے گا۔

انگریزی میں ایمان کا ترجمہ Faith (فیتھ) کرنا غلط ہے

عزیزانِ من! محض مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے تو ایمان لانے والا نہیں ہوسکتا۔ قرآن کے الفاظ موجود ہیں، تو ایمان لانے کے لیے پہلی شرط کیا ہوگی؟ وہی کہ **وَ الَّـذِيْـنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا** (25:73) فہم وشعور کی رو سے، عقل وبصیرت کی رو سے، دیکھ بھال کر، سمجھ سوچ کر، اس چیز کو پھر صحیح ماننا کہ واقعی خدا نے جو کہا ہے وہ ایک حقیقت ہے، یہ محض مان لینا نہیں ہے۔ میں جو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ ایمان کا ترجمہ Faith (فیتھ) ہے ہی نہیں۔ یہ ترجمہ غلط ہے۔ یہ عیسائیت کے الفاظ ہیں جو ہمارے ہاں آگئے ہوئے ہیں۔ ایمان کے معنی ہی Conviction (کن وکشن) ہیں، من اٰمَنَ کے معنی ہی ہیں:

One who is convinced of these facts

عزیزانِ من! سوچیے اس کیٹگری (قسم) کے اندر ہم میں سے کوئی بھی آتا ہے۔ اور پھر توقعات ہم کررہے ہیں ان نعماء یعنی خوشگواریوں کی، جو مومنین کا حصہ ہوتی ہیں۔ یہی چیخ رہے ہیں کہ وہ Appointment (تقرری) جو ڈاکٹروں کے لیے تھی، مجھے کیوں نہیں ملی، میں تو ڈاکٹر کا بیٹا ہوں۔ یہ تو جو ڈاکٹر بنتا ہے اس کو ملتی ہے۔ اس کے لیے ایک ریفرنس لکھ لیجیے۔ وہ ہے (5:69)۔

عزیزانِ من! اب جو بات سامنے آرہی ہے یہ تو پوچھو نہیں کہ اس نے مجھے کتنے عرصے تک ورطہ حیرت میں رکھا۔ اسی سلسلہ میں

اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں ''پھر کوئی مشکل مقام آیا'' [1] قرآن نے یایھا الذین امنوا کے متعلق کہا تھا کہ امنوا (من اٰمَنَ) کہ ان میں سے جوکوئی بھی ایمان لاتا ہے۔ کس پہ ایمان لاتا ہے؟ قرآن پہ ایمان لاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک نبوت کے لیے انتخاب کا معیار

قرآن حضورِ نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا۔ پہلے انتخابِ خداوندی یہ ہے کہ خدا اس دور کے پورے انسانوں میں سے ایک فرد کو منتخب کرتا ہے۔ یہ وہ ہوتا ہے جس کا سینہ وحی جیسی صداقتوں کا مہبط بنتا ہے۔ وہ بڑی عظیم شخصیت تھی' پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں یہ کہا ہے کہ یہ تو شاعری ہے جو تم کہہ رہے ہو کہ ''آگ لینے کو جائیں اور پیغمبری مل جائے۔'' لیکن پیغمبری یوں نہیں ملا کرتی۔ وہ اس قصے میں ہے کہ وہاں جب پیغمبری ملی ہے تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ شکریہ جناب کا' بہت بڑا احسان مجھ پہ کیا ہے کہ اِدھر میں آیا ہوں اور تو نے مجھے پیغمبری دی۔ کہنے لگے: موسیٰ علیہ السلام! یہ آج کی بات نہیں ہے' یہ تو جب سے تم پیدا ہوئے ہو اس زمانے سے ہم پیغمبری دینے کے لیے تمہیں تیار کر رہے تھے [2] تو گویا اس قسم کا وہ فرد ہوتا ہے اور واقعی وحی جیسے عظیم حقائق کا مہبط بننے کے لیے' عزیزانِ من! پوچھو نہیں کہ اس قلب کی کیا کیفیت ہونی چاہیے۔

ایک رسول کو بھی عقل وشعور کے تحت وحی خداوندی پر ایمان لانا پڑتا ہے

قرآن' اس پہ نازل ہو رہا ہے' وہ دوسروں تک پہنچا رہا ہے' دوسروں کو اسکی دعوت دے رہا ہے کہ اس کو صحیح تسلیم کرو۔ اس پہ نازل ہو رہا ہے' کیا ذہن میں یہ بات آئی جو میں کہہ رہا ہوں؟ اس سے بڑا تو مومن کوئی نہیں ہوسکتا لیکن آپ حیران ہونگے قرآن کہتا ہے کہ **اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ** (2:285) رسول بھی اس کے اوپر ایمان لاتا ہے جو خدا کی طرف سے اس پہ نازل کیا جاتا ہے۔ (اللہ اکبر! اللہ اکبر)۔ عزیزانِ من! سر پکڑ کے بیٹھ جانے والی بات ہے یا نہیں؟ کس کیٹگری (قسم) میں وہ شامل کر رہا ہے **اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ** (2:285) مومن جس طرح سے ایمان لا کر مومن بنتا ہے' رسول بھی اسی طرح سے ایمان لاتا ہے۔ کس پہ ایمان لاتا ہے؟ **بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ** (2:285) جو اس پر اس کے رب کی طرف سے نازل ہوتا ہے' عزیزانِ من! لائیے ساری دنیا کے عقل وشعور کے مالکوں کو اور مذاہب کی کتابوں کو اور ان سے کہیے کہ کہیں سے یہ ٹکڑا نکال کے بتائیں۔
بات کیا ہوئی تھی؟ وحی کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ **مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی** (53:3) اس میں رسول کی اپنی عقل وفکر کا کوئی دخل

---

[1] مجھے آہ وفغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا — تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا (بالِ جبریل)

[2] ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005۔

نہیں ہوتا' وہ اس کی فکری تخلیق نہیں ہوتی' وہ اس کے اوپر Objectively (خارج سے) نازل کیا جاتا ہے' دیا جاتا ہے' اس کے قلب میں القا کر دیا جاتا ہے' اس میں اس کی عقل وفکر کا دخل نہیں ہوتا اور یہ جو کہا ہے کہ اٰمن الرسول تو ایمان کی تو اس نے پہلے شرط بتائی کہ وہ عقل وفکر کی رو سے ایمان لایا جاتا ہے۔ وہ چیز جو رسول کو وہبی طور پر ملی تھی' جس میں اس کی فکر کا کوئی دخل نہیں تھا' رسول بھی اس کے اوپر پھر دوبارہ اپنی عقل وفکر کی رو سے ایمان لاتا ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (2:285) كُلٌّ میں یہ سب آتے ہیں: اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ (2:285)۔ رسول اس بات پہ بھی ایمان لاتا ہے کہ میں اس کا پیغامبر ہوں' یہ اس کا پیغام ہے' یہ اس کا کلام ہے' یہ اس کی وحی ہے' یہ صداقتیں ہیں' یہ حقیقتیں ہیں۔ وہ ان پر بھی فکر وشعور اور علم و بصیرت کی رو سے ایمان لاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163) لو بھئی! سب سے پہلے میں مسلمان ہوتا ہوں۔ مسلمان ہوتا ہوں' ہمارا محاورہ زبان کا ہے۔ یہی کہنا پڑتا ہے یعنی وہ رسول یہ کہتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163) سب سے پہلے میں خود اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ اور اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (2:285) وہ اس پر ایمان لاتا ہے جو اس پہ نازل کیا گیا ہے۔ ہم تک تو وہ صرف پہنچا تا ہی ہے' اس پہ تو وہ نازل ہوتا ہے۔

وحی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ قلبِ نبوی پر باہر سے نازل ہوتی ہے

عزیزانِ من! اس ایک ٹکڑے نے وحی کی حقیقت کو بھی ایسا واضح کیا ہے کہ یہ کہیں اور نہیں ہو سکتا۔ یہ جو اس پہ نازل ہوا ہے اس میں اس کی اپنی عقل وفکر کا کوئی دخل نہیں تھا اس لیے محض اس کے نازل ہونے سے اس کا اس پر ایمان نہیں ہو جاتا۔ اس اعتبار سے رسول اور جس تک قرآن پہنچتا ہے' اس کو وہ ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ قرآن اس کے پاس ہے' قرآن کی صداقتیں اس کے پاس ہیں' اس کو بھی اس قرآن کی ان آیات کے اوپر اس طرح' جیسا اس نے کہا ہے' ایمان لانا ہوتا ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ (2:285) رسول بھی اس طرح سے ایمان لاتا ہے۔ عزیزانِ من! کیا آپ نے کبھی اس سے پہلے یہ سنا بھی تھا؟ یہ آیت تو میں (معاذ اللہ) اپنی طرف سے نہیں پڑھ رہا' یہ سورۃ البقرۃ کی آخری سے پہلی آیت ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو خدا تعالیٰ پر اور قرآن پر ایمان لانے کا اعلان کرنا پڑا تھا

یہ آیت وہ ہے جسے عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ نمازوں میں' جماعتوں میں' امام وغیرہ' یہ آخری آیات پڑھا کرتے ہیں۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ ...... (2:285)۔ یہ آیتیں آپ روز سنتے ہیں لیکن کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ یہ بات کیا ہے۔ یہ اتنی ہی بات نہیں ہے' ایک اور جگہ یہ بھی ہے یعنی یہی نہیں کہ رسول اپنے دل میں ایمان

لے آتا ہے اور اس طرح سے مومنین کی صف میں ہی شامل ہو جاتا ہے۔ یہ اتنا ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! کہا یہ جاتا ہے کہ **قُلْ** (42:15) اے رسول! اعلان کر دو ان سے کہہ دو خدا رسول کو حکم دے رہا ہے کہ **قُلْ** (42:15) یہ کہو۔ کیا کہو؟ **اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ** (42:15) جو خدا نے مجھ پہ کتاب نازل کی ہے میں اس پر خود ایمان لایا ہوں۔ کہا کہ اس کا یہ اعلان کرو۔ امن الرسول کہہ کے یہی نہیں کہا کہ خدا نے کہہ دیا ہے کہ رسول بھی ایمان لے آیا ہے' چلو ٹھیک ہے جی: اسی جو کہہ دتا اے۔ ❶ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ بس تم **قُلْ** (42:15) اعلان کرو کہ **اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ ج وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ** (42:15)۔ کیا کہوں یہ پوری کی پوری آیت ہی عجیب وغریب ہے لیکن میں اپنے آپ کو اتنے ٹکڑے تک ہی محدود رکھوں گا کہ یہ بڑا ہی اہم موضوع ہے۔ پھر تھوڑا سا پیچھے چلیے۔

اعوان یا پٹھان یا سید کے گھر میں پیدا ہو جانے سے جو ہم اعوان پٹھان یا سید ہو گئے' وہ تو ٹھیک ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے' یہ بھی ہمارا ایک ذہن کا تصور ہے' کچھ اور بات نہیں ہے' نہ اعوان نہ پٹھان نہ سید' کچھ بات ہی نہیں ہے۔ بہرحال وہ تو ہو گئے۔ ہم نے مان لیے۔ پھر کیا اس کے بعد ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر خود ہی بن گیا؟ مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے ہم اس قوم کے فرد تو بن جاتے ہیں جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہود ونصاریٰ صابئین وغیرہ کی طرح ہمیں بھی ایمان لانا پڑے گا۔ ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ عزیزانِ من! جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے جس ذاتِ اقدس واعظم پر قرآن نازل ہوا ہے اس کے متعلق خدا کی شہادت ہے: **اٰمَنَ الرَّسُوْلُ** (2:285)۔ اس کا اعلان یہ ہے کہ **اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ** (42:15) میں بھی ما انزل اللہ پر ایمان لایا ہوں اور یہ کہ **اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ** (6:163) میں یوں مسلم ہوا ہوں۔ یہ جو ایمان لانا ہے اس کے لیے سوال یہ ہے کہ کس طرح سے یہ ایمان لایا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم پیدائشی مسلمان کا نہ ایمان قبول کرتا ہے اور نہ اُسے مومن تسلیم کرتا ہے

اب پھر وہ آیت آ گئی جو آج کے درس میں ہمارے زیرِ غور ہے کہ **وَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْہَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا** (25:73) وہ اس پہ آنکھیں بند کر کے نہیں گر پڑتے' آنکھیں کھول کے' کان کھول کے' بصیرت اور سماعت اور عقل وہوش کی رو سے' ان کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جو ایسا کرتا ہے وہ پھر مومنین کے حلقے میں داخل ہوتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا' تو ٹھیک ہے' مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا مسلمان تو ہے۔ قرآن نہ اس کا ایمان تسلیم کرتا ہے' نہ اسے مومن تسلیم کرتا ہے۔ یہ جو فتوے لگتے ہیں' یہ تو فقہ کی باتیں ہیں۔ عزیزانِ من! فتویٰ لگانے والے سے بھی کبھی پوچھو کہ تم بھی ساری عمر اس طرح سے ایمان لائے ہو۔ اب اگلے قدم پہ آیئے۔ عقل وہوش کی رو سے' فہم وفراست سے' غور وتدبر کے بعد' سب کچھ دیکھ بھال کے' یہ قرآن کی صداقتوں کو صحیح مان لیا' ٹھیک ہے تو بس کام ہو گیا یہی

---

❶ ہم نے جو کہہ دیا۔

مقصد ہے قرآن کا۔ ہم نے مان لیا کہ یہ صحیح ہے' یہ غلط ہے۔ عقل وفکر کی رو سے' تجربے مشاہدے کی رو سے' بھی اس کو یقین کی حد تک' مان لیا کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے' تو کیا یہ کافی ہو گیا؟

کیا عقل وشعور سے ایمان لے آنا کافی ہے؟

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ یہ ذہنی طور پر ہو گیا' ہم نے اس کو Intellectually (عقلی طور پر) سمجھ بھی لیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ذہنی طور پر کسی چیز کو سمجھ لینا قرآن کا مقصد تھا؟ کیا یہ مقصد تھا کہ صاحب! یہ فلاسفر ہو جائیں اور یہ ذہنی طور پہ سمجھ لیں کہ ہاں صاحب! بالکل ٹھیک ہے' میں مانتا ہوں' دلائل بھی دیں' دوسروں سے بحثیں بھی کیں' بڑی بڑی کتابیں بھی لکھیں' اسلام کی صداقتوں کے لیے دلائل اور براہین کے انبار بھی لگا دیں' تو کیا اس کا مقصد یہی ہے؟ جی نہیں' آپ کہیں گے کہ پہلی ہی منزل کچھ کم نہیں تھی۔ تم نے یہ کیا کیا؟ عزیزانِ من! میں نے آپ سے یہ نہیں کیا' خود میں بھی تو اسی میں شامل ہوں:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

(اقبالؒ)

میں تو خود کانپ اٹھتا ہوں جب کبھی بھی میں یہ کہنے لگتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ تو کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا کہ واقعی ایمان لے آیا ہوں لیکن بہرحال ذہنی طور پہ تو صحیح ہے' وہ تو آپ سمجھتے ہیں کہ میں ساری عمر' چالیس سال سے' یہ کچھ لکھتا رہا' قرآن کے حقائق کی تائید میں' دلائل و براہین ہیں' یہ ساری بیسیوں کتابیں لکھ دیں۔ سب کچھ ہوا' تو کیا مومن ہو گیا؟ قرآن کہتا ہے کہ **قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا** (49:14) یہ اعراب' یہ بدو' یہ صحرائی لوگ' یہ کہتے ہیں کہ اٰمَنَّا (49:14) ہم ایمان لے آئے۔ **قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا** (49:14) ان سے کہو کہ یہ مت کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ **وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا** (49:14) یہی کہو کہ ہم نے تسلیم کر لیا ہے' ہم اس کے سامنے جھک گئے ہیں' **وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ** (49:14) کیونکہ ایمان ابھی دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے کے لیے بھی پہلی منزل تھی کہ وہ عقل وفکر کی رو سے ان صداقتوں کو صحیح تسلیم کرے۔ یہ فکری اور عقلی چیز پہلی شرط تھی۔ ہم تو اس پہلی شرط پہ ہی رک گئے' اس پہ تو ہم میں سے ایک بھی پورا نہیں اترتا۔ ایک یہ چیز ہو گئی ہے۔

ایمان کا 'دماغ سے قلب تک' کی رسائی حاصل کرنا بھی لازم ہے

عقل وفکر کے طور پر' ہم نے یہ مان بھی لیا لیکن وہ کہتا ہے کہ اپنے آپ کو ابھی بھی ایمان والے نہ کہو' کیوں نہ کہو؟ کیونکہ ایمان تمہارے دماغ تک تو ہے' تمہارے دماغ سے تمہارے قلب پر ابھی نازل نہیں ہوا۔ یہ تو قلب کے اندر جانے والی بات ایک اور تھی۔

عزیزانِ من! آج یہ بات سمجھ میں آتی ہے جب یہ علم النفس یا سائیکولوجی اس دور میں آئی ہے کہ دماغی طور پر کسی چیز کو مان لینا' انسان کی سیرت و کردار پہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

نفسیاتی تبدیلی کے بغیر سیرت و کردار کی پختگی ممکن ہی نہیں

بڑے بڑے مفکر ہیں' بڑے بڑے فلاسفر ہیں۔ ان کی کتابیں اٹھا کے دیکھیے۔ یہ جتنی بھی اقدار (Values) اور Truth (صداقت) اور اخلاقیات ہیں' ان کے اوپر پوچھو نہیں کیسے کیسے انہوں نے مفکرانہ انداز سے دلائل دیئے ہیں' کتنی بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں! ان کی زندگی کو جھانک کے دیکھیے تو جو کچھ فکری طور پہ کہہ رہے ہیں' اس کا کہیں ذرا سا نشان بھی ان کی سیرت کے اوپر نظر نہیں آتا' کیا ہوا؟ ایمان دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ قرآن کے الفاظ عجیب ہیں۔ اس میں یہاں دماغ اور دل کا خود ہی فرق کر کے بتا دیا' فکری طور پر جو کچھ کہا ہے وہ دل میں نہیں اترا' اور قرآن یہ کہتا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ** (13:11) جب تک کوئی قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا کرتی' اپنے قلب کی تبدیلی پیدا نہیں کرتی' اس کے حالات میں کبھی تبدیلی نہیں پیدا ہو سکتی۔ جو چیز قوم کے لیے کہی' وہی چیز ایک فرد کے لیے ہے۔ جب تک اس کے دل کے اندر تبدیلی نہیں آتی' جب تک اس کا دل نہیں بدلتا' جسے آپ یوں کہہ لیجیے کہ جب تک یہ دل نہیں بدلتا' اس وقت تک اس کی سیرت اور کردار نہیں بدل سکتا' خواہ فکری طور پہ اس نے قرآن کے حقائق کو لاکھ سمجھ لیا ہو۔ سقراط[1] نے تو یہی کہا تھا کہ

Knowledge is virtue.

''کسی چیز کا سمجھ لینا ہی نیکی ہے'' یہ اس نے غلط کہا تھا۔ جو نالج ہے' جو کسی چیز کے متعلق علم ہو جانا ہے' یہی Virtue (نیکی) نہیں ہے۔ یہ تو صرف سمجھ لینا ہے کہ یہ Virtue (نیکی) ہے' یہ خیر ہے' وہ شر ہے' یہ صحیح ہے' وہ غلط ہے' یہ صرف سمجھ لینے والی بات ہے۔ انسان کا سیرت و کردار ان چیزوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن اب جو بات آگے آئی وہ سمجھنے کی ہے۔

قلب کی تبدیلی کی ایک عملی مثال

آیئے' ایک مثال سے بات سمجھتے ہیں۔ ایک شخص جانتا نہیں ہے کہ یہ جو پاؤڈر سا ہے' یہ سنکھیا ہے یا یہ مصری' پسی ہوئی چینی ہے۔ وہ یہ جانتا نہیں ہے۔ وہ سنکھیا پھانک لیتا ہے' موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ تو نہ جاننا تھا۔ اس کے برعکس جو خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے' وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ سنکھیا ہے' مہلک ہے' بلکہ اس سے زیادہ بڑھ کر تو کوئی دوسرا جانتا ہی نہیں ہے کیونکہ اس نے ابھی یہ کام کرنا ہے یعنی اس کو مرنا

---

[1] سقراط (C. 469-399 B.C.)

ہے۔اسے یہ یقین ہے کہ یہ جو چیز ہے اس سے موت واقع ہو جائے گی۔اگر اسے یہ یقین نہ ہو بلکہ یہ ہو کہ پتہ نہیں یہ وہی مصری نہ ہو یا آج کل دے اعتبار دا نال کتھے نقلی سنکھیا ای نا دین ڈئے ہون، سنکھیا وی تے اصلی نئیں ملدا۔ ❶ لیکن یہ جو آج آپ کو نقلی، جعلی، ملاوٹی مل رہا ہے، ملاوٹ تو ہر چیز میں ہو رہی ہے، تو وہ خودکشی کرنے والا پہلے اس کا یقین کرے گا کہ واقعی یہ اصلی سنکھیا ہے۔تو سنکھیا کے مہلک ہونے پر فکری طور پر جتنا یقین اس خودکشی کرنے والے کو ہوتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں ہوتا اور اس کے باوجود وہ سنکھیا پھانک لیتا ہے، جاننے کے باوجود کہ یہ مہلک ہے، اس سے ہلاکت ہو گی۔کیوں پھانکتا ہے؟ وہ زندگی پر اپنی موت کو ترجیح دیتا ہے، اسے زیادہ پسند کرتا ہے۔

اب آگے بات یہ آئی کہ یہ فکری بات نہ ہوئی۔فکری طور پہ تو میں نے کہا ہے کہ ابھی اس نے دیکھا ہے کہ اس سے تو موت واقع ہو جائے گی یقینی طور پہ موت واقع ہو جائے گی۔یہ جو چیز ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اوپر موت کو ترجیح دیتا ہے، یہ قلب کی چیز ہے، جذباتی چیز ہے، وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا، موت کو زیادہ پسند کرتا ہے۔اب ہمارے سامنے اگلا قدم آ گیا، اسے قوتِ فیصلہ کہتے ہیں۔پہلی چیز تو یہ آ گئی کہ وہ فکری طور پر، عقل و فہم کی رو سے، تجربے مشاہدے کی رو سے، یہ یقین کرے کہ یہ سنکھیا ہے، یہ ہلاکت آفریں ہوتا ہے۔سنکھیے کے مہلک ہونے پر ایمان لائے۔اگلی بات ہے کہ اندر ایک فیصلہ کرنے والی قوت ہے، وہ فیصلہ کرے کہ سنکھیا نہیں کھانا، اس سے موت واقع ہو جائے گی۔کون یہ ایسا فیصلہ کرے گا؟ وہ جو موت کے مقابلے میں زندگی کو ترجیح دے گا۔صرف جاننا کچھ نہیں ہے۔وہ جو غالب (1797-1869ء) نے کہا تھا، وہ بڑی پتے کی بات کہہ گیا ہے:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کسی عمل کے لیے طبیعت کا مائل ہونا: یہ سیرت کی تبدیلی پر موقوف ہے

یہ جو طبیعت کا ادھر آنا ہے، یہ جو ہے، یہ جانتا ہوں فکری بات نہیں ہے اور اس نے بڑا صحیح کہا ہے کہ جانتا ہوں، ثوابِ طاعت و زہد، خودکشی کرنے والا جانتا ہے کہ یہ مہلک ہے اس سے موت واقع ہو جائے گی، پر طبیعت ادھر نہیں آتی، اور ہمارا مفکر قرآن اقبالؒ (1877-1938) کہہ گیا کہ

خرد نے کہہ بھی دیا 'لا الٰہ' تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(ضربِ کلیم)

---

❶ آج کل کے لحاظ سے کہ یہ کہیں جعلی سنکھیا ہی نہ دے رہے ہوں، اصلی سنکھیا بھی تو دستیاب نہیں ہے۔

حالانکہ خرد کی رو سے لا الٰہ کہنا قرآن خود کہتا ہے کہ لا الٰہ اسی کا قابل قبول ہے جو خرد کی رو سے کہتا ہے لیکن اگلی بات جو ہے یہ اس بات پہ آیا ہے جو قرآن نے ان سے کہا ہے کہ ابھی اپنے آپ کو یہ مت کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں کیونکہ **وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ** ❶ (49:14)۔اس ❷ نے یہ کہا کہ

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود

جب یہ جان کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے تو پھر جان کچھ اور ہو جاتی ہے اور

جاں چوں دیگر شُد، جہاں دیگر شود

(جاوید نامہ)

جب جان کچھ اور ہو جاتی ہے تو یہ دنیا بدل جاتی ہے۔

قلب کے بدل جانے سے دو جہانوں اور دو جانوں کی متضاد کیفیت

خودکشی کرنے والے کے لیے دیکھیے جان دوسری ہو جاتی ہے' جہان اور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ دوسرا شخص خودکشی نہیں کرنا چاہتا' اس کا جہان اور اس کی جان اور ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں کے کس طرح دو متضاد جہان ہیں۔ یہ جہان اس کے نزدیک ایسا ہے کہ جتنی جلدی اس سے چھٹکارا ہو جائے وہ اس کو پسند کرتا ہے' کوشش کرتا ہے' بھاگتا ہے' دریا میں جا کر چھلانگ لگاتا ہے' یہ جہان ہمارے لیے جو مرنا نہیں چاہتے ہیں' پوچھو نہیں' ایک ایک سانس کے لیے ڈاکٹروں کو سینکڑوں ہزاروں روپے دیتے ہیں' کہ چار سانس ہی زیادہ آ جائیں۔ دونوں جہان مختلف ہو گئے۔ کس سے مختلف ہوئے؟ اندر سے ایک چیز کے بدلنے سے۔ کیا بدلتا ہے؟ یہ کہ تم کس کو زیادہ ترجیح دیتے ہو' کس کو زیادہ پسند کرتے ہو؟ یہاں یہ بات آ گئی کہ وہ موت کو زیادہ پسند کرتا ہے' ترجیح دیتا ہے جبکہ ہم زندہ رہنے کو پسند کرتے ہیں' اسے ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے دونوں کا سنکھیے کے متعلق جو علم ہے وہ دو مختلف نتائج پیدا کر رہا ہے۔ وہ اس کے حسبِ منشا نتیجہ پیدا کر رہا ہے جبکہ ہم اس سے باز رہتے ہیں تو وہ ہمارے حسبِ منشا نتیجہ پیدا کر رہا ہے۔ سوال یہی ہے کہ تم دونوں میں سے کس چیز کو زیادہ پسند کرتے ہو۔ آیئے دیکھیں' قرآن کیا کہتا ہے۔ جہاں تک معلومات کا تعلق ہے' علم حاصل ہونے کا تعلق ہے' سقراط (C.469-399B.C) کے الفاظ میں' نالج (Knowledge) کا تعلق ہے' قرآن یہ کہتا ہے کہ اس کے متعلق بھی خود نہ فیصلہ کیا کرو' تمہاری محدود عقل آپ نہیں فیصلہ کر سکتی' وحی تمہیں یہ بتائے گی کہ کون سی چیز تمہارے لیے فائدے مند ہے' کونسی نقصان دینے والی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم صدیوں کے

---

❶ ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔

❷ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) کی طرف ہے۔

تجربات و مشاہدات کے بعد یہ دیکھیں کہ یہ سنکھیا ہلاکت آفریں ہے، وحی پہلے دن یہ کہہ دیتی ہے کہ دیکھو، یہ سنکھیا ہے، اس سے موت واقع ہوجاتی ہے۔ بس وحی یہ کرتی ہے، وحی یہ علم دیتی ہے: **وَ عَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَ عَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّ ہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ** (2:216) ہوسکتا ہے کہ تم اپنی عقل و فکر کی رو سے کسی چیز کو اپنے لیے بہت اچھا سمجھو لیکن درحقیقت وہ تمہارے لیے نقصان رساں ہوتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے لیے نقصان رساں سمجھو درحقیقت وہ تمہارے لیے فائدہ رساں ہوتی ہے۔ یہ تو یہی ہے کہ بچے کو کڑوی دوائی ہم پلایا کرتے ہیں، وہ بھاگتا ہے، روتا ہے: چھڑاں ماردا جنوں کیندے ہیگے نیں۔ [1] وہ نہیں جانتا کہ یہ اس کے لیے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ ہے۔

صرف وحی ہر دو راستوں کا تعین کرتی ہے

تو بات یہ ہوئی کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ صرف وحی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ یہ چیز تمہارے لیے فائدہ مند ہے اور یہ چیز تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔ اب تمہارے اندر وہ خیر والی چیز ٹیکے (Injection) سے داخل نہیں کی جاسکتی نیز وہ خیر والی چیز تمہیں شر سے از خود نہیں بچا سکتی۔ تمہیں اس کے لیے وحی کے مطابق چلنا ہوگا۔ اس نے تو تمہیں اس کے متعلق صرف بتایا ہے کیونکہ **وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ** [2] (2:216)۔ یہ اسی آیت کا اگلا ہی ٹکڑا ہے۔ کیا بات ہے! بات ساری یہاں علم کی ہے: تم خود اس چیز کو نہیں جانتے، خدا جانتا ہے۔ اس نے بات تمہیں بتا دی۔ اب تم اور وہ ایک سطح کے اوپر آ گئے اور اس سے زیادہ، وہ خود کچھ نہیں کرتا۔ آپ نے جان لیا کہ یہ شر ہے، یہ خیر ہے۔ آپ نے جان لیا کہ یہ سنکھیا ہے، یہ مصری ہے۔ وحی نے بتا دیا تم نے خود تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ سنکھیا واقعی مار دینے والی چیز ہے۔ وحی نے یہ کیا۔ یہاں تک آپ پہنچ گئے۔ اب اگلی بات ہے کہ موت کو زیادہ پسند کرتے ہو، ترجیح دیتے ہو یا زندگی کو۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چیز ہم مجبوراً کسی کے اوپر عائد نہیں کرتے کہ تم اس کو ترجیح دو، اس کو ترجیح نہ دو۔ ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ فائدے مند ہے، یہ نقصان دہ ہے، جو جی چاہے راستہ اختیار کرلو۔ دیکھیے یہ جو لفظ میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ کون سی چیز ہے جس کو تم زیادہ پسند کرتے ہو، یہ ہم علم حاصل ہونے کے بعد کی بات کر رہے ہیں۔ وحی نے دو چیزوں کا علم دے دیا۔ اب اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ دیکھو فیصلہ تم کرو کہ کس چیز کو زیادہ پسند کرتے ہو۔ اب ٹائی (Tie) پڑ رہی ہے، دو متضاد کششیں سامنے ہیں: زندگی اور موت۔ یہ جو اقدارِ خداوندی یا اصولِ حیات ہیں، ان کے مقابلے میں یہ متاعِ دنیا ہے جو یونہی حاصل ہوجاتا ہے، جس طرح سے جی چاہے لوٹ لو۔ دو چیزیں اپنے سامنے آ گئیں، ان دو میں ٹائی (Tie) پڑ گئی۔ اب قرآن کہتا ہے کہ **قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ وَ اِخۡوَانُکُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ وَ عَشِیۡرَتُکُمۡ وَ اَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡہَا وَ تِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَہَا وَ مَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَہَاۤ** (9:24) اے رسول! ان کو بتا دو، ان سے کہہ دو کہ اگر

---

[1] جسے بدکنا، ڈرنا یا خوف کھانا کہتے ہیں۔

[2] اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تمہارے ماں باپ' تمہارے بیٹے بیٹیاں' اولاد' تمہارے بھائی بہن' تمہاری بیویاں' بیویوں کے لیے ان کے شوہر' تمہارے اہل خاندان' تمہاری مال و دولت' جس کو تم اس طرح سے اکٹھا کرتے رہتے ہو' سمیٹتے رہتے ہو' تمہاری تجارت کاروبار' جس کے مندا پڑنے سے تم اتنا ڈرتے ہو' تمہارے یہ محلات' یہ کوٹھیاں' یہ بنگلے' جن کو تم اتنا پسند کرتے ہو' سارا کچھ گنا دیا۔ اس دنیا کی ان چیزوں میں یہی کچھ گنایا جاسکتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ساری چیزیں اس قابل ہیں کہ یقیناً ان کو حاصل کرو لیکن اگر **اَحَبَّ اِلَيْكُمْ** (9:24) تم ان چیزوں کو زیادہ ترجیح دو **مِنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ** (9:24) اللہ اور رسول اور اس کے راستے میں جہاد کے مقابلے میں' ان چیزوں کو اگر تم زیادہ پسند کرو' انہیں ترجیح دینے لگ جاؤ' یعنی تم زندگی کے مقابلے میں موت کو ترجیح دے دو' یہ دیکھیے **اَحَبَّ اِلَيْكُمْ** (9:24) احب خود بتا رہا ہے کہ تم زیادہ پسند کرتے ہو' اس چیز کو ترجیح دیتے ہو' ہاں اگر تم ان چیزوں کو اللہ' اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد پر ترجیح دینے لگ جاؤ تو **فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ** (9:24) پھر تھوڑا سا انتظار کرو۔ سنکھیا اندر جانے دیجیے' نتیجہ ظاہر ہو جائے گا۔ اے سنکھیا کی پڑیا ہاتھ میں لینے والو! یہ اس لیے ہم نے بنایا تھا کہ اسے دوائی کے طور پہ استعمال کیا جائے' ڈاکٹر آخری توانائی جسم کے اندر پیدا کرنے کے لیے اس کا ایک ڈراپ دے لیکن اگر تم یہ جانتے بوجھتے کہ اس کی اتنی خوراک تمہیں مار دے گی اور تم زندگی کے مقابلے میں موت کو زیادہ ترجیح دیتے ہو' تو وہ ٹھیک ہے ہم تو تمہیں روکیں گے نہیں' ہم نے تمہیں صاحب اختیار پیدا کیا ہے' پھانک لو اور اس کے بعد کہا ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے' دو تین منٹ ٹھہر جاؤ' ہمیں کہنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ **اَحَبَّ اِلَيْكُمْ** (9:24) تم نے خود ہی ان کو دوسری چیزوں پر ترجیح دی ہے۔

وحی کی عطا کردہ سرفرازیاں

آپ نے غور فرمایا کہ ایمان کیا کرتا ہے۔ ایمان عقل و فکر کی رو سے' قرآن کی Values یا اقدار کو انسانی زندگی کے لیے مدد و معاون' نشو و نما کا ذریعہ' آئندہ زندگی کی منازل طے کرنے کے لیے ارتقائی منازل کی سیڑھیاں' خوشگواریاں' سرفرازیاں' یہ سارا کچھ بتاتا ہے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ کچھ ملے گا' ان کو چھوڑ دو گے تو ذلت اور خواریاں' دنیا بھر کی تمام نکبت و زبوں حالیاں' یہاں بھی' آخرت میں بھی' تمہارے حصے میں آئیں گی۔ وہ تم کو اس چیز کا علم دے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان اقدار کو علم و بصیرت کی رو سے ماننا کہ ان کے اتباع سے یہ ہوگا' ان کے خلاف جانے سے یہ ہوگا' اب یہ ہوا آپ کا ذہنی ایمان۔

اقدارِ خداوندی کے تحت انسانی اختیار و ارادے کی آزادی

اب آگے یہ بات آئی کہ جب سفرِ حیات میں ٹائی Tie پڑ جائے۔ ایک طرف یہ چیزیں ہوں' دوسری طرف کوئی قدر ہو۔ قدر یہ ہے

کہ دوسرے کے مال کو کسی طرح سے بھی غلط طریقے پہ، حرام طور پر، ناجائز طریقے سے، فریب کاری سے، چھوؤ بھی نہیں۔ یہ ہوئی وہ قدر۔ ایک طرف یہ اتنی بڑی Attraction (جاذبیت) کہ کوئی دیکھ نہیں رہا، پکڑے نہیں جا سکتے، کچھ صورت نہیں ہے، ذرا سا یوں ایک سیکنڈ کے لیے ذرا جھوٹ بولا، فائل کے اوپر دو لفظ یوں لکھے، یہ سارے کا سارا آ گیا۔ یہ دو چیزیں آپ کے سامنے آ گئیں۔ اب سوال ہوا **اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ** (9:24) کا کہ تم ان میں سے کس کو ترجیح دیتے ہو؟ کہا کہ یہ وہ چیز ہے۔ اب تم اس صورت میں کس قدر (Value) کی حفاظت کو ترجیح دو گے؟ وہ جو تم ذہنی طور پہ ایمان لائے تھے، کیا وہ تمہارے جذبات پر اثر انداز ہو گیا ہوا ہے؟ اگر تمہارے جذبات اس قالب کے اندر ڈھل گئے ہیں تو تم، جس طرح زندگی کو ترجیح دینے والا سنکھیے سے دور بھاگتا ہے، آگ سے دور بھاگتا ہے، تم ان تمام کششوں سے دور بھاگ جاؤ گے کیونکہ تم اقدارِ خداوندی (Divine Values) کو ترجیح دیتے ہو۔ اب یہ جو ترجیح دینے والا عمل اس طرح سے ہے یہ ہے عملِ صالح۔ اس سے اس نے ایمان کے بعد عمل صالح کیا، صلاحیت بخش کام کیا، زندہ رہنے والا کام کیا۔ ابھی میں زندہ رہنے والی بات کرتا ہوں۔

کسی قدر (Value) کی نافرمانی کے سلسلہ میں ایمان کی تجدید، اس کی باز آفرینی

پچھلی آیت (25:70) کے اندر، توبہ والی آیت کے اندر، میں نے کہا تھا کہ ایک غلطی تو وہ ہے کہ سنکھیا اتنا کھا لیا کہ موت ہی واقع ہو گئی۔ ایک غلطی یہ ہے کہ وہ سنکھیا غلطی سے تھوڑا سا کھایا گیا، اس کو نقصان تو کچھ ہوا لیکن یہ جانتے ہوئے کہ یہ سنکھیا ہے، اس کی پہلی شرط کے لیے کہا کہ **اِلَّا مَنۡ تَابَ** (25:70) جس کو احساس ہو جائے کہ او ہو، غلطی ہو گئی، لغزش ہو گئی۔ اس کے بعد ہے کہ **وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا** (25:70)۔ درمیان میں یہ ہے کہ یہی نہیں کہ اس کے بعد اس چوراہے کے اوپر واپس آ گیا اور اس کے بعد آ کے اس نے صحیح کام کیا: **اٰمـنـا**۔ یہاں تو یہ اور بات ہو گئی کہ جب بھی انسان کسی Divine Value یا قدرِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس وقت اس کے اندر ایمان نہیں رہتا، جب وہ پھر اس سے باز آتا ہے، اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے، اس کی (Return) ریٹرن (مراجعت) ہوتی ہے: **مـن اٰمَـنَ**۔ تو اس کے بعد پھر اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ کہے کہ او ہو، میرے ایمان کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں ایسا نہ کروں۔ یہاں **اٰمَـنَ** ہے۔ پھر اپنی باز آفرینی کے لیے، واپس آنے کے لیے، کہا ہے جسے آپ توبہ کہتے ہیں، یعنی کتنی باریک بات ہے کہ جب تم نے اس کی خلاف ورزی کی ہے، تو سچی بات یہ ہے کہ اس وقت تمہارے اندر یہ ایمان نہیں تھا۔ تو بات ٹھیک ہے، خودکشی کرنے والے کے اندر یہ ایمان نہیں ہوتا کہ موت کے مقابلے میں زندگی زیادہ قیمتی ہے۔ اگر آخری وقت میں بھی وہ چھلانگ لگانے سے ذرا پہلے بھی، اس کو اس چیز کا احساس ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مانتے ہو کہ زندگی زیادہ اچھی ہے: **اٰمَـنَ** وہ کہتا ہے تو یہ وہی کر سکتا ہے جو پھر اس چیز کو،

اس بات کو Review کرے کہ نہیں یار زندگی زیادہ قیمتی ہے۔ ایمان تو یہ چیز ہے۔

ایمان ہر آن اپنی قوت کا اظہار چاہتا ہے

اس پہ مجھے یاد آ گیا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی وہ حدیث کتنا چمکتا ہوا گوہر ہے جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی انسان زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا ایمان اس کے سامنے باہر کھڑا ہوتا ہے۔ خوب سمجھائی ہے بات! کہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ یہی نہیں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے یہ سائن کر دیا اور مان لیا اور ساری عمر کے لیے ایمان والی بات ہو گئی۔ آپ جب بھی اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس وقت آپ کا صداقت کے اوپر محکم یقین نہیں ہوتا۔ سہو سے نسیان سے ہو جانا کچھ اور بات ہے لیکن یہ جانتے بوجھتے ہوئے پھر اگر اس کا ارتکاب ہوتا ہے تو اس وقت آپ نہیں کہہ سکتے کہ میرا ان صداقتوں کے اوپر ایمان تھا۔ تو عزیزانِ من! ایمان کی تو یہ قوت ہو گئی۔ محض مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے ایمان نہیں ہوتا' ایمان قرآن کی صداقتوں کو علی وجہ البصیرت' عقل و فکر' غور و تدبر' کے بعد ماننے سے ایمان آتا ہے لیکن یہ ایمان ذہنی ایمان ہے۔ اس کے بعد صورت یہ ہے کہ قلب کی گہرائیوں میں یہ ایمان اس طرح سے اترے کہ ہر وہ چیز جو اس کے خلاف جاتی ہے اس کے متعلق آپ سمجھیں کہ یہ میرے لیے مہلک ہے' میرے لیے موت کا پیغام ہے' یہ تین چیزیں اکٹھی ہوں گی تو پھر اس شخص کو مومن کہا جائے گا' پھر ایمان اس کے دل میں داخل ہو جائے گا۔

اہلِ ایمان کی ایک حسین دعا

عزیزانِ من! اب اگلی آیت مجھے بار بار پکار رہی ہے۔ مومنوں کی بات ہو رہی تھی کہ یہ لوگ جب قوانین خداوندی پر بلا سوچے سمجھے عمل نہیں کرتے' تو زندگی کے دوسرے معاملات کے فیصلے بے سوچے سمجھے کیسے کریں گے؟ اور بات ہو رہی تھی کہ صاحب! یہ خود کرتے ہیں' اور ان کی ایک دعا بھی ہے۔ یہ بڑی حسین دعا ہے: یا اللہ! باہر کے معاشرے میں تو تم نے ہم کو بتا دیا کہ یہ کرو اور یہ کرو۔ اس کے بعد وہاں سے پلٹ کے اب شام کو گھر آئیں' تو وہ گھر ایسا دے **وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا** (25:74) یا اللہ! ہم نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کی ہے ہم نے اس گھر کو تیرے قواعد کے مطابق اچھا رکھنے کے لیے سب کچھ' جو کچھ ہو سکتا ہے' کیا ہے۔ اس کے باوجود' کچھ اور باتیں ایسی ہیں جن پہ ہمارا یقینی کنٹرول ہوتا ہے۔ یہ ھب لنا وہبی طور پہ ملنا بغیر معاوضے کے کوئی چیز دے دینا ہے۔ کیا حسین دعا ہے! کہا کہ یا اللہ! میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے یہ کچھ کرنے کے لیے اس گھر کے اندر بڑی کاریگری کی ہے۔ میں نے اپنی طرف سے بہت کچھ کیا ہے' بہت سے عناصر ابھی ایسے بھی ہیں کہ ان کے اوپر کچھ پورا کنٹرول نہیں ہے۔ میری دعا یہ ہے کہ تو اپنی طرف سے اسے پورا کر دے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس گھر کو کیا بنا دے؟ کہا کہ **هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ** (25:74) یا

اللہ! اس گھر میں بسنے والی بیوی اور بچے میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائیں۔

انسان کی کامیابی کا راز گھر کی ٹھنڈک میں مضمر ہے

عزیزانِ من! معاشرے میں صحیح کام وہ کرسکتا ہے جس کے گھر کے اندر اس کو ٹھنڈک ملتی ہو۔ یہاں اگر سکون اور سکینت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ باہر کی دنیا میں بھی بندے دا پتر بن کے رہندا اے ❶۔ اگر اس کو یہاں یہ چیز نصیب نہیں ہوتی تو یہ وہ اضطراب ہے، یہ وہ جہنم کی آگ ہے، جو باہر بجھ نہیں سکتی، اسی لیے **ھب لنا** کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میری کوششوں سے کچھ ہوگا، اس میں کچھ تیری توحید کا بھی دخل ہے، تو وہ عطا فرما، بلا مزد و معاوضہ عطا فرما کہ یہ بیوی اور بچے میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائیں۔

اس ٹھنڈک کے حصول کا طریق

برادرانِ عزیز! وہ تو اسی صورت میں ہوگا کہ تم آگ لے کر اندر نہ جاؤ۔ اگر انہوں نے تمہارے لیے برف کی سل رکھی ہوئی ہے اور تم آگ کا شعلہ لے گئے ہو تو وہ برف پہلے ہی پانی بن جائے گی۔ تم آگ کا شعلہ نہ لے کر جاؤ، پھر وہاں کی برف تمہیں دونوں طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے گی۔ اگر یہاں سے جہنم کی آگ اندر لے کر جاؤ، اور وہاں سے یہ توقع کرو کہ وہ برف تمہیں ٹھنڈک دے گی، خالی ان کی برف ٹھنڈک نہیں دے سکتی۔ عزیزانِ من! یہ تو دونوں طرف سے ہوتا ہے۔ یہ چیز یہاں کرو **اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا** (25:74) اور باہر کی دنیا میں جب پھر ہم جائیں تو یہی نہیں کہا کہ مجھے متقی بنا۔ متقی کے معنی یہ ہوتے ہیں: زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنے والا۔ یہ بڑی چیز ہے، بڑی جامع اصطلاح ہے۔ دعا تو یہ ہے کہ جو متقی بنتا ہے قرآن کہتا ہے کہ نہیں، یہ دعا یہ ہے کہ متقین کے لیے امام بنا دے۔ یہ امام کیا ہوتا ہے؟ وہ ہمیں اتنا ہی پتہ ہے: اوجیہڑا اگے کھلوتا ہویا ہوندا ہیگا ❷۔ یہ بات نہیں ہے۔ عزیزانِ من! متقین کا امام یہ نہیں ہے کہ اوناں دا بہت وڈا سارا بنا دے۔ او میرے پچھے کھلوتے رہن، میں اوہناں دے اگے کھلوتا رواں ❸۔ امام یہ نہیں ہوتا۔ معمار جب دیوار بناتے ہیں تو ان کے پاس بڑا سادہ سا ایک آلہ ہوتا ہے اُسے ساہول (Plumb line) کہتے ہیں۔ اس کے نیچے اس کی ڈوری ہوتی ہے۔ وہ آلہ ایک لٹو سا ہوتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ اس ڈوری میں لٹکایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس لٹو سے ہر وقت دیکھتا ہے کہ دیوار سیدھی جا رہی ہے۔ وہ لٹو بتا دیتا ہے کہ درمیان میں کہیں کجی یا ٹیڑھ پن تو نہیں آ گیا۔ کہتا ہے کہ میری زندگی کو ایسا بنا دے کہ

---

❶ انسان بن کر رہتا ہے۔

❷ وہ جو (نماز میں) آگے کھڑا ہوا ہوتا ہے۔

❸ ان کا بہت بڑا بنا دے کہ وہ میرے پیچھے کھڑے رہیں اور میں ان کے آگے کھڑا رہوں۔

میری زندگی اور سیرت کو دیکھ کے دوسرے اپنی زندگیوں کی پیمائش کر لیں کہ ان میں کہیں کجی تو نہیں آ رہی۔ صحیح زبان میں اس کو لیڈر کہیں گے۔ ہمارے ہاں اس کے لیے لفظ ہی امام (Leader) ہوتا تھا۔ اسلامی اصطلاح میں' آپ کو یہ پتہ ہے جو سربراہِ مملکت ہوتا تھا' اس کو امام کہتے تھے۔ امام کے یہ معنی نہیں ہوتے تھے کہ وہ نماز میں جماعت کراتا تھا۔ وہ ہوتا یہ تھا کہ اس کی جو سیرت تھی وہ اس ساہول (Plumb line) کا کام دیتی تھی کہ جس سے دیوار کا سیدھ پن اور ٹیڑھ پن ماپا جائے۔ ہر وقت دیکھا جائے کہ کہیں یہ اینٹ غلط تو نہیں لگ گئی۔ امام یہ ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **وَ اجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا** (25:74) اور یہ عباد الرحمٰن کی خصوصیات آ رہی تھیں کہ معاشرہ میں ان کی پوزیشن ایسی ہو کہ جو لوگ غلط روشِ زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہیں ان کی امامت (لیڈرشپ) ان کے حصے میں آئے۔

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ **اُولٰٓئِکَ یُجۡزَوۡنَ الۡغُرۡفَةَ بِمَا صَبَرُوۡا** (25:75) یہ ہیں وہ لوگ جن کے اندر یہ خصوصیات ہیں کہ یہ لوگ نظامِ خداوندی کے قیام اور استحکام کے لیے نہایت استقامت اور ثبات کے ساتھ سرگرم عمل رہے ہیں۔ یہاں لفظ یجزون آیا ہے یعنی انہیں یہ چیز مفت نہیں مل رہی' ان کو ان کے ایمان کا' ان اعمال کا بدلا دیا جا رہا ہے' یہ ان کا فطری نتیجہ ہے' کیا ہے نتیجہ ان کا؟ **الغرفة**. یہ ایک لفظ ہے جس میں یہ بتا دیا گیا ہے۔

ہر قسم کی نعمتوں سے بھرپور زندگی

قربان جایئے عربوں کی زبان پہ' قرآن کے انتخاب پہ! ایک لفظ ہے' عزیزانِ من! الغرفة۔ ان کے ہاں الغرفة کا لفظ استعمال ہوتا تھا ''اس قسم کی زندگی' اس قسم کی نعمت' ایک تو جس میں بلندی پائی جائے' یہ اوپر جو اوپر کی منزل کا بالا خانہ ہوتا تھا' غرفة وہی ہوتا ہے۔ بلندی پائی جائے' تیزی پائی جائے' تیز رفتار اونچی جو چلنے والی ہوا ہے اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ اس میں سیرابیت کی خصوصیت ہوتی تھی۔ جو پانی سے بھری ہوئی ہوتی تھی اس کو بھی یہ کہتے تھے۔ کہا کہ جن کی سیرت و کردار میں یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں' اب سوال یہ ہے کہ ان کی اس سیرت و کردار کا بدلا کیا دیا جائے گا؟ یہ بدلہ الغرفة ہے یعنی بلندیاں تیز رفتاریاں۔ اور قرآن نے کہا ہے کہ پانی سے زندگی ہے۔ یہ جتنی ممدِ حیات چیزیں ہیں' وہ بھرپور ندیوں کی طرح ان کے ساتھ رواں دواں چلیں۔ مگر یہ یونہی نہیں مل جائیں گی۔ اس کے لیے کہا ہے کہ **بِمَا صَبَرُوۡا** (25:75)۔ یہ ان کی استقامات کی وجہ سے' زندگی بھر مستقل مزاج رہنے سے ملیں گی۔ یہ ان کی استقامت سے ہوگا اور پھر زندگی کی جو اگلی منزل آئے گی' ان کے لیے یہی منزل جس میں یہاں وہ جو معاشرہ یہاں قائم کریں گے **یُلَقَّوۡنَ فِیۡهَا تَحِیَّةً وَّ سَلٰمًا** (25:75) اس میں ہر طرف سے ان کے لیے نوید جاں فزا ہوگی: تحیة یعنی زندگی کی نوید ہوگی۔ تَحِیَّةً کے اس ایک لفظ میں قرآن نے ساری بات کہہ دی لیکن عزیزانِ من! ٹھہریئے' ابھی ساری بات نہیں کہی۔ یہ زندگی ہے۔ وسلٰمًا ہے

یعنی بھر پور زندگی مکمل زندگی: سلٰمًا کے معنی صرف سلامتی نہیں ہوتا' اس کے معنی صرف Peace نہیں ہوتا' وہ تو ایک Negative چیز ہے۔ یہ سلٰمًا ہے' میں نے کہا ہوا ہے کہ جسے مرغِ مسلم کہتے ہیں' جس میں سے کوئی چیز نہ کم ہوئی ہو' زندگی اور ایسی بھر پور زندگی کہ جس میں کوئی کمی نہ واقع ہوئی ہو' یہ ان کو دیں گے۔ **خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَا** (25:76) وہ اس میں رہیں گے۔ **حَسُنَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّ مُقَامًا** (25:76) ٹھہرنے کی جگہ بھی نہایت عمدہ' جہاں مقام کرنا ہے' وہ بھی بڑا حسین۔

اس کے بعد یہ جو مخالفین ہیں' ان کے لیے اب یہ اس سورۃ کی آخری آیت آ گئی کہ **قُلۡ مَا یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡ لَا دُعَآؤُکُمۡ ۚ فَقَدۡ کَذَّبۡتُمۡ فَسَوۡفَ یَکُوۡنُ لِزَامًا** (25:77) یہ جو مخالفین ہیں' ان سے تم یہ بات کہہ دو کہ اگر مخالفت کرتے رہو گے تو خدا کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا' تمہارا ہی کچھ بگڑے گا' تم نے ان صداقتوں کی تکذیب کی' تم کہتے رہے کہ سنکھیا ہلاکت آفریں نہیں ہوتا' ہم کہتے رہے ہلاکت آفریں ہوتا ہے' تم نے کہا کہ نہیں ہوتا۔ تم نے جھٹلایا ہے۔ ہم نے کہا کہ اسے پھانکتے ہو تو پھانک لو اور اس کے بعد ہے کہ **فَسَوۡفَ یَکُوۡنُ لِزَامًا** (25:77) پھر دیکھو گے کہ تم سے موت چپکتی کیسے ہے۔ اس لیے اے رسول! ان مخالفین سے کہہ دو کہ یہ ہے میری دعوت۔ اگر تم اس دعوت میں میرا ساتھ نہیں دیتے' تو نہ دو۔ میرا نشو و نما دینے والا تمہاری ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کی میزان میں تمہاری مخالفت کا پر کاہ جتنا بھی وزن نہیں۔ تم اس دعوت کی تکذیب کرتے ہو تو اس سے اُس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اِس سے تم خود ہی تباہ ہو گے۔ اور یقین رکھو کہ وہ تباہی تمہارے سامنے آ کر رہے گی۔

سورۃ الفرقان کی آخری آیت بھی' عزیزانِ من! آج آ گئی۔ اس کے بعد آئندہ درس میں اگلی سورۃ الشعرآء لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀......❀......❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)